سالنامہ
۱۹۷۹ء
ہما
اردو ڈائجسٹ
آپ بیتی نمبر
8/-

فروری ۱۹۷۹ء جلد ۱۵ شمارہ ۱۵۱

آپ بیتی نمبر کی قیمت آٹھ روپے، عام شمارے کی قیمت چار روپے، سال بھر کی قیمت پینسٹھ روپے جس میں سالنامہ اور نمبروں کی قیمت اور پچیس روپے رجسٹری اور ڈاک خرچ کے شامل ہیں۔
ہر شمارہ رجسٹری سے بھیجا جاتا ہے۔
فون نمبر ۶۹۸۸۶۴

ھما کے بال و پر

جگہ کی تنگی اجازت نہیں دیتی کہ پوری فہرست شائع کیجائے اس لئے "ھما کے بال و پر" کے تحت صرف ان حضرات کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں جن کی آپ بیتیاں اس نمبر میں منتخب یا ملخص کی گئی ہیں۔ (ادارہ)

- بہادر شاہ ظفر
- سرسید احمد خاں
- مہاتما گاندھی
- مسٹر محمد علی جناح
- مولانا ابوالکلام آزاد
- پنڈت جواہر لال نہرو
- نواب زادہ لیاقت علی خاں
- مولانا محمد علی جوہر
- مولانا حسین احمد مدنی

- ذوالفقار علی بھٹو
- محمد علی کلے
- کرنل قذافی
- موشے دایان
- انورالسادات
- جارج حبش
- خروشچیف
- غوث علی شاہ قلندر
- عبدالمجید قریشی

- شاہ فیصل
- کرنل ناصر
- یاسر عرفات
- لیلیٰ خالد
- مرارجی ڈیسائی
- خان عبدالغفار خاں
- ہوش بلگرامی
- ایک نازی مجرم اور دوسرے

- مرزا غالب
- میر تقی میر
- جوش ملیح آبادی
- دیوان سنگھ مفتون
- ریاض خیرآبادی

ترتیب: احمد مصطفیٰ صدیقی راہی —— تزئین کار: ای۔ رعنا + بہزاد راہی —— ناظم اعلیٰ: خالد مصطفیٰ صدیقی
طبوعہ: امپیریل پریس لال کنواں دہلی —— پرنٹر و پبلشر: خالد مصطفیٰ صدیقی
مالک: خالد مصطفیٰ صدیقی
مقام اشاعت: بی ۱۷۔ جنگ پورہ ایکسٹنشن نئی دہلی ۱۴
تاریخ اشاعت: ۱۹ر دسمبر ۷۸ء

فہرست

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

۱۵۱ ویں منزل

اردو ڈائجسٹ "ھُما" کا سالنامہ ۱۹۷۹ء "آپ بیتی نمبر" کی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی بساط اور وسائل کے مطابق بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ برصغیر ہندوپاک کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کی اہم شخصیتوں کی آپ بیتیاں بھی اس نمبر میں شامل ہوں۔ چنانچہ یہ آپ بیتیاں جو ہزاروں صفحات پر بکھری ہوئی تھیں ان میں سے خاص، اہم اور دلچسپ واقعات کا انتخاب اور تلخیص کرکے ہم نے اپنے ان محدود صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن شخصیتوں کی آپ بیتیاں اس نمبر میں شامل ہیں وہ کسی نہ کسی اعتبار سے عالمی شہرت کی مالک ہیں۔ ان کے مطالعے سے آپ کو مختلف قوم اور ملک سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں، فنکاروں اور اہم شخصیتوں کے خیالات، نظریات، مشاغل اور دلچسپیوں کا پتہ چل سکے گا۔ کچھ ایسے تاریخی حقائق بھی آپ کے سامنے آئیں گے جن پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور بعض حیرت انگیز اور دلچسپ انکشافات سے آپ یقیناً چونک بھی اٹھیں گے۔

یہ آپ بیتیاں زیادہ تر متعلقہ شخصیت کی خودنوشت سوانح حیات اور تقریروں سے ماخوذ ہیں اور بعض مستند ریکارڈس کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہیں جس میں ہم نے اپنی طرف سے کسی قسم کی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا ہے۔

ایک بات اور عرض کردیں کہ ان آپ بیتیوں میں جن لوگوں نے اپنے خیالات اور نظریات پیش کئے ہیں۔ ان سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ یہ ان کے اپنے نظریات ہیں۔ ہم ان سے اتفاق یا اختلاف کئے بغیر جوں کی توں آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ آپ خود اندازہ کریں گے کہ کس قدر جستجو اور چھان بین کے بعد ہم اس لائق ہوسکے ہیں کہ یہ ضخیم نمبر آپ کی خدمت میں پیش کریں۔ اردو میں اس سے پہلے کبھی ایک ساتھ ایسی آپ بیتیاں نہیں پیش کی گئی تھیں۔ ہم اپنی اس کوشش اور جستجو میں کس حد تک کامیاب رہے، یہ فیصلہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ نمبر بھی ھُما کے سابقہ نمبروں کی طرح مقبولیت حاصل کرے گا۔ (مدیر)

میں ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو لاڑکانہ (سندھ) میں پیدا ہوا تھا۔ میں سرشاہنواز بھٹو کا تیسرا لڑکا ہوں۔ جب میری عمر چھ سات سال کی تھی تو لاڑکانہ میں نہ بجلی تھی اور نہ پختہ سڑکیں بلکہ ایسا کوئی اسکول بھی نہ تھا جس میں تعلیم کا معقول انتظام ہو۔ گھر پر ایک مولوی صاحب کلام پاک پڑھانے آیا کرتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں والد محترم بمبئی منتقل ہو گئے اور یہیں میری باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ چونکہ لاڑکانہ میں میری تعلیم باقاعدہ طور پر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں کچھ پیچھے رہ گیا۔ یہاں میں نے کیتھڈرل ہائی اسکول کی ابتدائی جماعت میں داخلہ لیا۔

۱۹۴۶ء میں میں نے اپنی تعلیم کا ابتدائی حصہ مکمل کرلیا۔ اسی سال اعلیٰ تعلیم کے لئے میں نے امریکہ کا رخ کیا۔ یہاں میں پڑھائی کے علاوہ دوسری سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ یونیورسٹی کی کونسل نے میرے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ "ذوالفقار علی بھٹو ذہانت کے اعتبار سے درسگاہ کے دوسرے طالب علموں کی سطح سے بہت بلند ہے"۔ انگلینڈ میں میں نے تین سال کا کورس دو ہی سال میں مکمل کرلیا تو برطانوی طلباء بے حد ششدر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آکسفورڈ سے میں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال بیرسٹری ایٹ لا کی ڈگری بھی اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ میرے اس تعلیمی ریکارڈ

میرے شب و روز

موت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں سابق وزیراعظم پاکستان مسٹر بھٹو پر کیا گزر رہی ہے؟
انہیں کی زبانی سنئے (ادارہ)

سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور مجھے بین الاقوامی قانون کے شعبہ میں لیکچرار شپ مل گئی۔

اسی دوران میری شادی نصرت اصفہانی سے ہوئی جو مرزا محمد اصفہانی کی صاحبزادی ہیں۔

یوں تو میری سیاسی زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز آئے لیکن اقتدار کی باگ ڈور جب میرے ہاتھ میں آئی۔ تو پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ پاکستان دوبارہ عالمی برادری میں اپنا کھویا ہوا مقام اور وقار حاصل کرے میں چاہتا تھا کہ مغربی سامراج کے شکنجے سے اپنے وطن کو دھیرے دھیرے باہر نکال لوں۔ میں نے اس ٹوٹے پھوٹے ملک کو ایک دستور دیا۔ جمہوریت بحال کی۔

آخر کار مجھے اپنی سامراج دشمن پالیسیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اقتدار غیر قانونی طور پر مجھ سے چھین لیا گیا۔ مجھ پہ قتل کا مقدمہ چلایا گیا۔ جس کے بارے میں میں نے کھری عدالت میں کہا تھا کہ "یہ قتل کا مقدمہ نہیں بلکہ "مقدمہ کا قتل" ہے۔

میں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین مجریہ ۱۹۷۳ء کا خالق ہوں۔ مذکورہ آئین کی باضابطہ تدفین پر بہت افسردہ اور اداس ہوں۔ کیا یہ آئین اس لئے دفن کیا گیا کہ اس کا خالق اس وقت موت کی کوٹھری میں بند ہے۔ یہ آئین تمام سیاسی جماعتوں کی اتفاق رائے سے بنایا گیا تھا۔ اور یہ قوم کی امانت تھا۔ لہٰذ

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس نے اس آئین کا جنازہ نکالا اُس نے اُسی آئین کے تحت حلف اٹھایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ آئین موجود ہے۔ اس کی تدفین نہیں کی گئی! اس کے جواب میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ آئین کی دفعات وفاق کو نواب شاہ، لاہور، مردان یا خضدار میں عصمت دری کی اجازت نہیں دیتیں۔ اور نہ ہی لوگوں نے اس قوم کو اس لیے جنم دیا تھا کہ وہ مایوس ہو کر عین عالمِ شباب میں خود کو نذرِ آتش کر لیں اور موت کی آغوش میں چلے جائیں۔ حقائق بہت تلخ اور ترش ہیں اور وقت نے خطرناک دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔

۲ ستمبر ۱۹۷۷ء (یہ ماہِ رمضان تھا) کو صبح کاذب کے وقت کمانڈوز، بری فوج کے جوانوں اور ایف آئی اے کے اہل کاروں کی بھاری تعداد کراچی میں واقع میرے مکان ۷۰، کلفٹن پر دھاوا بولا۔ اور اسٹین گنوں اور دیگر خودکار ہتھیاروں کی نوک پر نہایت ڈرامائی انداز میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میری نوجوان بچیوں کو نہایت بدتمیزی سے نیند سے بیدار کیا گیا۔ انھیں خوفزدہ کیا گیا۔ ڈرایا گیا۔ میرے ملازمین کو شدید زد و کوب کیا گیا۔ اور تلاشی کے دوران ہمارے گھر کی ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیا گیا، گرفتاری کے بعد بذریعہ طیارہ مجھے لاہور لایا گیا۔ اور چھاؤنی میں واقع ایک فوجی بنگلے میں رکھا گیا۔ یہاں کے انچارج ایک کرنل اور دو میجر تھے۔ بنگلے پر سخت پہرہ تھا۔ بری فوج کے تقریباً ۱۵، ۲۰ جوان چوبیس گھنٹے بنگلے کی چار دیواری میں گشت کرتے رہتے تھے۔ بنگلے کے سامنے واقع پارک میں فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور لائیٹ آرٹلری متعین تھی۔ رات کے وقت بنگلے کے باہر بالکل تاریکی تھی۔ اور بنگلے کے ہر کمرے میں ایک چھوٹا سا نیلا بلب جل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر سُو تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے وقت گشت کرنے والے جوانوں کے بھاری جوتوں کی دھمک اور زمین کھودنے کی آوازوں کے سبب میں سو نہ سکا۔ زمین کھودنے کی آوازیں سُن کر مجھے شیخ مجیب الرحمٰن کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انھوں نے جنوری ۱۹۷۲ء میں مجھ سے کہے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہر رات اُن کی کوٹھری کے باہر قبر کھودی جاتی تھی۔

یہ نفسیاتی جنگ کا ایک حربہ تھا۔ تاکہ انھیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا جائے۔ اور ان کے اعصاب جواب دے جائیں۔ مجھے اخبارات نہیں دیئے گئے۔ نہ کسی سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ یہاں تک کہ میرے وکلا کو بھی اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ جو کرنل اس جگہ کا نگران تھا۔ وہ جنرل یحییٰ خان کا بھانجا تھا۔

بلا نوٹس اور وکلا کی امداد فراہم کیے بغیر ۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کی شب کو مجھے ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مجسٹریٹ کو بتایا گیا کہ مجھے ایف آئی اے کی تحویل میں رکھا گیا ہے۔ حالانکہ میں آرمی کی چوتھی کارپس کی تحویل میں تھا۔ ۴ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے عبدالخالق آیا۔ اور دھمکی دی کہ اگر میں نے تعاون نہ کیا۔ تو مجھے دردناک نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس تشدد آمیز دھمکی نے مجھے مشتعل کر دیا۔ اور میں اس پر برس پڑا۔ چنانچہ وہ فوراً معافی مانگنے لگا۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی کے حکم کے تحت ۵ ستمبر ۱۹۷۷ء کو میرے وکلا کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی گئی اور اس کے اگلے ہی روز آرمی اور پولیس کی بھاری جمعیت کے پہرے میں مجھے کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۷۷ء سے ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء تک مجھے قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ میرے سیل میں صفائی کا انتظام نہایت ناقص تھا۔ سخت بدبو آتی تھی۔ مچھروں اور مکھیوں کی بھرمار تھی۔ قیدِ تنہائی کے یہ دن ناقابلِ فراموش ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے تقریباً دس دن قبل جیل میں فوج کی موجودگی اور اس کی سرگرمیوں نے پُراسرار فضا پیدا کر دی۔ پھانسی گھر کا متعدد بار معائنہ کیا گیا۔ اور صفائی ستھرائی کی گئی۔ اور یہ بھی پروگرام بنایا گیا کہ "واقعہ" کے بعد غیرملکی اور ملکی فوٹو گرافروں کو تصویر اتارنے کی اجازت دی جائے۔ جیل کے ٹاور پر ایک ایک گن نصب کر دی گئیں اور [illegible] جیل کو ایک اذیت خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ جیل میں تو یہ حال تھا، اُدھر پورے ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اور اعلان کیا گیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں فوجی عدالتوں سے کوڑوں اور قیدِ سخت کی سزا کا

دی جائیں گی۔ علاوہ ازیں تھوک کے حساب سے گرفتاریاں کی گئیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور نے وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا حکم جاری کرتے ہوئے، اپنے حکم نامے میں صاف طور پر لکھا۔ لاتعداد شہریوں کی گرفتاری اس لئے ضروری تھی کہ لاہور ہائی کورٹ سے میرے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ فیصلے کے اعلان سے دو دن قبل پورے لاہور کو ایک فوجی بیرک بنا دیا گیا۔ جگہ جگہ مسلح محافظ کھڑے تھے۔ ان اقدامات کا مقصد عوام کو خوفزدہ کرنا تھا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو جب مجھے ہائی کورٹ لے جایا گیا تو راستے میں طاقت کے بے رحمانہ اور برہنہ مظاہرے کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہائی کورٹ نے پھانسی کی سزا سنائی۔ عدالت سے واپسی پر بند گاڑی میں مسلح پولیس والوں نے مجھے اس طرح اپنے گھیرے میں لئے رکھا کہ بندوقوں کی نالیاں میرے سینے اور کندھوں کو چھو رہی تھیں۔ اوپر ہیلی کاپٹر اڑ رہے تھے۔ جیل کے باہر فوج کی پوری طاقت موجود تھی۔ کھلی جگہ پر فوجی کیمپ لگا دیئے گئے تھے اور جیل جانے والی سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی تھیں اور جب کار کے لئے جیل کا پھاٹک کھولا گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ گاڑی فوجیوں سے بھری ہوئی تھی ؎

اسی دن سہ پہر کو مجھے موت کی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں مجھے شب و روز ۲۴ گھنٹوں میں سے ۲۲ گھنٹے فولادی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا۔ اب بھی کلائیوں پر نشانات موجود ہیں۔ جو اُن پُر مسرت ایام کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء کی رات کو چھاپہ ماروں نے کچھ مشقیں کیں۔ وہ میری کوٹھری کی چھت پر چڑھ گئے بعض دیواروں پر کھڑے نظر آئے۔ اسی طرح کا "جنگلی کھیل" ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء کی شب کو بھی کھیلا گیا۔ وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی لہر کے دوران میرے ڈینٹل سرجن ڈاکٹر ظفر نیازی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے سبب میرے دانتوں کا علاج معطل ہو گیا۔ اس سے بہت عرصے قبل ڈاکٹر نصیر شیخ کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو میرے معالج ہیں سلا ہو میں موت کی کوٹھری میں بے پناہ گرمی، حفظان صحت کے منافی ماحول، مکھیوں، مچھروں اور کیڑے مکوڑوں سے مجھے سخت بخار ہو گیا۔ اور چند قے بھی ہوئیں جس کی وجہ سے دوران میں نیم بے ہوش رہا۔ موسم سرما میں دو مرتبہ ملیریا ہوا معدے میں گرانی اور سر میں شدید درد رہنے۔ مزید یہ کہ سینے میں بھی شدید درد ہونے لگا۔ تین مرتبہ مجھے خون کی قے ہوئیں اور ناک سے بھی خون نکلا۔ گرفتاری کے بعد سے اب تک میرا وزن چالیس پونڈ کم ہو گیا ہے ؎

یہ تو تھے کوٹ لکھپت جیل کے حالات، ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں میرے ساتھ جو رویہ روا رکھا جا رہا ہے یہ بھی سنیے۔ ۱۷ مئی ۱۹۷۸ء کو مجھے راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل لایا گیا۔ اس جیل کے قریب ہی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا محل واقع ہے۔ جیل حکام نے شاید ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجھ پر "ذہنی تشدد" کی انتہا کر دی۔ چنانچہ مجھے گذشتہ چار ماہ کے دوران دو مرتبہ مجبوراً بھوک ہڑتال کرنی پڑی۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے حکم پر میرے طبی معائنے کے لئے دو ڈاکٹروں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ میرا اندازہ ہے، کہ اس بورڈ نے ۴ اگست ۱۹۷۸ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ جس میں سفارش کی گئی تھی کہ سات سے نو مکمل میڈیکل ٹیسٹ ہونے چاہئیں۔ ایک عام فہم آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایسے ٹیسٹ ہسپتال کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً موت کی کوٹھری میں تو بالکل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ڈاکٹروں کی رپورٹ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں بخار رہنے لگا۔ قے بھی ہوئیں اور خون بھی تھوکا۔ ۲۵ اگست ۱۹۷۸ء کی شب کو میں نے اپنے مسوڑھوں میں سوجن محسوس کی۔ اُن سے خون اور پیپ بہہ رہا تھا۔ اور شدید درد تھا۔ اگلے دن "ہفتہ وار ملاقات" پر میری بیٹی ملنے آئی تو گفتگو کے لئے میں بمشکل منہ کھول سکا۔ وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کے اصرار پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو بلوایا گیا۔ اور اسے بتایا گیا کہ دانتوں کے علاج کے لئے ڈاکٹر بلایا جائے۔ اسی رات کو آرمی کے ڈینٹل ڈاکٹر میجر حنیف خٹک آئے۔ انھوں نے میرا معائنہ کیا اور کہا کہ حالت تشویشناک ہے۔ انھوں نے

چند ہدایات دیں۔ اور کہا کہ چند دنوں کے بعد پھر آؤں گا۔ اگر سوجن کم نہ ہوئی تو ہسپتال میں منتقل کرنے کی سفارش کروں گا۔ چھ دن گذر گئے لیکن ڈاکٹر دوبارہ نہیں آیا۔ بالآخر ۳ ستمبر ۱۹۷۸ء کو میں نے جیل انتظامیہ سے رجوع کیا کہ وہ آرمی کے ڈینٹل ڈاکٹر کو بلوائے۔ اسی شام کو ڈینٹل ڈاکٹر میجر حنیف خٹک کے بجائے دوسرے ڈاکٹر کو لایا گیا۔ جس پر میں نے اعتراض کیا کہ ہر مرتبہ ڈاکٹر کو تبدیل کر دینا مناسب نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میرے ڈینٹل سرجن ڈاکٹر ظفر نیازی کو جب گرفتار کیا گیا تو میں نے کہا تھا کہ کراچی سے ڈینٹل سرجن بلایا جائے۔ لیکن میری درخواست مسترد کر دی گئی۔ اور اس کی جگہ فوج کے ڈاکٹر کو بھیجا گیا۔ اب دوسرا ڈاکٹر بھیجا گیا ہے۔ اس کی وجہ بتائی جائے۔ معلوم ہوا کہ آرمی کے ڈاکٹر نے بھی مجھے ڈینٹل کلینک منتقل کرنے کی سفارش کی تھی۔ ۹ ستمبر ۱۹۷۸ء کو صوبائی انتظامیہ کے ایک سول ڈینٹل سرجن ڈاکٹر رشید میری کوٹھری میں آئے۔ انھوں نے میرے دانتوں کا اور مسوڑھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ موت کی کوٹھری میں میرا علاج نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ مجھے ہسپتال منتقل کرنے کی سفارش کریں گے۔ اس کے بعد ڈاکٹر رشید پھر کبھی نظر نہیں آئے۔ اور نہ کوئی دوسرا ڈاکٹر آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دانتوں اور مسوڑھوں میں مزید تکلیف بڑھ گئی۔

دراصل میری حالت ایسی ہے کہ ہر وہ ڈاکٹر جو اپنے پیشے سے دیانت دار ہوگا لازماً مجھے ہسپتال میں منتقل کرنے کی سفارش کرے گا۔ نہ جانے انتظامیہ مجھے ہسپتال منتقل کرنے سے کیوں گھبراتی ہے۔ میں بیرون ملک نہیں اپنے ہی ملک کے ہسپتال میں علاج کرانا چاہتا ہوں۔ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے ہسپتال کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ کھاریاں سے ایک بکتر بند ڈویژن بھی بلوایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ہسپتال پر پہرہ نہ لگایا جائے تب بھی میں فرار نہیں ہوں گا۔ بھلا میں اپنے ملک کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے عوام سے کیسے بھاگ سکتا ہوں۔ یہ تو ہے جسمانی اذیت، ذہنی اذیت پہنچانے کے لئے بھی مختلف حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک رات میری کوٹھری کی چھت پر پتھر پھینکے گئے، اور اگلی رات کوٹھری سے متصل کمین کے سائبان پر چھلانگیں لگائی گئیں۔ جیل میں مجھ سے جس قسم کا رویہ برتا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ میں موت کی کوٹھری ہی میں مر جاؤں ۔

صاف گوئی، راست بازی اور حق پرستی ایسے دینی شعار ہیں جنہیں پیغمبر نے انسانی اخلاق اور محاسنِ آدمیت کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ اسی لئے مجھے صاف صاف کہنا پڑتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی ڈائری نہیں رکھی نہ کبھی مجھے خیال آیا کہ فلسطین سے اس کے باشندوں کو اجاڑ دئے جانے کے بعد انہیں دوبارہ بسانے کے سوال پر کبھی غور نہیں کیا جائے گا۔

ارضِ مقدس کو اس کے لباس سے محروم کر ایسی سنگ وخشت کی قدروں سے متعارف کرا جائے گا جن میں مادیت ہی مادیت ہوگی روحانیت کا کوئی نام و نشان نہ ہوگا۔ انسانیت کو ایک ایسی لحد میں اتار دیا جائے گا جس کی گہرائی کو ناپنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔

اور جب فلسطین اجڑ گیا اور اس کے مکین وہاں

سے مویشیوں کی طرح باہر دھکیل دیے گئے تو جابروں کو یہ خیال و گمان بھی نہ تھا کہ وہ اپنے ارد گرد ٹائم بم کی ایک ایسی لائن بچھا رہے ہیں جو کبھی بھی ان کے خوابوں کے محل کو مسمار کر سکتی ہے۔ انھیں یہ بھی وہم و شائبہ نہ تھا کہ وہ اس طرح ایک ایسی سرفروش اور جاں نثار فوج کی تنظیم اور اس کی بنیادیں قائم کر رہے ہیں جو ان کے لیے ابد تک ایک خطرۂ عظیم بنی رہے گی اور ان کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون اڑا دے گی۔

فلسطین سے نکالے گئے غازی کچھ دن تک اندھیروں میں بھٹکتے رہے اور جب ان میں شعور پیدا ہوا تو انھوں نے تلوار، شمشیر، نیزے اور دوسرے آلات حرب کو اپنا حلیف بنا لیا۔ دنیا کی تاریخ میں مجاہدین اور غازیان فلسطین کی فوج نے پہلی بار جذبۂ سرفروشی سے متاثر ہو کر سپر اور ڈھال کو کچرے دان میں پھینک دیا۔ وہ اپنے وطن کی خاطر پروانہ وار لڑنے کے لیے سپر اور ڈھال کے مفہوم کو فراموش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے نزدیک زندگی جب جہنم بن گئی تو انھیں موت کے آغوش میں چلے جانے کے تصور اور تخیل، دلفریبی کا مرکز و محور نظر آنے لگے۔

جب فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے نکالا گیا اس وقت میں ایک کمسن بچی تھی لیکن آج بھی میرے کانوں میں وہ دلگداز چیخیں، آہ و بکا، رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں گونج رہی ہیں جو میں نے سن شعور کو پہنچنے سے پہلے سنی تھیں۔ آج بھی میری نگاہوں میں وہ الم ریز اور روح فرسا منظر کھٹکتا ہے جب مظلوم عربوں کو ظالم صیہونی درندوں نے اپنے مغربی آقاؤں کی فوجی مدد سے دربدر کیا تھا جب فلسطین پر چاروں طرف آگ برسنا شروع ہوئی اور جب اچانک قیامت نے ہمیں آ کر گھیر لیا تو میرا خاندان بھی ماتم کناں، رواں دواں لبنان کی جانب ہجرت کر کے وہیں آباد ہو گیا۔ وقت کا قافلہ آگے بڑھتا رہا اور مجھ میں شعور بیدار ہوتا چلا گیا۔

لبنان آ کر میں نے بیروت یونیورسٹی جو امریکی سرمایہ کی امداد سے قائم کی گئی تھی داخلہ لے لیا اور پھر جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ صدر ناصر کی "عرب قومی تحریک" نے مجھے اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔

۱۹۶۷ء میں مشرق وسطیٰ پر جنگ کے بادل منڈلائے۔ عربوں کو بری طرح شکست ہوئی لیکن اس شکست سے مردہ جذبات میں زندگی کی برقی لہر دوڑ گئی۔ ہم نے اپنے ماضی کا جائزہ لیا اور مستقبل کے لیے نئے منصوبے تیز تر طریقے سے بنائے۔ اب میں ناصر کی عرب نیشنلسٹ تحریک کو مردہ قرار دے کر پی۔ ایف۔ ایل۔ پی کے چھاپہ ماروں کی جماعت میں داخل ہو گئی۔ اس جماعت کے سربراہ ڈاکٹر جارج حبش نے مجھے اپنے جذبۂ حب الوطنی سے اس قدر متاثر اور مسحور کیا کہ میرا نام ان کے جاں نثاروں کی فہرست میں نمایاں اور ممتاز ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں میں مجھے تربیت دے کر دہشت پسند گروپ کا ممبر بنا دیا گیا۔

میرے ذمہ ان شیر بچوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت بھی سونپ دی گئی جنھیں سن بلوغت کو پہنچتے ہی ہتھیار سنبھالنا تھے۔ میں عبرانی، انگریزی، فرانسیسی زبانوں سے اپنی مادری زبان عربی کے علاوہ بخوبی واقفیت رکھتی ہوں۔ میں نے خاص طور پر چند ہونے والے مجاہدین کو عبرانی زبان پڑھا کر انھیں اس زبان میں بولنے اور سمجھنے میں طاق کر دیا تاکہ جب وہ فلسطین میں بسے ہوئے غاصب صیہونی درندوں پر دھاوا بولنے جائیں تو ان پر غیر اسرائیلی ہونے کا شبہ نہ ہو۔

میرے علاوہ کچھ دیگر عرب خواتین بھی میدان جنگ میں کود پڑیں۔ اور ۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کو جس سرفروش مجاہدہ نے برطانیہ کے VC-10 کو ہائی جیک کیا وہ مونا عابد الساجد تھی۔ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایسے ہنگامے کی ابتدا کی تھی جس کا تصور کرتے ہی بعض مردوں

کے ذہنوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ دہشت پسند خواتین نے اسرائیل کے بہترین دماغوں اور فوجی جنرلوں کے حواس باختہ کر دیے ہیں۔ اسرائیل کی روز افزوں بڑھتی ہوئی یہودیوں کی آبادی ایک دم منجمد ہو کر رہ گئی۔

۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ مجھے ڈاکٹر حبش کی جانب سے استعمار پرستوں کے جہازوں کو ہائی جیک کرنے کا حکم ہوا۔ اور میں نے ٹرانس ورلڈ ایئر لائنس کے ایک ہوائی جہاز کو جو تل ابیب سے نیویارک کی جانب انتہائی شان و شوکت سے پرواز کر رہا تھا ایک چڑیا کی طرح اپنے جال میں پھنسا لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پرواز کے دوران جہاز میں بڑی چہل پہل تھی۔ مسافر انتہائی خوشگوار فضا میں مسرور محو گفتگو تھے کہ انہیں میری آواز سنائی دی۔ میں نے صرف یہ کہا تھا:

"خواتین و حضرات اپنی اپنی کمر سے پیٹیاں باندھ لیں۔ یہ اس جہاز کے اس نئے کیپٹن کا حکم ہے جو پی ایف ایل پی کی مجاہدہ ہے۔ میں نے اس کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور میرا نام لیلیٰ خالد ہے۔"

یہ ایک نسوانی آواز ان مسافروں کے لئے صور اسرافیل کی صورت میں قیامت برپا کر چکی تھی۔ سارے جہاز میں خاموشی طاری ہو گئی۔ لبوں پر قفل پڑ گئے تھرتھراتے ہوئے اجسام کو جیسے ناگوں نے ڈس لیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ لوگ جہاز میں نہیں بلکہ اپنی اپنی قبروں میں مصری ممیوں کی طرح بیٹھے تھے۔

پھر ۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کو ایک بج کر سات منٹ پر جب اسرائیلی بوئنگ ۷۰۷ ایمسٹرڈم سے نیویارک کی جانب پرواز کر رہا تھا تو اس میں میرے ساتھ میرا ساتھی پیٹرک آرگیلو بھی موجود تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر کا سپوت تھا اور عمرانیات میں ایم۔ اے کر رہا تھا لیکن اس نے بھی اپنی جان کو فلسطینی جدوجہد کی تحریک کیلئے وقف کر دیا تھا لیکن بجائے پچاس منٹ پرواز کے پہلے حرم سے پستول نکالا اور جہاز کے فرسٹ کلاس سیکشن میں پہنچتے ہی اس کے ہائی جیک کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب میری آواز گونجی اور میں نے کہا کہ "کوئی مسافر اپنی جگہ سے نہ ہلے" تو ان سب پر مردنی چھا گئی۔ میرا ساتھی کچھ نروس ہو گیا اور اس وجہ سے اس کی جان گئی اور میں گرفتار کر لی گئی۔ تین مسلح بندوقچیوں نے میری ناوابستگی میں مجھ سے پستول اور دستی بم چھین لیے۔ اسی اثنا میں پیٹرک نے فائر کر دیے لیکن اسرائیلی جاسوسوں نے اس پر بھی قابو پا لیا اور اسے فرش پر گرانے کے بعد یہ صیہونی پاگل کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے اور پھر ایک درندہ صفت اسرائیلی نے اس کی پیٹھ پر گولیاں

برسا دیں۔ مرتے وقت بھی میرے ساتھی کے چہرے پر کوئی درد و کرب کے نشان نہیں تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے آخری سلام کیا اور کچھ لمحہ بعد وہ فلسطین پر جان نچھاور کرنے والوں کی فہرست میں جلی حروف سے اپنا نام لکھوا چکا تھا۔

اسرائیلی "بہادر" ایک مرد کی لاش اور ایک گرفتار شدہ عورت سے اتنے مرعوب ہوئے کہ انہوں نے جہاز کو لندن کے ہوائی اڈے پر اتار لیا اور پھر برطانوی پولیس اور اسرائیلی جاسوسوں میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ دونوں ہی مجھے اپنی حراست میں لینا چاہتے تھے۔ آخرکار مجھے برطانوی پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا۔

اگرچہ اس مشن میں میں ناکام رہی لیکن اسی دوران ہمارے غازیوں اور چھاپہ مار مجاہدوں نے چار اور جہازوں کو ہائی جیک کر لیا۔ دنیا کے بڑے بڑے اخباروں نے اس روز اس خبر کے علاوہ اور کسی خبر کو اہمیت ہی نہیں دی اور استعمار پرستوں کے دلوں میں آگ لگ گئی۔ سرمایہ داروں کے قلعے زمین پر آ گرے۔

برطانوی جیل میں میرے ساتھ نرم سلوک برتا گیا اور کچھ دن بعد ڈاکٹر جارج حبش کے الٹی میٹم دینے کی وجہ سے نہ صرف مجھے برطانوی جیل سے رہائی ملی بلکہ مغربی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی جیلوں سے تمام سرفروش مجاہدین کو رہا کر دیا گیا۔ یروشلم میں گرفتار شدہ کمانڈوز کو بھی اسرائیل نے آزاد کر دیا اور دنیا کی عظیم طاقتوں کو ہماری تنظیم کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

۱۹۰۶ء میں میرے والد محترم روضۃ المہنا کے معرکے میں فتحیاب ہوئے تھے۔ اس شاندار فتح کے بعد ہی میری پیدائش ہوئی تھی۔ وہ صفر کا مہینہ تھا۔

میرا نام میرے دادا فیصل بن ترکی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ فیصل بن ترکی ان رہنماؤں میں سے تھے جو اس تحریک کے بانی تھے جو تحریک بالآخر سعودی سلطنت کے قیام پر منتج ہوئی۔

میرے بہت سے القاب ہیں جن میں سے کچھ رسمی ہیں اور کچھ خاندانی۔ بہر حال میرے القاب مندرجہ ذیل ہیں۔

ملک المملکۃ (شہنشاہ مملکت)

الجالس علی العرش (تخت نشین)

امام المسلمین (مسلمانوں کے امام)

خادم الحرمین الشریفین (خادم حرمین شریفین)

ابو عبداللہ (والد عبداللہ)

میں نے غلاموں کو آزاد کرنے کا فرمان جاری کیا

شاہ فیصل مرحوم

بڑی تعریف ہوئی۔ اس سے والد بزرگوار بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے جنگ عظیم اول ختم ہو جانے کے بعد یورپ بھیج دیا تاکہ میں وہاں سیاسی تربیت حاصل کرسکوں
اس دورۂ برطانیہ میں میں ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے گیا تھا۔ لیکن انگلستان میں میں لارڈ کرزن کے برتاؤ سے بہت ناراض ہوا۔ اس لئے دوسرے ہی دن میں پیرس روانہ ہو گیا۔ لارڈ کرزن کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے کسی بچے کو میٹھی ٹافی دے کر بہلایا جائے۔ بہرحال بعد میں انگلستان نے معذرت کی۔
میں نے کئی معرکے سر کئے اور مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ میرے والد محترم کو میری سیاسی سوجھ بوجھ پر اس حد تک اعتماد ہو گیا کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں مجھے اس کانفرنس میں نمائندگی کے لئے لندن بھیجا جو فلسطین کے بارے میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں میں نے تقسیم فلسطین کی شدت سے مخالفت کی اور فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے لئے ایک ہی مشترکہ حکومت کے قیام کا مشورہ دیا (یہ دونوں مطالبات اس قسم کے ہیں جیسے کہ آج پی۔ ایل۔ او۔ فلسطین کے پیش نظر ہیں — ادارہ)
۲۵ر اپریل ۱۹۴۵ء کو میں اپنے ملک کے نمائندے کے طور پر اقوام متحدہ کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی جو سان فرانسسکو میں منعقد ہوا تھا۔ یہاں بھی خدا کا کرم ہوا اور میں نے کچھ ایسا نقش چھوڑا کہ دو سال بعد ہی عرب ممالک کے جملہ وفد نے مجھے اپنے ممالک کی طرف سے فلسطین کے مسئلہ پر خطاب کرنے کے لئے متفقہ طور پر منتخب کیا۔ میں نے فلسطین کی تقسیم کی پھر شدت سے مخالفت کی۔
عنان حکومت سنبھالنے سے قبل اگرچہ میں نے ملک کی اقتصادی حالت کی اصلاح کی بہت کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ ملک میں ایسا نظام رائج تھا جس نے ملک کی اقتصادی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔
لوگوں کی نظر میری طرف اٹھی۔ میرے بھائی خالد بن عبدالعزیز (جو اس وقت فرمانروا ہیں۔ ادارہ) میرے بڑے بھائی شاہ سعود کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۴ر مارچ

ان القاب کے باوجود میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے "برادر محترم" کہہ کر مخاطب کیا کریں۔ اس کے علاوہ "خادم حرمین شریفین" کا لقب بھی مجھے پسند تھا کہ جلالت و عظمت اور عرش خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور بادشاہ تو فقط خادم قوم و ملک ہوتا ہے۔
میرے آٹھ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں عبداللہ، محمد، خالد، عبدالرحمن، سعود، سعد، متذراہ ترکی۔ میں اپنی والدہ ماجدہ کے مہربان وجود سے اس وقت محروم ہو گیا جب میں شیر خوار تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم ان نامور اساتذہ سے حاصل کی جو علم و ادب میں نہایت ممتاز مقام کے حامل تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا۔
۱۳۳۹ھ میں حائل کے معرکہ کے وقت میں نے جنگی قابلیت کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا کہ خدا کے فضل سے اس کی

۱۹۵۸ء کو وہ ان کے پاس گئے۔ اس وقت وہ روزہ افطار کر رہے تھے۔ خالد نے ان سے کہا "ہم نے پورا عزم کر لیا تھا کہ آپ کو تخت و تاج سے محروم کر کے رہیں گے لیکن آپ کے بھائی (یعنی میں) نے ہماری رائے سے اختلاف کیا۔ اور انہوں نے کہا کہ "انہیں حکومت آپ کے ہاتھ ہی رہنے گی"

بڑے بھائی یہ سن کر اپنے اختیارات سے دست بردار ہو گئے۔ لیکن برائے نام بادشاہ وہی تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ بغیر کسی قسم کی تلخی کے بات طے ہو گئی۔ کچھ دنوں تک معاملہ یونہی چلتا رہا۔

پھر ۲ر نومبر ۱۹۶۴ء کو سعودی عرب کے فرماں روا کی حیثیت سے میری بیعت کی گئی۔ حکومت سنبھالتے ہی میں ملکی تنظیم نو کے لئے کمر بستہ ہو گیا۔ حکومت کے خزانہ کو جو کہ بڑی کٹھن صورت حال سے دوچار تھا سنبھالنے کے لئے اقدامات کئے حکومت کے انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے ایک کمیٹی بنائی اس طرح ملک کی ترقی کے لئے نیز اس کی سماجی اور اقتصادی بہتری کے لئے ایک جامع اور وسیع منصوبہ تیار کیا۔

ملکی اصلاح کے اس منصوبہ کی ابتدا نہایت چھوٹی اور سطحی باتوں کی اصلاح سے کی گئی جو عام طور پر معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ہاتھ چومنے کی رسم۔ رعایا عموماً محبوب اور ہر دلعزیز بادشاہ کا ہاتھ چوم کر اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے لیکن یہ عمل معاشرے میں ایک عادت اور رسم کی طرح بن چکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس رسم کو ختم کرنے کا فرمان جاری کیا۔ اور علماء کو میں نے نہایت وضاحت سے بتایا کہ یہ عادت ذلت کی علامت ہے چونکہ میں اپنے لئے یہ چیز پسند نہیں کرتا اس لئے میرے لئے یہ جائز نہیں کہ دوسروں کو اس کے لئے مجبور کروں۔ اسلام نے کبھی اس قسم کی چیز کو مستحسن نہیں سمجھا اور نہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسلام نے غلامی کے خلاف جدوجہد پر زور دیا ہے۔ لہذا میں نے تمام غلاموں کو آزاد کر دینے کا فرمان جاری کیا۔ اس طرح ان کو سعودی عرب کے عام شہریوں کے حقوق حاصل ہو گئے ان کے مالکوں کو ۶۰ ملین ریال معاوضہ کی صورت میں ادا

شاہ عبدالعزیز

کر دئے گئے۔ یہ تھی تو بڑی معمولی سی بات لیکن اس اقدام سے یہ مملکت قرون وسطیٰ کے مخصوص ماحول سے نکل کر جدید دور میں۔ حریت کے دور میں داخل ہو گئی۔

میں نے نہ تو کبھی تمباکو نوشی کی اور نہ ہی کبھی شراب کے قریب پھٹکا۔ میں نے کبھی کسی ایسی چیز میں دلچسپی نہ لی جسے خدائے تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو یا متقی اور صالح لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔

میری زندگی بھر یہ خواہش رہی کہ میں دین اسلام کی خدمت کروں۔ چنانچہ تمام عالم اسلام میں میں نے ایک دینی سفارت بھیجنے کا انتظام کیا۔ جس نے تمام اہم ممالک کا دورہ کیا ان نمائندگان نے ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کا جائزہ لیا خدائے تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے اس سفارت کی بدولت متعلقہ ممالک میں اسلام کی نشاۃ کے دروازے کھل گئے اور یہ سفارت اس حد تک کامیاب رہی کہ ان علاقوں

آزادیٔ فلسطین کے رہنما یاسر عرفات اور شاہ فیصل مرحوم

میں سے جن کو میرا ذاتی پیغام پہنچایا گیا تھا ایک مملکت کے سربراہ عمر بیکوف تھے جو کرجاون کے حاکم تھے انہوں نے سچے اسلام کا اقرار کیا اور اس کا عملی طور پر اظہار کرتے ہوئے اپنا نام جوزف (عیسائی) کی بجائے عمر (اسلامی) رکھا۔

بیت المقدس اور بیت اللحم میں ایک عجیب غم اور بے کسی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس بے بسی اور غم و حزن کا سایہ اسرائیلی حکومت کے مقبوضہ علاقے میں عیسائی لوگوں سے خاص تقریب پر اس رویہ کی وجہ سے جو اس حکومت نے عیسائیوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ بیت اللحم کرسمس کے موقع پر ایک چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ خاص گرجا گھر کے نزدیک علاقوں میں مختلف مقامات میں گھروں کی چھتوں پر فوج بٹھا دی گئی ہے۔ عیسائی زائرین کو ناروا طور پر تنگ کرنے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

اسرائیلی حکام نے بیت المقدس کی بعض نہایت اہم اور مشہور شخصیتوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جبکہ اس گرفتاری کے ساتھ بہت سے لوگوں کو نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو بغیر کسی عدالتی کاروائی یا قانونی جواز کے فوجی اور عام جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہی تحفہ حکومت اسرائیل مقبوضہ سرزمین کے بسنے والوں کو کرسمس کے موقع پر پیش کر رہی ہے۔

اس شہر سے متعلق جو قدیم ترین تاریخی حقائق میسر آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰۰ سال قبل مسیح یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں یہاں یوسی لوگ آباد تھے۔ وہاں کے شہنشاہ کا نام "ملک صادق" تھا۔ یوسی لوگ عرب تھے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے عربی میں "یوسین" کے معنی ہیں۔ بہادر لوگ۔

فلسطین کی اپنی طویل تاریخ ہے۔ مختلف تاریخی ادوار میں یہاں مختلف قومیں حملہ آور نظر آتی ہیں۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں ہمیں چند یقینی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہودی فلسطین کے اصل باشندے نہیں ہیں۔

۲۔ یہودی بھی ان فاتحین کی طرح ہیں جو باہر سے یہاں آئے اور بزور شمشیر فلسطین فتح کرنے کے بعد کچھ عرصہ یہاں قیام

پذیر رہے۔ لیکن جیسا کہ سب فاتحین کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی آخر کار فلسطین سے نکل گئے۔

۳۔ یہودیوں کی فلسطین میں موجودگی کے بارے میں جو شواہد ہمیں تاریخی طور پر ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فلسطین میں موجودگی کا عرصہ نہایت مختصر تھا۔

۴۔ فلسطین پر کسی بھی دور میں حتیٰ کہ ملک سلطان کے دور میں بھی خالص یہودی حکومت قائم نہ تھی۔

۵۔ تاریخ فلسطین کے کسی بھی دور میں یہودی لوگ فلسطین کی اکثریتی آبادی کی حیثیت سے نہیں رہے۔

۶۔ یہودی فلسطین سے نکل گئے یا نکال دیئے گئے تو فلسطین میں اس کے اصل باشندے رہ گئے جو قدیم زمانہ سے اس میں رہ رہے ہیں اور آج تک ہیں۔ سوا سو سال کی طویل مدت کے دوران فلسطین میں مطلقاً کوئی یہودی آباد نہیں رہا۔

ایک بدو سے دلچسپ گفتگو

ایک بار کا ذکر ہے۔ میری سواری خاموشی سے چل رہی تھی اسی وقت اچانک ایک بدو ظاہر ہوا۔ وہ پکار رہا تھا "یا فیصل۔ یا فیصل"۔ میں نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ اس کی ضرورت پہلے پوری کر دو۔ پھر اس کے بعد میرے دفتر میں بھیجو۔ جب وہ آیا تو میں نے پوچھا تمہیں کیا شکایت ہے؟ اس نے جواب دیا "میں نے ریڈیو پر اعلان سنا ہے کہ پاکستان اس وقت طوفان کا شکار ہو گیا ہے وہاں پر ہزاروں لوگ اس آفت کی نذر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب نے پاکستان کو لاکھوں ریال دیئے ہیں۔ لیکن میں۔ جس کا خیمہ سیلاب بہا کر لے گیا اور جانور بھی اس کی نذر ہو گئے ہیں۔ مجھے آپ کی طرف سے ایک ریال کی امداد بھی نہیں ملی۔"

میں نے اس سے پوچھا "تم نے کسی سے شکایت بھی کی ہے؟"

اس نے کہا "میں نے تو صرف خدا سے شکایت کی تھی۔"

میں نے کہا "میں بھی اللہ پر ایمان رکھتا ہوں۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ مجھے تمہاری مصیبت کے بارے میں علم ہو جاتا"۔

اس پر اس نے فوراً کہا "کیا آپ ہم سب کے سردار نہیں ہیں!"

میں اس کی معصومیت پر ہنس پڑا

میرا یہ ایمان ہے کہ عام غریب، لاچار، عاجز اور مریض دراصل حاکم کی ذمہ داری میں ہوتے ہیں۔ حاکم کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کا خیال رکھے۔

آخری خواہش

میری دلی خواہش ہے کہ میں دم واپسیں سے پہلے پہلے کم از کم ایک بار مسجد اقصیٰ میں فریضۂ نماز ادا کروں اور دل کا اطمینان حاصل کر سکوں۔

(شہادت بروز منگل ۱۲ ربیع الاول بمطابق ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء)

میری پیدائش ۱۸۹۵ء میں کرنال (مشرقی پنجاب) میں ہوئی۔ میرے والد صاحب کا نام رستم علی خان تھا، ہمارا سلسلۂ نسب ایران کے منصف مزاج بادشاہ نوشیرواں عادل سے ملتا ہے۔ میرے آباؤ اجداد تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قبل ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔

میری والدہ جنابہ محمودہ شاہ جہاں نے مجھے ابتدائی تعلیم سے سرفراز کیا اور مجھے قرآنِ حکیم اور احادیث وغیرہ کا درس بھی انہوں نے ہی دیا۔ وہ ایک نیک بخت خاتون تھیں اور قصبہ راج پور کے نواب گوہر علی خاں کی دختر تھیں۔

۱۹۱۹ء میں میں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا اسی سال میری شادی نواب زادی جہانگیرہ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد والد ماجد جناب رستم علی خاں داغِ مفارقت دے گئے۔ والد ماجد کی جدائی کا صدمہ بڑا جانکاہ تھا لیکن خدا نے صبر جمیل عطا کیا اور میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حصولِ تعلیم کے سلسلے میں میں نے انگلستان کا طویل سفر کیا اور ۱۹۲۱ء میں (EXETER) کالج، آکسفورڈ سے ایم اے کیا اور ۱۹۲۲ء میں بار ایٹ لا کی سند حاصل کی۔

مجھے زمانۂ طالب علمی سے ہی سیاست سے خاصی دلچسپی تھی۔ میں آکسفورڈ کی انڈین کونسل کا ناظم مالیات بھی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں، میں وطن واپس آیا۔ ۱۹۲۶ء میں، میں نے یوپی اسمبلی کی رکنیت کے لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں آنے والے سائمن کمیشن کا میں نے قائداعظم کے ساتھ بائیکاٹ کیا۔ پھر میں نے اسمبلی کے اسپیکر کے لیے انتخاب لڑا اور واضح اکثریت سے کامیاب ہوا۔

۱۹۳۶ء میں، میں مسلم لیگ کا اعزازی جنرل سکرٹری منتخب ہوا اور قیام پاکستان تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ ۱۹۳۹ء میں برطانوی تجارتی وفد میں بحیثیت رکن انگلستان گیا۔ ۱۹۴۰ء میں کراچی آیا تو مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کا لیڈر منتخب ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں بریلی سے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں بھی منتخب ہوا۔ اب مرکزی اسمبلی میں قائداعظم لیڈر اور میں ڈپٹی لیڈر مقرر ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہندوستان میں عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا تو میں وزیر مالیات بنا۔

میں وزارت کا بھوکا کبھی نہیں تھا۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ جائداد اور میں خوش ہوں کیونکہ یہی دو چیزیں ایمان میں خلل ڈالتی ہیں۔ میرے پاس میری جان ہے جسے قوم و ملک کے لیے وقف کر چکا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا میں کس حد تک قوم کے کام آیا۔ ایک موقع پر قائداعظم نے میرے متعلق اس خیال کا اظہار کیا تھا:

"لیاقت علی خان میرے دست راست ہیں۔"

آپ نے تاریخ کے مشکل ترین وقت میں بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ آپ بلاشبہ ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے لیکن عوام کے ساتھ ان کا سلوک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ دوسرے نواب بھی ان کی تقلید کریں گے۔"

قائداعظم مرحوم کی محبت تھی جو انہوں نے یہ بات کہی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے قوم و ملک کی خدمت ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر انجام دی ہے۔ آزادی کی حفاظت کرنا ہر آزاد قوم کا اولین فرض ہے اور اسی لیے ہم خود کو مستحکم و مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد میں نے اپنی ساری طاقت اس قوم کی کشتی کو کنارے لگانے میں صرف کی۔ ابھی مملکت نوزائیدہ ہی تھی کہ قائداعظم مالک حقیقی سے جا ملے۔ قوم میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ قوم کو حوصلہ دے سکوں تاکہ قوم اٹھ کھڑی ہو۔ میرے کاندھے پر گراں بار ذمہ داریاں آ پڑیں۔ لیکن میں بالکل نہ گھبرایا کیونکہ میرا ہمیشہ خدا پر بھروسہ رہا۔ نہایت مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرتا رہا اور اپنے طور پر فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ★★

۱۹۲۱ء میں جب گاندھی جی نے عدم تشدد کی تحریک شروع کی، تو میرے ذہن میں قدرے ہیجان برپا ہوا، لیکن مجھے ان دنوں اپنے بھائیوں کی تعلیم کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا تھا جو کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ آئندہ دو تین برس میں مجھے اپنی بہن کی شادی کے اخراجات بھی برداشت کرنا تھے۔ میں نے ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کو ہی اپنا فریضہ سمجھا۔ اگرچہ جدوجہد آزادی کی تڑپ مجھ میں موجود تھی، لیکن ان دنوں میرے دل پر اس نے کچھ زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ انہی ایام میں مجھے اپنے چھوٹے بھائی کا خط ملا جو بمبئی کے الفنسٹن کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا: "میں گاندھی جی کی تحریک سے حد درجہ متاثر ہوا ہوں۔ تعلیم جاری رکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ مجھے کالج چھوڑنے سے پہلے آپ کی اجازت درکار ہے۔" میں نے جواباً لکھا: "اس لمحے میں تو میں ملازمت چھوڑنے کے متعلق نہیں سوچ رہا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ محسوس کرتا ہوں کہ فی الحال مجھے سرکاری ملازمت ہی میں رہنا چاہیے۔ اگر تم تحریک میں شامل ہونا چاہو تو ایسا کرنے کی تمہیں مکمل آزادی ہے، میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔ تاہم اگر تم نے سرکار کے خلاف تحریک میں شرکت کی تو میرے لیے تمہاری امداد کرنا ممکن نہ ہو گا، کیونکہ میں اس سرکار کا خدمت گزار

"میں نے سردار پٹیل کی غلامی قبول نہیں کی"

وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی کی زندگی کے چند اوراق

لگتا ہوں۔ کم از کم سالِ اول تو مکمل کر لو۔"

میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے سالِ اول کا امتحان پاس کر لیا، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس تحریک سے اس حد تک متاثر ہے کہ سرکاری کالج میں تعلیم جاری رکھنا اس کے بس میں نہیں رہا۔ میں نے اسے بمبئی کی کسی ٹیکسٹائل مل میں بلا تنخواہ امیدوار ویونگ ماسٹر بھرتی کرا دیا۔ اس کی تربیت پر آتنا ہی خرچ اٹھتا تھا جتنا اس کی کالج کی تعلیم پر اٹھا کرتا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں مجھے کھاندہ ضلع سے ضلع بروچ میں تبدیل کر دیا گیا۔ بروچ میں ایک کلب تھا اور کئی وکیل اس کے ممبر تھے۔ بعض سرکاری افسر بھی کلب میں آیا کرتے تھے۔ یہاں ٹینس اور برج کھیلنے کی سہولتیں تھیں۔ جن دنوں میں دورے پر نہ ہوتا باقاعدگی کے ساتھ کلب جا کر ٹینس اور برج کھیلتا، لیکن برج کھیلتے وقت میں شرط نہ بدتا تھا۔ ہار کی صورت میں ساتھی رقم ادا کرتا اور اگر جیت ہوتی، تو بازی کی رقم بھی وہی سمیٹ لیتا۔ میں خال خال ہی بارتا۔

اس کلب کا ایک رکن نرسی منی لال بہت لائق اور مرنجاں مرنج وکیل تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے۔ جب بھی کوئی اسے شراب کا جام پیش کرتا، وہ دوسروں کی آنکھ بچا کر شراب نیچے انڈیل دیتا۔ کرایے کے تانگے پر کلب سے گھر جاتے ہوئے وہ اکثر کوچوان کے ساتھ بیٹھتا اور شرابیوں کی سی حرکتیں کرتا۔ پیدل گھر جاتے وقت وہ لڑکھڑا کر چلتا۔ مقدمے کے دوران وہ اپنے مدِمقابل کو بظاہر تو لقمے دیتا، لیکن وہ دراصل چکمہ دے جاتا۔ وہ نئے نئے قانونی نکتے پیدا کرنے میں بڑا ماہر تھا۔ اس کی ایک ہی کمزوری تھی۔ عدالت میں کبھی نہ جھگڑتا اور جھگڑالو وکیل کے آگے ہتھیار ڈال دیتا۔ ایک بار کسی مقدمے کے سلسلے میں ضلع مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا اور ذرا فاصلے پر کھڑا بحث کر رہا تھا کہ مجسٹریٹ نے اسے قریب آنے کو کہا۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ ضلع مجسٹریٹ نے جب اس سے پوچھا کہ بحث میں اور کتنی دیر لگے گی، تو اس نے فوراً بحث ختم کر دی۔ یوں تو یہ بات ذاتی وقار کے منافی تھی، لیکن اس کے نتیجے میں وہ مقدمہ جیت گیا۔

بروچ میں میری تبدیلی کے دو تین ماہ بعد اس ضلع میں ایک نئے ڈی ایس پی ضیاء الدین احمد کی تعیناتی ہوئی۔ وہ پنجابی تھے۔ ان دنوں سول سروس اور انڈین پولیس سروس کے افسر صوبائی

سردار پٹیل

سول سروس کے افسروں کو اپنے سے کمتر خیال کرتے تھے۔ جب کوئی نیا افسر تبدیل ہو کر آتا، تو وہ ضلع میں متعین افسروں سے خود جا کر ملتا اور وہ پھر جوابی ملاقات کرتے۔ مجھے ملازمت کے دوران معلوم ہوا کہ انڈین سروس کے افسروں نے اپنی الگ دنیا بسا رکھی ہے۔ انہیں صوبائی سروس کے افسروں سے میل جول پسند نہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی سے ایسے سماجی مراسم نہ رکھوں گا جو عدمِ مساوات پر مبنی ہوں۔ لہٰذا دو تین ماہ تک احمد صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ کسی شادی کی تقریب میں ہماری ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ میں ان سے ملنے کیوں نہیں آیا؟ میں نے جواب دیا: "آپ نئے نئے آئے تھے اور ملاقات میں آپ کو پہل کرنا چاہیے تھی۔" میرا یہ جواب انہیں ناگوار گزرا۔ اس کے بعد دو تین بار ایسا ہوا کہ مقدمات میں پولیس افسروں کی زیادتی کے باعث مجھے پولیس افسروں سے وضاحت طلب کرنا پڑی۔ احمد صاحب کو یہ بات بھی ناگوار گزری۔ اس کے چند ماہ بعد ضلع کے کلکٹر کے اعزاز میں کوئی تقریب تھی۔ میں احمد صاحب اور دو تین سرکردہ وکیل ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں احمد صاحب کہنے

لگے پولیس کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔" دراصل وہ مجھ سے خائف تھے اور ایک لحاظ سے انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی۔ چنانچہ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "پولیس افسر کی نسبت سب ڈویژنل مجسٹریٹ کو زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ پولیس جسے چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ لیکن مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر وہ کسی کو چوبیس گھنٹے سے زائد اپنی حراست میں نہیں رکھ سکتی۔ مجسٹریٹ حراست میں لینے کی وجہ دریافت کر سکتا ہے اور جسے چاہے دو سال تک قید بامشقت کی سزا دے سکتا ہے۔" احمد صاحب کو احساس ہوا کہ وہ باتوں میں مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ وہ عمر میں مجھ سے دس پندرہ سال بڑے تھے۔ کہنے لگے: "ابھی تم نوجوان ہو، وقت تمہیں سب کچھ سکھا دے گا۔" میں نے کہا: "وقت مجھے کیا سکھائے گا، میں اور میرے گھر والے سب قناعت پسند ہیں۔ ہم پچاس روپے ماہانہ میں گزر بسر کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے میں یہاں بھی جاؤں گا، اس سے زیادہ کما سکوں گا۔" ڈی ایس پی میرا مطلب سمجھ گئے اور پھر دوستانہ انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ اُن کے جانے کے بعد منشی پیشہ وکیل کہنے لگے کہ ایک ڈی ایس پی سے اس انداز میں گفتگو کر کے آپ نے مشکلات کو دعوت دی ہے۔ میں نے عرض کیا: "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر انسان اپنا کام محتاط ہو کر کرے تو اسے کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

میری عدالت میں ایک دلچسپ مقدمہ پیش ہوا۔ کسی مندر سے ملحق کوئی ادارہ واقع تھا۔ دونوں کی انتظامیہ میں کسی بات پر تنازعہ ہوا۔ مندر کی انتظامیہ نے کسی عمارت کی بنیادیں کھود دیں جنہیں ملحقہ ادارے کی انتظامیہ نے نقصان پہنچایا۔ مندر کے منتظم نے ضلع مجسٹریٹ سے شکایت کر دی۔ دوسرے فریق کو مطلع کیے بغیر مجسٹریٹ موقع دیکھنے روانہ ہوا۔ وہ ملحقہ ادارے کے راستے سے گزر کر مندر کی طرف جانا چاہتا تھا، لیکن پٹھان چوکیدار اُسے پہچان نہ سکا اور مزاحم ہوا۔ مجسٹریٹ نے اُسے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا کرنے کے الزام میں حراست میں لے لیا اور پھر موقع کا معائنہ کیا۔ چونکہ مجسٹریٹ خود فریق بن گیا تھا، اس لیے یہ مقدمہ اُس نے میری عدالت میں منتقل کر دیا۔ مدعا علیہ نے سورت کے معروف وکیل چنی لال گاندھی کو وکیل کیا۔ اُسے دیوان بہادر کا خطاب ملا ہوا تھا اور وہ بمبئی کی صوبائی اسمبلی کا رکن بھی تھا۔ پہلے ہی روز جب ملزم عدالت میں داخل ہوا چنی لال گاندھی نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا۔ عدالتی قواعد کی رو سے منصف ہی ملزم کو بیٹھنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ میرے دل میں معاً یہ خیال آیا کہ عدالت کو مرعوب کرنے کی غرض سے دیوان بہادر نے یہ حرکت کی ہے۔ میں نے چنی لال سے مخاطب ہو کر کہا: "مسٹر گاندھی! چونکہ آپ نے عدالت کا استحقاق مجروح کیا ہے لہٰذا آپ کو معذرت پیش کرنی چاہیے۔ ملزم کو بھی کھڑا ہونے کے لیے کہیں۔" عدالت میں کئی لوگ موجود تھے۔ ان سب کی موجودگی میں اُسے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا اور ساتھ ہی اس نے معذرت بھی کی۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ ملزم چونکہ پٹھان ہے اور مدعی ضلع مجسٹریٹ، اس لیے ملزم سزا سے نہیں بچ سکتا۔ مقدمے کے آخر میں فریقین نے اپنے دلائل پیش کیے۔ بحث کے دوران ملزم کے حق میں مسٹر گاندھی کے بعض دلائل میں نے تسلیم کیے اور جب فیصلہ لکھا

شروع کیا، تو مجھے احساس ہوا کہ چونکہ ضلع مجسٹریٹ نے معائنے کی کوئی پیشگی اطلاع نہ دی تھی، اُسے بلا اجازت مندر سے ملحقہ ادارے میں داخل ہونے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس کے علاوہ مجسٹریٹ کے فرائض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ بھی نہ پڑی، کیونکہ پٹھان چوکیدار کو حراست میں لینے کے بعد اس نے معائنہ تو کر لیا تھا۔ بہرحال میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجسٹریٹ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا اور پٹھان کے رویّے پر قانونی خلاف ورزی کا اطلاق نہیں ہوتا، چنانچہ میں نے چوکیدار کو بری کر دیا۔ ضلع مجسٹریٹ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس فیصلے سے اُسکی سبکی ہوئی ہے، حکومت سے عدالتِ عالیہ میں اپیل کرنے کی درخواست کی، لیکن حکومت نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۰ء تک میں نے کوئی ایک ہزار فوجداری مقدمات کے فیصلے کیے ہوں گے۔ میرے کئی فیصلوں کے خلاف عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا گیا، لیکن سوائے تین کے عدالتِ عالیہ نے میرے تمام فیصلے برقرار رکھے۔

جہاں تک ممکن ہوتا، میں طرفین کے وکلا سے مشورہ کرنے کے بعد مقدموں کی تاریخیں مقرر کیا کرتا۔ لیکن ان پر یہ بات بھی واضح کر دیتا کہ عام حالات میں ان تاریخوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ میں گواہوں سے بھی کہا کرتا تھا کہ اگر پہلے روز ان کی شہادت ختم نہ ہوئی، تو انہیں اگلے روز پھر آنا پڑے گا۔ یعنی تاریخ مقرر کر کے معینہ تاریخ ہی پر مقدمے کی سماعت کرتے۔ عام طور پر تین چار سماعتوں میں مقدمہ مکمل ہو جاتا۔ جس روز شہادتیں ختم ہوتیں، اُسی روز میں بحث سُنتا اور جہاں تک ممکن ہوتا، اُسی روز فیصلہ بھی سنا دیتا۔ ایک بار طویل تمہید کے بعد نوجوان وکیل نے بحث شروع کی۔ جب میں نے اسے طویل تقریر کرنے سے روکتے ہوئے بعض نکات پر بحث کرنے کو کہا، تو وہ کہنے لگا: "عدالت میں مفصّل دلائل پیش کرنا میرا حق ہے۔" میں نے دریافت کیا: "ضابطۂ فوجداری کی کونسی دفعہ کے تحت آپ کو یہ حق ملا ہے؟" وہ کسی دفعہ کا حوالہ تو نہ دے سکا، لیکن طویل تقریر پر اصرار کرتے ہوئے بولا: "اگر مجھے روکا گیا، تو میں واک آؤٹ کر جاؤں گا۔" میں نے جواباً کہا: "آپ چاہیں تو واک آؤٹ کر جائیں، لیکن میں کاروائی جاری رکھوں گا۔" اس پر وہ واک آؤٹ کر گیا۔ میں نے فریقِ مخالف کی بحث سُن کر فیصلہ سُنا دیا۔ یہ فیصلہ واک آؤٹ کرنے والے وکیل کے حق میں تھا۔ اب اُسے احساس ہوا کہ اس کا اصرار مناسب نہ تھا۔ میری عدالت سے کسی اور عدالت میں انتقالِ مقدمہ کے معاملے میں کبھی کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ گیارہ سالہ ملازمت کے دوران فقط چار پانچ بار اس طرح کی کوشش ہوئی جو بالآخر کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

زیرِ سماعت مقدمے کے بارے میں عدالت کو پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کرنی چاہیے۔ میری عدالت میں ذکر ذیل کا ایک مقدمہ آیا۔ ملزم لمبا تڑنگا اور مزاج کا تیز شخص تھا۔ اس کی

شکل صورت، چال ڈھال ایسی تھی کہ دیکھنے والا اسے خواہ مخواہ مجرم سمجھتا۔ واقعات کے مطابق ڈاکہ کی واردات رات ڈیڑھ بجے ہوئی۔ گواہوں نے شہادت دی کہ چاندنی رات میں ہم نے اسے یہ واردات کرتے دیکھا۔ شہادتیں ختم ہوئیں اور میں بحث سن کر اس نتیجے پر پہنچا کہ جرم ثابت ہوگیا ہے۔ میں نے فیصلہ لکھنا شروع کیا۔ گواہوں نے بیان کیا تھا کہ چاند کی آٹھویں یا نویں شب کو ڈیڑھ بجے یہ واردات ہوئی میں نے سوچا اس روشنی میں ملزم کی صحیح شناخت ممکن ہے؟ جونہی دل میں یہ شک پیدا ہوا، میں نے فیصلہ لکھنا بند کردیا۔ چاند کی آٹھویں یا نویں شب کو ہفتہ عشرہ باقی تھا۔ میں نے چند دنوں کے لیے فیصلہ ملتوی کردیا۔ جب وہ رات آئی، تو میں اسی اور رات کے ڈیڑھ بجے چند آدمیوں کو اتنے ہی فاصلے پر کھڑا کردیا جتنا فاصلہ گواہوں نے شہادت کے دوران بیان کیا تھا۔ میں نے انہیں شناخت کرنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ رات کے پچھلے پہر اتنے فاصلے سے یقینی شناخت ممکن نہیں، چنانچہ شک کا فائدہ دیتے ہوئے میں نے ملزم کو بری کردیا۔

ایک بار میں گودھرا کے تعلقے شہر کے دورے پر گیا۔ ایک ہریجن عورت نے شکایت کی کہ فوجدار اس کی آبرو ریزی کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ عورت شہر سے تین میل دور کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ فوجدار کے خلاف شکایت کی تفتیش پولیس کے سپرد کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ ضابطۂ فوجداری کے تحت مجسٹریٹ کو ابتدائی تحقیقات کا اختیار حاصل ہے چنانچہ میں نے خود تفتیش کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز مذکورہ گاؤں میں پہنچا۔ فوجدار کے ہمراہ ہیڈ کانسٹبل بھی تھا۔ میں نے اس کی ڈائری اپنے قبضے میں لے لی۔ اس ڈائری میں یہ اندراج موجود تھا کہ وقوعہ کے روز فوجدار اس گاؤں میں آیا تھا۔ میں ہریجن عورت اور گواہوں کے بیان لے کر دفتر آ گیا۔ شام کے وقت مجھے کلکٹر کی دفتری یادداشت موصول ہوئی، وہ ضلع مجسٹریٹ بھی تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ان سے شکایت کی تھی کہ میں فوجدار کو خواہ مخواہ ملوث کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کلکٹر نے مجھ سے حقیقتِ حال دریافت کی تھی۔ میں نے جواباً تحریر کیا کہ میں گودھرے واپس جا کر بعد ساڑھا وا قعہ زبانی بیان کردوں گا۔

کلکٹر مسٹر گیوولڈ ووڈ اوڈن تجربہ کار سینئر افسر تھے بھاونگر کے مہاراجہ جن دنوں نابالغ تھے، تو مسٹر اوڈن ان کے سرپرست بھی رہے۔ گودھرا پہنچنے پر میں انہیں اصل صورتِ حال بتائی تو وہ بولے: "ڈی۔ ایس پی کا کہنا ہے کہ مبینہ وقوعہ کے وقت وہ فوجدار کے ساتھ تھا۔" میں نے جواباً کہا: "اگر ان کا یہی کہنا ہے تو آپ ان سے تحریری بیان لے لیں، کیونکہ میرے قبضے میں پولیس کی جو ڈائری ہے، وہ کچھ اور بیان کرتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس مقدمے کی سماعت نہ کروں، تو آپ اسے کسی اور مجسٹریٹ کی عدالت میں منتقل کردیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، ورنہ میری آپ سے گزارش ہے کہ اس معاملے میں مداخلت نہ فرمائیں۔" انہوں نے مجھے سماعت کی اجازت دے دی اور جب ڈی۔ ایس پی سے تحریری بیان طلب کیا تو وہ اپنے پہلے بیان سے یہ کہتے ہوئے منحرف ہوگیا کہ پہلا بیان کسی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اس انحراف سے کلکٹر کو یقین ہوگیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

میں نے ابتدائی تفتیش مکمل کرکے فوجدار کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیے اور اس کی ضمانت بھی منظور نہ کی۔ اس نے سیشن کورٹ میں اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوگئی۔ اس مقدمے کا جب تک سیشن کورٹ نے فیصلہ نہ کیا فوجدار جیل ہی میں رہا۔ چونکہ فوجدار بہت بدنام تھا، اس لیے بے شمار لوگ اس شخص کو (یعنی مجھے) دیکھنے آئے جس نے اسے جیل میں ڈالا تھا۔ میں نے سماعت مکمل کرنے کے بعد مقدمہ سیشن سپرد کردیا۔ سیشن کورٹ میں مجھے بطور گواہ طلب کیا گیا، تو میں نے اصل واقعہ جو میرے علم میں آیا تھا، بیان کیا، لیکن صفائی کے وکیل نے نالش کنندہ اور دیگر گواہوں سے کچھ جوڑ کرکے ان کے بیان دلوائے میرے اور ان کے بیانات میں تضاد پیدا ہوا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملزم بری ہوگیا۔

میں نے جب یہ مقدمہ سیشن سپرد کیا، تو ڈی۔ ایس۔ پی مجھ سے ناراض ہوگیا۔ اس نے ضلع مجسٹریٹ سے یہاں تک کہہ دیا: "اگر سب انسپکٹر کو کچھ ہوگیا، تو میں مسٹر ڈیسائی کے تحفظ کا ذمے دار نہ ہوں گا۔" ضلع مجسٹریٹ نے مجھ سے بات کی۔ میں نے جواب دیا: "آپ ڈی۔ ایس۔ پی کو متنبہ کردیں کہ اگر مجھے کوئی خطرہ

لاحق ہو، تو اسی کو قصوروار گردانا جائے گا۔" ڈی ایس پی کا بنگلہ میرے بنگلے کے عین سامنے تھا۔ میں نے ضلع مجسٹریٹ سے دوبارہ کہا: "آپ ڈی ایس پی سے کہہ دیں کہ اگر مجھے کوئی گزند پہنچا تو میں اسے ذمے دار ٹھہراؤں گا۔" ضلع مجسٹریٹ نے ڈی ایس پی سے بات کی، تو اس نے مجھے چٹھی لکھی: "آپ کی حفاظت کے سلسلے میں میں ہر ممکن قدم اٹھاؤں گا۔ میں آپ کے بنگلے پر پولیس کا ایک دستہ متعین کر دوں گا۔" میں نے جواباً لکھا: "مجھے پولیس کے دستے کی ضرورت نہیں۔ میری حفاظت کی ذمے داری آپ پر عاید ہوتی ہے اور آپ جو مناسب سمجھیں، کریں۔" سارے شہر میں یہ بات پھیل گئی۔ میری لاعلمی میں رات کے وقت متعدد اشخاص میرے بنگلے پر پہرہ دیتے۔ ان میں اکثر گھانچی ذات کے مسلمان تھے۔

اس صورتِ حال پر ڈی ایس پی مزید خفا ہوا اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ اس نے ضلع مجسٹریٹ سے شکایت کی کہ مسٹر ڈیسائی نے بنگلے کے مالک کا بہت سا فرنیچر کرایہ ادا کیے بغیر اپنے استعمال میں لا رکھا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے جب اس بارے میں مجھ سے پوچھا، تو میں نے انہیں بتایا: "بنگلے کے مالکان کی صرف تین کرسیاں اور ایک میز ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی سامان نہیں۔ آپ چاہیں تو خود اس کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ ڈی ایس پی نے غلط اطلاع فراہم کر کے آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ اس سے وضاحت طلب کریں، ورنہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔" ڈی ایس پی چونکہ قصوروار تھا، اس لیے اس نے مجھ سے معافی مانگ لی۔

گودھرا میں مسلمانوں کی آبادی پچاس فی صد سے زیادہ تھی۔ اکثریت کی ذات گھانچی تھی۔ باقی مسلمان شیعہ داؤدی بوہرے تھے۔ گھانچی زیادہ تر زراعت پیشہ، سرکاری ملازم یا جنگلوں کے ٹھیکیدار تھے۔ ان کی عورتیں اگر کسی بات پر لڑ پڑتیں اور شام تک لڑائی ختم نہ ہوتی، تو وہ اپنی ٹوکریاں الٹی کر کے رکھ دیتیں۔ اس حرکت کا مطلب ہوتا کہ لڑائی شب بھر کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔ اگلی صبح لڑائی پھر وہیں سے شروع ہو گی جہاں ختم کی گئی ہے۔

میں کسی کی سفارش ماننے کا قائل نہ تھا۔ اگر کوئی فریق سفارش لے کر آتا، تو میں صاف صاف کہہ دیتا کہ تم سفارش لائے ہو، میں فیصلہ تمہارے خلاف کروں گا۔ میں نے ایک دو بار اس پر عمل بھی کیا۔ اس کا لوگوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ ایک بار ایک شخص آموں کی بہت بڑی ٹوکری لایا۔ میں نے جب پوچھا کہ "بھئی تم یہ آم کیوں لائے؟" تو جواب ملا "سرکار! یہ آم آپ کے بچوں کے لیے ہیں۔" میں نے پوچھا: "آج اچانک میرے بچے تمہیں کیونکر یاد آ گئے؟ بہتر ہو گا تم یہ آم غریب بچوں میں بانٹ دو۔" اس نے جواباً کہا: "آپ جسے چاہیں، یہ آم دے دیں۔" چنانچہ اس شخص کی موجودگی میں میں نے سارے آم اپنی بھنگن کے گھر بھیج دیے۔ اس کے بعد پھر کسی نے مجھے تحفے تحائف پیش کرنے کی جرأت نہ کی۔

میری ملازمت کا تلخ ترین تجربہ وہ امتیازی سلوک تھا جو ہندوستانی افسروں کے مقابلے میں انگریز افسروں کے ساتھ کیا جاتا۔ انگریز سول افسر دوسرے افسروں کے ساتھ مختلف رویہ رکھتے تھے۔ سفید فام اور سیاہ فام افسروں کے ساتھ یکساں سلوک نہ ہوتا۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال نہایت تکلیف دہ تھی۔ ۱۹۲۷ء سے میرے دل میں یہ خیال انگڑائیاں لینے لگا کہ میں اب زیادہ دیر تک سرکار کی ملازمت نہ کر سکوں گا۔ سفید فام افسر چاہتے تھے کہ کوئی سرکاری افسر کانگریس کے کارکنوں یا گاندھی جی کے پیروکاروں کے ساتھ میل جول نہ رکھے۔ ایک بار شری دربار گوپال داس ڈیسائی کو گودھرا آنا تھا۔ وہ اپنے دوست کے پاس ٹھہرنا چاہتے تھے جو ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے اجازت طلب کی گئی۔ اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ڈپٹی پولیٹیکل ایجنٹ کو اپنی ملازمت پیاری تھی۔ اس نے اپنے دوست کو خط لکھ کر معذرت کر دی۔ کچھ عرصے بعد شری مہادیو ڈیسائی کو گودھرا آنا تھا۔ ان کے ساتھ میرے گہرے مراسم تھے۔ میں نے انہیں اپنے ہاں قیام کی دعوت دی اور کلکٹر سے اجازت بھی نہ لی۔ شری مہادیو ڈیسائی میرے گھر ٹھہرے۔ کلکٹر صاحب میرے مزاج سے واقف تھے۔ انہیں اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

۱۹۲۷-۲۸ء میں گودھرا میں ایک واقعہ پیش آیا، جو میری زندگی پر حد درجہ اثر انداز ہوا۔ ان دنوں شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی تقریباً برابر تھی۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں کی قلیل سی اکثریت ہو۔ مسلمانوں کا مسجد کے آگے باجا بجانے پر

سخت مزاحم ہوا کرتے تھے۔ اس پر بعض اوقات ہندو مسلم فساد بھی ہو جاتا تھا۔ اس طرح کا ایک جھگڑا ہوا تھا جب ایک ڈی ایس پی بیرون سے گوجرانوالہ تبدیل ہو چکا تھا۔ کسی تقریب میں ہندوؤں نے جلوس نکالا اور سارے راستے باجہ بجانے پر بضد تھے۔ انہوں نے باصرار کہا کہ مسجد کے آگے سے گزرتے وقت باجہ بجانے پر تو مسلمانوں کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ ڈی ایس پی نے جلوس کی حفاظت کے لیے پولیس تعینات کی اور جلوس مسجد کے آگے سے باجہ بجاتا ہوا گزر گیا چونکہ جلوس پولیس کی حفاظت میں تھا، مسلمان مزاحم نہ ہوئے، لیکن جب جلوس منتشر ہوا تو مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ جلوس کے قائد شری رومن راؤ مشتعل کی سخت پٹائی ہوئی۔ جونہی وہ زمین پر گرا، اس کا ساتھی پرشوتم داس شاہ اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ بھی شدید زخمی ہوا اور بالآخر چل بسا۔ شری رومن راؤ کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اس کے علاوہ فریقین میں بہت سے لوگوں کو چوٹیں وغیرہ آئیں۔

میں اُس وقت کرکٹ کھیل رہا تھا جونہی اس حادثے کی اطلاع ملی میں سائیکل پر سوار ہو کر موقع پر پہنچ گیا۔ مسٹر بارٹ شون ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر مجھ سے دس منٹ پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھے اور مجھ سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ کانگریسیوں کے سخت مخالف تھے۔ جن لوگوں کی پٹائی ہوئی وہ ہندو کانگریسی تھے۔ مسٹر بارٹ شون نے عجیب و غریب رویہ اختیار کرتے ہوئے حملہ آوروں سے جانبداری برتی۔ اُس وقت شام سات بجے تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً سول ہسپتال جا کر زخمیوں کے بیان لینے کا حکم دیا۔ ان کا حکم تو غیر قانونی نہ تھا، تاہم ان کی نیت میں فتور ضرور تھا۔ وہ شروع ہی سے ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے کہ گواہوں کے بیانات میں تضاد نمایاں ہو۔ میں نے سول ہسپتال پہنچ کر زخمیوں کے بیان لیے۔ مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی نیت پر شک تھا، اس لیے ہسپتال پہنچنے، بیان لینے، واپس چلنے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے گھر پہنچنے کا وقت بھی میں نے نوٹ کیا اور بیانات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حوالے کر دیئے۔

جب سے مسٹر بارٹ شون نے گوجرانوالہ میں چارج لیا تھا میرے اور اُن کے مابین کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ تبادلے کے بعد جونہی وہ اسٹیشن پر پہنچ کر ریل گاڑی سے اُترے، انہوں نے مجھے اپنے بنگلے پر سامان بھجوانے کے لیے کہا۔ میں نے تعمیل حکم کے بعد بل بھیج دیا۔ انہیں یہ بات پسند نہ آئی، تاہم انہوں نے بل ادا کر دیا۔ پھر انہوں نے اپنے لیے ایک بھینس کی فرمائش کی۔ میں نے رقم طلب کی، ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے یہ کام کسی اور کے ذمے لگا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بنگلے کے کمپاؤنڈ کی صفائی وغیرہ کے اخراجات اتفاقی مصارف کے فنڈ سے ادا کرنے کا حکم دیا، تو میں نے اُن سے کہا کہ یہ مناسب نہیں، آپ یہ اخراجات اپنی گرہ سے ادا کریں۔ میں ان کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ میں نے اپنے کام میں انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ لیکن ان کا رویہ ہمدردانہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے زخمیوں کے بیانات کے سلسلے میں وقت نوٹ کر لیا تھا۔

اس کے بعد ڈی ایس پی نے تفتیش کے دوران ایسے اقدامات کیے جن پر شری رومن راؤ مظلوم نے اعتراض کیا اور بیان دیا کہ فساد ڈی ایس پی کے اشتعال دلانے پر ہوا ہے۔ یہ سراسر سچ تھا۔ ڈی ایس پی کے جذبات مجروح ہوئے تھے وہ نالش کرنے والوں کے خلاف ہو گیا۔ میں تاڑ گیا کہ مقدمے کی تفتیش مناسب

خطوط پر نہیں ہو رہی۔ تفتیش کے دوران بمبئی صوبائی اسمبلی کے دو رکن واقعات کی جانچ پڑتال کے لیے گودھرا پہنچے۔ انہوں نے اور لوگوں کے علاوہ ڈی۔ ایس۔ پی کے بارے میں مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی اور ڈی ایس پی کے خلاف افواہ کا ذکر بھی کیا۔ میں نے کہا یہ الزام بے بنیاد ہے۔ جب وہ مجھ سے مل کر چلے گئے، تو ڈی ایس پی صاحب کا رقعہ ملا۔ لکھا تھا: "میری طبیعت قدرے ناساز ہے شکر گزار ہوں گا اگر آپ تشریف لا سکیں۔" ان کا بنگلہ قریب ہی تھا میں پہنچا معلوم ہوا کہ ناسازیٔ طبع محض ایک بہانہ ہے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے دریافت کیا: "اسمبلی کے دونوں ارکان نے آپ سے کیا پوچھا تھا اور آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے جواب دیا "میں نے اس مقدمے میں لوگوں کے بیان لیے ہیں اور مجھے بطور گواہ پیش ہونا ہوگا۔ میرے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں، کیونکہ اس طرح کے تمام سوال عدالت میں کیے جائیں گے۔ براہ کرم آپ مقدمے کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔" انہوں نے اصرار کیا۔ میں نے پھر جواب دیا: "آپ کا اصرار نامناسب ہے۔ آپ میری دیانتداری پر اعتماد رکھیں میں وہی کہوں گا جو حق ہوگا۔" لیکن ڈی ایس پی صاحب اپنے اصرار پر قائم رہے۔ انہیں میرا جواب ناگوار گزرا اور انہوں نے مجھے صاف صاف بتا بھی دیا۔ میں نے مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی اور اپنے گھر آگیا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تبادلۂ خیال کے لیے طلب کیا۔ ڈی ایس پی بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ڈی ایس پی سے اپنی گفتگو کا خلاصہ مجھے بتایا اور بعد ازاں مجھ سے وضاحت طلب کی۔ ڈی ایس پی نے ان کی تائید کی۔ میں نے بلا تامل جواب دیا "میں اس موضوع پر آپ سے کوئی گفتگو نہیں کر سکتا۔ مجھے اس مقدمے میں بطور گواہ پیش ہونا ہے۔ یہ میں ڈی ایس پی صاحب سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہنے لگے "تو تمہیں وضاحت پیش کرنا ہوگی۔" میں نے کہا "آپ کا اصرار انتہائی نامناسب ہے۔ میں دباؤ میں آنے والا انسان نہیں۔ اگر آپ کو اور کوئی بات نہیں کرنی تو بہتر ہے میں آپ سے اجازت لوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور وہاں سے چلا آیا۔

کچھ دن بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے دوبارہ طلب کیا۔ ڈی ایس پی اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل ویسٹرن ڈویژن بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا "گودھرا کے مضافات میں چھ دیہات میں بعض سرکردہ چودھریوں نے وہاں کے لوگوں کو ہراساں کر رکھا ہے۔ انہیں امن و امان قائم رکھنے کے سلسلے میں پابند کیا جانا چاہیے۔" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا "ان کے خلاف مقدمہ دائر کر کے ضمانتیں طلب کی جائیں۔" میں فوراً تاڑ گیا کہ ایک ایسی سازش تیار کی جا رہی ہے جس کے ذریعے مجرم بے گناہوں کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں سے بحث کرنا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اگرچہ یہ ساری کارروائی غلط تھی، تاہم مجھے اپنی عدالت میں کسی مقدمے کے بھیجے جانے پر اعتراض کا کوئی حق نہ تھا۔ ان دنوں بعض ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ ایسے ہتھکنڈے روا رکھے ہوئے تھے۔ یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ آجکل ایسا نہیں ہوتا۔

• دو دن بعد چھ لیڈروں کو گرفتار کر کے میری عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان سے ایک ایک ہزار روپے علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ ان چاروں ملزموں میں سے ایک کا باپ اسی علاقے

یا ایک روز پہلے مر گیا تھا۔ اس نے دس بارہ دن کے لیے مقدمہ ملتوی کیے جانے کی درخواست پیش کی تاکہ وہ اپنے باپ کے کریا کرم کی رسمیں پوری کرنے کے بعد کسی وکیل کا بندوبست بھی کر سکے۔ میں نے اس سے کہا، "اگر تم اس بات کی ضمانت دو کہ مقدمے کے فیصلے تک امن و امان قائم رکھو گے، تو میں تمہیں ضمانت پر چھوڑ دوں گا۔" چاروں ملزموں نے اس حکم کی تعمیل کا اقرار کیا، تو میں نے ان سب کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ یہ بات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے علم میں آئی۔

اس نے مجھے بلا کر وضاحت طلب کی۔ میں نے جواب دیا، "آپ کا رویہ سراسر غلط ہے۔ میں نے بطور مجسٹریٹ جو موزوں سمجھا وہی کیا۔ بیٹے کو اس کے باپ کے کریا کرم کی آخری رسمیں پوری کرنے اور کسی وکیل کا انتظام کرنے کے لیے خاصی مہلت دینا چاہیے تھی۔ آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے کیونکہ امن و امان کے قیام کی ضمانت حاصل کر لی گئی ہے۔ مقدمے کو طول دینے سے ہمارا مقصد حل ہو جاتا ہے، ملزموں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کمشنر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے دھمکی دی، "تمہیں معلوم ہونا چاہیے اس مقدمے میں کمشنر بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔" میں نے کہا، "اس مقدمے سے کمشنر کی دلچسپی کا کیا تعلق؟ خود آپ کی مداخلت نامناسب ہے۔ مجھے آپ جیسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں آپ کے ماتحت اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔ میری آپ سے درخواست ہے مجھے یہاں سے تبدیل کرا دیں۔" اس دو ٹوک جواب نے ساری بحث کا خاتمہ کر دیا۔ انہیں مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

غرض میں نے مقدمے کی سماعت کی۔ پہلے ہی روز جب شہادتیں لیں، تو ملزموں کے خلاف کوئی بات ریکارڈ پر نہیں آئی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزموں کو بری کر دینا چاہیے، لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دباؤ کے پیش نظر میں نے مقدمہ ملتوی کر دیا تاکہ سوچ بچار اور فیصلہ لکھنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ اس دوران میں میرے بعض بہی خواہوں اور چند وکیلوں نے یہ مشورہ دیا کہ مناسب ہے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے [illegible] اور ملزموں کے خلاف فیصلہ کر دوں۔ میں نے یہ مشورہ نہ مانا اور ملزموں کو بری کر دیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مارے غصے کے پاگل ہو گیا۔ اس نے اسی روز شام کے وقت ایک دعوت میں ضلع کے افسروں کو اپنے گھر بلایا۔ ان افسروں میں پولیس کے سب انسپکٹر تک شامل ہوئے، لیکن بظاہر غلطی کے طور پر موصوف نے مجھے نہ بلایا،

حالانکہ میں ان کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ مجھے اس کی چنداں پروا بھی نہ تھی۔ اس واقعے کے بعد سرکاری کاغذات کی آمدورفت کے علاوہ ہماری ملاقات تک نہ ہوئی۔ میں نے ان سے اپنے تبادلے کے لیے کہا تھا، لیکن انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی۔ سال کے آخر میں چار ماہ کی رخصت پر چلا گیا۔

ہندو مسلم فساد کے مقدمے کی سماعت مسٹر سی اے مرڈ نے کی۔ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے زیر اثر تھے۔ شہادتیں لیتے وقت نالش کرنے والوں کی شہادتیں نظر انداز کر دی گئیں۔ میں بطور گواہ پیش ہوا۔ صفائی کے وکلا نے مجھ پر بڑی لمبی جرح کی۔ میں نے صحیح صحیح بیان دیا اور مجسٹریٹ اس میں کوئی خامی نہ پا سکے۔ ہسپتال میں جب میں زخمیوں کے بیان لے رہا تھا تو ایک پارسی بھی مسٹر ڈی۔ آر۔ آنکلسریا آئی۔ سی۔ ایس اسسٹنٹ کلکٹر گودھرا کے ساتھ اس وقت ہسپتال میں موجود تھا۔ اس نے اپنی شہادت دیتے وقت کہا تھا کہ زخمیوں کے بیان قلم بند کرتے وقت مولوی ذیشان ان سے تبادلۂ خیالات بھی کر رہے تھے۔ مسٹر آنکلسریا بھی بطور گواہ پیش ہوئے اور انہوں نے اس الزام کو غلط قرار دیا۔ مجسٹریٹ نے ملزموں کو بری کر دیا اور مسٹر آنکلسریا کی تردید کے باوجود اس نے پارسی کی گواہی کو بنیاد بنا کر اپنے فیصلے میں میرے خلاف بعض جملے لکھ دیے۔

اس فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل ہوئی۔ اگرچہ میں اپیل میں فریق نہ تھا تاہم سیشن جج نے اپنے فیصلے میں یہ جملے حذف کیے جانے کا حکم دیا اور کہا کہ میرے خلاف مجسٹریٹ کا تبصرہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ فسادات کے اس مقدمے نے میرا یہ خیال یقین میں بدل دیا کہ بہت سے انگریز افسر اور پولیس کے ملازم جان بوجھ کر ایک فرقے کی دوسرے کے خلاف حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ چونکہ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی کے غیر منصفانہ اور جانبدارانہ رویے کی مخالفت کی تھی، وہ میرے دشمن بن گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے حکومت سے میرے خلاف محکمانہ انکوائری کی سفارش کی۔ گودھرا میں چار سالہ ملازمت کے دوران مجھے زندگی کا مقصد سمجھنے کا موقع ملا اور میں پہلی بار سنجیدگی سے سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے جب فطری طریق علاج اپنایا، تو انجکشنوں پر بھی اعتقاد نہ رہا۔ میرا عقیدہ تھا اور ہے کہ انجکشن نہ صرف بے کار بلکہ ضرر رساں

ثابت ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں میری لڑکی کو چیچک نکل آئی۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹروں کے بجائے خود ہی اس کا علاج کیا۔ بچی کی صحت جونہی بحال ہوئی، میرا بڑا لڑکا اس مرض کا شکار ہو گیا۔ ان دنوں گودھرے کے کلکٹر مسٹر برہام تھے۔ وہ بااکردار اور دیانتدار افسر تھے۔ وہ گودھرا آئے، چھٹی پر تھے اور ان کی شادی کو ابھی تین ماہ ہی ہوئے تھے ان کے پولیٹیکل پرسنل اسسٹنٹ خان سے میرے بچوں کی بیماری کا ذکر کیا۔ انگریز چیچک سے بہت گھبراتے تھے مسٹر برہام بہت خوفزدہ ہوئے اور انہوں نے میرے بچوں کی عیادت کے طور پر مجھے چٹھی لکھی اور پوچھا کہ کون سا ڈاکٹر ان کا علاج کر رہا ہے۔ میں نے جواب تحریر کیا، میری بچی کو چیچک نکلی تھی لیکن اس کی صحت بحال ہو چکی ہے، اب میرے لڑکے کو چیچک نکل آئی ہے میں خود ہی اس کا علاج کر رہا ہوں۔ کلکٹر نے فوراً حکم جاری کیا کہ سول اسٹیشن کے تمام مکینوں اور سرکاری ملازموں کو چیچک کے ٹیکے لگائے جائیں۔ انہوں نے مجھے بھی چٹھی لکھی کہ تا اطلاع ثانی تم دفتر نہ آؤ۔ انہوں نے یہ اس لیے ضروری کہا تاکہ میری وجہ سے چھوت چھات کی یہ بیماری پھیل نہ جائے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ فائلوں کاغذات سے بھی چیچک پھیل سکتی ہے۔ سول سرجن میرے پاس آئے اور کہنے لگے، "اگر آپ کی اجازت ہو، تو میں آپ کے بچوں کا معائنہ کر لوں؟" میں نے جواب دیا، "مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔" سول سرجن نے دوبارہ نہایت عاجزانہ التجا کی۔ اور کہا: "میں علاج معالجے کے سلسلے میں آپ کو کوئی مشورہ نہ دوں گا۔ میں تو کلکٹر کو فقط اپنی رپورٹ پیش کر دوں گا۔" میں نے اجازت دے دی۔ کلکٹر کو سول سرجن کی رپورٹ ملی، تو اس نے مجھے ایک نوٹ (دفتری یادداشت) لکھا "بچوں کی بیماری کے دوران تم ان سے الگ تھلگ ہی رہو اور خود بھی چیچک کا ٹیکہ لگوا لو۔ اگر میری ان ہدایات پر عمل کرو، تو دفتر آ سکتے ہو، ورنہ رخصت لے لو۔" میں نے فوری جواب لکھا، "مجھے ٹیکوں پر اعتماد نہیں۔ اگر ہوتا بھی تو ایک باپ کا اپنے بچوں سے ایسے وقت الگ رہنا جب انہیں اس کی اشد ضرورت ہو، انتہائی سنگدلانہ حرکت ہوگی۔ میں آپ کے مشورے پر عمل نہیں کر سکتا۔ رخصت کا تقاضا کر رہا ہوں۔ لیکن اہلیہ کی خواہش کے مطابق فلاں تاریخ رخصت کی مدت لکھ رہا ہوں لیکن یہ ایک ماہ سے کم نہ ہونی چاہیے، جو کہ آپ کا خیال ہے کہ خطرناک ہے

بھی یہ بیماری پھیل سکتی ہے، اس لیے آئندہ آپ کو خط نہ لکھوں گا۔ میری ایک ماہ کی رخصت منظور ہو گئی۔

پھر روز بعد جب میرے لڑکے کی صحت بحال ہو گئی، تو میں نے رخصت کے بقیہ دن گودھرے سے باہر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یوں ہی کلکٹر کو پتہ چلا، انہوں نے مجھے چٹھی لکھی، "میں نے سنا ہے تم گودھرا سے باہر جانا چاہتے ہو۔ اگر میری اطلاع صحیح ہے، تو میں کہوں گا کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ کیونکہ اس طرح تم گودھرے سے باہر چیچک پھیلاؤ گے، لہٰذا تمہیں گودھرے سے باہر نہ جانا چاہیے۔" میں نے جواباً تحریر کیا، "آپ کو مجھے منع کرنے کا کیا اختیار ہے؟ ہمارے ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں کہ اگر کسی کے خاندان میں چیچک نکل آئی ہو، تو وہ شہر سے باہر نہیں جا سکتا۔ میرا لڑکا اب بالکل تندرست ہے اور میں محض تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ میری یہی خواہش ہے کہ آپ میری رخصت میں توسیع کر دیں۔"

انہوں نے سول سرجن کو دوبارہ میرے ہاں بھیج دیا۔ یہ نیا سول سرجن اینگلو انڈین تھا اور میرے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پیش آیا۔ بچوں کو دیکھتے ہی اس نے کہا، "یہ تو اب بالکل تندرست ہیں۔" اس نے کلکٹر کو رپورٹ پیش کی، تو کلکٹر نے مجھے مصالحت آمیز نوٹ لکھ بھیجا، "تمہارے شہر سے باہر جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن جانے سے پہلے مجھ سے ضرور ملنا اور مزید رخصت دے دینا۔" میں ملنے گیا، تو اس نے معانقہ کیا۔ "وہ ہنستے ہوئے بولا، "تم نے ہمیں بڑے ہی خطرے میں ڈال دیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "اب تو آپ قائل ہو گئے ہوں گے کہ میں نے آپ کو کسی خطرناک صورت حال سے دوچار نہیں کیا۔"

[illegible] کو میں ڈنڈی میں گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کا مارچ دیکھنے گیا۔ وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ لوگوں میں جوش و خروش کی انتہا تھی۔ گاندھی جی نے جب نمک ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا، تو بہت سے لیڈر اس فیصلے سے متاثر نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ انقلابی اور موثر پروگرام نہ تھا۔ لیکن گاندھی جی نے جب مارچ کا آغاز کیا اور ڈنڈی پہنچے، تو اس سے گجرات اور ملک کے دوسرے حصوں میں جو جوش و خروش پیدا ہوا، اس نے ان سب لیڈروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اسی روز میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر گودھرے کے واقعے کے سلسلے میں میرے خلاف تحقیقات کی

خاتمے کے سلسلے میں گاندھی جی سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا تو گاندھی جی اور دیگر قائدین کو فروری ۱۹۳۱ء کے آخر میں جیل سے رہا کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے مجھے پیغام بھیجا کہ اگر تم دوبارہ سرکاری ملازمت اختیار کرنا چاہو تو میں وائسرائے سے بات کروں گا۔ جواب بھیجنے کے بجائے میں دلی جا کر خود گاندھی جی سے ملا اور ان سے کہا: "میں ملازمت پر واپس جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ حصولِ آزادی کے سلسلے میں ستیہ گرہ کی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی اور اسے قبل از وقت واپس لے لیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل قریب میں آزادی نہیں مل سکتی۔" گاندھی جی بولے: "میں وائسرائے پر زور دوں گا کہ تمہیں پنشن دی جائے۔"

میری مدتِ ملازمت کی رو سے میری پنشن مبلغ ایک سو پچاس روپے ماہوار بنتی تھی۔ اگرچہ وائسرائے نے گاندھی جی کی تجویز تسلیم کر لی، تاہم بمبئی کے گورنر نے اس پر عمل درآمد سے انکار کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں شری بالا صاحب کھیر کی وزارت میں وزیر مالیات بنا، تو میں وائسرائے کی منظور کردہ پنشن کے حق سے دستبردار ہو گیا۔

وائسرائے سے مذاکرات کے لیے گاندھی جی روزانہ صبح ۱۰ بجے جاتے اور رات کے وقت لوٹتے۔ بعض اوقات وہ بہت دیر سے آتے اور ایک روز تو وہ صبح تین بجے لوٹے۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد وہ ہر روز مجلسِ عاملہ کو مذاکرات کے خلاصے سے آگاہ کرتے اور اپنے رفقا سے تبادلۂ خیال کے بعد اگلے روز کے مذاکرات کی تیاری کرتے۔ مجلسِ عاملہ کی رضامندی سے قطعی سمجھوتا ہوا تو گاندھی جی نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ سردار پٹیل اور جواہر لال ڈاکٹر انصاری کے ہاں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گاندھی جی جب دستخط کر کے لوٹے، تو سردار پٹیل نے انہیں بتایا کہ جواہر لال اس سمجھوتے پر اس حد تک ناخوش ہیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے پنڈت جی کو رام کرنے کی درخواست کی۔ گاندھی جی فی الفور جواہر لال کے پاس پہنچے اور اختلاف کی وجہ دریافت کی۔ جواہر لال نے کہا: "یہ عارضی صلح ہمارے لیے خوش آئند نہیں اور اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" گاندھی جی نے جواب دیا: "اگر تم اتنے ہی ناخوش ہو اور تمہارا خیال ہے کہ ہمیں یہ عارضی صلح قبول نہ کرنی چاہیے تھی اب بھی ہاتھ سے کچھ نہیں گیا۔ اگر تم چاہو، تو میں وائسرائے کو فوراً تحریری اطلاع بھیج دیتا ہوں۔" جواہر لال نے تامل کیا اور کہا: "نہیں چاہتا آپ یہ قدم اٹھائیں۔ آئندہ میں اس سمجھوتے کے بارے میں کوئی شکایت نہ کروں گا۔" چنانچہ اس طرح پنڈت جی نے یہ سمجھوتہ قبول کر لیا۔
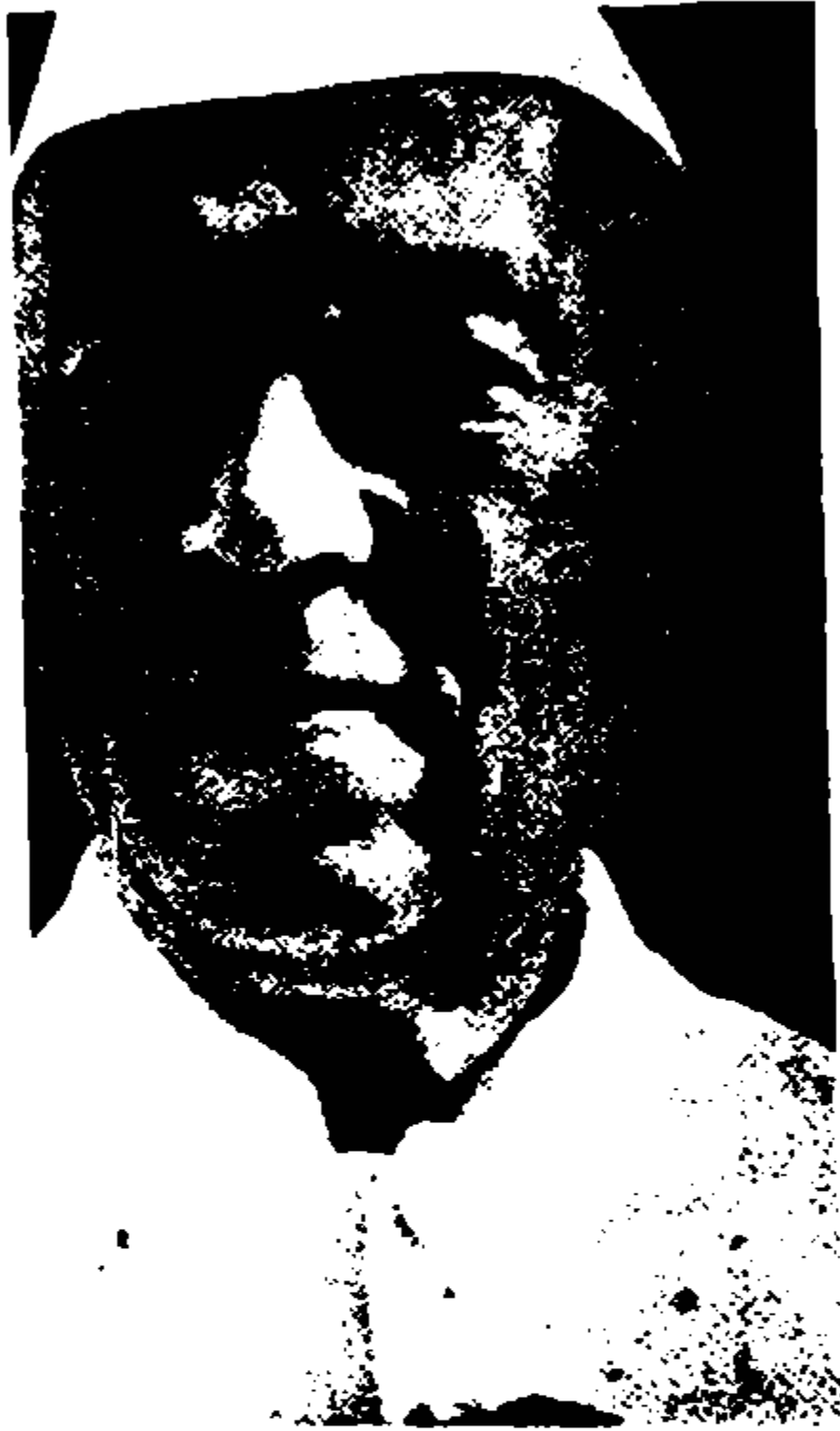
کچھ عرصے بعد کراچی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اس اجلاس میں شمولیت کی تیاری کر لی۔ انہیں دنوں گاندھی جی گجرات کا دورہ کر رہے تھے۔ دورے میں ان کے ساتھ تھا۔ سردار پٹیل نے افسرانِ دیہہ سے بعض معلومات

حاصل کرنے کے لیے مجھ سے کہا جسے میں نے مناسب نہ سمجھا، کیونکہ اس سے سرکاری ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی اور یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لینا پڑتا۔ سردار پٹیل خفا ہو گئے، لیکن انہوں نے اصرار نہ کیا۔ ایک روز گاندھی جی نے مجھ سے پوچھا: تم کراچی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کر رہے ہو؟ میں فوراً تاڑ گیا کہ کسی نے گاندھی جی سے میری شکایت کی ہوگی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ گاندھی جی کہنے لگے، میرا خیال ہے تم یہ ارادہ ملتوی کر دو اور گجرات میں رہ کر کام کرو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ ایسی ہدایت کیوں دے رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا، یہ کانگریس کا پہلا اجلاس ہوگا جس میں سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد میں شرکت کروں گا۔ اس کے علاوہ اس میں وائسرائے سے کیا گیا معاہدہ بھی زیر بحث آئے گا۔ اسی وجہ سے میں اس اہم اجلاس میں شرکت کا متمنی ہوں۔ اگر آپ مجھے حکم دے رہے ہیں، تو مجھ پر اس کی پابندی بہر حال لازمی ہے۔ گاندھی جی نے بڑی ملائمت سے جواب دیا: میں حکم دینا نہیں بلکہ تمہارے دل کو اپیل کرنا چاہتا ہوں۔ میں عرض گزار ہوا، آپ کی بات مجھے قائل نہ کر سکی، تاہم اگر آپ چاہتے ہوں کہ میں آپ کے فیصلے کا پابند رہوں، تو میں ایسا ہی کروں گا اور حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں گا۔ میری بات سن کر گاندھی جی نے اپنا مشورہ واپس لے لیا۔ میرا خیال ہے، سردار پٹیل نے گاندھی جی سے میری شکایت کی ہوگی، کیونکہ میں نے افسران دیہہ سے معلومات اکٹھی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس اجلاس کے بعد سردار پٹیل کی مخالفت کے باوجود مجھے گجرات پردیش کانگریس کا سیکرٹری چن لیا گیا۔ میرے علاوہ دو اور اشخاص بھی سیکرٹری چنے گئے تھے۔ ایک بار سردار پٹیل چند روز کے لیے احمد آباد آئے۔ میں ان سے ہر دوسرے تیسرے روز ملاقات کرتا اور کام ختم ہونے پر لوٹ آتا۔ بہت لوگ ان سے ملنے آتے اور یوں دربار سا لگ جاتا۔ مجھے اس دربار میں بے وجہ بیٹھنا پسند نہ تھا۔ چند روز بعد مجھے ایک بے تکلف دوست کی چٹھی ملی جس میں اس بات پر شکوہ کیا گیا تھا کہ میں سردار پٹیل سے بہت کم ملتا ہوں۔ میں نے جواب لکھا: "میں سردار صاحب سے اکثر ملتا رہتا ہوں، لیکن ان کے پاس ضرورت سے زیادہ ٹھہرنا پسند نہیں کرتا۔ میں ہر اہم معاملے پر ان سے مشورہ کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کو میں بطور سیکرٹری نمٹا سکتا ہوں، ان میں ان کی ہدایت نہیں لیتا۔ اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں دربار میں بیٹھا کروں، تو یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، کیونکہ میں نے ایک کی غلامی چھوڑ دی تھی اور دوسرے کی غلامی قبول کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔"

۱۹۳۱ء کی لندن گول میز کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے کے طور پر گاندھی جی کی شرکت کا فیصلہ کرنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا دلی میں اجلاس ہوا۔ گاندھی جی نے مجوزہ کانفرنس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی کامیابی کے متعلق حوصلہ شکن تقریر کی۔ ہم سب حد درجہ دل شکستہ ہوئے۔ ان کی تقریر میں اتنا درد تھا کہ بہت سے حاضرین کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ تقریر کے دوران انہوں نے کوئی چٹکلہ چھوڑا، تو ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ یہ ان کی مخصوص صفت تھی۔ وہ ماحول کو گمبھیر بنا کر کوئی ایسا چٹکلہ چھوڑتے کہ فضا معاً بدل جاتی۔

ملک کے مختلف حصوں سے جب گاندھی ــــ ارون معاہدے کی خلاف ورزی کی اطلاعات موصول ہونے لگیں، تو جولائی یا اگست ۱۹۳۱ء میں وائسرائے نے ایک اجلاس بلایا جس میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال، سردار پٹیل اور بعض دیگر زعما کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جواہر لال، سردار پٹیل اور چند دیگر افراد بمبئی سے فرنٹیئر میل کے ذریعے شملے کے لیے روانہ ہوئے۔ میں بعض رفقائے کار کے ہمراہ سورت کے ریلوے اسٹیشن پر انہیں ملنے گیا۔ جواہر لال نے اسٹیشن کے ریستوران سے چائے منگوائی۔ ویٹر ان کے ڈبے میں چائے کی ٹرے لایا۔ ٹرے میں ایک کے بجائے دو پیالیاں دیکھ کر جواہر لال مشتعل ہو گئے۔ دراصل گاڑی میں کسی بحث کے دوران وہ برہم ہو گئے تھے، لیکن ویٹر کو ٹرے میں دو پیالیاں لاتے دیکھ کر وہ غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے ٹرے کو پلیٹ فارم پر رکھا اور ٹھوکر مار کر دور گرا دیا۔ ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ خوش قسمتی سے اس واقعے کے فوراً بعد گاڑی چل دی ہمیں یہ سوچ کر مسرت ہوئی کہ پنڈت جی کے غیظ و غضب کا نشانہ ٹرے ہی بنے، بے چارہ ویٹر نہیں۔

میری اس اڑتالیس سال کی زندگی میں دس برس امن سکون اور چین سے گزرے ہیں جنہیں ایام طفلی کہا جا سکتا ہے میں اپنے وطن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوشی اور مسرت سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔ ہم میں کوئی مذہبی امتیاز نہیں تھا عیسائی، یہودی اور مسلمان سب ہی اتحاد و اتفاق سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ میری پیدائش القدس و دمشق کے ایک خوش حال گھرانے میں ہوئی جو آجکل اسرائیلیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ زندگی کے دن طمانیت اور سکون کے ساتھ گزر رہے تھے کہ ارض فلسطین پر ایک دھماکہ ہوا۔ اور ہمارا وطن جہاں ہمارے آباؤ اجداد پشت ہا پشت سے امن و آشتی کی فضاؤں میں رہتے چلے آئے تھے غیر ملکی یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہمیں اپنی سرزمین سے نکال دیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں لاکھوں فلسطینیوں کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا ہمارے قافلے بے سروسامانی کے عالم میں ارض مقدس

کو چھوڑ کر ان جان منزلوں کی سمت چل پڑے۔ موت کے فرشتے ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ غیر منقولہ جائداد تو ہم سے چھین ہی لی گئی تھی لیکن اگر ہم منقولہ املاک کو ساتھ لانے کا انتظام کرتے تو شاید اس اہتمام کے دوران ہی مارے جاتے۔

فلسطین اجڑ گیا۔ اور وہاں کے مکین تباہ و برباد ہوئے۔ ایک خاندان جو ایک ہی چھت کے نیچے محبت و شفقت کی لڑیوں میں منسلک تھا ایسا منتشر ہوا کہ ماں اُردن، باپ لبنان، بہن سعودی عرب، بھائی شام اور بیٹا مصر کی سرحدوں میں جا پہنچا۔ کسی کو کسی کی عرصۂ دراز تک خبر نہیں ہوئی۔ اسرائیلی درندوں سے صرف مسلمان عرب ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ عیسائیوں کو بھی فلسطین چھوڑنا پڑا۔ ادھر دن پر جبر و تشدد کے بادل منڈلاتے رہے یہودیوں کے قدیم گھرانے جو اپنے ہم مذہبوں کا استقبال کرنے کے لئے وہیں رہ گئے تھے ان کی استعمار پرستی کا شکار ہوتے رہے۔ ہم میں اور ان میں یہ فرق تھا کہ ہمارے سروں پر آسمان کی چھت تھی اور ہم ستاروں کی طرح ویران اور لق و دق صحراؤں میں بھٹکتے پھر رہے تھے جبکہ فلسطین کے قدیمی یہودی گھرانے اپنے ہی مکانوں کی چھتوں کے نیچے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے ناانصافی کی چکی کے پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے تھے۔
مغربی ممالک سے آتے ہوئے پناہ گزین دراصل استعمار پرست تھے۔ انہوں نے پرانی وضع کے مکانوں کو مسمار کر کے

ان پر کئی منزلہ شاندار عمارتیں تعمیر کیں لیکن ان عمارتوں کے مکینوں میں کوئی ضابطۂ اخلاق نہ تھا۔ شرافت اور مروت کو مشینی آلات نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں کے جہانِ تازہ میں انسانیت سوز افکار کی نمود تھی اور یہ مہاجرین گرد وحشت سے اپنی نئی زندگی کو سنوارنے میں مصروف ہو گئے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ نئی قدریں، نئی دنیا اور نیا جہان محض بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر سے وجود میں نہیں آتے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ معصوم بچے، نازک بدن عورتیں اور خستہ حال بوڑھے مال و متاع سے محروم، وطن سے اجڑے ہوئے خیموں میں زندگی گزارنے لگے۔ لیکن انہوں نے امنگوں اور حوصلوں کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس ناانصافی کا بدلہ لینے کے لیے جگہ جگہ سرفروش مجاہدوں نے مختلف جماعتوں کی تشکیل کی اور انتہائی صبر آزما حالات میں اسرائیلی غاصبوں کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنانے کا عزم بالجزم کر لیا۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں قیام اسرائیل کے بعد میں نے غازہ میں آکر پناہ لی۔ کچھ دن تک میں قاہرہ یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ انجینیرنگ کی ڈگری لینے کے بعد میں کویت کی ایک فرم میں انجینیر ہو گیا۔ لیکن شب و روز مجھے ایک ہی خیال نے پریشان کر رکھا تھا۔ اور وہ خیال اپنے وطن فلسطین کی بازیافت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ برسوں کے بعد بھی فلسطین کے مہاجرین ظلم کی چکی میں پستے چلے جا رہے تھے۔ میں اگرچہ اقتصادی معنوں میں خوش حال تھا لیکن میرا جسم وطن کے غم کے شعلوں میں جھلس رہا تھا اور دماغ کی حیثیت تنور جیسی تھی۔ اور جب دل و دماغ کو سکون نہ ہو تو دولت کس کام کی ہے۔ میں نے مذکورہ ملازمت کو ۱۹۶۵ء میں خیرباد کہہ دیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب نہر سوئز پر حملہ ہوا تو میں نے خود کو عوامی مزاحمتی تحریک میں منسلک پایا اور یہیں میرے ذہن میں وہ خیال خورشید مستقل کی طرح چمکا جس نے تمام مہاجرین کو متحد کر کے اسرائیل کے شب و روز کو جہنم بنا دینے کی تحریک کا سلسلہ جاری کر دیا۔

۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیلی جنگ کے بعد مجھے اس 'الفتح' کا معتمد بنایا گیا جس میں سرفروشوں، مجاہدوں اور

فدائیوں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہو گی۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر میں اس تنظیم میں سات ہزار تربیت یافتہ مجاہد شامل ہو گئے تھے اور پانچ ہزار کے قریب مختلف ممالک میں جنگی بالخصوص چھاپہ مار کی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیج دیے گئے تھے اور آج ان مجاہدین کی تعداد یہ ہے کہ ہر جوان ——— مرد ہو یا عورت اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لیے زندگی کی بازی لگانے کو ہر وقت تیار ہے۔ اور یہ دعویٰ مبالغے سے بری ہے کہ عرب متحدہ افواج نے اسرائیل کو مجموعی طور پر اتنا پریشان نہیں کیا جتنا الفتح کے مجاہدین نے کر دیا ہے۔ اسرائیل کے رہنے والوں کی راتوں کی نیندیں حرام اور دن کے سکون کو درہم برہم کر دینے میں الفتح کے مجاہدین کا ہی ہاتھ ہے

میں نے 'الفتح' کی تحریک میں جان ڈالنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے ممالک کا دورہ کیا ہے روس اور چین کے سربراہوں سے مذاکرات کیے ہیں۔ عرب ممالک کا

الفتح کی مشعل لیے ہوئے یاسر عرفات

چہرہ چھپا مارا ہے۔ ہر انصاف پسند ممالک نے اپنی تمام ہمدردیاں فلسطین کے مظلوموں کے ساتھ ظاہر کی ہیں اور ہمیں ہماری مطلوبہ چیزیں اور جدید ترین آلات حرب بھی فراہم کئے ہیں۔ لیکن ہماری تنظیم اور تحریک ہر خارجی اثر سے آزاد ہے۔ نہ یہ تحریک عرب ممالک کے داخلی امور میں دخل اندازی کا ارادہ رکھتی ہے نہ اُن پر بوجھ بن کر کام چلانا چاہتی ہے۔ ہمارا مقصد اتنا ہی ہے کہ فلسطین کی جنگ آزادی میں عرب حکومتیں ہماری مقدور بھر اعانت کریں تاکہ ہمیں ہمارا وطن اور اس کی مقدس سرزمین واپس مل جائے۔

دراصل فتح کی تنظیم سے اسرائیل میں انتشار پھیل چکا ہے۔ یہ تنظیم فلسطینی عربوں کے حوصلوں کو بلند کرنے اور اُن میں اتحاد اور اعتماد کی روح پھونکنے میں دوسری تنظیموں سے بہت آگے جا چکی ہے۔ فتح کی تحریک اسرائیلی فوج کے لیے ایک عذاب مستقل بن چکی ہے۔ اسی تحریک کی وجہ سے اسرائیل کا وجود ایک دائمی خطرے سے دوچار ہے۔ اس تحریک نے اسرائیل کی دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی ہوئی آبادی کی رفتار کو روک دیا ہے۔ مغربی ممالک کے یہودی اب اسرائیل میں مستقل سکونت کے خواب و خیال کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے ۔"الفتح" کی سرگرمیوں کا نتیجہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔

اسرائیل کی صیہونی حکومت نے میرے سر کی قیمت کروڑوں روپے لگادی ہے لیکن شاید وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ میرے بعد یہ تحریک اور بھی بڑھے گی اور اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک فلسطینیوں کو اُن کی سرزمین واپس نہیں کردی جاتی۔ کسی بھی فرد کے ہونے نہ ہونے سے ایسی تحریکیں ختم نہیں ہوسکتیں۔

الفتح کے مجاہدین اور سرفروشوں نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد تین سال کی مدت میں اسرائیل کے ڈیڑھ سو مختلف ٹھکانوں کو اپنے کامیاب حملوں سے ٹھکانے لگادیا۔ ہزاروں اسرائیلی فوجی اور درجنوں فوجی افسران دار الفنا کو روانہ کردیے گئے۔ اس دوران ہم نے اسرائیلیوں کے درجن سے زیادہ اسلحہ خانے نذر آتش کردیے سینکڑوں مسلح فوجی کاریں اور بارہ ہوائی جہازوں کو آگ لگادی۔ سابق وزیر دفاع موشے دایان کو شدید چوٹیں پہنچائیں جنہیں وہ ہسپتال میں مہینوں تک زیر علاج رہنے کے بعد بھی اچھا نہیں کرپائے۔

بہرحال ہماری تحریک آگے بڑھتی رہی۔ یہ دوچار دس لاکھ انسانوں کی زندگی اور خوشحالی کا مسئلہ نہیں بلکہ بیس لاکھ نفوس کے مستقبل کی بات تھی جو ماضی اور حال سے منسلک تھی۔ آخرکار اقوام متحدہ میں پہلی بار مجھے اس کے اجلاس میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ یہ اس کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ ایک ایسے شخص کو دعوت تقریر دی

گئی تھی جس کا کسی حکومت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی ملک یا کسی ریاست کا سربراہ تھا۔

۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں میری شرکت سے اسرائیلی حکومت کے ایوانوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ سارے اسرائیل پر رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنی مفصل اور طویل تقریر میں جو کچھ دنیا بھر کی تمام حکومتوں کے نمائندوں کے سامنے کہا اس کا متن یہی تھا کہ فلسطینی عوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں اپنے قدیمی وطن میں واپس پہنچا کر از سر نو بسا دیا جائے۔ میں نے صاف اور واضح الفاظ میں اقوام متحدہ کو متنبہ کیا کہ:

• اگر فلسطین کے مسئلہ کو جلد از جلد سلجھایا نہ گیا تو دنیا کو تیسری جنگ عالمگیر کے شعلوں میں جھلسنا پڑے گا۔ ساری دنیا میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ اور اس عذاب کا شکار اُن قوموں کو بھی ہونا پڑے گا جو ابھی تک امن اور چین سے فلسطینی مہاجرین کی زبوں حالی اور پریشانی کو تماشائیوں کی طرح دیکھ رہی ہیں۔ ہماری جنگ فلسطین میں پشت ہا پشت سے آباد یہودیوں سے نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ معتبر شہریوں کی طرح رہیں گے۔ ہماری جنگ نسلی امتیاز اور جور و ستم کے خلاف ہے۔ اس لیے میں تمام امن پرست طاقتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دنیا کو جنگ کا میدان بننے سے بچائیں اور حق و انصاف کا ساتھ دیں

اور میں نے اپنی تقریر کا اختتام کرتے ہوئے اقوام متحدہ میں جمع سربراہان اقوام کو بتایا کہ۔

"میں یہاں ملے جلے جذبات لے کر آیا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں شاخِ زیتون بھی ہے جو امن و آشتی — صلح و صفائی کا نشان ہے اور دوسری جانب جہادِ آزادی کی خاطر بندوق بھی ہے جو ہلاکت اور تباہی کا پیش خیمہ قرار دی جا سکتی ہے۔ مجھے اُمید واثق ہے کہ میرے ہاتھوں سے شاخِ زیتون کو ذگرنے دیا جائے گا۔"

★

بچپن اور زمانۂ طالب علمی

مجھے نوعمری میں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا جب تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا آگیا تو میں نے ۱۹۵۴ء میں قصبہ کے ایک اسکول میں داخلہ لینا چاہا۔ اس وقت سہ ماہی امتحانات کے نتائج نکل رہے تھے اور داخلہ میں دشواریاں تھیں لیکن میرا ایک خصوصی امتحان لیا گیا جس میں، میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ گاؤں کے فقیہہ نے جو تعلیم دی تھی وہ رائگاں نہیں گئی۔

کلاس کے اکثر طلبا، میرے دیہاتی لب و لہجہ کا مذاق اڑاتے تھے لیکن اس کا مجھ پر اچھا ہی اثر پڑا کیونکہ میں نے اپنی اصلاح کرنا شروع کر دی۔ اسکول کی تعلیم میں اکثر رکاوٹیں اور پیچیدگیاں پیدا

ہم انقلاب کیوں اور کیسے لائے؟

لیبیا کے مرد آہن معمر قذافی

ہوتی رہیں کیونکہ اکثر میرے والد صاحب کسی نہ کسی وجہ سے جائے رہائش بدلتے رہتے تھے ۱۹۵۷ء تک تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا ۱۹۶۱ء میں میں سبھا کے بورڈنگ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں مصر اور شام کے تعلقات کشیدہ ہو گئے میں نے ناصر مرحوم کی حمایت اور شام کی مذمت میں ایک جلوس نکالا۔ اس "جرم" میں مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے سوریطا کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۳ء میں جب میری عمر اکیس سال کی تھی، پڑھائی ختم کر کے میں ملٹری اکیڈمی بن غازی میں شریک ہو گیا۔ نو آبادیاتی نظام کے حامیوں کو میں نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔

۱۹۶۱ء میں میں نے البعث پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ چند دیگر مسلم جماعتوں سے رابطہ قائم کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ذہن پر متضاد خیالات کا اثر پڑنے لگا۔ ایک طرف ناصر مرحوم کا مداح اور حامی تھا میرے دل میں ان کے لئے بڑی گہری عقیدت تھی لیکن دوسری طرف ان کے حد زیادہ بڑھے ہوئے عرب قومیت کے نظریے سے مجھے اختلاف تھا "عرب قومیت" کا نعرہ ناصر ہی کی دین ہے بہر حال چونکہ میں ان کی شخصیت سے متاثر تھا اس لئے ان کی قیادت کا ہر حال میں قائل اور مداح تھا۔

۱۹۶۲ء میں جب میں کالج میں تھا تو ایک مرتبہ انگریزی داں انسپکٹر جانسن کالج کے معائنہ کے لئے آیا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی غیر ملکی کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ میں نے اپنی چابی کی زنجیر میں صدر ناصر مرحوم کی تصویر فیشن اور عقیدت کے طور پر لگا رکھی تھی انسپکٹر کو چڑانے کی غرض سے اس کے سامنے مرحوم ناصر کی تصویر میں قصداً ہلانے لگا۔ انسپکٹر نے مجھے کلاس روم سے باہر نکال دیا۔ اس واقعہ کے بعد میرے دل میں ناصر کے تئیں عقیدت کا جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔

میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی غیر ملکی کو دیکھا تھا

ملٹری اکیڈمی میں شمولیت

میں نے دیکھا کہ میرا ملک تیزی سے سیاسی اور معاشی بحران کا شکار ہو رہا ہے۔ عوام کی غریبی اور پریشان حالی دیکھ کر میں مغموم ہو جاتا تھا۔ تیل جو لیبیا کی معیشت کے لئے آگ جان کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا فائدہ مغربی اور امریکی کمپنیاں اٹھا رہی تھیں۔

تیل سے مالا مال ہونے کے باوجود میرے ملک کے عوام کی اکثریت کے پاس نہ بارش اور طوفان سے بچنے کے لئے گھر میسر تھے نہ تن ڈھکنے کے لئے مناسب کپڑے۔

اسی صورتِ حال نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لوں۔ چنانچہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ میں اس میں شامل ہو گیا۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں لیبیا کو آزاد ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ لیکن اس کی جگہ موروثی دستوری بادشاہت نے لے لی۔ اور ادریس السنوسی کو بادشاہ مقرر کیا گیا۔ بادشاہ کے گرد خوشامدی اور چاپلوس لوگوں کا جمِ غفیر ہوتا تھا۔ ملک میں چاروں طرف بدعنوانیاں پھیل گئیں۔ عام لوگوں کے لئے زندگی دوبھر ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ بچپن ہی سے میرے دل میں قوم کے لئے بے پناہ درد امڈ آیا تھا۔ میری عمر جب ۱۶۔۱۷ سال کی تھی تو میں نے ان بدعنوانیوں کے خلاف "جریدۂ فیضان" میں ایک مراسلہ شائع کرایا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ بیرونی ممالک ہمارے تیل سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارا استحصال کر رہے ہیں۔

ملٹری اکیڈمی میں میرا داخلہ لینا دراصل انھیں چیزوں کا ردِ عمل تھا۔ میرے دل میں انقلاب کا پودا پروان چڑھ رہا تھا۔ ملٹری کالج میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ میں دن رات اسی فکر میں رہتا کہ کس طرح آرٹیلری اور دیگر اہم لوازمات کے سہارے انقلاب کا نقشہ تیار کیا جائے، ان باتوں پر غور و خوض کے لئے ہم نے ایک تنظیم بنائی اور وقتاً فوقتاً اجتماع کر کے اپنے مسائل اور پروگرام پر تبادلۂ خیال کرتے ہمارے سامنے ایک اور مسئلہ تھا کہ اجتماعات میں شرکت کس طرح کریں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اور ہمیں اپنے مقصد میں بھی کامیابی ہو۔ اس کے لئے ہمیں کاروں کی بھی ضرورت تھی۔ اس وقت کار کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن مالی مشکلات میں گرفتار ہونے کے باوجود تمام انقلاب پسند طلبا۔ اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنے لازمی اخراجات کم کر دینگے اور اپنی ذاتی رقم کا کچھ حصہ تنظیم کے حوالے کر دینگے۔ کئی افسروں نے اپنی پوری تنخواہیں اپنے ملک کے آنے والے انقلاب کے لئے وقف کر دیں۔

اس انقلاب میں لیبیا کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ لیکن بڑی ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ ہر وقت راز فاش ہونے کا کھٹکا لگا رہتا۔ ذرا سی چوک سے سارے انقلابی تختۂ دار پر چڑھائے جا سکتے تھے۔ ہمیں ہر قدم سوچ سوچ کر اٹھانا پڑتا تھا۔ لیکن لیبیا کو ہر حال میں معاشی پس ماندگی کے بھنور سے نکالنا تھا۔ ہماری تنظیم میں کافی اتحاد اور جوش و خروش تھا۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ ہتھیار حاصل کرنا تھا۔

انقلاب کی سمت

سنہ ۱۹۶۴ء میں رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو ایک میٹنگ بلائی گئی ہمیں خفیہ طور پر اہم ساتھیوں کو اطلاع دینی تھی۔ لیبیا میں جگہ جگہ چیک پوائنٹ قائم کئے گئے تھے تاکہ مسافروں کی تلاشی لی جائے۔ ان جگہوں پر کافی احتیاط اور مضبوطی کی ضرورت تھی ہمیں ایسے طریقے اپنانے تھے کہ عوام اور فوجی مشکوک نہ ہونے پائیں۔

رمضان مبارک کے طویل خشک دن تھے۔ ہم سرطے کے لئے بحیرہ روم کے ساحل پر پہنچے اسی راستے سے ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔ ہم نے راستہ میں کھانے پینے کی ضروری اشیا خریدیں۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم سبھی روزے سے تھے، مسلسل سفر نے نڈھال کر دیا تھا۔ افطار کے بعد ہم سرطے روانہ ہوئے۔ سرطے ہوٹل کے رجسٹر میں سب نے میری طرح فرضی نام لکھوائے۔ مجھے لفٹننٹ

ابو بکر محمد یونس کا انتظار تھا وہ بن غازی کے ایک مقام سے آنے والا تھا۔ اس کے آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ میں نے اس راستے سے آنے والے مسافروں سے پوچھا کہ کہیں راستہ میں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آیا، اس کا جواب نفی میں ملا۔ لہذا میں نے محمد یونس (بن غازی) فون کیا معلوم ہوا کہ ابو بکر بیرک میں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس بیرک کے لوگوں نے پوچھا کہ "تم وہاں کیا کر رہے ہو"

میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور فوراً بول پڑا

"اپنے والدین سے ملنے آیا ہوں"

دریں اثنا طوفان آگیا۔ سب نے اپنی کاریں بڑھائیں اور اس طرف چل پڑے جہاں میرا خاندان رہتا تھا۔ سرطے کی میٹنگ ملتوی کر دی گئی۔

اس دوران میری پوسٹنگ طرابلس ہو گئی لازمی طور پر مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ لیکن بہر حال جانا پڑا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کسی عمل سے کسی کو میرے متعلق شبہ پیدا ہو۔ یہاں میرے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھا گیا۔ دراصل یہ عنایت اس لئے بھی تھی کہ میں امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کے خلاف لوگوں کو نہ بھڑکاؤں۔

یہاں میں نے دیکھا کہ تنظیم کی ہدایت پر عوام مغربی طاقتوں کے خلاف اپنی جد وجہد میں مصروف ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن چونکہ میں خود اس میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اپنی بے بسی پر مغموم بھی ہو جاتا۔ پھر بھی جب موقع ملتا خفیہ طور پر ان لوگوں میں سرکلر وغیرہ تقسیم کر دیتا۔ سنٹرل کمیٹی نے محسوس کیا کہ انقلاب کے لئے ہمارے پاس ضروری طاقت موجود ہے۔ طرابلس اور بن غازی پر ایک ہی ساتھ قبضہ کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن ہمیں یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری سرگرمیوں کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

انقلابی جدوجہد کا آخری سال

اس سال میں نے اپنی فوجی زندگی میں پہلی بار ۴۵ دن کی چھٹی لی۔ اس دوران انقلاب کے لئے روزانہ اجتماعات منعقد کئے گئے۔ انقلابی تنظیم سے اشتراک کے لئے "عوام کے نمائندوں پر مبنی" "پاپولر فارمیشن" بنائی گئی انقلابیوں کی ملٹری کمانڈ نے طرابلس کے بیرکوں میں اجتماعات کے دوران یہ فیصلہ کیا کہ ۱۲ مارچ کو شاہ ادریس کی سالگرہ ہے اسی روز جب شاہ اور اس کے حواری جشن میں مصروف ہوں تو حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ اب آپریشن کا دن ۲۴ مارچ مقرر کیا گیا۔

گو ہماری سرگرمیوں پر شک ہونے لگا تھا بلکہ سیکریٹ سروس کے میجر علی شعبان اور لفٹننٹ کرنل سلیمان روزانہ کیمپ کا دورہ کرنے لگے۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ ان دو افسروں کو ہماری تحریک کے

بارے میں کیا اور کس حد تک معلومات حاصل تھیں چاروں طرف خفیہ پولیس کا گشت جاری ہوگیا۔

میرے نام وارنٹ تیار ہوچکا تھا لیکن کسی وجہ سے اس پر عمل نہیں کیا گیا تھا بات دراصل یہ تھی کہ بادشاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے خلاف اس قسم کی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ آخر کس طرح اس مہم کا راز کسی پر افشا ہوا۔

شاہ ادریس کو ترکی منتقل کیا جارہا تھا انتظامیہ کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار اور چوکس تھا۔ ۲۴ مارچ کا جو دن انقلاب کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ بھی ملتوی ہوگیا۔

اگست کے مہینہ تک میں اور میرے ساتھی صرف سرکلر کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ اس درمیان ہم اپنی ہمت اور حوصلہ کو جمع کرتے رہے۔

انقلابی جدوجہد کا آخری دن

یہ ۳۰ اگست ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ میرے ساتھی عمر المہیشی کو آج بن غازی سے طرابلس جانا تھا وہاں عبدالسلام اور عبدالمنعم اس کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن طیارے پر جگہ نہیں تھی۔ عمر پریشان ہوگیا کیونکہ ZERO HOUR آج رات شروع ہونے والا تھا۔ بارے ایک دوست کے توسط سے اسے جگہ مل گئی۔

ادھر بن غازی میں میرے ساتھ المغاریف تھا۔ ہمیں پورا یقین ہوچکا تھا کہ ملٹری پولیس ہمارے پروگرام سے بالکل بے خبر ہے۔ اب ہم نے طے کیا کہ ملٹری کے تمام بیرکوں پر ایک ساتھ ہی قبضہ کیا جائے۔ لیکن حکومت کے اہم اداروں مثلاً ریڈیو، پولیس ہیڈ کوارٹر، ملٹری ہسپتال اور پوسٹ آفس وغیرہ کو یونہی چھوڑ دیا جائے البتہ اہم فوجی افسران وزراء اور حکومت کے اہم کارندوں کو گرفتار کرلیا جائے۔

میرے ساتھیوں نے ہتھیار حاصل کرلئے کئی تمام گنیں خفیہ مقامات پر چھپا دی گئیں ہم نے خاص خاص راستوں کو بند کردینے کا فیصلہ کیا تاکہ کوئی کمک نہ پہنچنے پائے۔

اور اس طرح آج ۳۰ اگست کو ہفتہ کے دن انقلابی گھڑی آہی گئی جس کا میں کوئی بارہ برس سے انتظار کر رہا تھا۔

اعلان انقلاب

آپریشن شروع ہوگیا طرابلس میں قبضہ کی مہم کا سلسلہ بغیر کسی مزاحمت کے چلتا رہا۔ کہیں کہیں کچھ رکاوٹوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً طرابلس ریڈیو اسٹیشن کے قریب جھڑپ ہوگئی۔ ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی مہم کی قیادت الحمید نے کی تھی اس وقت اس کے پاس تصادم کو روکنے کے لئے کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ اسکے پاس اسلحہ اور افراد کی کمی تھی۔ بہرحال اسے بروقت مدد مل گئی ورنہ اگر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ نہ ہوتا تو یقیناً آپریشن ناکام ہوسکتا تھا۔

طرابلس میں "ZERO HOUR" رات ایک بجے شروع ہوا تھا۔

صبح چار بجے تک بن غازی میں بھی اہم مراکز پر قبضہ ہوچکا تھا۔ تمام نشریاتی ادارے ہمارے قبضہ میں آچکے تھے۔ میں بہ نفس نفیس کچھ دیر ریڈیو اسٹیشن پر موجود تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کو پہنچنے والے سارے راستے مسدود کئے جاچکے تھے۔

طرابلس، جالود، الحوفی اور دیگر مراکز آزاد افسران کے قبضہ میں آچکے تھے اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی میں پہلا اعلامیہ لکھ چکا تھا۔ فون کرنے والا وزارت اطلاعات کا سینئر افسر تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ روزانہ کی ہلکی موسیقی کی بجائے فوجی موسیقی کیوں نشر کی جارہی ہے، اسے جواب ملا۔ ۰۰ ملک اب فوج

کے قبضہ میں ہے۔"
چاروں طرف سے خبریں آرہی تھیں کہ آزاد افسر تمام اہم مراکز پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔
اور پھر وہ گھڑی بھی آگئی کہ جب میں نے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کیا۔
"اب آزاد اور خود مختار لیبی عرب جمہوریہ کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ بدعنوان حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔"

"وہ منزل ابھی نہیں آئی"

انقلاب کے بعد، اقتدار عوام کے ہاتھ میں آگیا ہے لیبیا کی آبادی بیس لاکھ ہے۔ کبھی یہ قوم گمنام تھی لیکن اب ساری دنیا اس سے واقف ہو چکی ہے۔ ہم انقلاب کے "نشے" میں کھو کر اگر رہ گئے تو صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے اب ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ ہمیں بہت آگے جانا ہے اقتصادی انقلاب لانے کے لئے پرانے تمام قوانین کو ختم کرنا ہے۔ ملک کی خوشحالی اور ترقی کے لئے نئے انقلابی احکامات جاری کرنے ۔ جو ان کی خلاف ورزی کرے گا انہیں سزا دینے سے بھی ہم گریز نہیں کریں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہو جائیں۔

ہم مسلمان ہیں۔ اسلامی شریعت کے سائے تلے ہمیں پروان چڑھنا ہے۔ ہم کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کریں گے اور نہ کسی کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ خلقِ خدا پر ظلم کرے یا اس کے ساتھ زیادتی کرے۔

اس ملک کو جہالت اور گمراہی کے اندھیروں سے نکالنا ہے۔ ہم عوام کے ساتھی ہیں عوام سے ہمیں تعاون چاہئے۔ عوام میں ہم اسلحہ تقسیم کریں گے یہ ایک نیا اور اچھوتا تجربہ ہے اگر کوئی اس عوامی انقلاب کے خلاف کام کرے گا تو وہ اسلحہ سے محروم رہے گا ملک سے رشوت خوری، بدعنوانی، اقربا پروری، غرضکہ ہر برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ ہم ثقافتی انقلاب لائیں گے اور عرب اتحاد کا راستہ روکنے والی طاقتوں کے سر کچل کر رکھ دیں گے۔ ہمارے یہاں اس شخص کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی جو اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہے گا یا جعل سازی کرے گا۔

صرف یہی نہیں بلکہ ہم ہر اس عالمی تحریک کا ساتھ دیں گے جو انصاف اور حق کے لئے شروع کی جائے گی۔ ہم آئرلینڈ کی آزادی کی حمایت کریں گے۔ امریکہ میں کالوں کے خلاف جو منافرت پائی جاتی ہے اس کی ہم کھل کر مخالفت کریں گے۔ فلسطین کی مقدس سرزمین پر صیہونی طاقتوں نے جو غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اس کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی ہم ہر ممکن مدد کریں گے کہ یہ ہمارا مقدس فرض ہے۔ غرضکہ ساری دنیا میں ہم انصاف پسند تحریکوں کا ساتھ دیں گے۔ لیبی عوام کو اسلام کی اشاعت نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں کرنی ہے۔

(ترتیب معین اعجاز) ★

میں پنجابی مسلم راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گذریں میرے ایک جدّ کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے وہاں انہوں نے ایک خواجہ کی لڑکی سے شادی کرلی اور انہیں کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے وہ جدّ جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔

میری ولادت ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو بمقام کراچی ہوئی تعلیم کا آغاز ۱۸۸۲ء میں مکتب سے ہوا۔ بعد ازاں گوکل داس پرائمری اسکول بمبئی اور چند سال اور مدرسہ ہائی اسکول کراچی میں پڑھا۔ مدرسہ کے صدر دروازے پر یہ کتبہ تھا۔ "علم حاصل کرنے کے لیے آؤ" "خدمت کرنے کے لیے جاؤ" ۱۸۹۲ء میں جب میں میٹرک کا امتحان پاس کرچکا تو والد محترم جناح پونجا کے ایک انگریز دوست مسٹر فریڈرک کرافٹ کے مشورے پر بیرسٹری کے لیے میں انگلستان روانہ ہوا۔

لندن کا تاثر

انگلستان کے باشندے میرے لیے غیر مانوس تھے۔ یہاں میں رسل روڈ کنگسٹن کے ایک معمولی مکان میں رہتا تھا۔ جلد ہی میرا

دل وہاں لگ گیا اور میں خوش و خرم رہنے لگا۔ تعلیم کے دوران ایک مرتبہ مجھے لندن میں پولیس سے سابقہ پڑا۔ ایک رات ہم کشتی رانی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک چھکڑا مل گیا۔ ہم سب دوست باری باری ایک دوسرے کو چھکڑے پر کھینچ رہے تھے کہ اتنے میں پولیس آگئی اور سب کو پولیس اسٹیشن لے گئی لیکن انہوں نے مجھے کچھ نہ کہا اور بغیر کسی شرط کے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں دادا بھائی نوروجی کے الیکشن کے ہنگاموں میں حصہ لیا۔ اکیس سال کی عمر میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر کراچی واپس آیا۔ ۱۹۱۸ء میں ایک پارسی لڑکی مس رتن پٹیٹ سے شادی کی۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو گئی تھی۔

وکالت میں کامیابی

۱۸۹۶ء میں بمبئی میں، پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۰۰ء میں پریسی ڈنسی مجسٹریٹ بمبئی مقرر ہوا۔ دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کانگریس میں شرکت کی اور پھر ملازمت چھوڑ کر بمبئی ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اسی پریکٹس کے طفیل مجھے عزت، دولت اور شہرت سب کچھ نصیب ہوئی۔

ایک دلچسپ بات

بمبئی کے عکمۂ جوڈیشل کے پہلے سر چارلس اولیونٹ کی پندرہ سو روپیہ ماہوار گریڈ کی مستقل ملازمت کی پیشکش ٹھکرا دینے کے دو سال بعد جب سر چارلس انگلستان سے واپس آئے جہاں وہ پنشن پا کر جا چکے تھے تو اورینٹ کلب کے ایک جلسہ میں اتفاقاً میری ملاقات ان سے ہوئی۔ خود اٹھ کر میرے پاس آئے اور پوچھا کیسے گزرتی ہے؟ میں نے کہا "خدا کا شکر ہے"۔ پوچھا آمدنی کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا دو ہزار روپیہ سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے "شاباش! مجھے مسرت ہے کہ تم نے میری پیش کش ٹھکرا دی۔"

میدانِ سیاست میں بڑھتے قدم

۱۹۱۰ء میں سپریم امپیریل کونسل کا بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوا۔ انڈیا کونسل کی ہیئت ترکیبی پر سخت نکتہ چینی کی۔ وقف علی الاولاد کا مسودۂ قانون پیش کیا جو منظور ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں کانگریس کے ایک وفد میں شریک ہو کر مسٹر گوکھلے کے ساتھ لندن گیا تاکہ آنے والے اصلاحات کے سلسلہ میں ممبرانِ پارلیمنٹ

سے تبادلۂ خیال کروں۔

ٹائمز لندن کو انٹرویو

میں نے ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیا۔ میری صاف گوئی سے غیر تو غیر اپنے بھی ناراض ہوئے۔ لیکن میں نے حق بات کہنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ لندن کے اخبار "ٹائمز" نے ایک بار میرا طویل انٹرویو لیا۔ میں نے اس انٹرویو میں بڑی دو ٹوک باتیں کہیں اور میرے اس مجلے پر سرکاری حلقوں میں بڑا ہنگامہ

ہوا ۔۔۔ "برٹش امپائر کا ہندوستان وہ تنہا ممبر ہے جو حکومت کے نظام میں نمائندگی سے محروم ہے اور دنیا میں ہندوستان وہ تنہا ملک ہے جہاں نمائندہ اور ذمہ دار حکومت کا وجود ہی نہیں ہے"

رولٹ بل کی مخالفت

میں نے رولٹ بل کی مخالفت بڑی شد و مد سے کی تھی کیونکہ اس کمیٹی نے "مجرمانہ سیاسی سازش" کا مسئلہ اس طرح اٹھایا تھا جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتاً نمودار ہو گئے ہوں۔ مسٹر رولٹ کی صدارت میں تشکیل کی گئی اس کمیٹی نے ایسی سفارشات پیش کی تھیں جنہیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا تقرر تک نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ اگر اسے قانون کی شکل دی گئی تو سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے گی۔ میں نے جو احتجاجی مکتوب اس سلسلے میں وائسرائے ہند کے نام بھیجا تھا اس کا متن یہ ہے۔

"رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ کی مہر تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے اور قوم کے دستوری اور آئینی حق کو سوخت کر لیا گیا ہے لہٰذا میں اس فیصلے اور حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہار برہمی کے طور پر امپیریل کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ ان حالات میں کوئی خود دار آدمی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتا۔"

میری اس علیحدگی اور خاموشی سے میرے بہت سے دوستوں کو شکایت پیدا ہو گئی۔ اکثر احباب نے پوچھا کہ میں سیاست کے اس نازک دور میں خاموش کیوں ہو گیا۔ بلا شبہ صورت حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز تھی ایک طرف حکومت کا وہ خود سرانہ اور سفاکانہ طرز عمل تھا جس نے وقار قومی کو مجروح کر رکھا تھا۔

سیاسی بصیرت رکھنے والا کوئی بھی شخص حکومت کو اس طرز عمل پر ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جنگ عظیم میں ہندوستان نے اپنا خون بہایا تھا۔ مال و زر سے حکومت کی مدد کی تھی لیکن صلہ کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ ۔۔۔ دوسری طرف ہمارے اندر بھی پھوٹ تھی۔

"اتحاد کا سفیر"

میں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بہت کچھ کیا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے مجھے "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کہا تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ بد نصیب ہندوستان کے یہ دو فرزند ایک دوسرے کو پہچانیں، سمجھیں اور باہمی رواداری اور محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں ۔۔۔ مجھے بہت سے لوگ کوستے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہندوستانی اور ان کی کئی نسلیں رہتی دنیا تک مجھے اچھے الفاظ میں یاد کریں گی اور

لیاقت علی خاں اور محمد علی جناح

مجھے دعا دیتی کو میں اسوقت دنیا میں موجود نہیں ہونگا
حقیقی مسرت ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک
بہت بڑے سیٹھ کے یہاں مہمان تھا۔ صبح کو رخصت کے
وقت میں نے حسب دستور اس کے ملازم کو روپوں کی ایک
معقول رقم دینا چاہی بوڑھے ملازم نے واپس کر دی میں
نے اس خیال سے کہ بہت بڑے آدمی کا ملازم ہے شاید اس
رقم کو اپنی پوزیشن سے کم سمجھتا ہے رقم کو دگنا کر دیا ملازم نے
پھر واپس کر دی تین چار مرتبہ ایسا ہی ہوا میں ہر دفعہ اضافہ
کرتا اور وہ واپس کر دیتا۔ میں حیران تھا کہ کہاں تک بڑھاتا جاؤں
آخر میں نے وجہ پوچھی تو بوڑھے ملازم کی آنکھوں میں آنسو آگئے
میں نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے نہایت موثر اور
رقت انگیز لہجہ میں کہا۔

"قائد اعظم! آپ مجھے روپے دے کر خوش کرنا چاہتے
ہیں۔ میرا بال بال آپ کی ان محنتوں اور جان کاہیوں پر
خوش ہے جو آپ قوم کے لیے کر رہے ہیں میں خدا سے دعا
کرتا ہوں کہ وہ میری باقی عمر آپ کو بخش دے بلکہ جو کام آپ
نے اپنے ذمہ لیا ہے آپ اسے پورا کر سکیں۔ یہ رقم جو آپ مجھے دے
رہے ہیں اسی کام میں صرف فرمائیں۔

بڑے بڑے مہاراجے یا نواب جو میری تعریف کرتے
ہیں مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی
نیتوں اور عملوں سے میں خوب واقف ہوں۔ میری حقیقی
مسرت غریبوں کے اخلاص میں ہے۔

شاعر اعظم اقبال علامہ اقبال کے شعر جو عظیم فنی
حیثیت اختیار کر چکے ہیں ہماری رہنمائی اور ہمارے دلوں
میں جوش عمل پیدا کرنے کے لیے ہم میں ہمیشہ موجود
رہیں گے۔ ان کے اشعار اپنی ہیت کی دل آویزی ا

پر یقین محکم اور مسلسل عمل وپیہم جدوجہد۔ مختصر یہ کہ اقبال کے پیام کی یہی خصوصیت اقبال کو ایک سچے مسلمان کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

شہری آزادی اور حقوق نسواں میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی جارحانہ کارروائی یا احکام کی بہت اخراجی کرتے ہیں لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے آئین و ضوابط کا بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ ہر آئین میں سب سے زیادہ اہم شے شہری آزادی ہے، میرا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ حکومت بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر جرم ثابت کئے ایک منٹ کے لیے بھی کسی انسان کی آزادی ضبط نہیں کر سکتی۔

دنیا میں کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ گامزن نہ ہوں ہم بہت سی رسوم کا شکار ہیں۔ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں بند کر کے رکھنا انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کی تقلید کریں بلکہ اسلام کے معیار کے مطابق عورتوں کی پوزیشن کو سماج میں بلند کرنا چاہیے:

مرض الموت میں اپنے معالج سے میں نے کبھی اپنی صحت کی پروا نہیں کی موت اور زندگی سب خدا کی طرف سے ہے موت وقت متعین سے پہلے نہیں آسکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میں خداوند قدوس کی ذات کے سوا اس دنیا میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ موت کا خوف مجھ پر کبھی نہیں طاری رہا۔ جب موت کو آنا ہے اور ضرور آنا ہے تو پھر موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ مجھے میری بیماری کے متعلق تمام صورت حال سے آگاہ کر دیں کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ کس حد تک بڑھ چکی ہے۔ میں یہ اسلئے پوچھ رہا ہوں کہ ہر مریض کو اپنے معالج سے یہ دریافت کرنے کا حق ہوتا ہے بیماری کی نوعیت معلوم کرنے کے بعد میں آپ سے زیادہ سے زیادہ تعاون کر سکوں گا اور علاج میں آپ کو آسانی ہو گی لیکن اگر طبی اصول صورتِ حال بیان کرنے میں مانع ہوں تو پھر میں۔

زبان کی شیرینی کے علاوہ اس عظیم المرتبت شاعر کے دل و دماغ کی صحیح معنوں میں عکاسی بھی کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ محبوب شخصیت اسلام کی تعلیمات کی کس قدر گرویدہ تھی اقبال حضرت رسالت مآب صلعم کے ایک سچے اور مخلص پیرو تھے۔ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے۔

اقبال محض ایک پیغام بردار فلسفی نہ تھے۔ انھوں نے ہمت و جرأت، عمل و سعی پیہم، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور خدمت اسلام کی بھی دعوت دی۔ ان کی ذات گرامی حاصل تھی ایک طرف شاعر کی مثال پسندی اور دوسری طرف ایک ایسے آدمی کی حقیقت پسندی کی جو گرد و پیش کی چیزوں کو عملی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو۔ خدا تعالیٰ

آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔"

قیامِ پاکستان کے بعد دلی میں آخری دن میں دہلی کے باشندوں کو الوداع کہتا ہوں جہاں ہر فرقہ سے تعلق رکھنے والے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اب ہمیں ماضی کو دفن کر دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد حکومتوں کی طرح اپنی زندگی کا نیا دور شروع کریں۔

آخری دعا (پُرنم آنکھوں سے اپنا منہ کمبل سے ڈھانپ کر بھرائی ہوئی آواز میں)

"اے خدا!

تو ہی اس قوم کی حفاظت کرنے والا ہے میری قوم کمزور ہے اور ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ ابھی تو اس کی ابھی بھی دور نہیں ہوئی تو بھی تو اس کا حامی و ناصر ہے"

[وفات۔ ۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء۔ رات کو ۱۰ بجکر ۲۵ منٹ پر]

★

جس خالق نے مجھے ۵ ذالحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذالحجہ ۱۳۴۵ھ کو میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کیے۔ اِس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجیب و غریب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ رمضان ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ کوئی ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ۲۷، ۲۸ سال کی تھی۔ سوائے قرآن کے کچھ نہیں پڑھا تھا۔ اس کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے بیس پچیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی جن میں سب سے بڑے کی عمر ۱۳ سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا خود میں تھا جس کی عمر اس وقت پورے دو سال تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوئے ہیں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا

مولانا محمد علی جوہر کی کہانی خود ان کی زبانی

وہ زمانہ جو ریاست ہائے رامپور میں گذرا

لباس پہنا اور اسی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گذر کی مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اسی عیش و آرام میں رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا، مگر کچھ زائد ہی تھا، جو بفضلہٖ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ سلامت تھے۔ جن کی جائدادوں پر قرضے کا وہ بوجھ نہ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا جو ریاست رامپور رہتا بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لئے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ تو سب اسکول چھوڑ چھوڑ کر گھر چلے گئے مگر ہماری ہی تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رامپور کے باشندوں میں غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوئے اسی طرح ان میں سب سے پہلے آکسفرڈ کا گریجویٹ میں ہوا۔ میرے سب سے بڑے چچا، جو ہماری جائداد کا انتظام فرمایا کرتے تھے، اور ریاست میں ایک بہت بڑے عہدے پر ممتاز تھے، اس وقت زندہ تھے۔ جب میں ان کے سب سے چھوٹے مرحوم بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا اور ایک بیوہ کا پرورش کردہ، اس ریاست میں ان سے بھی بڑے عہدے پر مقرر کیا گیا، تو انھوں نے اس اعزاز پر مجھے گلے لگا لیا اور پیار کیا۔

ریاست ہائے رامپور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پر ملازمت کرنے اور جو جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں، انہیں نیک نامی کے ساتھ بجالانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدوں کے دیے جانے مگر بمجبوری قبول نہ کر سکنے کے بعد میں نے دنیائے صحافت میں قدم رکھا اور ملک و ملت کی خدمت کے لئے اس شعبۂ زندگی میں داخل ہوا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خدمات کی انجام دہی میں نیک نامی حاصل

کی یا بدنامی۔ لیکن غالباً یہ تو آج بھی نہ کہا جائے گا کہ گمنام رہا۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی نمائندہ سیاسی انجمن یعنی مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۷ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔ گو قید فرنگ کی بدولت کرسی صدارت پر میری تصویر ہی "جلوہ افروز" ہوئی۔ اس عزت افزائی کے باعث اپنی ملت کا آج تک مشکور ہوں مگر میری نظر میں جو اس کی حقیقت تھی وہ اس زمانے کے اس شعر سے واضح ہوتی ہے۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

پانچ سال کی نظر بندی اور قید سے رہائی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیت خلافت کی طرف سے ایک وفد کا سرکردہ ہو کر یورپ جانا اور وزرائے برطانیہ فرانس واطالیہ و پاپائے روم سے ملنا پڑا۔ پھر دو سال کی قید سخت کی سزا بھگتنی پڑی۔ اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی نمائندہ سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے لئے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے عالم اسلام کی موتمر کے لیئے بھی مسلمانان ہندوستان کی نمائندگی کے لیئے جمعیت خلافت کی طرف سے منتخب ہوا۔

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسولؐ

گو موتمر کا اجلاس دوم حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں منعقد نہیں کیا گیا تھا لیکن موتمر کی شاخ ہند کی طرف سے اس کے لئے بھی بلا اختلاف منتخب ہوا۔ ان مناصب کے متعلق جو فرائض تھے انھیں نیک نامی سے انجام دیا یا بدنامی نصیب ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یقیناً گمنام نہیں رہا۔

لیکن نہ یہاں کا نام مطلوب ہے اور نہ یہاں کی نیک نامی۔ جو کچھ مطلوب ہے وہ وہی "صلۂ روز جزا" جس کو ۱۹۱۷ء کے انتخاب صدارت کے بعد کے شعر میں ذکر ہے۔ دیکھیے وہاں کیا ملتا ہے۔ خود خدا شاہد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بدبختی سے: ؎

ان کو مانا ہے یہ کہنا نہیں مانا ان کا

ہزاروں گناہ کیے ہیں۔ فرائض مذہبی کی ادائیگی میں لاکھوں کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ تاہم اس رحیم و کریم کا شکر ہے کہ اسلام کے مصائب میں شریک کر کے آنکھیں کھول دیں اور اپنے گمراہ بندے کو راہ راست پر لایا۔ ممکن ہے کہ اب بھی وسوسۂ شیطانی ہی ہو اور میری بھی وہی حالت ہو جس کے متعلق غالب نے لکھا ہے کہ ؎

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن دل تو کہتا ہے کہ جس کے نام نامی پر میرے والدین نے میرا نام رکھا تھا اس کے طفیل میں مجھ پر بھی کرم ہوا اور مجھ سے بھی اس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چاہنے والا فرما رہا ہے:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی

جتنا سوچتا ہوں وہی حقیقت معلوم ہوتی ہے جو بحالت نظر بندی چھندواڑے میں ان اشعار میں کہی گئی تھی:

یہ نظر بندی تو نکلی ردّ سحر
دیدہ ہائے شوق اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں مجھ پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اک قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

کیا یہ جائز نہیں کہ میں اپنے ہم نام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے طفیل میں آج جبکہ مجھے پیدا ہوئے نصف صدی گذر چکی ہے اپنے دل کو ڈھارس بندھاؤں کہ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ اور اس غزل کا مقطع بھی سچ ہو جائے۔

جینے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر

آپ بیتی منیب
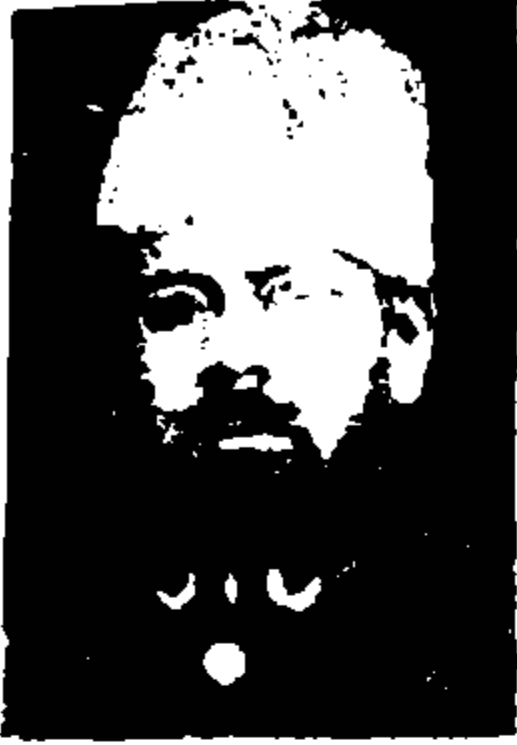
مرے جو ہم آپ کے جوہر کھلے

جب میں دس بارہ برس کا لڑکا تھا تو خیال کیا کرتا تھا کہ پچاس برس کا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپے میں اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں دوسروں کی مدد لینی پڑتی ہے اور دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے میری آرزو تھی کہ خدا کرے پچاس سال کی عمر سے پہلے ہی موت آجائے تاکہ سسک سسک کر اور پلنگ پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہ پڑے۔ آج پچاس سال کا ہو گیا مگر اب تک موت نہ آئی۔ حالانکہ جس سال سے میدانِ صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابیطس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور جو راحت یا آرام سکون و بے فکری اس کا مقابلہ کرنے کے لیے درکار ہیں وہ مفقود ہیں۔ اس وقت تک جتنی عمر ہوتی ہے اس کا آخری تہائی حصہ اس مرض میں گذرا ہے۔ اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے حافظہ بے حد خراب ہو گیا ہے۔ لیکن بحمد اللہ اب تک دوسروں کا دست نگر ہونا نہیں پڑا۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں ابھی دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی اور گو سال گذشتہ میں چار ماہ تک صاحب فراش رہا تب بھی ملک وملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا جو کانگریس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا۔ اور گو اسی دن جس دن موتمر عالم اسلامی نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا۔ آدھے جسم میں بے حسی پیدا ہو گئی اور وہ بھی قلب والے آدھے حصے میں۔ اور میں سمجھا کہ اللہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ ہی کے لیے مہمان نوازی فرمائی۔ مگر موت نصیب ہو کر جنت المعلیٰ میں سونا میسر نہ ہوا۔ دوسرے ہی دن سے موتمر کے ہر جلسے میں شریک ہوا اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارت روضہ رسولؐ کے لیے چلا تو راستے میں دنبل نکل آیا جس سے خیال ہوا کہ شاید اس سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں اور جنت المعلیٰ کی جگہ جنت البقیع میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مہمان نوازی کا سامان کر دیا جائیگا مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ منورہ میں بھی میسر نہ آئی۔ البتہ جب مولوی ثناء اللہ صاحب نے بندھا ہوا ہاتھ مدینہ منورہ سے واپسی پر دیکھ کر پوچھا تو غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں سے یہ شعر سنانا پڑا ہے

> موت ان کی ہے جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے
>
> زندگی ان کی جو اس کوچے سے گھائل آئے

نہ معلوم ہمارے نو دقیر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں، جو صرف انھیں کا حصہ ہے (جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے) لیکن میں تو اس قید قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں۔ نیز اس زندگی کا جو ان کے حق میں ہے (جو اس کوچے سے گھائل آئے) ہیں کہ بحمد اللہ اس سے گھائل ہو کر آیا ہوں۔ باوجود روز افزوں ملکی وملی ذاتی مصائب کے آج ۱۵ ذالحجہ ۱۳۴۵ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں جو "اس کوچے سے گھائل" آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے اور اسی "کوچے" کی خاکروبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا اس دور افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہ

آیا ہے پسند آئے یا نہ آئے جس کے طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی اسی کے طفیل اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخواں کے لیے دو مشت خاک پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہوگا لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندے کا نام محمدؐ اور علیؓ ہی کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمدؐ اور علیؓ ہی کے دین کی خدمت کے لئے جلایا جائے تاکہ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہو کیونکہ

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گذرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی موت آئے اسی راستے میں آئے جس میں محمد اور علی کو آئی تھی تاکہ ہمارے اس بندے کے یہ سب شعر صحیح نکلیں:

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام کام کرتا ہے

میرے رنگ کفن کی شوخی دیکھ
یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں
دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

قارئین سے استدعا ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ جو دن زندگی کے اب بھی باقی ہیں خدمت اسلام میں صرف ہوں اور موت آئے تو اللہ ہی کے راستے میں پچاس برس جہاں ایک اللہ کے حق ادا کرنے میں لاکھوں کوتاہیاں ہوتی ہیں وہاں اس کی کروڑہا کروڑ مخلوق کا حق ادا کرنے میں کیا کچھ کوتاہیاں نہ ہوئی ہوں گی۔ سب بھائیوں اور بہنوں سے التجا ہے کہ جس کسی کو میں نے ہاتھ سے زبان سے قلم سے تکلیف پہنچائی ہو یا سوئے ظن ہی کے باعث دل ہی دل میں اس کو برا سمجھ کر اس کی حق تلفی کی ہو وہ مجھے اللہ معاف کردے خداوند کریم اس کو اس کا اجر دے گا جس کسی نے مجھے نقصان پہنچایا ہے اسے میں نے للہ معاف کیا۔ میری بحمد اللہ آج کسی سے ذاتی عداوت نہیں۔ لیکن جب تک خلق اللہ کی خدمت کرتا رہوں گا یہ ممکن نہیں کہ کسی کو برا نہ کہوں۔ لیکن خداوند مجھ پر کرم فرما اور میری دوستی اور دشمنی سب تیرے ہی لیے ہو۔ اور الحب فی اللہ والبغض فی اللہ میرا شعار رہے۔ خداوند اتنا کرم اور فرما کہ مجھے الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس میں شامل فرما۔ اگر یہ دعائیں قبول فرمانا ہیں تو ابھی اور زندہ رکھ تاکہ کچھ اور تیری مخلوق کی خدمت اور تیری عبادت کرسکوں ورنہ بس اب زندگی سے بیزار ہوں آج ہی میرا خاتمہ کردے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

★

میں ۱۹۲۶ء میں ایک ایسے عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا جو پشتہا پشت سے مقبوضہ فلسطین میں سکونت پذیر تھا۔ میرے بچپن کے دن فلسطین میں گذرے جو آجتک میرے ذہن و دماغ میں تھے میں فلسطین کی وہ روح پرور فضائیں اکثر میرے صبر و قرار کو درہم برہم کردیتی ہیں جہاں عیسائی مسلمان اور یہودی اتحاد و اتفاق کے روح پرور مناظر آئے دن دیکھنے میں آتے تھے۔ ہم میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہر شخص بلا امتیاز دین و مذہب خود کو عرب قرار دے کر مگن اور مست تھا۔ فرقہ وارانہ منافرت اور رنگ و نسل کے تفرقے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا زندگی اطمینان اور سکون کے ساتھ گذر رہی تھی بچپن کے دوران میں اپنے عرب ساتھیوں کے ساتھ گلی کوچوں اور میدانوں میں ہنسی خوشی کھیلتا رہا۔ اسی ارض مقدس پر مجھے ثانوی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ لیکن ایک دن مسرتوں کے اس بحر ذخار میں ایک ایسا طوفان آیا جس نے سارے فلسطین کا شیرازۂ اتحاد منتشر کردیا اس وقت میری عمر سولہ برس کی تھی جب سامراجی قصائیوں نے اس مقدس زمین کا بٹوارہ کردیا۔ مادر وطن کے دو ٹکڑے

اور فلسطین جل رہا تھا

• جارج حبش

ایک سنسنی خیز
آپ بیتی کے
چند ورق

ہو گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فلسطین کے بٹوارے کے چند ماہ بعد ہی تمام دنیا سے دولت مند اور رئیس، امیر اور کبیر یہودیوں کے قافلے کے قافلے فلسطین میں وارد ہونا شروع ہو گئے۔ آنے والوں کو رہائش کے لیے زمین اور مکان کی ضرورت تھی۔ تجارت کے لیے دکانیں درکار تھیں چنانچہ ان نو واردوں نے قدیم باشندوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ جنہوں نے اس سرزمین کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا انہیں بھیڑ بکریوں اور دوسرے حیوانوں کی طرح دربدر کر دیا گیا۔ جن کے آبائی مکان تھے ان سے زبردستی چھین لیے گئے اور کیمپوں اور خیموں میں انہیں منتقل کر دیا گیا۔

اس تقسیم نے سارے فلسطین کو جہنم بنا دیا۔ سارے فلسطین کی فضا آہ و بکا سے گونج اٹھی۔ تباہی کا اژدہا ہر جانب پھنکاریں مارنے لگا۔ سرسبز و شاداب فصلوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ہریالی کی جگہ سلگتی بھڑکتی چنگاریوں نے لے لی۔ آبادیاں اجڑ گئیں۔ گنجان محلّے قبرستان کی مانند ویران اور اداس دکھائی دینے لگے۔ انسانیت کا خوف انسانیت کے نام پر ہونے لگا۔ جن گھروں کو غریب اور نادار مہاجرین نے خیرباد کہا انھیں ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا۔ بعض مکانوں اور بہت سے محلوں کو پیٹرول ڈال کر شعلوں کا مسکن بنا دیا گیا اور یہ سب کچھ ان مغربی یہودیوں نے کیا جو فلسطین میں پہلی بار اپنا منحوس قدم رکھ رہے تھے۔ وہ اپنی دولت کے سہارے نئی عمارتیں، نئی منزلیں اور نئے محلات کی تعمیر میں لگ گئے۔ شہر کا قدیم چہرہ بدل دیا گیا۔ اور جب عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو ہمارا گھر خاندان بھی وہاں سے چل پڑا۔ جن مصائب اور مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے ہم لبنان پہنچے ان کا ذکر اتنا دہشت ناک ہے جسے سن کر غیر جانب داروں کا بھی لہو کھول سکتا ہے۔

لبنان آکر میں نے بیروت کی ایک امریکن یونیورسٹی میں ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا میرے علاوہ یہاں اور بھی ایسے بہت سے طالب علم تھے جو فلسطین کے مختلف شہروں سے ہجرت کرنے کے بعد اس یونیورسٹی میں داخلہ لے چکے تھے۔

بیروت کی فضا پرسکون تھی لیکن وطن پھر وطن ہے جس کی یادیں مجھے آئے دن مغموم اور غمگین کرنے لگیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ نئے ماحول کو گلے لگا لوں لیکن فلسطین کی یاد دل میں کانٹا بن کر چبھ گئی اور اس نے ایک ایسے ناسور کی شکل اختیار کر لی جو آج بھی میرے سارے جسم میں پھیلا ہوا ہے۔

اپنے وطن کی بازیافت کے مسرور کن خیال سے میں نے عرب نیشنلسٹ تحریک سے خود کو وابستہ کر دیا۔ یہ تحریک اگرچہ ان دنوں شباب پر تھی لیکن اس کی حیثیت ایک بزم عزا جیسی تھی جہاں ہم بیٹھ کر کچھ دیر پرانی یادوں کو تازہ کر کے آنکھوں سے آنسو بہا لیتے تھے۔ مایوسی اور محرومی کی یہ فضا انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ نام کو تحریک تھی لیکن بالکل غیر فعال اور اس کے باوجود مجھے محض اسی جرم میں بیروت کی اس امریکن یونیورسٹی سے نکال دیا گیا کہ میں جماعت مذکورہ کا رکن بن کر اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ یہ سانحہ ۱۹۴۸ء میں پیش آیا اس وقت میری زندگی بائیس سال کے گراں بار وزن کو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے تھی ایک مردہ لاش کی طرح لحد سے باہر بھٹک رہی تھی۔

۱۹۴۸ء کے بعد سے ۱۹۶۷ء تک میں اسی عرب نیشنلسٹ تحریک سے متعلق رہا۔ ڈاکٹری کو میں نے ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی بچوں سے التفات رہا ہے شاید اس وجہ سے بھی کہ بچپن سے خود میری میٹھی یادیں وابستہ تھیں۔ اس لیے میں نے اپنے دائرہ علاج کو بچوں تک محدود رکھا۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کے قومیا لینے کے بعد مصر پر مغربی طاقتوں نے جو فوجی حملہ کیا اس نے میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر دیا۔ مصر اگرچہ میرا وطن نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ میری ہمدردی کی وجوہات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ اس کے ساتھ بھی کم و بیش وہی ہوا جو فلسطین کے ساتھ ہوا تھا۔ دوسری سب سے اہم وجہ یہ بھی تھی کہ مصر کے عوام خصوصاً مصری فوج جس میں انوار السادات اور جمال ناصر بھی شامل تھے فلسطین کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کے خلاف میدان جنگ میں شریک ہو کر اپنا خون بہا

چکے تھے۔ مصری چاہتے تھے کہ ہمارے غم کا مداوا کریں لیکن ہتھیاروں کی کمی اور مغربی طاقتوں کی بے پناہ قوت نے انہیں معذور اور مجبور کر دیا تھا۔

۱۹۵۶ء پر مصر پر کیے جانے والے حملوں کے خلاف روس نے جو خیر سگالی کا مظاہرہ کیا اُس کی وجہ سے جابر اور قاتل فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور میرے دل میں روس کے لیے جذبۂ رفاقت جاگ اٹھا۔ عرصۂ دراز تک میں روسی طلسم میں پھنسا رہا چونکہ انجام کار ہمارے حلیف نے ہماری جد و جہد میں ایسا ساتھ نہیں دیا کہ ہمیں ہماری کھوئی ہوئی سرزمین واپس مل جائی۔

لیکن یہ ہنگامہ وقتی طور پر رفع ہوا تھا عرب سرزمین پر مغربی سامراجی طاقتوں کی نگاہیں گدھوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ زمین کی اس کرۂ ارض پر کوئی کمی نہیں۔ آج بھی کروڑوں ایکڑ رقبہ خالی پڑا ہے جسے آباد کیا جا سکتا ہے لیکن اصل مسئلہ تیل کا تھا جو یہاں کی زمینوں میں پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور مغربی سائنس داں اس راز سے عربوں سے بہت پہلے ہی واقف ہو چکے تھے۔ اگر وہ اپنے بنائے ہوئے منحوس اور سیاہ منصوبوں میں کامیاب ہو جاتے تو شاید آج سارے تیل کے چشمے اُن کے قبضۂ اقتدار میں منتقل ہو چکے ہوتے

۱۹۶۷ء میں اسرائیلی حکومت نے اچانک مصر پر حملہ کر دیا۔ اس حملے نے واضح طور پر یہ ثابت کر دیا کہ دغاباز صیہونی طاقت کبھی بھی امن و صلح کے ساتھ عربوں کے چھین لیے ہوئے علاقے واپس نہیں کرے گی۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ کے خاتمے کے بعد ہزاروں مربع میل رقبہ اسرائیلیوں کے ناپاک قبضے میں چلا گیا اور عرب ممالک کی نااہل حکومتیں عارضی صلح نامہ پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اس شرمناک واقعہ نے میرے جسم میں آگ لگا دی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جس جماعت کا میں ابھی تک ممبر رہا ہوں وہ ایک مردہ لاش ہے جسے سپردِ زمین کر دینا ہی صحت و سلامتی کی ضمانت ہے۔

اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے میں نے ایک انقلاب پرست اور دہشت پسند پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ جس لمحے میں نے یہ فیصلہ کیا وہ میری زندگی کا سب سے اہم لمحہ بن

کردہ گیا۔ میں نے فلسطین کو نجات دلانے والا عوامی محاذ بنا ڈالا۔ جو دنیا بھر میں پی ایف ایل پی (پاپولر فرنٹ فار لبریشن آف فلسطین) کے نام سے چند ہفتوں میں مشہور ہو گیا اور جس کی جنبشِ ابرو نے اسرائیلی حکومت اور اُسکے حواریوں کی بلند و بالا عمارتوں میں شگاف ڈال کر رکھ دیے۔

اس جماعت کو فعال اور خوفناک بنانے کے لیے میں نے طویل سفر کیا اور ویت نام پہنچ کر میں نے بذاتِ خود اُن گوریلا افواج کی نقل و حرکت کا مطالعہ کیا جو چین کے رہنما ماؤزے تنگ کی ہدایات کو سینے میں لیے مغربی استعمار پرستوں کا ناک میں دم کیے ہوئے تھیں۔ گولیوں کی بوچھار اور فضاؤں سے بموں کی بارش کے دوران میری نگاہوں نے جو منظر دیکھے اُن سے میرے دل میں یقین اور اتحاد کی یہ لہر پیدا ہوئی کہ ایک دن ویت نام کے سرفروشوں کو اُن کا مقصود نظر مل جائے گا اور اگر فلسطین کے مجاہدین اور خواتین نے بھی یہی طریقہ اپنایا

تو ایک دن اسرائیل کی جانب سے از خود صلح و صفائی کے پیغامات آنے شروع ہو جائیں گے ــــــ انہیں اپنا سر ہمارے قدموں میں جھکا دینا پڑے گا۔

اگرچہ زمانہ طالب علمی سے ہی میں نے فدائیانِ فلسطین کی تحریک میں دوش بدوش حصہ لیا ہر محاذ اور ہر جہاد میں شریک رہا لیکن پی ایف ایل پی کے قیام سے پہلے مجھے کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ اس محاذ کو متحرک اور فعال بنانے اور اس میں روح پھونکنے کے لیے میں نے چین کا رُخ بھی کیا تھا اور وہاں گوریلا وارفیئر کی باضابطہ اور باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنی تنظیم میں بھرتی شروع کی۔ لیکن اس تنظیم کی رکنیت ہر کس و ناکس کے لیے عام نہیں تھی۔ اس کے دروازے اُن مخصوص مجاہدوں کے لیے ہی کھولے گئے جن کے قلب فولاد کے اور جگر پتھروں جیسے پائے گئے۔ اس مقصد کے لیے ہر ممبر کا پہلے جسمانی معائنہ کیا گیا اس کے بعد ہر کامندہ کے دل اور گردے کا طبی معائنہ کونسل کے چنیدہ ممبران کے سامنے پیش کیا گیا۔ اگر وہ کمزور دل کا ثابت ہوا تو اُس پر ممبری کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔ کچھ ہی دِنوں کے اندر ہی اندر میری اس تنظیم کی تعداد پانچ ہزار سے بڑھ کر دس ہزار ہو گئی اور اتنی تعداد میرے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کافی تھی کیونکہ اس جماعت کا ہر فرد پانچ لاکھ انسانوں کی قوت کے برابر تھا۔ جس پل، بندھ، ٹرین، جہاز کو بنانے کے لیے پانچ لاکھ انسان کام کر سکتے تھے انھیں محض ایک کمانڈو تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ اس دہشت خیز تنظیم کا ہر فرد شیر دل تھا اور وطن کی خاطر مرنے اور شہید ہونے کی قلبی تمنا اور دلی آرزو رکھتا تھا۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک تربیتی کیمپوں کے اندر صحراؤں میں کمانڈوز کو ہدایات دی جاتی رہیں۔ انہیں گوریلا طرز کی جنگ کے سامان، ہتھیار اور آلات حرب فراہم کیے گئے انہیں فاقے کرائے گئے، اُن پر سختیاں برتی گئیں اور پریشان کن حالات میں خندہ پیشانی کے ساتھ اپنا فرض پورا کرنے اور مفوضہ خدمات کو انجام دینے کے درس دیے گئے۔ اس طرح ہر رضاکار کو شیر دل اور جاں فروش بنا دیا گیا۔

۱۹۷۰ء میں ۶ ستمبر کو ایک ہی دن میں ہماری تنظیم کے کمانڈوز نے امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کے تین ہوائی جہازوں کا اغوا کر لیا۔ یہ دن تاریخ عالم میں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا ۹ ستمبر کو محض تین یوم کے بعد ہماری تنظیم کی ایک سرفروش مجاہدہ مونا عابد السامجوہ نے برطانیہ کے ایک جہاز (وی سی ۱۰) کو اغوا کر کے ان کی تعداد کو چار بنا دیا۔ یہ جہاز معمولی تخمینے کے مطابق کم از کم نصف ارب روپے کی لاگت سے معرضِ وجود میں آتے تھے اور ان کے بنانے کے دوران ہزاروں کاریگروں انجینئروں اور مزدوروں نے حصہ لیا تھا لیکن انھیں محض چھ سات کمانڈوز نے تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لیے اپنے جال میں پھنسا لیا۔

جہازوں کے اس اغوا کی وارداتوں نے ساری دنیا میں کہرام برپا کر دیا۔ دشمنوں کا ذکر کیا دوستوں تک نے اس عمل پر ہماری مخالفت کا اظہار کیا۔ کسی نے بھی یہ نہ سوچا کہ محض چار جہازوں کے اغوا کرنے والوں کی سرزمین پر بسنے والے لاکھوں انسانوں کو جب مال و متاع سے محروم کر کے دیس بدر کیا تو کھربوں روپیوں کا مالی نقصان اور ہزاروں انسانوں کا جانی زیاں ہو چکا تھا، محض چار جہازوں پر ساری دنیا کے اخبارات چیخ چیخ کر احتجاج کرنے لگے۔ کئی ممالک کے ایوان ہائے حکومت اس معمولی سے واقعے سے گونج اٹھے۔

ہمارے فدائیوں نے مسافروں کو پناہ دے کر جہازوں کو قاہرہ اور عمان کے میدانوں میں آگ کی نذر کر دیا۔ من جملہ ساڑھے پانچ سو مسافروں کے محض ڈیڑھ سو اسرائیلیوں کے علاوہ سب کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن ان ڈیڑھ سو اسرائیلیوں کی خاطر اقوام متحدہ میں شور مچ گیا۔ دنیا کی عظیم ترین ریڈ کراس سوسائٹی کے افراد اُن کی خدمت کے لیے اُردن پہنچ گئے صدر نکسن اور برطانوی وزیر اعظم ہیتھ کی نیندیں حرام ہو گئیں جتنے ہمہ ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر اس واقعہ پر کھڑک اٹھے شاید فلسطینیوں کے لیے پچیس سال میں بھی نہیں کھڑکے ہوں گے انتقامی کارروائی کے دوران ایک مجاہدہ لیلیٰ خالد کو گرفتار کر لیا گیا جسے بعد میں بادلِ ناخواستہ رہا کرنا ہی پڑا۔

جہازوں کے اغوا اور اُن کو جلا کر خاکستر کر دینے کا مقصد

فلسطین کی آزادی میری زندگی کا مقصد ہے

...تھا یہ بے حد معمولی تھا لیکن اس نے اسرائیلیوں کی صفوں میں خوف اور دہشت پھیلا دی اور انجام کار اسرائیلیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ یہ اسرائیل جو ساری عرب سرزمین کو ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے اب غور و فکر کے سمندروں میں غرق ہو گئے۔ گھروں اور دفتروں میں بیٹھ کر الفتح ایل پی کی نقل و حرکت پہ نگرانی کرنے کے لیے خفیہ سکیمیں ترتیب دی گئیں۔ اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ عزائم کے حلقے اندر سے منہدم پڑے۔ ہر لمحہ اور ہر پل ان بزدلوں کو مسلسلے مجاہدین اپنے سروں پر کھڑے نظر آنے لگے۔

اس واقعہ کے رونما ہونے سے قبل میری تنظیم کے ان شاہدوں نے ایل ایل ایر لائنز کے ایک جہاز کو اغوا کر کے الجزائر پہنچا دیا اور یہیں سے ہم نے ہوائی جہازوں کے اغوا کرنے کی تجویزوں پر خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ غور و خوض شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں فدائیوں نے اُس پیٹرول کی پائپ لائن کو اُڑا دیا جو سعودی عرب کا تیل بیروت تک پہنچانے کے لیے ڈالی گئی تھی لیکن اسے اسرائیلیوں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ ہماری تنظیم کے کمانڈوز نے اسرائیلی سرحدوں کے اندر اور خود تل ابیب کے بڑے بڑے ہوٹلوں، بڑی بڑی شاہراہوں اور مغرب سے آئے ہوئے یہودیوں کے کھیتوں اور کارخانوں میں جتنی تباہی اور بربادی پھیلائی ہے اسے ریکارڈ کرنے کے لیے مضبوط کتاب درکار ہوگی۔ فی الحال ہم نے خود جان بوجھ کر بہت سے ایسے دہشت خیز کارناموں کو صیغہ راز میں رکھ چھوڑا ہے جیسے اتفاق سے اسرائیل حکومت نے بھی اپنے باشندوں کے چین اور سکون کو حرام نہ کرنے کی خاطر کوئی پبلسٹی نہیں دی ہے۔

میری زندگی کا پہلا اور آخری فرض فلسطین کو آزاد کرانا ہے اور وقت کا یہ فرمان پی ایف ایل پی کی تنظیم نے ۱۹۶۷ء میں اپنے جنم دن پر ہی تحریر کر دیا تھا۔ موت ٹل سکتی ہے لیکن یہ فرمان نہیں ٹل سکتا۔ یہ میرا عقیدہ اور ایمان ہے

آپ بیتی نمبر

میرا نام محمد علی کلے ہے۔ کبھی میرا نام کیشیس کلے ہوا کرتا تھا۔

میرے والد کا نام کیشیس مارسلس کلے اور والدہ کا نام اوڈسّا کلے ہے۔ انھیں مجھ پر اور مجھے ان پر فخر ہے۔

میری عمر اس وقت ۴۰ سال ہے۔ میں ۱۷ جنوری ۱۴۲ کو لوئی ولا میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں میں نے اسلام قبول کیا اسی سال میری پہلی شادی بھی ہوئی تھی۔

۱۹۵۹ء میں شکاگو میں میں نے گولڈن گلوز چیمپئن شپ

کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد کامیابیاں میرے قدم چومتی رہیں۔ ۱۵ستمبر ۱۹۷۸ء کو لیون اسپنکس کو شکست دے کر میں نے تیسری بار عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن شپ کا اعزاز واپس لیا۔

مجھ سے قبل دنیا کے کسی باکسر نے تین بار یہ اعزاز نہیں حاصل کیا تھا۔ میری کامیابیوں کی داستان بڑی طویل ہے، لیکن ایک بار مجھے شکست کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیلی فورنیا میں کین نارٹن سے جو مقابلہ ہوا تھا اس میں مجھے ناکامی ہوئی۔ میرے دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے طنز کا نشانہ بنایا مجھے گالیاں دیں، میرا مذاق اڑایا۔ یہ میری زندگی کا تاریک ترین باب تھا۔

دراصل یہ میرا امتحان تھا۔ اللہ میرا امتحان لے رہا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح نہیں نبھایا۔ تربیت میں ڈھیل دی۔ آرام زیادہ کیا۔ راتوں کو جاگا۔ لڑائی ایک بہت سنجیدہ اور خطرناک پیشہ ہے، لیکن میں نے کوتاہی برتی تھی۔ اللہ مجھے جگانا چاہتا تھا اور یاد دلانا چاہتا تھا کہ میرا مشن کیا ہے۔ میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں ناقابل تسخیر ہوں۔ کوئی مجھے آسانی سے شکست نہیں دے سکتا۔ لیکن اب میں جان گیا ہوں کہ جس طرح لگاتار شکستیں ایک باکسر کو ختم کر دیتی ہیں اسی طرح لگاتار آسان فتوحات بھی اس کے لئے خطرناک بن جاتی ہیں۔

اس شکست کے ذریعے دراصل اللہ تعالیٰ میری آنکھیں کھولنا چاہتا تھا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے دشمن کہہ رہے ہیں علی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لیکن میں عہد کرتا ہوں کہ میں واپس آؤں گا۔ میں اپنا عالمی خطاب دوبارہ حاصل کروں گا۔

میں اپنے وطن لوئی ولا واپس جانا چاہتا ہوں تاکہ ایک بار پھر اپنے آپ کو دریافت کر سکوں۔ اس محمد علی کو تلاش کروں جو کروڑوں دلوں کی امیدوں کا مرکز ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے پورے قصبے کو پہلے ہی سے میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔ لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے میری طرف ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ عورتیں اور بچے کھڑکیوں سے جھانک رہے ہیں۔ بچے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں "محمد علی ـــــــ ہمارا عالمی چیمپئن" شاید لئی ٹی ویژن پر نورٹن کے ہاتھوں مجھے مات کھاتے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی انہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں

میرے والدین کو مجھ پر ناز ہے اور مجھے اپنے والدین پر فخر ہے

ناقابلِ تسخیر ہوں۔ ٹرک گاڑیوں میں میرا پیچھا کرتے ہیں میں رک رک کر انہیں آگو گزرات دیتا ہوں۔ اب میں اس راستے پر ہوں جو میرے گھر کی طرف جاتا ہے۔ میرے والدین میرے منتظر ہیں۔

میں کئی دن تک اپنے ماں باپ کے ساتھ لوئی ولا میں گھومتا پھرتا ہوں اور اپنے بچپن کی یاد تازہ کرتا ہوں۔ اپنے رشتہ داروں اور بچپن کے ساتھیوں سے ملاقاتیں کرتا ہوں۔ میری ماں اشارے کر کے ان جگہوں کی طرف میری توجہ دلاتی ہے جن سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ میری ماں کہتی ہے "جب سے تم یہاں سے گئے ہو، لوئی ولا کافی بدل گیا ہے۔ جب تم یہاں پلے بڑھے تھے تب کالوں کے ساتھ گوروں کا رویہ بہت برا تھا۔ انہیں گوروں کے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔" پھر ماں نے ایک دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جب تم چھوٹے سے تھے تو ایک بار تم اس دوکان کے قریب کھڑے ہو کر بلبلانے لگے تھے کیونکہ تمہیں پیاس لگی تھی۔ بہت سے گورے بچے اس دوکان سے پانی لے کر پی رہے تھے لیکن جب میں نے تمہیں پانی پلانا چاہا تو کلرک نے مجھ سے صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر ہم یہاں نیگرو کو پانی پلائیں گے تو ہمیں نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ تم مچل مچل کر روتے رہے لیکن میں تمہاری پیاس بجھانے میں ناکام رہی۔ آخر کار کالوں کے علاقوں میں پہنچ کر میں نے تمہیں پانی پلایا۔"

میں نے لوئی ولا کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے پاس بس روک دی۔

"تم نے بس یہاں کیوں روک دی؟" میری ماں نے حیرت سے پوچھا "یہ اسٹیشن تو کب کا بند ہو چکا ہے۔ اب یہاں کوئی گاڑی نہیں رکتی۔"

میں بیس سال پرانی یادوں میں کھو گیا۔ ایمیٹ ٹل کی اور میری عمر ایک تھی۔ ہم ایک ہی دن ایک

ہی سال پیدا ہوتے تھے۔ میں نے اس کی تصویر کالوں کے ایک اخبار میں دیکھی تھی۔ ایک طرف اس کی ہنستی ہوئی تصویر تھی، اور دوسری طرف اس کی لاش کی تصویر تھی۔ اس کا سر کچلا ہوا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اس معصوم بچے کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ کالا تھا۔ گوروں نے صرف لطف اٹھانے کے لئے اُسے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا تھا۔

گورے کالوں کو ایک کھمبے میں باندھ کر دھار دار چاقوؤں سے بیہوشی کی حالت میں ان کے جسم کی کھال اتار لیتے ہیں اور پھر اس کھال کو اپنے بٹوے اور پرس بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

کئی دن تک ایمیٹ کا مسخ شدہ چہرہ دن رات میرے ذہن پر چھایا رہا۔ آخر کار ایک دن میں نے ان مظالم کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دوست روبی کنگ کو ساتھ لیا، اور پھر ہم دونوں رات کی تاریکی میں اس ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں آج میں بیس سال بعد کھڑا ہوں۔ ہم نے جوتہ پالش کرنے والے کے شیڈ سے لوہے کے دو اسٹینڈ نکالے اور انھیں لا کر ریل کی پٹری پر جما دیا۔ کچھ دیر بعد ایک ڈیزل انجن آیا۔ ایک پہیہ پٹری پر سے اُتر گیا اور بہت زور کا دھماکہ ہوا۔ ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور دو دن تک وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ جب دو دن بعد ہم وہاں گئے تو ریلوے کا عملہ اس وقت بھی انجن کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اٹھانے میں مصروف تھا۔

میں نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ مجھے ۱۹۶۸ء کے موسم گرما کا وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب میں خاکی پتلون اور پسینے میں شرابور قمیص پہنے ہوئے لوئی ولا کے امیر ترین آدمی ولیم رینالڈ کے شاندار گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اس وقت میری شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی، لوگوں کو یقین تھا کہ میں جلد ہی روم سے گولڈ میڈل جیت کر واپس لوٹوں گا۔ کروڑپتی رینالڈ مجھے نوکری دینا چاہتا تھا۔ تاکہ میں معاشی فکر سے آزاد ہو کر جلد ہی ایک عظیم باکسر بن جاؤں اور اپنے قصبے کا نام روشن کروں۔ اس خبر سے میرا پورا گھر مسرور ہو اُٹھا تھا کہ چلو اب ہمارے غربت کے دن ختم ہو گئے۔

اس گھر میں میرا واسطہ مسٹر رینالڈ سے نہیں بلکہ اُن کی

پہلی شادی کی یادگار تصویر

انہی سے پڑا جو گھر کا نظام چلاتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کمرے فرش، پاخانہ اور غسل خانہ وغیرہ صاف کرنے کے سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ میرے ساتھ وہ خاتون زر خرید غلاموں جیسا سلوک کرتیں۔ جب میں مسٹر رینالڈ کے بارے میں پوچھتا تو جواب ملتا کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں۔ ان کے پاس ملنے کا وقت نہیں ہے۔

لیکن ایک روز اتفاق سے ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے مجھے مخاطب کیا "ہیلو۔ دنیا کے اگلے اولمپک چیمپئن" جواب میں میں اسی قدر کہہ پایا تھا "مسٹر رینالڈ" کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور کہا "رینالڈ نہیں، مجھے اگلے عالمی چیمپئن کا منیجر کہو"

ان کا صرف یہ جملہ سن کر مجھ میں نیا جوش آگیا۔ میں نے اس ہفتے فرش اور غسل خانے خوب رگڑ رگڑ کر صاف کئے۔ ایک روز

انہوں نے مجھ سے پوچھا "تمہیں کوئی خاص ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ" میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "تربیت کے دوران آپ کے خیال میں مجھے کس طرح کا کام کرنا چاہیے۔؟"

اس پر اپنی بیوی کو مخاطب کر کے انہوں نے کہا "اسے خوب کھلاؤ کیونکہ اسے مضبوط جسم بنانے کے لئے اچھے کھانے کی ضرورت ہے۔ اس کو ایک شاندار لڑاکا بننا ہے۔"

جب میں روم سے اولمپک گولڈ میڈل جیت کر واپس لوٹا تو اسی کروڑپتی ریناؤلڈ نے مجھے لاکھوں ڈالر کا ایک کنٹریکٹ پیش کیا، لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد سے گوروں کے اخبارات مجھے احسان فراموش کے لقب سے یاد کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو پتہ نہیں ہے، یا پھر وہ جان کر بھی انجان بنتے ہیں کہ اس کروڑپتی کے لئے مجھ جیسے باکسر کی حیثیت ریس کے ایک گھوڑے سے زیادہ نہیں جس پر کروڑپتی پیسہ خرچ کرتا ہے۔ ریس میں دوڑاتا ہے۔ اس سے خوب پیسہ کماتا ہے اور جب وہ گھوڑا کمزور پڑنے لگتا ہے تو اسے گولی مار دیتا ہے۔ محمد علی نے کبھی اپنے آپ کو ریس کا گھوڑا بننے کی اجازت دی ہے اور نہ کبھی دے گا۔

۱۹۶۰ء کی ایک شام جب یاد آتی ہے تو میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی ہے۔ میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسی شام کیشس کلے ہمیشہ کے لئے مر گیا اور اس کی جگہ محمد علی نے جنم لیا۔

میں اپنے جگری دوست رونی کے ساتھ ایک نئے تعمیر شدہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ رونی نے یہاں جانے سے روکا تھا لیکن میں نہیں مانا۔ یہاں موٹر سائیکل پر گھومنے والے گوروں کے غنڈوں کا ایک گروہ تھا۔ اس میں سلم نام کے ایک لڑکے کو میں جانتا تھا۔ اس کا سردار بھی وہیں بیٹھا تھا جسے لوگ مینڈک کہتے تھے۔

میں اور رونی ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان ویٹرس نے ہمارے سامنے پانی کے گلاس رکھ دیئے۔ رونی نے ہمبرگر اور ملک شیک کا آرڈر دیا۔ لیکن کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک موٹے بھدے شخص نے ویٹرس کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ کچھ دیر بعد اس ویٹرس نے ہمیں آہستہ سے جواب دیا۔

"ہم یہاں کالوں کی سروس نہیں کرتے۔"

میں نے اسے بتایا "میں اولمپک چیمپئن کیشس کلے ہوں۔"

ویٹرس بھاگ کر ریسٹورنٹ کے مالک کے پاس گئی۔ مالک نے کہا "مجھے اس کی پرواہ نہیں وہ کون ہے۔"

اس کی آواز تیز تھی۔ سارے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے غنڈوں کا گروہ مالک کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ رونی کا ہاتھ پتلون کی اس جیب کی طرف بڑھ گیا تھا جس میں اس کا چاقو تھا۔ اس نے سرگوشی کی "تم مالک کو سنبھالو، میں مینڈک کو سنبھالتا ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بے عزتی کا جو زخم میرے سینے پر لگا تھا اس کے لئے کسی اور لڑائی کی ضرورت تھی بہت بڑی جنگ کی۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ مجھے کھسکتا دیکھ کر ریسٹورنٹ کے مالک اور مینڈک نے قہقہہ لگایا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے سے باہر نکلتا، ایک دبلی پتلی کالی عورت نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اپنے ایمان کو قائم رکھنا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ اچانک پیچھے سے آواز آئی "ارے اولمپک نیگرو" میں نے مڑکر دیکھا۔ مینڈک اور اس کے کئی ساتھی پیچھا کر رہے تھے۔ وہ میری طرف اشارہ کر رہے تھے اور فحش گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سلم ہی ایسا تھا جس سے ہماری معمولی سی رسم و راہ تھی۔ اس نے قریب آکر کہا "کلے میں نے تمہیں بچانے کی بہت کوشش کی، لیکن مینڈک غصے سے پاگل ہو گیا ہے۔ اب اس کا غصہ اسی وقت ٹھنڈا ہو گا جب تم اسے کوئی معمولی نذرانہ پیش کرو۔" سلم نے میری گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مینڈک اپنی محبوبہ کے لئے وہ تحفہ دو اولمپک گولڈ میڈل چاہتا ہے جو تمہارے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔ پھر تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

رونی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "جاؤ مینڈک سے کہہ دو، یہ تحفہ ہم اس کی ماں کو دیں گے۔ اگر اس کی ماں ہمارے ساتھ کاروبار کرنے کو تیار ہو۔"

سلم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اچھا پھر ملیں گے سلم" یہ کہہ کر میں نے اپنی موٹر سائیکل کو ریس دی.........

میرے سامنے اپنا پورا مستقبل تھا۔ اگر میں اس گروہ کے

ساتھ لگ جاتا تو میرا مستقبل تاریک تھا۔ میں نے اور روبی نے اپنی موٹر سائیکلیں پوری رفتار سے دوڑا دیں۔ لیکن مینڈک کے ساتھی ہمیں چاروں طرف سے گھیر لینا چاہتے تھے۔

روبی نے چیخ کر مجھ سے کہا "کلے تم نکل جاؤ۔ تمہارے سامنے پورا مستقبل ہے۔ میں ان سے نپٹ لوں گا۔" ہم مینڈک اور اس کے ساتھیوں کی موٹر سائیکلوں کی آوازیں سن رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ مینڈک کو یہ امید ہوگی کہ ہم بچنے کے لئے کالوں کے علاقے کی طرف جائیں گے، اس لئے ہمیں وہ اس راستے پر گھیرنے کی کوشش کرے گا ——— میرا ارادہ پل کو پار کر کے دس پندرہ میل کی دوری پر واقع دوسرے پل سے واپس کالوں کے علاقے میں آنے کا تھا۔

لیکن ہم نے مینڈک کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ جیسے ہی ہم پل کے قریب پہنچے، پیچھے سے ایک عورت کی آواز آئی۔ "کالے کتو! ہم تمہارا بھرتا بنا دیں گے" روبی نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا "تم نکل جاؤ۔ وہ تمہیں پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں انہیں روکنے کی کوشش کروں گا۔"

لیکن اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی مینڈک موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہم پل میں داخل ہو چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ مینڈک کچھ کہتا روبی نے پھرتی سے اپنی موٹر سائیکل سے چھلانگ لگائی اور اسے مینڈک کی موٹر سائیکل کی طرف دھکیل دیا۔ اس کی موٹر سائیکل ایک دھماکے کے ساتھ سمنٹ کے ستون سے ٹکرائی۔ مینڈک کی محبوبہ نے زوردار چیخ ماری۔ مینڈک لہولہان ہو گیا۔

روبی مینڈک کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اس کا خوفناک چاقو مینڈک کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس کے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ میں اس حرامزادے کی گردن الگ کر دوں گا۔"

اس کی محبوبہ ہم سے التجا کر رہی تھی کہ ہم مینڈک کی جان بخش دیں۔ وہ پل کے درمیان میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور ادھر آنے والے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہنے لگی "خدا کے لئے واپس چلے جاؤ، ورنہ یہ مینڈک کی جان لے لیں گے۔"

روبی نے مجھ سے چیخ کر کہا

میں نے روبی سے کہا "اس کے گلے پر سے چاقو ہٹا لو۔ اسے بولنے دو۔" روبی نے چاقو ہٹا دیا۔ مینڈک خرخراتی ہوئی آواز میں زور سے چیخا "سور کی اولادو، واپس جاؤ۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں، واپس جاؤ۔ سلم تو بھی واپس چلا جا۔"

میں نے اور روبی نے ٹھوک پیٹ کر مینڈک کی موٹر سائیکل درست کر دی اور اسے اس کی محبوبہ کے ساتھ اس پر بٹھا دیا۔ مینڈک کی انگلیاں ہینڈل پر اچھی طرح جما دی گئیں تاکہ راستے میں موٹر سائیکل اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

ریسٹورنٹ میں گورے مالک کے ہاتھوں بے عزتی کرانے کے بعد میرے سینے میں جو درد ہو رہا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

میں نے اولمپک گولڈ میڈل دریا کی نذر کر دیا

ہم اپنے جسم اور ہاتھوں پر بکھرے ہوئے مینڈک اور اس

کے خون سے بھیگے صاف کرنے کے لئے دریا کی طرف بڑھ گیا۔ دریا کے ٹھنڈے پانی سے رگڑ رگڑ کر ہم نے خون کے دھبے صاف کئے۔ میرے اولمپک گولڈ میڈل پر بھی خون کا دھبہ لگ گیا تھا۔ اس کی سنہری پرت بھی ایک طرف سے اتر گئی تھی۔ میں نے اسے گلے سے اتار کر دھویا اور پل کے کٹہرے پر لٹکا دیا۔ جب سے میں نے یہ گولڈ میڈل جیتا تھا آج پہلی بار یہ مجھ سے الگ ہوا تھا۔ دراصل ایک طرح سے میں اس تمغے کی پوجا کرنے لگا تھا۔ لیکن اب میری نظر میں اس میڈل کی وقعت دھات کے ایک معمولی ٹکڑے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس میڈل کو حاصل کرنے کے بعد بھی میں گوروں کے ریسٹورنٹ میں جا کے پینے کا مجاز نہیں تھا۔ رونی نے میڈل واپس میری گردن میں ڈال دیا۔ وہ موٹر سائیکل اٹھانے کے لئے پل کی طرف بڑھا لیکن میں موٹر سائیکل کو نظر انداز کرتا ہوا پل کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ یہاں دریا بہت گہرا تھا۔ رونی بھانپ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔

وہ تیزی سے میری طرف دوڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچتا میں نے اپنی زندگی کا یہ قیمتی سرمایہ ہاتھ بڑھا کر دریا کے حوالے کر دیا۔ میں مڑا تو رونی میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ "میرے خدا! یہ تو نے کیا کیا!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ میں دنیا سے اپنی عزت اس لئے کرانا چاہتا تھا کہ مجھ میں کچھ صلاحیتیں تھیں —— میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر چیمپین بننا چاہتا تھا۔ میں گوروں سے عزت اور دولت کی بھیک نہیں لینا چاہتا تھا۔

اسلام کی روشنی سے میرا سینہ منور ہوگیا

اب میری زندگی کا ایک ہی مشن رہ گیا تھا۔ کالوں کو ان کے حقوق دلانا، حق اور انصاف کے لئے جنگ لڑنا۔ مجھے آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ دنیا میں صرف ایک مذہب ہے جو مکمل برابری کی تعلیم دیتا ہے جو بلا تفریق،

عالمی خطاب حاصل کرنے کے بعد

رنگ و نسل، حق و انصاف کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور وہ ہے
مذہب اسلام۔ میں سوتے جاگتے رب العزت کا شکریہ ادا کرتا
ہوں جس نے مجھے صحیح راہ دکھائی اور مجھے مذہب اسلام کی آغوش
میں پناہ لینے کا موقع دیا۔ اس سلسلے میں میں کالوں کے مذہبی
رہنما عالی جاہ محمد مرحوم (اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے) اور
اپنے دوست ہربرٹ محمد کا خاص طور سے شکر گزار ہوں۔ ہربرٹ
مجھے ایک فوٹوگرافر کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن اس نے میرے مستقبل
کی تصویر اس طرح بدل دی کہ اس میں بے پناہ تابناکی آگئی۔

عالمی خطاب حاصل کرنے کے لئے میری اور عالمی چیمپین سونی
لسٹن کی کشتی ہونے والی تھی میں اس وقت کا شدت سے انتظا

کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دن میں یہ اعزاز ضرور حاصل کروں گا۔ اس خواب کے حقیقت بننے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ اب میں شہرت اور دولت کی بلندی پر پہنچنے والا تھا اسی دن اچانک دروازہ کھلا، اور میرا استاد اینگلو ڈنڈی بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا "تم جانتے ہو، باہر کون کھڑا ہے؟" اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور قریب ہی کھڑے ہوئے مالکم ایکس کی طرف اشارہ کیا جو اس وقت امریکہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے نمائندے سمجھے جاتے تھے، اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "اگر اخبارات کو پتہ لگ گیا کہ تمہارا تعلق مالکم ایکس جیسے خطرناک مسلمانوں سے ہے تو تمہارا پورا کیریر تباہ ہو جائے گا۔

اینگلو واحد گورا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں لیکن اس وقت اسے بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں بھی اسلام قبول کر چکا ہوں جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور اپنے بھائی کیری کو فون کر کے بلایا۔ کیری نے ملاقات کی رپورٹ بل میکڈونلڈ کو پہنچائی۔ بل نے کشتی میں لاکھوں ڈالر کا سرمایہ لگایا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر مقابلہ رک سکتا تھا۔

مجھے بعد میں اس کے دفتر میں طلب کیا گیا۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم گھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا "کیا یہ سچ ہے کہ ایک ہفتے پہلے تم مینشن آف اسلام کی مسجد میں گئے تھے؟" "تم نے اخبار نویسوں سے کالے مسلمانوں کی تعریف کی۔؟"

"یہ سچ ہے" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

میکڈونالڈ کی آواز کرخت ہو گئی "کیا یہ سچ ہے کہ کیمپ میں مالکم ایکس تمہاری دعوت پر آیا ہے"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"جی ہاں"

مالکم ایکس کا اسلامی نام ملک شباز تھا۔ گورے اس سے بہت زیادہ خوف کھاتے تھے۔ یہ گورے سماج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بات کرتا تھا۔ ظاہر ہے اس کا میرے ساتھ نظر آنا گوروں کے لئے بڑی خطرناک بات تھی۔ میکڈونالڈ نے اپنی جرح جاری رکھی۔

"میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے کیمپ میں کیپٹن سموئیل نام کا ایک مسلمان ہے۔ تمہارے حفاظتی گارڈ ـــــ اور کھانا پکانے والی عورتیں بھی مسلمان ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟

"میرا جواب پھر "ہاں" تھا"

اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "اگر تم اپنے مستقبل کو بچانا چاہتے ہو تو تمہیں ان تمام مسلمانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا جنہوں نے تمہیں گھیر رکھا ہے ـــــ آج رات ہی تم ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اعلان کرو گے کہ تمہارا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ـــــ اگر تم ایسا کرو گے تب ہی ہم آگے بڑھیں گے"

میں نے بہت اطمینان سے سوال کیا "اور اگر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو؟"

اس نے آہستہ سے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا "اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو مقابلہ نہیں ہو گا۔ تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا"

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "میں چاہتا ہوں کہ یہ کشتی ہو لیکن اگر اس کشتی کے لئے کوئی میرے ایمان کا سودا کرنا چاہے تو میں اس کے لئے تیار نہیں۔ اپنے ایمان کی خاطر عالمی خطاب اور تابناک مستقبل تو کیا، میں اپنے آپ کو بھی قربان کر سکتا ہوں"

کیمپ کے دروازے کے باہر ہی میرا دوست براؤن کھڑا تھا اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا "اب کیا کرنا ہے؟"

"ہم واپس جا رہے ہیں" میں نے جواب دیا۔ "اب کوئی چیمپئن شپ کی کشتی نہیں ہو گی۔ سامان باندھو اور گھر واپس چلو"

لیکن کیری ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "رک جاؤ، رک جاؤ۔ ہم میکڈونلڈ سے بات کر رہے ہیں۔ ہمیں صرف ایک گھنٹے کی مہلت اور دے دو"

میں نے بس سے باہر نکلتے ہوئے کہا "میکڈونلڈ سے کہہ دو، مجھے اس کی کوئی شرط منظور نہیں ہے کشتی میری شرطوں پر ہو گی"

ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن کیری کے پاس سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے براؤن سے کہا "دیکھو روانگی کے لئے سب چیزیں تیار ہیں یا نہیں؟" وہ باہر گیا اور پھر دوڑتا ہوا آیا "تمہارے لئے فون ہے" میں نے ریسیور اٹھایا۔ کیری بول رہا تھا "کشتی مقررہ دن اور مقررہ وقت پر ہو گی۔ میکڈونلڈ تیار ہو گیا ہے"

اس کے بعد کی کہانی سے آپ سب واقف ہیں لوگوں کے اس یقین کے باوجود کہ لسٹن میرا بھرتا بنا دے گا، میں نے چھٹے راؤنڈ میں لسٹن کو چت کر کے عالمی خطاب جیت لیا۔ ★★

میں نے زندگی بھر اطمینان اور سکون کا سانس نہیں لیا۔ جدوجہد میری زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اسکول جانے سے آج تک میں نے دنیا کی انتہائی سرد و بعید گرم فضاؤں میں سانس لی ہے۔ میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اسکندریہ کے نزدیک بنی مور میرا آبائی شہر ہے۔ جس زمانے میں مجھے دنیا میں آنکھیں کھولنے کا اتفاق ہوا میرا ملک میرا وطن انتہائی کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ سرزمین وطن پر چاروں طرف مصائب کی حکمرانی تھی اور فضاؤں میں نکبت و افلاس کے بادل منڈلا رہے تھے [illegible] دوسری مصیبت میں مبتلا تھا۔ ایک جانب پاشاؤں کا استبداد اور دوسری طرف برطانوی سامراج کا استحصال بالجبر۔ مصر کی نوے فیصدی سے زیادہ آبادی فقر و فاقہ میں مبتلا تھی۔ دنیا کی سب سے اچھی، نفیس اور اعلیٰ کپاس پیدا کرنے والے اچھے لباس سے محروم تھے۔

میرے والد عبدالناصر حسین قصبہ بنی مور میں سب پوسٹ ماسٹر تھے۔ بہت دن بعد جب میں سن شعور کو پہنچا تو میری خالہ نے مجھ سے انتہائی شفقت اور محبت سے کہا کہ جب تم پیدا ہوئے تھے اس دن فہیمہ باجی کے چہرے پر

ملک نے مجھے پیراہن چیتھڑوں سے مسل کر رکھ دیا

مصر کے مرحوم صدر کی آپ بیتی

ایسی چمک دمک تھی جیسے وہ سورج کی روشنی میں نہا رہی ہوں۔ انہیں میری تاریخ ولادت یعنی ۱۵ جنوری اسی واقعہ کی وجہ سے اس وقت بھی یاد تھی جب انہوں نے مجھ سے مذکورہ بات کہی۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں اسکول جا رہا تھا اور مجھے کسی نے بتایا کہ میری والدہ فہیمہ خانم رحلت کر گئی ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ والدہ کی موت کا غم میں آج تک نہیں بھولا اگرچہ میرے ذہن اور دماغ میں ان کی ممتا کی پوری تصویر اتنی کم عمری میں نہیں ابھری تھی۔ وقتی طور پر میری خالہ کے ان الفاظ نے میرے دل میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں ہائر سکنڈری کے امتحان کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نہر سوئز کے علاقے میں برطانوی سامراج کی بربریت نے مصری باشندوں کی زندگی حرام کر دی ہے۔ ساری آمدنی پر یہ تاجر قوم غاصبانہ قبضہ کر چکی تھی۔ جو کچھ مصر کے خزانے میں آتا تھا وہ اگرچہ برائے نام ہی تھا لیکن قصر شاہی کے مصارف کے لئے چلا جاتا۔ اگرچہ مجھے میرے دوست شرمیلا اور سادہ لوح جوان سمجھتے تھے لیکن وطن کے درد اور ہم وطنوں کی مصیبتیں مجھ سے دیکھی نہیں گئیں اور میں نے سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنے ملک اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کی گئی کوششوں کے نتیجے میں مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ جیل جا کر میں نے محسوس کیا کہ یہ انسانوں کا مسکن نہیں بلکہ جانوروں کے اصطبل سے بھی بدتر مقام ہے۔ میں نے جیل کے قیدیوں میں شعور اور احساس کے ان جذبات کو جگانا شروع کیا جو کسی بھی زندہ قوم کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جیل کے اندر مشکلات کا سامنا میرے لئے ایک مشعل راہ کا کام کر گیا۔ سیاسی زندگی سے تائب ہونے کی بجائے میں سیاست کے میدان میں بقیہ زندگی کاٹنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

جیل سے باہر آ کر میں نے ملٹری کالج میں داخلہ کے لئے درخواست دی لیکن میری درخواست کو رد کر دیا گیا۔ وہ ایک یادگار انٹرویو تھا جو میں نے فوجی اکیڈیمی کی کونسل میں دیا تھا۔ برطانوی فوجی افسران بھی اس کونسل میں تھے اور ان میں سے چند اس انٹرویو میں بھی موجود تھے۔ مجھ سے جتنے سوالات کئے گئے میں نے ان کا صحیح جواب دیا۔ انٹرویو بورڈ نے مجھ سے یہ سوال بھی کیا کہ میں نے ۱۹۳۵ء کے مظاہروں میں عملی حصہ لیا تھا کہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ جھوٹ سے مجھے اتنی ہی نفرت تھی جتنی استغفار سے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بورڈ نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ میں صاحب جائداد ہوں کہ نہیں۔ میرے داخلے کے لئے کوئی بڑی شخصیت سفارش کر سکتی ہے کہ نہیں میرے خاندان میں کوئی فوج کا افسر ہوا بھی ہے کہ نہیں۔ ان تمام باتوں کا جواب میرے پاس نفی میں ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا بہرحال مجھ جیسے چھ فٹے صحت مند، توانا اور تندرست نوجوان کو محض اس لئے ملٹری کالج میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا کہ میں ۱۹۳۵ء میں مخالف برطانوی اور شہنشاہیت کے خلاف مظاہروں کے دوران جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔

اس انٹرویو کے انجام سے باخبر ہونے کے بعد میں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن جلد ہی چھٹی حس نے مجھے متنبہ کیا کہ لاقانونیت اور شہنشاہیت کے اس دور میں قانون کا ماہر ہو جانا ایک بے لوث، بے غرض اور طالب صداقت کے لئے بے معنی چیز ہے۔ اس طرح ضمیر کا بار بار خون کرنا پڑے گا اور میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا لیکن ضمیر کو قتل کرنے کی لکیریں میرے ہاتھوں میں ازل سے ہی نہیں تھیں۔

دو سال گزر گئے۔ اور ۱۹۳۸ء ہماری زندگی میں داخل ہو گیا۔ میں قانون کی تعلیم ایک سال قبل ترک کرنے کے بعد ملٹری کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ نیا سال میرے لئے نیا لباس لایا اور یہ لباس سکنڈ لیفٹننٹ کا یونی فارم تھا۔ وقت کا کیلنڈر ایک ایک کر کے ماہ و سال کے صفحات اس طرح اتارتا چلا جا رہا تھا جیسے سوکھے درخت سوکھے پتوں کو لچی شاخوں سے گرا دیتے ہیں۔ مصری عوام اب بھی زندگی کی کشمکش میں غلاموں کی طرح مبتلا تھے۔ نہ انہیں آزادی گفتار حاصل تھی نہ خوشحال زندگی۔ وہ ایک ایسی جیل کے قیدی تھے جو شب و روز محنت اور مشقت کرنے کے بعد شام کو روکھی سوکھی روٹی کھا کر کھردری زمین پر سو جاتے ہیں۔

آپ بیتی — جمال عبدالناصر

جنگ کے بادل ایک بار پھر یورپ کی فضاؤں پر چھاگئے

ایک جنگ اس وقت ہو رہی تھی جب میں پیدا ہوا تھا اور اب دوسری جنگ اس وقت شروع ہونے لگی جب مجھ میں جوانی کا احساس بیدار ہو رہا تھا۔ برطانوی حکمرانوں نے پورے مصر کو اپنے غلط وعدوں سے فریب دے کر اور سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ جنگ عظیم ثانی میں شامل کر لیا تھا۔ جرمنی کے ہٹلر اور اطالیہ کے مسولینی بھوکے شیروں کی طرح گرج رہے تھے۔ مصر ان کے لئے قربانی کا بکرا جیسا تھا۔ میں بھی اس جنگ میں شامل تھا کیپٹن جمال ناصر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے سوالی کی صورت میں جس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ جنگ میں فتح و نصرت کے بعد مصر کو خوشحالی، سرسبزی اور شادابی کے سرچشموں میں نہلا دیا جائے گا اور ان وعدوں کو ایفا کرنے کی بجائے انگریزوں نے فلسطین کی سرزمین کو یہودی غاصبوں کے حوالے کر کے ایک مستقل مصیبت کھڑی کر دی۔

مجھے انگریزوں کے وعدوں نے اتنا سرشار اور مگن کر دیا تھا کہ میں نے الامین کے مورچے کو فتح کرنے کے دوران موت اور زیست کو ایک ہی جیسا قرار دے دیا تھا۔ میرے سر پر اس مورچے کو سر کرنے کا سہرا باندھتے ہوئے مجھے میجر بنا دیا گیا تھا بظاہر یہ ایک بڑا فوجی اعزاز تھا کہ میرے شانوں پر ستاروں کی جگہ تاج لگا دیا گیا تھا۔ لیکن جب انگریز غاصبوں نے فلسطین کے مسئلہ پر اپنی بے ایمانی اور ذلت نفسی کا ثبوت دیا تو میں نے قاہرہ کی سڑکوں پر اپنا فوجی پیراہن تار تار کر کے اسے جوتوں سے مسل کر رکھ دیا۔ لوگ اس منظر سے بے حد متاثر ہوئے اور ان میں برطانوی سامراج سے نفرت و حقارت کے جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔

اس بے ایمانی اور دغابازی نے میرے قدموں کا رخ اپنے آبائی شہر کی بجائے فلسطین کے میدان کارزار کی جانب پھیر دیا۔ یہاں بھی مجھے اپنی زندگی کو قربان کر دینے کا شوق جنوں کی طرح سوار تھا۔ مجھے ذلت اور پستی کی زندگی سے نفرت تھی۔ مجھے انصاف کا خون ہوتے ہوئے دیکھنے کی کبھی بھی تاب اور ہمت نہیں ہوئی۔ صیہونی درندوں سے

مورچہ لیتے ہوئے میں نے کسی قسم کا پس و پیش نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میرے داہنے شانے میں کسی اسرائیلی سپاہی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی پیوست ہو گئی۔ لمحہ بھر کے لئے معلوم ہوا کہ میرا سارا جسم آگ میں جھلس گیا ہو لیکن میں نے اس گولی کو اپنے ہی ہاتھوں سے نوچ کر حقارت کے ساتھ گندگی اور غلاظت سمجھ کر پھینک دیا۔ عرب پرستی کا جنون جذبہ ایمانی کی طرح مجھ پر سوار تھا جو مجھے اپنی جان کی قربانی دینے پر اکسا رہا تھا۔ لیکن اس گولی نے بہر حال میرے اعصاب پر اتنا اثر کیا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے زبردستی ہسپتال میں داخل کر دیا۔

فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ قبضے سے نجات دلانے کے دوران عرب افواج نے قطعی طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کے پاس جدید ترین آلات حرب اور دفاعی اور حملہ آوری کے ہتھیاروں کی قلت تھی۔ اور اس نے مصر کی افواج نے ایک ایسی جماعت کی بنیاد رکھی جسے "آزاد افسران" کا نام دیا گیا۔ ہسپتال میں علاج کے دوران میں

عربوں کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچتا رہتا تھا اور مصری غریب عوام اور مفلس کسانوں کی زبوں حالی بھی میری نیندیں حرام کر چکی تھی۔ نہر سوئز کے علاقے میں برطانوی سامراج کی من مانیاں کینسر کی طرح پھیل چکی تھیں۔ اور اس کینسر کا آپریشن کرنے کے لئے آزاد افسران کی انقلابی کونسل نے جنرل محمد نجیب کی سرکردگی میں شاہ فاروق کو معزول کر کے ۱۹۵۲ء میں اکیس توپوں کی سلامی کے ساتھ انہیں بحیرہ روم کے حسین ترین جزیرے کاپری کی جانب روانہ کر دیا۔

شاہ فاروق نے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مصر کے غریب عوام جب روٹی کپڑے اور مکان کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے تو شاہ فاروق کبھی قصر شاہی اور کبھی دنیا کے عظیم ترین اور حسین ترین ہوٹلوں میں لب و رخسار اور زلف و مژگاں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ خود انہیں احساس تھا کہ کسی روز وہ قصر شاہی سے باہر کر دیئے جائیں گے ان کے سر پر رکھا ہوا تاج کسی مردے کی کھوپڑی کی طرح راہ گیروں کے پیروں تلے روندا جائے گا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف دو بادشاہ رہیں گے ایک برطانیہ میں اور دوسرا تاش کے پتوں پر۔ اور شاید اسی لئے وہ زندگی کی تمام مسرتیں ایک ہی دن میں لوٹ لینے کی کوشش میں ہمیشہ مصروف رہے۔ بہر حال ان کی عیاشانہ زندگی کا جو رد عمل ہوا وہ ہر جابر اور غاصب حکمراں کے لئے ایک ناقابل فراموش سبق ہے۔ یہ مکافات عمل کی دنیا ہے۔ برائی اور بھلائی کا نتیجہ ہمیشہ اور ہر شخص کو موت سے قبل اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔

دو سال اور گزر گئے لیکن جنرل نجیب بھی اس درد کی دوا تلاش نہیں کر سکے جس سے بیمار مصر کو صحت یابی کی امید ہو سکتی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں انہیں سبکدوش کر کے مصری عوام نے مجھے وزیر اعظم کا عہدہ سپرد کر دیا۔ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد میں نے قصر القبہ میں قیام کی بجائے قاہرہ کے مضافات میں ایک چھوٹے سے جدید طرز کے بنے ہوئے مکان میں اپنے پانچوں بچوں اور بیوی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہیں دی کہ عوام لباس و مکان کی آسائشوں سے محروم رہیں اور میں عیش و عشرت کے ساتھ محلوں میں راحت و سکون کی زندگی گزاروں۔ میری دونوں لڑکیاں ہدیٰ اور مونا۔ میری بیوی طحیہ اور تینوں لڑکوں، خالد، عبدالحکیم اور عبدالکریم نے بھی محلوں کی زندگی کو ذرہ برابر التفات نہیں بخشا۔

کچھ دن بعد ۱۹۵۶ء ہی میں مجھے ننانوے فیصدی ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ سرزمین مصر کی جمہوری حکومت کا صدر چن لیا گیا۔ شاید یہ اعزاز کسی بھی جمہوری انتخاب میں کسی فرد کو کبھی بھی میسر نہیں آیا۔ کچھ لوگوں نے مجھے کمیونسٹ قرار دیا کیونکہ میں نے مصر کو ایک ایسا دستور دیا جو عوام کو اعلیٰ قدروں کا تاجدار بنانے کا پیش خیمہ تھا۔ میں یہ واضح کر دوں کہ نہ میں کمیونسٹ ہوں اور نہ روسی کمیونزم کا قائل ہوں۔ مصری سوشلزم اور روسی کمیونزم میں بڑا فرق ہے۔ میرا مقصد مصر کے عوام کی خوشحالی اور عرب اتحاد کے سوا کچھ اور نہیں۔

نہر سوئز اور اس کے مسائل میری باشعور زندگی کے آغاز سے ہی میری توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اسی ذیل میں مجھے جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ اب جبکہ میں مصر کی تمام طاقتوں کا مرکز بن گیا تو میں نے اسی سال یعنی ۱۹۵۶ء میں نہر سوئز کو غیر ملکی قبضہ و اقتدار سے نکال کر عوام کی آغوش میں ڈال دیا۔ اس واقعہ نے ساری دنیا میں ہلچل مچا دی۔ انصاف پسند قوتوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ جواہر لعل نہرو اور مارشل ٹیٹو نے خوشی کے نعرے لگائے مگر امریکہ کی شہ پر فرانس، برطانیہ اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کر کے اس فیصلے کو واپس لینے پر مجبور کیا لیکن میں پہاڑوں کی طرح اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ جنگ کے دوران مصری عوام کو انتہائی مصائب اور دکھوں کے طوفانوں اور سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود وہ بھی چٹانوں کی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ اور چند دنوں بعد ہی حملہ آوروں کے سپاہی اپنے اپنے ملکوں کی فوجی بارکوں میں شرم اور ذلت کے باعث منہ چھپانے کے لئے مصر کے مورچے خالی کر کے چلے گئے۔

نہر سوئز کو قومیا لینے کا عمل کسی صورت میں بھی بین الاقوامی جرم نہیں تھا۔ ہم نے اپنی ہی زمین پر غیر ملکی شراکت داری کو ان کی رقوم لوٹا کر آسے اپنی نگرانی میں لیا تھا۔ اس اقدام سے مصر کی اقتصادی مشکلات سے بڑی حد تک نجات ملی۔

اسوان بند کی تعمیر کا منصوبہ اگرچہ سو فیصدی میری دماغی اختراع نہیں تھی پھر بھی اس کی صورت گری میں میرے ذہن کو بڑا دخل تھا۔ امریکہ اور دوسری سامراجی طاقتوں نے اس منصوبے کے لئے قرض کی صورت میں مالی اور مادی امداد فراہم کرنے کے باوجود بیوفائی کا ثبوت دیا۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں روسی حکومت مصر کی مدد کے لئے تیار ہوگئی۔ اس بند کی تعمیر نے مصر کا پندرہ لاکھ ایکڑ رقبہ لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز و شاداب فصلوں میں بدل دیا لاکھوں گھروں میں بجلی کے چراغ جگمگا اٹھے۔

سوڈان کو آزاد کرنے اور اسے ایک خود مختار مملکت بننے کے لئے میں نے جو قدم اٹھایا مجھے خوشی ہے کہ مصر کی کسی بھی سیاسی جماعت نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اور اس طرح بغیر کسی تنازعہ کے ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ پھر میں نے شام اور مصر کے وفاق کے لئے جد و جہد کی لیکن یہ خواب کچھ دن کے بعد خواب بن کر ہی رہ گیا۔ مجھے زندگی میں اتنا عظیم صدمہ کبھی بھی نہیں ہوا جتنا اس کی شکستگی کی خبر سن کر ہوا۔

مصر کا قافلہ میری قیادت میں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ خوشحالی آزادی گفتار اور معاشی بے فکری کے چراغ گھر گھر روشن ہونے گئے جو مغربی سامراج کو گوارہ نہیں تھے اسی وجہ سے اچانک بغیر کسی الٹیمیٹم کے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کو اسرائیلی درندوں نے میری سرزمین پر حملہ کر کے بے خبری کے عالم میں ساری فضائی طاقت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ قصور اگرچہ میرا نہیں تھا لیکن میں نے قوم کے سامنے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا لیکن عوام اس کے خلاف ہوگئے اور مجھے مجبوراً اپنا استعفیٰ واپس لینا پڑا۔

مصر اور ہندوستان کی دوستی کی تصویر
ناصر اور جواہر لال نہرو

دوسرا عظیم صدمہ جسے شاید میں سہہ نہ سکوں ستمبر ۱۹۷۰ء میں اردن میں اس خون کی ہولی سے ہوا جو خود عربوں نے سرزمین عرب پر کھیلی ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء کو میں نے عرب چوٹی کانفرنس بلائی ہے تاکہ اردن میں خانہ جنگی کا اختتام ہو۔ پانچ دن پانچ راتیں گزر گئی ہیں لیکن مجھے نیند نہیں آئی ہے۔

(صدر موصوف واقعی اس صدمے کی تاب نہ لا سکے اور ۲۸ اور ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب کو عرب اتحاد کی حسرت لئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے) (ادارہ)

میری پیدائش ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو تہران کے ایک قدیم محلے کے نہایت معمولی سے مکان میں ہوئی۔ اس وقت شہر کے چاروں طرف فصیل تھی جس کو خشک کھائی نے گھیر رکھا تھا۔ آمد و رفت شہر کے دروازوں سے ہوتی تھی جو رات کو چوروں اور لٹیروں کے ڈر سے بند کر دیے جاتے تھے۔ ان دروازوں کو میرے والد کی رہنمائی میں شہر کو صاف ستھرا اور جدید طرز پر آباد کرنے کے پیش نظر گروا دیا گیا۔

تھوڑے عرصے بعد گھر والوں نے چونکہ دوسرا مکان لے لیا تھا، اس لیے پہلے گھر کی یادداشتیں میرے ذہن میں صاف محفوظ نہ رہ سکیں۔ بچپن کی جو بات یاد رہ گئی ہے وہ البرز کے پہاڑی سلسلے کا دلفریب منظر ہے جس نے پورے شہر تہران کو گھیر رکھا ہے اور مجھ پر ہمیشہ الہام کی سی کیفیت طاری کی ہے۔

اس کے علاوہ بچپن کی یادداشتوں میں جو چیز میرے

ذہن میں محفوظ ہے وہ اپنے والد کا بارعب چہرہ اور بلند قد ہے۔

بچپن میں میرا جسم کافی کمزور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں حمام میں پھسل کر زمین پر گر پڑا اور میرا سر بڑی طرح زمین سے جا ٹکرایا۔ اس وقت ہاشم میاں کی (جو ہمارے بڑے وفادار ملازم تھے) وحشت اور اضطراب نے جو میرے دل پر اثر کیا وہ چوٹ کے شدید درد سے زیادہ تھا

میرے بچپن کا سب سے زیادہ دلچسپ یادگاری دن وہ ہے جب میرے والد نے بڑی شان و شوکت سے رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کر کے ایرانی شہنشاہیت کا تاج سر پر رکھا اور میرے ولی عہد ہونے کا اعلان کیا۔ تاج پوشی کی عظیم الشان اور بے نظیر رسومات گلستان محل میں تخت طاؤس پر قدیم روایت کے مطابق ادا کی گئیں اس وقت میری عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بچپن کے کھیلوں میں جو کھیل مجھے بہت زیادہ پسند تھا وہ چور سپاہی تھا۔ اس کھیل کے لیے میں اپنے ساتھیوں کو دو ٹولیوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ محل میں جتنے بھی تہہ خانے اور جو نیچے بنے ہوئے تھے ان میں ہم گھسے پھرتے تھے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت چوروں کو پکڑنے کا ہمارا طریقہ بہت ہی ناقص اور ابتدائی تھا۔ جب میں سن بلوغ کو پہنچا تو گھوڑے کی سواری اور شکار کا شوق ہوا۔ نئے کھیلوں میں فٹ بال اور راکنگ مجھے بہت پسند تھے۔

ساری دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ بیٹے کی اخلاقی اور ذہنی ترقی میں باپ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ میرا معاملہ بھی اس اصول سے الگ نہیں ہے اور میری اخلاقی ترقی میں سب سے زیادہ اثر میرے والد کی شخصیت کا ہی رہا ہے۔

جب میں ولی عہد تھا تو میرے والد ہر روز میرے ساتھ ایک دو گھنٹے گزارتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ میری طرف سے پوری طرح باخبر رہیں اور ان کی مانند میں بھی ملک کے حالات سے آگاہ رہوں۔ سادگی ان

دورِ ولیعہدی کی ایک تصویر
اس وقت میری عمر چھ سال تھی

کی سب سے بڑی خوبی تھی اور ظاہرہ شان و شوکت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ میرے والد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے ہر کام میں باقاعدگی اور نظم و ترتیب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ جس وقت میں پڑھنے کی غرض سے یورپ جا رہا تھا تو انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ فارسی کا جو بھی سبق میں اپنے معلم سے پڑھوں اس کی اطلاع ہر ہفتے باقاعدگی کے ساتھ انہیں بھیجوں تاکہ وہ اس سے باخبر رہیں کہ لکھائی پڑھائی کے میدان میں، میں نے کتنی ترقی کی ہے؟ اتفاق سے ایک دفعہ ڈاک کے پہنچنے میں دیر ہو گئی، اس پر میرے والد اتنے پریشان ہوئے کہ انہوں نے فوراً میرے معلم کو تار دیا اور اس تاخیر کی اس کو سزا دی۔

تہران میں اپنے والد کے ہمراہ ایک فوجی جوان کی حیثیت سے

میرے والد چونکہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ایران میں مغربی طرزِ معاشرت کو اپنائیں گے اس لیے جب مجھے یورپ بھیجا گیا تو کسی کو اس پر تعجب نہیں ہوا۔

میں مئی ۱۹۳۱ء میں ابتدائی فوجی مدرسہ تہران سے فارغ التحصیل ہوا اور اسی سال ماہ ستمبر میں میں سوئٹزرلینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ چار سال تک میں سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہا۔ والد صاحب کی شخصیت کے بعد جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہاں کا جمہوری نظام تھا۔ یہاں میرا جسم اس تیزی سے بڑھنا شروع ہوا کہ دوسروں کو تو کیا خود مجھے بھی حیرت ہوتی تھی۔ میں نے پہلے بھی یہ اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں، میں جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن یہاں تن و توش نے وہ ترقی کی کہ ہاتھ پیروں میں بھرپور جان آگئی۔

۱۹۳۶ء کے موسمِ بہار کے شروع ہوتے ہی ڈپلوما حاصل کیا اور گھر جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میرے رشتے دار جو پہلوی بندرگاہ پر رخصت کرنے آئے تھے اب ایک ایسے شخص کو لینے آ رہے تھے جو چند سال میں اس قدر بدل چکا تھا کہ پہلی نظر میں تو اس کے لیے بھی پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ بندرگاہ پہلوی کی مجموعی طور پر حالت بہتر ہو گئی ہے۔ ایک ایرانی گاؤں کو کسی یورپی شہر میں بدل کر رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ پورے ملک میں جو آبادکاری اور ترقیات کا کام ہو رہا ہے بندرگاہ پہلوی تو اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اور رشتہ داروں سے ملنے کے بعد میں تہران کے ملٹری کالج میں داخل ہو گیا کیونکہ میرے والد چاہتے تھے کہ میں اپنی تعلیم اسی کالج میں ختم کروں اور ان کی موجودگی میں شہنشاہیت کے رموز بھی سیکھ لوں۔ ان کی یہ خواہش مجھے پسند آئی، چنانچہ اس پر میں نے عمل درآمد شروع کر دیا۔

فوجی خدمات کے علاوہ والد کی خدمت میں حاضر ہونا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ روزانہ کی پوری ملاقات میں حالاتِ حاضرہ، ملک کی داخلی اور خارجی سیاست پر تذکرہ رہتا۔ میرے والد جب ایران کے مختلف حصوں میں سفر کے لیے جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ رہتا۔

اگرچہ اس وقت میری عمر صرف انیس سال تھی لیکن کبھی کبھی مختلف مسائل پر میں اپنے نظریات بہت صاف اور کھلے الفاظ میں ان کے سامنے پیش کر دیتا... سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ میری رائے کو بڑے غور اور متانت سے سنتے اور میری تجاویز کو بہت کم رد کرتے تھے

۱۹۴۹ء میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا

مثال کے طور پر میرے بار بار سفارش کرنے پر بہت سے سیاسی قیدی رہا ہوئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر مصدق بھی تھا جس نے اپنے عہدِ وزارت میں ملک کو کنگال کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور قریب تھا کہ جس خاندان کی حکومت میرے والد نے قائم کی تھی اس کا تختہ الٹ دے۔ اگرچہ میں نے مصدق کو موت کے منہ سے چھڑایا اور اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا لیکن ساری دنیا نے دیکھا کہ اس نے مجھے اس کا کیا صلہ دیا اور میرے احسان کا کیا بدلہ دیا۔

۱۹۴۹ء میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ جیسے ہی میرے ہموطنوں کو اس بات کا علم ہوا وہ ایک دل اور ایک زبان ہو کر میری امداد کے لیے کمربستہ ہو گئے اور اس کے بعد "تودہ پارٹی" کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ میں نے اس رہائی کا کیسا غلط فائدہ اٹھایا۔

چند سال پہلے ہی ڈاکٹر مصدق نامی شخص۔ انگریزی اور امریکی اخبارات کا سب سے بڑا موضوع بحث بنا ہوا تھا اور یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اسی بنا پر ملک کے باہر بعض لوگوں نے اس کو ایرانیوں کے کردار کا نمونہ سمجھ لیا لیکن پڑھنے والوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں ہرگز وہ خصوصیات نہیں تھیں جن کی وجہ سے اس کو ایرانی قوم کا نمائندہ یا نمونہ کہا جا سکے۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرے والد نے مصدق کو ۱۹۴۰ء میں قید کر دیا تھا اور یہ شخص میری سفارش پر رہا ہوا تھا۔ اس نے جیسی احسان فراموشی کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی شخصیت کا نزدیک سے مطالعہ کا موقع مجھے اس وقت ملا جب وہ وزیراعظم بن چکا تھا۔ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ کاغذ پر بڑا شریف آدمی نظر آتا تھا۔ اپریل ۱۹۵۱ء سے جولائی ۱۹۵۳ء تک وہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہا اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس کے اخلاق و عادات کا لوگوں کو علم ہوا۔ اس کی عام معلومات بہت محدود تھیں جس پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اگرچہ اس کی تعلیم یورپ میں ہوئی تھی لیکن اس کو دوسرے ممالک کے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ اس کی پالیسی نفی پر مبنی تھی اور اسے ہٹ دھرمی کی عادت تھی۔ مصدق

گلستان محل کا ...
حصہ جہاں تخت
طاؤس رکھا ہے

جن اصولوں کا پرچار کرتا تھا ان کا نام اس نے "منفی توازن" رکھا تھا۔

ایران میں ریلوے لائن کا نہ بچھانا اس کی منفی پالیسی کی ایک روشن مثال ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اس نے میرے سامنے بڑی گستاخی سے کہا تھا کہ میرے والد نے یہ کام یعنی ریلوے لائن بچھا کر ملک کے ساتھ خیانت کی ہے۔

مصدق کی منفی پسندی کا اثر ملک کے دفاعی اور اندرونی امن و تحفظ جیسے مسائل پر بھی پڑا ہے۔

جس وقت مصدق وزیر اعظم تھا تو ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کے دوران "تودہ پارٹی" کے لوگوں اور غنڈوں نے پایۂ تخت اور دوسرے شہروں میں فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا۔ مصدق نے ان کی روک تھام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کی کوتاہیوں کی وجہ سے فسادات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔

اس کے زبردست حامیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کی اس حرکت کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ مصدق یا تو جان بوجھ کر یا انجانے میں ملک کو کمیونزم کی طرف لے جا رہا ہے۔

مصدق کی غیر منطقی طبیعت نے اس کو نہایت عجیب و غریب کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے پہلی بار اس کی اس فطرت کا علم اس وقت ہوا جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور اتحادی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ اتحادی فوجوں کے ایران ہمارے انتخابات اور نمائندوں کے تقرر میں بے جا دخل اندازی کر رہے تھے اس وجہ سے میں سخت پریشان اور دل برداشتہ تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس شرمناک رویے کی روک تھام کے لیے مصدق سے مشورہ کر لوں۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اپنا خیال اس پر ظاہر کیا کہ اس کو آئین کے بنیادی قوانین کے مطابق وزیر اعظم مقرر کر دوں اور کہوں کہ اپنی کابینہ کی تشکیل کرے اور نئے انتخابات اس ڈھنگ سے کرائے کہ اس میں غیر ممالک کا ہاتھ بالکل نہ ہو۔

مصدق نے جواب دیا کہ وہ دو شرطوں پر اس ذمہ داری کو قبول کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ دو شرطیں کیا ہیں تو اس نے جواب دیا کہ سب سے پہلے تو ان کی حفاظت کے لیے مسلح پہرے دار مقرر کیے جائیں۔ میں اس کی اس شرط کو فوراً مان گیا۔ میں نے دوسری شرط پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کام کی تکمیل کے لیے انگریزوں کی رضامندی ضروری ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا انگریزوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ان کو کون پوچھتا ہے۔ اس ملک میں تو صرف انگریز ہی ہیں جو ہر کام کا فیصلہ کرتے ہیں۔"

چنانچہ میں نے اس سے جرح شروع کی اور کہا کہ میرے والد تو کبھی کوئی کام کرنے کے لیے انگریزوں سے اس کی منظوری نہیں لیتے تھے لیکن مصدق پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ ابھی آپ جوان ہیں اور سیاسی مسائل کا تجربہ کم ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی

گلستان محل میں

اعلیٰحضرت شہنشاہ

[illegible] کی تاجپوشی

اس بات پر بضد رہا کہ انگریزوں کی موافقت کے بعد وہ مجھ سے تعاون کر سکتا ہے۔

مصدق کافی عرصے تک پارلیمنٹ کا نمائندہ رہا وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ گویا وہ جمہوریت کے اصول اکثریت کے نمائندوں کی حکومت اور نظم و نسق کا سختی سے پابند ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ اس کو مارشل لا سے سخت نفرت ہے اور وہ آزادانہ انتخابات اور آزادیٔ تحریر کا زبردست حامی ہے۔

اسی مصدق نے چند ماہ کے عرصے میں مجلس قانون ساز اور عدالتِ عالیہ کو ختم کرا دیا۔ قومی اسمبلی کو ختم کرنے کے لیے لوگوں کے جذبات کو ابھارا۔ اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ آزاد انتخابات کا خاتمہ کر دیا۔ مارشل لا کی مدت بڑھا دی۔ آئین کے اعتبار سے جو مجھے اختیارات دیے گئے تھے ان کو کم کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ پچاس سال آئین کو جو بڑی جد وجہد تیار کیا گیا تھا پامال کر کے رکھ دیا اور یہ سب اقدامات صرف اس لیے گئے تھے کہ ملک کے سربراہ کو ہٹا کر خود مطلق العنان حکمران بن جائے مگر اس کی یہ آرزو بر نہ آ سکی۔

فروری ۱۹۵۳ء میں مصدق نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں۔ میں نے اس خیال کے پیش نظر کہ وہ جن مقاصد کو پورا کرنا چاہتا ہے ان پر آزادی سے عمل کر سکے اور میں اس کے مکر و فریب سے دور رہوں، میں نے فوراً ہی اس کی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ساری بات راز ہی میں رہے اور یہ طے پایا کہ وہ فاطمی کو جو اس وقت وزیر خارجہ تھا شخصاً یہ حکم دے گا کہ میری ملکہ اور دیگر رشتے داروں کے پاسپورٹ اور تمام ضروری کاغذات جلد تیار کرا دے۔

سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ مصدق نے اپنے مخصوص درشت لہجے میں مجھے مشورہ دیا کہ میں ہوائی جہاز سے سفر نہ کروں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے اس ارادے سے باز رکھیں گے اور ایک جم غفیر ہوائی اڈے پر جمع ہو جائے گا اور میرا ہوائی جہاز پرواز نہ کر سکے گا۔

اگرچہ اس نے یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ میں عراق اور بیروت کا سفر اس طرح طے کروں کہ اس کا علم کسی کو نہ ہو۔ میں نے اس کی یہ تجویز بھی مان لی۔ لیکن یہ راز فاش ہو گیا۔ چنانچہ لوگ کثیر تعداد میں جمع ہونے لگے اور

جگہ جگہ مظاہرے کرتے اپنی شاہ دوستی اور وفاداری کا ثبوت دینے لگے۔ ان کے آگے مجھے جھکنا پڑا اور وقتی طور پر ترکِ وطن کا خیال چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کے بعد تودہ پارٹی نے مصدق کے ساتھیوں سے مل کر شہنشاہیت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کیا۔

اب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ایران سے باہر جانے میں عجلت کی اور یہ قدم اٹھا کر سخت غلطی کی لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ سفر میرے حق میں نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔

۱۹۵۳ء کے درمیانی عرصے میں ایرانی قوم کے فکر و نظر میں ایک نمایاں تبدیلی آئی اور پوری قوم مصدق سے بددل ہو گئی یہاں تک کہ اس کے رفیقوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ لوگ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ مصدق نے جو غیر ملکیوں کے خلاف رویہ اختیار کیا ہے اس میں جانب داری آ گئی ہے۔ مصدق کا پارلیمنٹ کو ختم کر دینے کا ارادہ بھی عوام کے خیالات کو نہ دبا سکا۔ اخبار کے مدیر ڈاکٹر مصدق کو پلے ہوئے غنڈوں اور تودہ پارٹی کے لوگوں سے قطعی خوف زدہ نہ ہوئے اور انہوں نے مصدق کے ارادوں کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

بہت سے علمائے دین، یونی ورسٹی کے طالب علم اور تاجر جو کبھی مصدق کی حمایت کرتے تھے اب اس سے نفرت کرنے لگے اور اس کی مخالفت پر اتر آئے لیکن یہ بات معلوم تھی کہ اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے طاقت اور مل کر قدم بڑھانے کی ضرورت تھی۔

۱۳ اگست ۱۹۵۳ء کو میں نے ایک فرمان پر دستخط کیے جس کی رو سے مصدق کو وزیراعظم کے عہدے سے معزول کر کے زاہدی کو اس کی جگہ مقرر کر دیا گیا۔

ایران میں بلکہ ساری دنیا میں حکومت سے بغاوت کرنے والوں کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بڑھاپے کے پیشِ نظر اس کو پھانسی کی سزا نہیں دی گئی بلکہ تین سال کے لیے نظر بند کر دیا گیا اور میری مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر موت کے پنجے سے بچ گیا۔

اس کو ۱۹۵۶ء میں جیل سے رہائی ہوئی! کیونکہ وہ دولت مند آدمی ہے اور تہران کے نزدیک اس کی زمین و جائداد کافی ہے اس لیے وہ اپنی جاگیر میں منتقل ہو گیا اور اس وقت جب یہ کتاب چھپنے کے لیے بھیجی جا رہی ہے وہ وہیں آرام و سکون کی زندگی اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ گزار رہا ہے۔ ■■

آپ بیتی نمبر

عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن
اسرائیل کے سابق وزیر دفاع موشے دایان کی آپ بیتی

میرے نام، موشے کی پیدائش، دگھ میں ہوئی، یہ دجانیہ کے زیتون کے باغ میں ایک تنہا مقبرے پر کندہ ہے. جہاں بحیرۂ گلیلی کے جنوبی سرے سے دریائے اردن بہتا ہے. یہ نام اس علاقے میں آباد ہونے والے یہودیوں کی سب سے پہلی قبر کی یاد دلاتا ہے. موشے بارسکی کی قبر جو روس سے ترکِ وطن کرکے یہاں آیا تھا.

عرب کیسے ہارے۔ اسرائیل کیونکر جیتا

میں ۴ مئی ۱۹۱۵ء کو دجانیہ میں پیدا ہوا۔ میرا نام موشے رکھا گیا۔ یہ علاقہ ان دنوں فلسطین کہلاتا تھا اور حکومت ترکیہ کے قلمرو میں شامل تھا۔ میرے والدین روس سے رضاکارانہ طور پر ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ دونوں نہایت تخیل پرست واقع ہوئے تھے۔

میرے دادا کے گھر میں مذہب کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ ان کی لائبریری میں مقدس کتابوں کے ساتھ ساتھ صیہونی کتابچے اور جدید عبرانی زبان میں نکلنے والا رسالا "عطیٰ فراغ" بھی ہوتا تھا۔ میرے باپ کے ہاں صیہونی مزدوروں کا ترجمان "دی ینگ ورکر" آیا کرتا جس میں سرزمین اسرائیل کے متعلق تفصیلات شائع ہوتی تھیں۔

میرے باپ نے اس سرزمین پر کام کرنے کا چیلنج قبول کر لیا۔ اس زمانے میں یہ علاقہ گرمی، مکھیوں، ملیریا کے مچھروں، غربت، گندگی اور دیگر ہر قسم کی خرابیوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ لیکن اس نے ان مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

دجانیہ میں آباد ہونے والے یہودیوں نے ایک نئے سماج کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے ملکی امدادِ باہمی کی بنیاد پر کام کرنا شروع کیا۔ نجی ملکیت کا کوئی سوال نہ تھا۔ سب لوگ کام کرتے تھے اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اشیاء لیتے تھے۔

میری پیدائش کے بعد کے ابتدائی چند سال جنگ و جدل کے سال تھے۔ ترکی نے اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور فلسطین میں عام لاقانونیت ہو چکی تھی۔ ترک حکمرانوں کو یہودی آبادی کی وفاداری پر اعتماد نہ تھا اور انہوں نے بہت سے یہودی رہنماؤں کو مصر میں جلا وطن کر کے بھیج دیا تھا۔

ابھی میں ایک سال کا تھا کہ مجھے آنکھوں کے ککروں کی بیماری ہو گئی۔ جو مشرقِ وسطیٰ کی متعدی بیماری ہے۔ مجھ سے یہ بیماری میری ماں کو بھی ہو گئی۔

اس بیماری سے نجات ہمیں کئی سال بعد ۱۹۱۹ء میں ملی۔ اس اثنا میں مشرقی یورپ سے نئے یہودی آباد کار آنے لگے اور ہمیں ایک اور بستی "دجانیہ ب" بسانا پڑی۔ اب ہم نے اپنے طرزِ زندگی میں کچھ تبدیلی پیدا کی اور مکمل اشتراکیت چھوڑ کر ایک مختلف قسم کی "کوآپریٹو فارمنگ" شروع کر دی۔ ہر خاندان نے اپنے لیے الگ مکان بنا کر رہنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ "شلاؤ" چلایا اور اس انداز پر بسنے والی پہلی بستی جزریل کی وادی میں نہلل تھی۔ ۱۹۲۱ء میں ہم اس بستی میں منتقل ہو گئے جہاں ہم نے اپنے لیے ایک اچھا سا مکان بنایا۔

وہیں میں نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا مکتبی درس کے علاوہ میں ہائیکنگ وغیرہ بھی کیا کرتا تھا۔ یہیں میں نے ہمسایہ دیہات کے عرب لڑکوں سے میل جول سیکھا۔ ورش نامی ایک ہندو لڑکے سے میری گہری دوستی قائم ہو گئی تھی۔

پاسبانی

۱۹۲۹ء میں جب میری عمر ۱۴ سال تھی، مجھے ایک خفیہ تنظیم "ہگانہ" کا رکن بنا لیا گیا۔ جو فلسطین میں آباد یہودیوں کی دفاعی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کے پاس اسلحہ اور تربیت یافتہ ارکان تھے۔ یہ ہتھیار بستی میں چھپا کر رکھے جاتے تھے مجھے بندوق چلانے کی پہلے ہی سے مشق تھی۔ کیونکہ میرے باپ کے پاس ایک بغیر لائسنس کی کاربائن تھی جسے مویشی خانے میں چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ اس خفیہ تنظیم کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آئے دن ہمسایہ عرب باشندے یہودی بستیوں پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہمارے ایک ہمسائے کے گھر میں بم پھینکا گیا۔ اس کا آٹھ سالہ لڑکا ہلاک ہو گیا اور دوسرے دن ہی اس کا باپ زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ حملہ آوروں کا تعلق مسلمانوں کی ایک خفیہ مذہبی تنظیم "قاسمیہ" سے تھا اور حملہ واضح طور پر سیاسی مقاصد اور پس منظر رکھتا تھا۔ اس ایک حملے نے واضح کر دیا کہ عرب اور یہودی کبھی اچھے ہمسایوں کی طرح مل کر نہیں رہ سکتے۔

اس زمانے میں مجھے اپنی ایک ہم مکتب لڑکی "جودث" سے محبت ہوگئی۔ ہم مل کو یہودی رہنماؤں خصوصاً بن گوریان کی تحریروں کو دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ میرے والدین کو جودث کے ساتھ میرے تعلقات کچھ زیادہ پسند نہ تھے۔ اس لیے ہمارے درمیان انس و محبت کے روابط جلد ختم ہوگئے۔

انہیں ایام میں ہم ایک بار پیدل گھومنے باہر نکل گئے۔ رات کو ایک وادی میں پہنچے اور دن بھر کے سفر سے تھکے ہونے کے باعث سو گئے۔ علی الصبح ایک عرب گڈریا ہمارے قریب سے گزرا۔ ہم نے اس سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ وہ ہمیں ایک قریبی خیمہ گاہ میں لے گیا۔ ہمیں بدوؤں کے سردار کے خیمے میں لے جایا گیا جہاں ہماری زبردست آؤ بھگت ہوئی۔ کھانا کھلانے کے بعد سردار نے ہمیں چند آدمی اور ایک گدھا دیا تاکہ وہ صحیح راستے پر ہماری رہنمائی کریں۔ میں ان بدوؤں کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔

۱۹۳۴ء میں میری ملاقات ایک دراز قد لڑکی روتھ شوارتز سے ہوئی جو مجھ سے دو برس چھوٹی تھی اور برلن سے یہاں اسکول میں داخل ہونے آئی تھی۔ روتھ سے میں نے انگریزی زبان میں اپنی لیاقت بڑھانے میں مدد لی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آکر کام کاج میں میری والدہ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں ہماری شادی ہوگئی۔

مئی ۱۹۳۶ء میں فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس دوران کچھ یہودی مارے گئے۔ عربوں کی بغاوت کا آغاز ایک عام ہڑتال سے ہوا جس کا مقصد ملک کی اقتصادیات کو درہم برہم کرنا تھا۔ بہت جلد یہ بغاوت ایک دہشت پسند تحریک میں تبدیل ہوگئی جو نہ صرف یہودی آبادی بلکہ برطانیہ کی استعماری حکومت کے بھی خلاف تھی۔ قدرتی طور پر برطانیہ کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں مجھے فلسطینی پولیس میں بھرتی کرلیا گیا۔ اس وقت میری عمر بائیس سال تھی۔ مجھے نہ صرف وردی ملی بلکہ لائسنس کے ساتھ ہتھیار بھی مل گیا۔ میری رہائش برطانوی فوجی کیمپ میں تھی، اور ہفتے میں ایک بار گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔

یہودی حکام اور انقلابی حکومت کے دوران اس تعاون کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہماری فوجی تربیت میں وسعت پیدا ہوگئی اور جو غیر قانونی اسلحہ ہم نے چھپا رکھا تھا اسے اب اعلانیہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔

قید و بند ۱۹۳۸ء تک فلسطین میں یہودیوں کی ایک اور نئی بستی "ھانیتا" قائم ہوچکی تھی۔ جہاں، فرقہ شمروں کے آدمی رہتے تھے۔ اس بستی کے لیے ہم نے عربوں سے تمام زمین خریدی تھی۔ روپیہ مشترکہ طور پر جمع کیا گیا تھا۔ مئی ۱۹۳۹ء میں حکومتِ برطانیہ نے عربوں کو خوش کرنے کے لیے ایک قرطاس ابیض، شائع کیا اور آئندہ کے لیے فلسطین میں آنے والے یہودی تارکینِ وطن پر پابندیاں عائد کردیں۔ یہودیوں نے اس نئی پالیسی کے خلاف فیصلہ کرلیا۔

اگست ۱۹۳۹ء میں ہماری خفیہ تنظیم "ہگانہ" نے کچھ فوجی مشقوں کا اہتمام کیا۔ جہاں مجھے بطور انسٹرکٹر حصہ لینا پڑا۔ ہم نے اپنی فوجی مشقوں کو برطانیہ سے اوجھل رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن انہیں کسی طرح سے پتہ چل گیا۔ ہم سب کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل خانہ ایک قسم کا قلعہ تھا جسے ۱۸ویں صدی میں عثمانی ترکوں نے فلسطین میں تیار کیا تھا۔ ہمیں پینے کے لیے تھوڑا سا پانی دیا گیا۔ اس کے بعد ہم نہ غلیظ اور خستہ چٹائیوں پر سوگئے۔ کھانے کے لیے ہمیں زیتون اور ایک بڑی روٹی دی جاتی تھی۔ تاہم ورزش کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جیل کی زندگی کا عام معمول یہ تھا کہ ہم علی الصبح جاگتے۔ بیدار کرنے کے لیے ایک گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے بستر لپیٹ دیتے اور حاضری کے لیے قطار میں کھڑے ہوجا

دن بھر ہم سے مشقت لی جاتی تھی۔ ادھر مقدمے کی کارروائی جاری رہی اور بالآخر ہمیں پانچ پانچ سال کی سزا دے دی گئی۔

مجموعی طور پر جیل میں ہم سے اچھا سلوک ہوا۔ ہمیں لکھنے پڑھنے کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ میں نے ایک باغیچے میں کام شروع کیا۔ اسی باغیچے کے راستے ہم چوری چھپے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں منگوا لیا کرتے تھے، اور ہمارے گھر والے کبھی کبھار ملاقات کے لیے آجاتے۔ اسی جیل میں بیشتر قوم پرست عرب رہنما بھی موجود تھے جن کے ساتھ ہمارے مراسم باہم احترام کی بنیاد پر قائم ہوئے۔ کیونکہ ہم سب بہرحال سیاسی قیدی تھے جیل کے اندر میری انگریزی کثرت مطالعہ سے بہت اچھی ہوگئی علاوہ ازیں میں نے دستکاری کے کام بھی سیکھ لیے۔

اسی اثنا میں جنگ عظیم میں برطانیہ پوری طرح ملوث ہو چکا تھا اور اسے یہودیوں کی ضرورت تھی۔ صیہونی تنظیم نے برطانیہ پر زور دیا کہ وہ ہمیں رہا کرنے۔ چنانچہ فروری ۱۹۴۱ء میں ہمیں جیل سے آزاد کر دیا گیا۔

سوئے دار تک: جیل سے رہائی ملتے ہی مجھے لڑائی کے محاذ پر جانا پڑا۔ جنرل رومیل کی افواج مغربی صحرا میں اپنا دوسرا بڑا حملہ شروع کر چکی تھیں۔ جیسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ہمارے خصوصی دفاعی دستے شام پر حملے کے سلسلے میں اتحادی افواج کے شانہ بشانہ لڑیں گے مجھے ایک یونٹ کا سربراہ بنایا گیا کہ ہم پلوں کی حفاظت کریں۔ دشمن کے ایک حملے کے سامنے اپنا دفاع کرتے ہوئے مجھے سر پر گہرے زخم آئے۔ مجھے کچھ دن ہسپتال رہنا پڑا اور میری آنکھ مکمل طور پر ضائع ہوگئی۔

جنگ عظیم کے آخری ایام پر جیسے ہی میرے زخم بھرے اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا، میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں جاسوسی سرگرمیوں میں توسیع کرنی چاہیے۔ ہمیں ایسے خصوصی جرمن اور عرب گروپ تیار کرنے چاہئیں جو ہمارے اپنے آدمیوں پر مشتمل ہوں اور عربوں میں گھل مل کر ان کی جاسوسی کر سکیں۔ چنانچہ ہم نے نازیوں کے مقبوضہ یورپ میں بھیجے جانے کے لیے امیدوار بھرتی کیے۔ انہیں برطانیہ کی انٹیلی جنس سروس تربیت فراہم کرتی تھی۔ اس عرصے میں میں مسلسل سفر کرتا رہا۔ کبھی عراق کبھی شام گیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوگئی اور میں اپنے فارم پر واپس آگیا۔ ۱۹۴۶ء میں مجھے لیبر پارٹی کی طرف سے بیسیل میں منعقد ہونے والی بائیسویں عالمی صیہونی کانگریس میں بطور شرکت کے لیے نامزد کیا گیا۔ اس کانگریس میں بن گوریان نے برطانیہ کی صیہونیت مخالف پالیسی کے خلاف جدوجہد پر زور دیا ہے۔ برطانیہ کی حکمت عملی سے پورا پورا اتفاق تھا ——— فلسطین پر برطانوی انتداب کا خاتمہ بالکل قریب آرہا تھا اور ہم نے مسلح عرب ریاستوں کی جانب سے امکانی حملے کے خلاف دفاعی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان دنوں میرے ذمے عربوں کے خلاف جاسوسی کے شعبے کی نگرانی تھی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو جب اقوام متحدہ کی جانب سے تقسیم فلسطین کے فیصلے کا اعلان ہوا میں نہلل میں تھا۔ میں نے بچوں کو بستروں سے جگایا اور رات بھر خوشی سے رقص کیا۔ دو ہزار سال کی تکالیف اور دہشت زدگی کے بعد یہ ہماری پہلی تاریخی کامیابی تھی کہ اقوام متحدہ نے اسرائیل کے بطور ریاست قیام کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس اعلان کے ساتھ ہی مقامی عربوں نے ہمسایہ عربوں کی فوجوں کے ساتھ مل کر یہودی آبادیوں پر حملے شروع کر دیے اور خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ عربوں کا بڑھتا ہوا دباؤ دیکھ کر ہمارے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ ہم آزاد اسرائیلی ریاست کا خیال ترک کر دیں کیونکہ ایسی ریاست عربوں کی دشمنی کے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔ لیکن ہم نے ان کا یہ مشورہ ٹھکرا دیا۔ اس خانہ جنگی میں میرا چھوٹا بھائی زوک بھی مارا گیا۔ جس کے ساتھ میری والدہ کو خصوصی محبت تھی۔ بہرحال ہم نے منظم انداز میں لڑائی جاری رکھی۔ عربوں کی جاسوسی کا شاندار نظام پہلے ہی موجود تھا
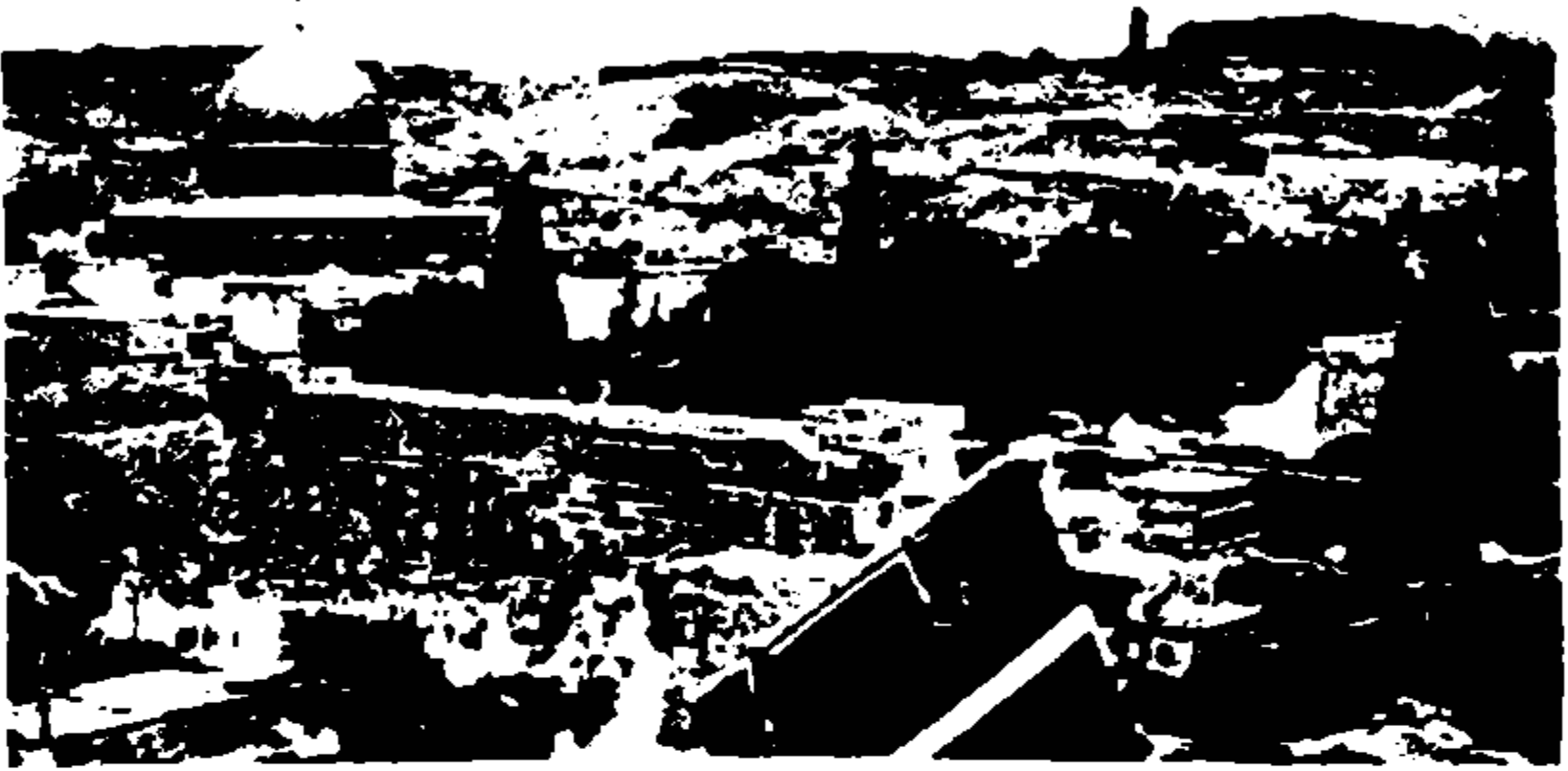
بیت المقدس اسرائیلی فوجیوں کی زد میں

اس کے نتیجے میں اسرائیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا۔

خطرات ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو بن گوریان نے ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے چند ہی گھنٹے بعد لبنان، شام، عراق، اردن، مصر اور سعودی عرب کی فوجوں نے چاروں طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ صورت حال بڑی نازک تھی۔ ہمارے پاس مقابلے میں اچھے ہتھیار نہ تھے اور فوج بھی ناکافی تھی۔ مجھے وادی اردن کے محاذ کی کمان سونپی گئی جہاں شامیوں نے حملہ کر رکھا تھا اور ان کے پاس ٹینکوں کے علاوہ ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ جب شامی ٹینک سرحد عبور کر کے دجانیہ میں داخل ہونے لگے تو ہم نے انھیں ٹینک بارود سے انہیں تہس نہس کر دیا اور شامی ایسی بدحواسی میں پسپا ہوئے کہ اپنے پیچھے بہت سے ہتھیار، گولے اور گاڑیاں چھوڑ گئے۔ ہم نے یہ کامیابی اس لیے حاصل کی کہ ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی قیمت پر پسپا نہیں ہوں گے۔ اسی لڑائی میں میرے سپرد ایک کمانڈو بٹالین تیار کرنے کا کام کیا گیا۔ اس بٹالین نے جو ۹ کمانڈو بٹالین کہلائی، لڑائی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

میرا دشمن میرا دوست

۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو مجھے یروشلم کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ میں اپنی بٹالین میں اس قدر مقبول تھا کہ اس تقرر پر انہوں نے بن گوریان وزیر اعظم کی طرف سے ایک وفد بھیج کر یہ درخواست کی کہ مجھے بٹالین کی کمان سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ بن گوریان نے انہیں یہ جواب دیا کہ یروشلم کو ایک اچھے کمانڈر کی زیادہ ضرورت ہے۔ یروشلم کی کمان سنبھالنے پر میں نے شہر کے اگلے مورچوں کا معائنہ کیا۔ شدید سرد کے دن تھے اور سپاہی معمولی خوراک کے ساتھ خندق میں رہنے پر مجبور تھے۔ میں سپاہیوں اور افسروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان سے اکثر ملاقات کرتا اور ان کے مسائل معلوم کرتا۔ میں یہاں اپنے خاندان کو بھی لے آیا اور ایک چھوٹے سے گھر میں اقامت اختیار کر لی۔ جب اردنی فوج ہم پر فائرنگ کرتی تھی تو گولیاں میرے گھر کے مشرقی حصے

چلنی کر دی تھیں۔

بالآخر شاہ عبداللہ اور اسرائیلی نمائندوں کے مابین رہوڈز میں مصالحتی مذاکرات کا آغاز ہوا۔

ان مذاکرات کے نتیجے میں جس لائن پر دونوں طرف سے جنگ بندی ہوئی وہیں شہر کو نصف نصف حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ لیکن دوسرے محاذوں پر لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے گھر سے تل ابیب تک فیلڈ ٹیلی فون مشرق وسطیٰ کی واحد ہاٹ لائن تھی، جو بہت ہی مفید ثابت ہوئی۔ اسی ٹیلی فون کے ذریعے ہم نے خفیہ طور پر اردن کے شاہ عبداللہ سے بھی ملاقاتیں کیں۔ یہ ملاقاتیں اردنی کمانڈر کرنل ال تل کے توسط سے ہوتی رہیں جو میرے اچھے دوست بن گئے تھے۔ ان کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں ہم نے جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی کیا۔

ایک عرب بادشاہ سے گفت و شنید

اردن کے ساتھ جنگ بندی کے بعد بعض علاقوں کے تبادلے اور دیگر تکنیکی امور کی وضاحت کے لیے طے پایا کہ دونوں طرف کے نمائندے آپس میں ملاقات کریں گے۔ اسرائیل کے نمائندہ وفد میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ لیکن ان ملاقاتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان دنوں جب ہم اردن میں تھے۔ شاہ عبداللہ نے اسرائیلی وفد سے ملنے کے لیے خواہش ظاہر کی۔

ہم نے شاہ عبداللہ سے دو بار ملاقات کی پہلی ملاقات ۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو اور دوسری ملاقات دو ہفتے بعد ہوئی۔ پہلی ملاقات میں بادشاہ کے ہمراہ ان کا ذاتی طبیب اور جنرل ال تل بھی تھا۔ دوسری ملاقات میں ان کا وزیر اعظم توفیق بھی شامل تھا۔ یہ ملاقات جزیرہ رہوڈز میں منعقد ہوئی تھی۔ دوران گفتگو شاہ نے کہا۔ وہ اور ہم سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ شاہ نے بتایا کہ وہ اپنے عوام کی نظر میں بادشاہ ہے لیکن اہل برطانیہ اُسے اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ شاہ عبداللہ نے ہم سے مصر کے ساتھ لڑائی کے مسئلے پر بھی بات چیت کی اور کہا کہ ہمیں کبھی مصر کو غزا کا علاقہ نہیں دینا چاہئے۔

شاہ عبداللہ سے متعلق میرا تاثر یہ رہا کہ وہ ایک ذہین آدمی ہے اور بہت اچھا رہنما جو نازک معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اس کی گفتگو سادہ مگر عربی کہاوتوں اور محاورات سے مزین ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیش ہوا تو اس نے ہمیں اپنے وزراء کی طرف بھیجنے کی بجائے خود ہی اس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ مذاکرات ایک مہینہ تک جاری رہے۔ اس کے بعد کے مذاکرات دونوں طرف کے وفود کے درمیان ہوئے جن کی صدارت اقوام متحدہ کے مصالحتی نمائندہ ڈاکٹر رالف بنچ نے کی۔ مذاکرات کے بعد سمجھوتے کا مسودہ تیار کرنے میں ڈاکٹر رالف کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اس قسم کا مسوّدہ تیار کر سکتا تھا جسے ہر دو فریق اپنی اپنی منشا کے مطابق معانی پہنا سکیں۔

اردن اور اسرائیل کے درمیان آخری سمجھوتہ شاہ عبداللہ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا اور اس سلسلہ میں ہم نے ان سے کئی بار ملاقات کی۔ یہ سمجھوتہ فلسطینیوں کو قابل قبول نہ تھا۔ انہیں خوش کرنے کے لیے بادشاہ نے اپنی کابینہ میں تین فلسطینی وزرا کو شامل کیا۔ لیکن فلسطینیوں میں سے ایک نے شاہ عبداللہ کو ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو مسجد اقصیٰ کی سیڑھیوں پر اس وقت قتل کر دیا تھا جب وہ جمعہ کی نماز کے بعد اپنے محل کو روانہ ہو رہے تھے۔

ایک نئی دنیا

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں مجھے میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ میری کمان میں جو علاقہ دیا گیا وہ اسرائیل کا جنوبی حصہ تھا جو کہ زیادہ تر خشک صحرا پر مشتمل تھا اور میرے لیے اجنبی تھا میں نے دیکھا کہ اس ریگستان میں کہیں کہیں یہودی بستیاں قائم ہو چکی ہیں۔ لیکن اس علاقے کی ترقی کا ذمہ دار محکمہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بن گوریان سے ملاقات کی اور علاقے کی ترقی کے لیے فوج کو استعمال کرنے پر زور دیا۔ یہاں ہماری سرحد مصر

سے ملتی ہے اور مجھے اکثر سرحدی دورے کرنے پڑتے تھے اور آہستہ آہستہ صحرائی مناظر سے میں دلچسپی لینے لگا۔ مجھے صحرا کی فراخی، کھلی ہوا اور نباتات بہت اچھی لگتی تھی

اسرائیل میں نئے مہاجرین کی آمد ایک بہت اہم مسئلہ تھی۔ لیکن یہ مسئلہ ہمارے عزائم کا امتحان بھی تھا۔ میں نے فوجیوں کو ان مہاجرین کی آباد کاری کا کام ——— پر لگا دیا۔ ان کے لیے اسرائیلی فوج نے مکانات بنائے سڑکیں تعمیر کیں۔ زمین دوز نالیاں کھودیں اور ہر قسم کی مدد فراہم کی۔ میں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ نئے آنے والوں کو اسی صحرا میں آباد کیا جائے۔ میرا یہ مشورہ قبول کر لیا گیا۔

گزشتہ سال کے مقابلے میں ۱۹۵۰ء ہمارے لیے ایک پرسکون سال تھا۔ چنانچہ ہم نے پہلی فرصت میں فوجی کی تربیت اور مہارت کا ایک ٹھوس پروگرام شروع کر دیا۔ میں تربیت کے اس پروگرام ہی کے سلسلے میں برطانیہ گیا جہاں میں نے ڈویژن کے سینئر آفیسرز اسکول کے کورس میں حصہ لیا۔

۱۹۵۲ء میں برطانیہ سے واپس اسرائیل پہنچا تو مجھے ڈپٹی چیف آف اسٹاف کی آسامی پیش کی گئی۔ لیکن میں نے یہ پیش کش اس بنا پر نا منظور کر دی کہ میں چیف آف اسٹاف کے ہر غلط آرڈر پر "جی ہاں جناب" نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے شمالی کمان کا جی او سی لگا دیا گیا۔ شمالی کمان کے علاقے میں کافی تعداد میں عرب باشندے آباد تھے جو اسرائیلیوں سے شدید نفرت کے جذبات رکھتے تھے۔

ایک فوج کی تعمیر

دسمبر ۱۹۵۲ء میں مجھے جنرل اسٹاف کی آپریشنز برانچ کا سربراہ مقرر کیا گیا اور اگلے سال دسمبر تک چیف آف اسٹاف۔ اسی سال میں نے فوج کی حملہ وارانہ اہلیت کا معیار بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے ایک عام سپاہی کی جنگی لیاقت بہتر بنانے کے علاوہ خصوصی ۱۰۱ کا یونٹ تیار کیے۔ جدید ترین ہتھیار حاصل

کیے۔ ہم نے فوجی تعمیر و ترقی کا ایک سہ سالہ پروگرام تیار کیا جس کے مطابق فوج کے لڑنے والے یونٹوں کو دوسرے یونٹوں پر ترجیح دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور نئے رنگروٹوں کی جنگی تربیت پر دیا گیا۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ فوج کی تنظیم کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ ہم نے دفاعی اخراجات بچانے کے لیے فوجی ادارے کو ختم کر دیا۔ خصوصی فوجی ہسپتالوں کی بجائے عام شہری ہسپتال استعمال کرنے لگے۔ فیلڈ کے باورچی خانے ختم کر دیے گئے۔ سرحدی علاقوں کے موثر دفاع اور نگرانی کے لیے ایک خصوصی یونٹ تیار کیا گیا جسے فورس ۱۰۱ کا نام دیا گیا۔ یہ رضا کاروں پر مشتمل تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارا بنیادی مسئلہ عرب دہشت پسندوں کی کارروائیوں کا مقابلہ نہیں بلکہ اپنی جنگجویانہ صلاحیت کا معیار بلند کرنا ہے۔

بطور چیف آف اسٹاف میرا اہم فرض اسرائیل کی دفاعی افواج کے امیج کی حفاظت کرنا تھا۔

اس مقصد کے لیے فوجی تنظیم میں بعض بنیادی تبدیلیاں لانا ضروری تھا۔ لیکن دشواری یہ پیدا ہوتی کہ بطور چیف آف اسٹاف مجھے براہ راست لڑنے کی بجائے دوسروں کو احکام جاری کرنے پڑتے تھے اور اکثر احکام کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں بطور چیف آف اسٹاف اپنے طرز عمل میں تبدیلیاں پیدا کروں اور "بڑا صاحب بہادر" بن جاؤں، لیکن میں نے اس مشورے کو رد کر دیا۔ سب سے پہلے تو میں نے چیف آف اسٹاف کے ساتھ ایڈی کیمپ کی آسامی ختم کر دی بطور ہیڈ آف آپریشن جو میز میرے استعمال میں تھی وہی میز میں نے یہاں منگوا لی۔ چیف آف اسٹاف کے وسیع و عریض دفتر کو میں نے کانفرنس روم میں بدل دیا اور خود ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ میں اپنے ماتحتوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ایسے دفتر یا مقام پر نہیں آئے جو ان کے عام ماحول سے مختلف ہے۔

میں رات کے وقت اچانک چھاپے مارتا تھا' اکثر تنہا ہوتا تھا تاکہ یہ دیکھوں کہ فوجی یونٹ مسلسل آمادگی اور سرگرمی میں ہیں کہ نہیں۔ جہاں کوئی مسئلہ ہوتا تھا میں موقع پر ہی اس کا فیصلہ کر دیتا تھا۔ جب کوئی تنظیمی یا انتظامی دشواری پیدا ہوتی، میں ہمیشہ اس شخص سے بات کرتا جو اس سلسلے میں ذمہ دار ہوتا تھا خواہ اس کا عہدہ یا رینک کتنا کم ہو۔

جون ۱۹۵۴ء میں وزیر دفاع لیون کے ساتھ میرے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خالص فوجی امور میں مداخلت کرنا چاہتا تھا اور یہ بات مجھے پسند نہ تھی چنانچہ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیون کا ردعمل یہ تھا کہ اس نے "غلط فہمی" کی ذمہ داری کسی اور پر عائد کرتے ہوئے مجھے کھانے پر مدعو کیا اور استعفیٰ واپس لینے کے لیے کہا۔ اس طرح وقتی طور پر یہ بحران ٹل گیا۔

فوج کی تعمیر کے سلسلے میں میرا اصرار اس بات پر ہوتا تھا کہ سپاہیوں سے زیادہ افسران اپنی جان خطرے میں ڈالیں اور آگے آئیں۔ چنانچہ میں نے ایک بار ایک فوجی افسر کو اس بات پر سبکدوش کر دیا کہ اس نے ایک سپاہی کو ایک خطرناک مشن پر بھیج دیا اور خود ایک محفوظ پناہ گاہ میں مقیم رہا تھا۔

ستمبر ۱۹۵۵ء میں مصر کے جمال عبدالناصر نے قاہرہ میں ایک فوجی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ انہوں نے چیکوسلواکیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے جس کے مطابق اس کا ملک چاول اور کپاس کے عوض ہتھیار حاصل کرے گا۔ اس معاہدے کے مطابق روسی بلاک سے مصر کو تین سو ٹینک، ایک سو بکتر بند توپوں، سینکڑوں درمیانی اور طیارہ شکن توپوں کے علاوہ، دو سو مگ، پچاس بمبار ہوائی جہاز، راڈر، دو ڈسٹرائر، چار مائن سویپر اور بے شمار دیگر ہتھیار ملنے تھے۔ مصر کی اس جنگی تیاری کا واضح مقصد اسرائیل کے ساتھ محاذ آرائی تھا۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں مصر کو روسی ہتھیاروں کی سپلائی شروع ہو گئی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اگلے آٹھ دس مہینوں تک مصران ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ہمارے لیے مسئلہ یہ تھا کہ ان ہتھیاروں کے مقابلے کے لیے کہاں سے ہتھیار حاصل کیے جائیں۔ امریکا اور برطانیہ ہمیں ہتھیار دینے پر تیار نہ تھے۔ فرانس اچھے ٹینک نہیں بنا رہا تھا۔ میں نے وزیر اعظم بن گوریان کو مشورہ دیا کہ مصر کے خلاف ایک محدود کارروائی یہ کر سکتے ہیں کہ غزا کی پٹی پر فوراً قابض ہو جائیں جو آگے چل کر مصری حملہ کا نقطہ آغاز بن سکتی ہے۔ لیکن یہ تجویز فوری طور پر قبول نہ کی گئی۔

اپریل ۱۹۵۶ء میں فرانسیسی کمک چند مسٹیر جنگی ہوائی جہازوں کی شکل میں ہماری طرف پہنچی۔ یہ طیارے روسی مگ طیاروں سے کسی حد تک بہتر تھے۔

فرانس نے ہمیں اے ایم ایکس اور شرمن ٹینک دینے کا وعدہ بھی کیا۔ برطانیہ نے بھی مسٹیر طیارے دینے پر اتفاق کر لیا۔ تاہم امریکا فوجی امداد دینے سے مسلسل انکار کرتا رہا۔

ہم نے دیکھا کہ کوئی بیرونی طاقت ہمارے ساتھ جنگی تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ تاہم ایک قوم ایسی تھی جس کے ساتھ ہم تعاون کر سکتے تھے، یہ تھی اسرائیلی قوم۔ ہم نے اپنے کارکنوں، اپنے اساتذہ اپنے طلبا اور اپنے نوجوانوں سے پیمان کیا، اپنے سپاہیوں اور رضاکاروں سے معاہدہ کیا کہ وہ اسرائیلی قوم کی بقا کے لیے اپنے آخری سانس تک لڑیں گے۔ اسی ایک پیمان پر ریاست کے کردار، فوج کی اہلیت اور قوم کی تعمیر کا دارومدار تھا۔ لیکن ہم عہدہ کواس کے ہتھیاروں کی فراہمی کے مسئلے سے بھی غافل نہ تھے۔ میں خود ایک خفیہ مشن پر فرانس گیا۔ اس کے نتیجے میں۔۔۔ فرانس نے ہمیں ہتھیاروں کی فراہمی جاری رکھنے کا یقین دلایا۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو روسی فوجی امداد کے نشے میں سرشار جمال عبدالناصر نے یہ اعلان کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا کہ نہر سویز کو قومیا لیا گیا ہے۔ اس اعلان پر برطانیہ

اور فرانس نے اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ بعض مبصرین کا تو یہ بھی خیال تھا کہ روس مصر کو مروانا چاہتا ہے اور اس کی اس شہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برطانیہ اور اسرائیل ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گے۔ بن گوریان نے مجھ سے کہا کہ موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال مصر کے خلاف ہماری کارروائی کے لیے بہت سازگار ہو چکی ہے لیکن دشواری یہ تھی کہ جب تک ہتھیار نہ مل جائیں ہمیں صبر سے کام لینا تھا۔

مصر کے خلاف آپریشن کے فیصلے کا حقیقی محرک فرانس تھا۔ برطانیہ کو فکر یہ تھی کہ اس کے عوام مصر کے خلاف حملے کی صورت میں حکومت کا ساتھ نہ دیں گے۔ اسی طرح امریکہ کے بارے میں بھی یقین تھا کہ وہ اس کارروائی کی مخالفت کرے گا۔ اس اثنا میں یہ سازش بھی تیار کی گئی کہ کسی طرح مصر کے جمال ناصر کی حکومت کا تختہ الٹا جائے۔

فرانسیسی تعاون کی شروعات

ہمیں ستمبر ۱۹۵۶ء کو یہ اطلاع ملی کہ فرانس مصر کے خلاف اسرائیلی کارروائی میں تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔ فرانسیسی حکام کا یہ خیال تھا کہ مصر کے خلاف جنگی آپریشن میں شرکت کے لیے اسرائیل کو باقاعدہ دعوت دی جائے۔ ہم نے فرانسیسی دعوت قبول کر لی۔ ہم نے فرانس کو یقین دلایا کہ مصر کے خلاف حملے کی صورت میں فرانس کو اسرائیلی فوج کے عملی تعاون کے علاوہ اسرائیل کا علاقہ اور جاسوسی اطلاعات استعمال کرنے کی بھی سہولت دی جائے گی۔

موقع جنگ کے پیشِ نظر میں نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ جنگی طیاروں کا مکمل استعمال اور پائلٹوں کی تربیت کے پروگرام پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ہمارا پروگرام زیادہ سے زیادہ جزیرہ نمائے سینا اور کم از کم آبنائے تیران اور غزا کی پٹی پر قبضہ تھا۔

ادھر فرانس فوری طور پر مصر کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف برطانیہ کا خیال تھا

کہ جب تک عالمی صورتِ حال اس کارروائی کے لیے مزید سازگار نہ ہو جائے مصر کے خلاف اقدام ملتوی کر دیا جائے۔ فرانس کا یہ بھی خیال تھا کہ برطانیہ کے بغیر تنہا فرانس اور اسرائیل مصر کے خلاف کارروائی میں حصہ لیں۔

ادھر اردن کی جانب سے اسرائیلی علاقے میں گوریلا اور دہشت پسندانہ کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ اردن کی حکومت نے ان متشددانہ کارروائیوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس دوران ہم نے فرانس کے ساتھ جنگی تعاون کے سلسلے میں مزید گفتگو کی۔ ہم نے فرانس سے کہا کہ اس کارروائی میں برطانیہ کو بھی شریک کیا جائے۔ امریکا سے یقین دہانی لی جائے کہ وہ ہم پر پابندیاں عائد نہ کرے گا۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ لڑائی میں شامل ہر ملک کی افواج اپنے

الگ محاذوں پر لڑیں گی۔ ہمیں برطانیہ کے متعلق یہ خوف تھا کہ کہیں وہ اردن کی مدد پر نہ آجائے۔ کارروائی کی موجودگی میں رُوس کی مداخلت کا سوال بھی زیرِ بحث آیا۔ فرانس کا خیال تھا کہ جس قدر کارروائی کی مدت کم ہوگی روسی جنگی مداخلت کا امکان بھی اتنا ہی کم ہوگا۔ فرانس کے لیے ایک دشواری یہ بھی تھی کہ اس کے پاس کام کے طیارے بڑے سے موجود ہی نہ تھے۔ فرانس کو امید تھی کہ ایک بار جنگی کارروائی کا آغاز ہو گیا تو یقیناً برطانیہ بھی شامل ہو جائیگا تاہم اس منصوبے پر براہِ راست کسی قسم کی بات چیت کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس آپریشن کو "آپریشن میکڈ" کا نام دیا گیا۔ مصری محاذ پر کارروائی میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ایسی گاڑیوں کی دستیابی تھا جو ریگستان میں آسانی سے چل سکیں۔ چنانچہ ہم نے فرانس سے چار پہیوں پر چلنے والا جیپ ٹرکوں کا مطالبہ کیا جن کے ذریعے ہم اپنی رسد اور فوج کی نقل و حرکت کو بہتر اور آسان بنا سکیں۔

اس کارروائی کے پیچھے ہمارا اصل مقصد صحرائے سینا پر قبضہ اور ایلات تک جہازرانی کی آزادی حاصل کرنا تھا۔ ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ مصر میں ناصر کی جگہ کوئی اور دوسری شخصیت برسرِ اقتدار آجائے۔ فرانس اور برطانیہ چاہتے تھے کہ اس کارروائی میں پہلی گولی اسرائیل چلائے لیکن بن گوریان اس معاملے میں قدرے تذبذب میں تھے بالآخر انہیں میں نے اس پر آمادہ کر لیا کہ اس تاریخی موقع کو کسی قیمت پر نہ گنوایا جائے۔ ایک امکانی خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں یہ کارروائی طویل جنگ اختیار نہ کر جائے۔ طویل جنگ کسی صورت میں بھی اسرائیل کی نوزائیدہ مملکت کے لیے مفید نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایسا امکان کم ہے اور یہ کہ ہم مصر کی فوجی طاقت کے متعلق بہت مبالغہ آمیز اندازے رکھتے ہیں۔

۸ اکتوبر کو میں نے فوجی سپہ سالاروں کا اجلاس بلایا اور صحرائے سینا میں مجوزہ کارروائی کو "آپریشن مسکیٹ" کا کوڈ نام دیا۔ میں نے ہدایت کی کہ ہمارا کام اس کارروائی میں دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی موت کے گھاٹ اتارنا نہیں بلکہ انہیں ہرانا، ان کے علاقے پر، ان کے ہتھیاروں اور رسد پر قابض ہونا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو دشمن کے مورچوں پر قبضہ کیا جائے۔ ورنہ انہیں الگ الگ پاکٹوں میں کاٹ کر تنہا کر دیا جائے آگے جا کر صرف اس وقت حملہ کیا جائے جب حالات بالکل سازگار ہوں۔ میں نے تنظیم کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ کسی ایک یونٹ کی کامیابی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔

فرانسیسی تعاون کا اگلا مرحلہ

۱۸ اکتوبر کو گائی مولٹ

وزیراعظم فرانس نے بن گوریان وزیراعظم اسرائیل کو پیرس آنے کی دعوت دی۔ ہم اکتوبر کو پیرس روانہ ہوئے۔ فرانس کے ساتھ تعاون اب آخری مرحلہ میں داخل ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے فرانس کی وساطت سے ہمیں یہ تجویز بھیجی تھی کہ سب سے پہلے اسرائیل مصر کے خلاف کارروائی کا آغاز کرے گا۔ جنگ چھڑ جانے پر برطانیہ اور فرانس دونوں مصر اور اسرائیل کو لڑائی بند کرنے یا بصورت دیگر نہر سوئز میں جہاز رانی کو برقرار رکھنے کی خاطر جنگ میں شرکت کی دھمکی دیں گے۔ مقصد یہ تھا کہ مصر کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں ان یورپی طاقتوں کے ہاتھ میں معقول جواز آجائے۔ فرانس کے ساتھ ہماری بات چیت کے دوران بن گوریان نے تجویز پیش کی کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی نئی سرحد بندی ہونی چاہیے۔ اور لبنان کے مسلم اکثریت کے علاقے نکال کر اسے عیسائی اکثریت کا ملک بنا دیا جائے جو یورپی طاقتوں کے لیے فوجی اڈہ بن سکے، تاہم فرانس اور برطانیہ کو زیادہ تر نہر سوئز پر قبضے سے دلچسپی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہی مہینہ اس کارروائی کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ اس بات چیت میں برطانیہ کے نمائندے نے بھی شرکت کی۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ ہم شروع سے ہی وسیع پیمانے پر مصر کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیں اور تنہا کم از کم ۳۶ گھنٹے۔

تک رسائی جاری رکھیں تاکہ برطانیہ اور فرانس کا معاہدہ اسرائیل کو الٹی میٹم محض ایک سوچی سمجھی سازش نہ سمجھ لیا جائے۔ بالآخر ۲۴ اکتوبر کو مشترکہ حملے کا پلان کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا جس کے مطابق سب سے پہلے اسرائیلی فوج ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو شام پانچ بجے بروز پیر حملے کا آغاز کرے گی۔ برطانیہ اور فرانس بدھ کے روز الٹی میٹم جاری کریں گے۔ مصر کی جانب سے الٹی میٹم رد کیے جانے کی صورت میں برطانوی اور فرانسیسی افواج بدھ کے روز صبح سویرے سے ہی مصری اڈوں کو بمباری کا نشانہ بنانا شروع کر دیں گی۔ جمعہ کے دن ۲ نومبر کے روز دو فرانسیسی بریگیڈ لڑائی میں شامل ہو جائیں گے۔ میری معلومات کے مطابق اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس کی طرف سے چار پیدل بریگیڈوں، چار سو جنگی طیاروں اور ایک سو بیس بمبار طیاروں کو حصہ لینا تھا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اگر اس جنگ میں اردن کی طرف سے اسرائیل پر حملہ ہوا اور اسرائیل نے اس کے خلاف جوابی کارروائی کی تو برطانیہ اردن کے ساتھ دفاعی معاہدہ ہونے کے باوجود اردن کا ساتھ نہیں دے گا۔ تاہم برطانیہ اور فرانس نے یہ واضح کر دیا کہ وہ ہمیں صحرائے سینا کے علاقے پر قابض ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کیونکہ یہ علاقہ وہ خود اپنی عملداری میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم اسرائیل کو خلیج عقبہ اور جزائر تیران پر قبضہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ نہر سوئز پر قبضہ صرف برطانیہ اور فرانس کی فوج کا کام تھا۔

اس آخری کانفرنس اور گفت و شنید سے ہم ۲۵ اکتوبر کو فارغ ہوئے۔ واپسی پر طیارے ہی میں، میں نے جنرل اسٹاف اور فیلڈ کمانڈر کے متعلق احکامات کے مسودے تیار کر لیے تھے۔ ہمارا بنیادی مقصد مغربی فوج کو بوکھلا کر انہیں شکست سے دوچار کرنا اور نہر سوئز پر قبضے کا خطرہ پیدا کرنا تھا۔ طیاروں کو ابتدا میں صرف محدود پیمانے پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب جنگ شروع کرنے میں صرف چار دن باقی رہ گئے تھے۔

سینائی مہم

ہم کو ایک ایسے علاقے میں کارروائی کرنی تھی جو اسرائیل سے تین گنا بڑا تھا۔ ہمارا سب سے اہم مقصد اس علاقے میں شرم الشیخ کے مقام پر قبضہ کر کے فدائین کی دہشت پسند کارروائیوں کا سدباب کرنا تھا۔ اگر ہم شرم الشیخ پر قابض ہو جاتے تو خلیج عقبہ کے گرد مصری ناکہ بندی خود بخود ختم ہو جاتی۔

ہم کا آغاز ۲۹ اکتوبر کی سہ پہر کو ہوا جب ۳۹۵ افراد پر مشتمل ہماری ایک بٹالین نہر سوئز سے تیس میل دور متلا درے کے مشرقی دہانے کے پاس اتر گئی۔ اس سے دو گھنٹے قبل ہمارے چار مستانگ طیاروں نے اپنے پروں اور پنکھوں کی مدد سے صرف چار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے مصری رابطہ ٹیلیفونوں کی تاریں کاٹ دی تھیں۔ اس عرصے میں پیراٹروپ بریگیڈ کی دیگر بٹالینوں نے اردن کی سرحد پر مجتمع ہونے کے بعد مشرق سے مغرب کی طرف صحرائے سینا میں مارچ شروع کیا۔ تو گھنٹے کے ریتیلے سفر میں ان کی بہت سی گاڑیاں خراب ہو گئیں لیکن انہوں نے سفر جاری رکھا۔ جب یہ فوجی دستے سینا میں واقع پہلے مصری مورچے تک پہنچے تو مصری سپاہی انہیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسرائیلی فوج نے اپنا مارچ جاری رکھا اور بالآخر ۹ میں سے صرف دو ٹینکوں کے ساتھ وہ دوسرے مصری مورچے تک پہنچے، جہاں پہلی اہم ہوائی لڑی گئی۔ اس اثنا میں ایک اور اسرائیلی بریگیڈ نے ایک اہم مصری مورچے پر صرف بیس منٹ میں قبضہ کر لیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہمارے چوتھے بریگیڈ نے صحرائے سینا میں واقع اہم چوراہے "قیمہ" پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہماری مہم کا ابتدائی مرحلہ مکمل ہو گیا اور ہمارے ابتدائی مقاصد پورے ہونے والے تھے۔ توقع کے عین مطابق مصریوں نے ہمارے حملوں کے مقابلہ میں روسی جنگی ہتھیار استعمال کرنے کے بجائے بھاگنے یا معمولی مزاحمت کرنے کو ترجیح دی۔ دست بدست لڑائی کی بجائے وہ ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ ہوائی جنگ کے بارے

میں میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ جب تک ہم نے ان کے ہوائی اڈوں پر حملے شروع نہیں کیے ان کے طیارے محاذ جنگ سے آگے نہیں بڑھے۔ ہوائی جھڑپوں کی جنگ میں مصری طیاروں نے بھاگنے کو غنیمت سمجھا۔ ادھر برطانیہ اور فرانس نے اپنے حملے میں ایک دن کی تاخیر کر دی۔ بن گوریان کو خدشہ تھا کہ اس تاخیر سے کہیں ہماری فوجیں صحرائے سینا میں گھر نہ جائیں۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ ہم تنہا بھی مصر کو شکست دے سکتے ہیں۔

۳۱ اکتوبر کی شام کو برطانیہ اور فرانس نے فریقین کو طے شدہ منصوبے کے مطابق جنگ بند کر دینے کا الٹی میٹم دے دیا اور ۱۲ گھنٹے کے اندر اندر اس کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں مداخلت کی دھمکی دی۔ توقع کے عین مطابق مصر نے الٹی میٹم کو رد کر دیا۔ لیکن معیاد گزرنے کے باوجود ہمارے اتحادیوں نے مصری ہوائی اڈوں پر بمباری شروع نہیں کی۔ اس دوران سیکورٹی کونسل میں ہمارے خلاف امریکا نے ایک قرارداد منظور کرا دی جسے فرانس نے ویٹو کر دیا۔

عالمی رائے عامہ ہمارے خلاف ہو چکی تھی۔ دو دن کے اندر اندر ہم کافی کامیابیاں حاصل کر چکے تھے اور اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں دو چار دن مزید درکار تھے، لیکن بڑھتے ہوئے عالمی دباؤ کے پیش نظر یہ بات مشکوک تھی کہ آیا ہمیں دو چار دن مل سکیں گے۔ ہمیں سرعت کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔

اب لڑائی کا رخ کو بدل کر صحرائے سینا کا شمالی سیکٹر بن چکا تھا اور بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع العریش کی بندرگاہ کی طرف پیش قدمی کے لیے پورا زور لگا دیا تھا نصف راستے تک ہماری کوئی خاص مزاحمت نہ ہوئی۔ یکم نومبر کی صبح کو ہم العریش میں داخل ہو گئے جسے مصری فوجی خالی کر کے بھاگ گئے تھے اور اپنے پیچھے گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ چھوڑ گئے تھے۔ اب تک اس جنگ میں ہمارے صرف ایک سو سپاہی ہلاک اور سات سو زخمی ہوئے تھے۔ مصری نقصان کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن ہم ہزاروں مصری فوجیوں کو قیدی بنا چکے تھے۔

۲ نومبر تک ہم نے غزہ کی پٹی پر قبضہ کر لیا تھا اور اب ہمارا اہم ترین کام شرم الشیخ پر قبضہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ کام نویں بریگیڈ کے ذمہ لگایا گیا۔ ادھر فرانس اور برطانیہ اس حملے پر مخالفانہ عالمی رویہ دیکھ کر نہر سویز میں فوجیں اتارنے کی تاریخوں میں نت نئی تبدیلی کر رہے تھے۔ جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسرائیل، برطانیہ اور فرانس کو فوری طور پر جنگ بند کرنے کے لیے کہا تو برطانیہ نے اسرائیل سے کہا کہ وہ اس قرارداد کو مسترد کر دے لیکن وہ خود عالمی رائے عامہ کا سامنا کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

پانچ نومبر کو ایک برطانوی بٹالین پورٹ سعید کے ہوائی اڈے پر قبضہ کرنے کے لیے اتری، دوسری طرف ایک فرانسیسی پیراشوٹ بٹالین نے پورٹ سعید باقی ماندہ ملک سے ملانے والے پلوں کو اڑانے کی کوشش کی۔ اسی رات روس کے وزیراعظم بلگانن نے فرانس برطانیہ اور اسرائیل کو دھمکی دی کہ روسی حکومت اس مجرمانہ جارحیت کی مذمت کرتی ہے اور روس جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف مناسب کارروائی... روس نے برطانوی اور فرانسیسی شہروں پر بلاسٹک میزائلوں سے بمباری کی دھمکی بھی دی تھی۔ لیکن جو روس نے برطانیہ اور فرانس کی طرف بھیجے گئے پیغام میں سفارتی زبان استعمال کی تھی، وہاں اسرائیل کے خلاف نہایت توہین آمیز اور نفرت انگیز جملے بھی استعمال کیے گئے تھے۔ بن گوریان کا ردعمل تو جذبات سے عاری تھا اور انہوں نے اپنا توازن برقرار رکھا تھا۔ اسی دن ہماری فوج نے تیزی سے پیش قدمی کر کے شرم الشیخ پر قبضہ کر لیا۔ شرم الشیخ تک پہنچنے سے پہلے ہمارے نویں بریگیڈ نے دشمن کے ملک میں دو سو میل کا دور ریگستانی راستہ طے کیا تھا۔ یہ بریگیڈ اٹھارہ سو افراد پر مشتمل تھا اور اس کے پاس دو سو گاڑیاں تھیں۔ اگر یہ بریگیڈ کہیں گھر جاتا تو اسے کمک یا واپسی

الفتح کے بانی یاسر عرفات اسرائیل کے ناپاک ارادوں کو کچلنے کا عزم کر چکے ہیں

فتح نہیں ہو سکتی تھی۔
اس مہم میں اسرائیل نے اپنے تین اہم مقاصد حاصل کیے۔
۱۔ خلیج عقبہ میں اسرائیلی جہازوں کے لیے جہاز رانی کی آزادی۔
۲۔ فدائین کی دہشت پسند کارروائیوں کا خاتمہ (مصر، شام اور اردن کی طرف سے اسرائیل کے خلاف مشترکہ کارروائی کے امکان کا خاتمہ۔
مارچ ۱۹۵۷ء میں لڑائی کے ساڑھے چار ماہ بعد اقوام متحدہ کی زیر نگرانی اسرائیلی افواج بعض یقین دہانیوں کے بعد مصری علاقہ خالی کر کے اپنی سرحدوں پر واپس آ گئیں۔ شرم الشیخ اور غزہ کے علاقے اقوام متحدہ کی ایمرجنسی تحویل میں چلے گئے اور ناصر نے ہمیں جہاز رانی کی آزادی دینے کا وعدہ کر لیا۔
بطور چیف آف اسٹاف میرے عہدے کی میعاد ختم ہوئی

آزادی اور سیاست

تو میں نے اپنی وردی چھینک دی اور اکتالیس سال کی عمر میں عبرانی یونیورسٹی یروشلم میں پولیٹیکل سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لے لیا۔ اس مضمون میں میری تخصیص مشرق وسطیٰ کے معاملات میں تھی۔ بطور طالب علم مجھے زندگی میں جو فرق محسوس ہوا وہ ذمہ داری کا نہ ہونا تھا اور میرے طالب علمی کے دو سال ایک طویل رخصت کی طرح گزر گئے۔

اس کے بعد سیاست کا وسیع میدان شروع ہوا۔ پارلیمان کے انتخابات نومبر ۱۹۵۹ء میں منعقد ہوئے تھے۔ مجھے اسرائیل کی لیبر پارٹی کی طرف سے بطور امیدوار الیکشن لڑنے کے لیے کہا گیا۔ الیکشن کے نتیجے میں بن گوریان کی لیبر پارٹی کو پہلے سے بھی زیادہ نشستیں مل گئیں۔ مجھے نئی حکومت میں وزیر زراعت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پودوں اور زراعت سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ میری ماں خود اپنے ہاتھ سے بھی گوبھی وغیرہ سبزیوں کو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں اگایا کرتی تھی۔ اسرائیل میں نوے فی صدی زمین حکومت کی ملکیت ہے جو یہاں کے عربوں سے حاصل کی گئی تھی۔ ہم

ے جو منصوبہ تیار کیا اس کے مطابق ساحلی زمینیں ہوٹلوں اور سیاحوں کے تفریحی مراکز میں تبدیل کر دی گئیں۔ تمام ذیلی علاقوں، شہروں کی بجائے دوسرے علاقوں میں منتقل کر دیے۔ بنجر زمینوں کو زیرِ کاشت لے آئے۔ مختلف ممالک نے ہم سے زرعی ماہرین کی خدمات بھی طلب کیں۔ جو ہم نے بخوشی مہیا کیں۔ ان ممالک میں لاطینی امریکا کے علاوہ، قبرص، ترکی، کریٹ اور تھائی لینڈ، سیلون اور نو آزاد افریقی ممالک تھے۔ افریقہ میں بہت سے دیگر ممالک کے ماہرین بھی کام کر رہے تھے۔ لیکن صرف اسرائیل اور چین دو ایسے ممالک تھے جن کے ماہرین مقامی باشندوں کے ساتھ مل کر ہاتھوں سے کام کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔

جون ۱۹۶۳ء میں بعض اندرونی اختلافات کی بنا پر بن گوریان نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ اشکول نے سنبھال لی۔ میں مزید ۱۸ ماہ تک وزارت میں شامل رہا لیکن نومبر ۱۹۶۴ء میں مستعفی ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ بیوی اشکول کے زمانے میں کھٹن کی موجودگی میں میرے لیے کام کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ میں خود کو قیدی سمجھنے لگا تھا۔

فرصت کے زمانے میں، میں نے اخبارات کے لیے جنگ اور دفاع وغیرہ کے موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ بطور ایک جنگی نامہ نگار کے میری یہ خواہش تھی کہ میں ویت نام کی جنگ کا موقع پر جا کر جائزہ لوں۔ چنانچہ امریکی وزیر دفاع مسٹر میکنامارا نے مجھے ویت نام میں گھومنے کی تمام سہولتیں مہیا کر دیں۔ اگست ۱۹۶۶ء میں، میں دانانگ سے پہلی ایئر بورن ڈویژن کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ہیلی کاپٹر میں سفر کر رہا تھا۔ ویت نام میں امریکی جنگ بنیادی طور پر ہیلی کاپٹر کی جنگ تھی۔ ان دنوں وہاں کوئی ستر سو ہیلی کاپٹر موجود تھے جو یورپ کے تمام ہیلی کاپٹروں سے بھی زیادہ تھے۔ ان ہیلی کاپٹروں کے ذریعے انتباہ کے چار گھنٹوں کے اندر اندر ایک مکمل بٹالین کو دوبارہ دو دو ہتھیاروں

سمت ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائی جا سکتی تھی۔ امریکی فوج کی کارکردگی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا گویا وہ لڑائی نہیں، لڑائی کی مشق کر رہی ہو۔ ان کا بنیادی مسئلہ ویت کانگ پر حملہ نہیں بلکہ ان کی تلاش تھی۔ ویت کانگ کے لڑنے کا انداز یہ تھا کہ وہ صرف اسی وقت تباہ کن حملہ کرتے تھے جب انہیں کامیابی کا یقین ہوتا تھا۔

عرب اسرائیل جنگ ۱۹۶۷ء

۲۲ مئی ۱۹۶۷ء کو مصر نے آبنائے تیران کی ناکہ بندی کا اعلان کیا جس کا واضح مطلب اسرائیل کے ساتھ جنگ کا آغاز کرنا تھا۔ ۲۶ مئی کو ناصر نے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ جون کے ابتدائی دنوں سے ہی اسرائیلی سرحدوں پر واقع عرب ممالک کی فوجیں ہماری سرحدوں پر جمع ہو گئیں۔ ہم نے لام بندی کا حکم دے دیا۔ ہماری حکومت کے سامنے دو راستے تھے۔ عربوں کے خلاف فوری کارروائی یا پھر ناصر پر سفارتی ذرائع سے آہستہ آہستہ دباؤ کا راستہ۔ ہم نے پہلے بین الاقوامی سفارتی ذرائع استعمال کیے لیکن بحران بڑھتا چلا گیا اور پانچ جون کی صبح کو ہوائی حملے کے سائرن ایک بار پھر چیخنے لگے کہ اسرائیل حالتِ جنگ میں ہے۔

یہ جنگ صدر ناصر کے غلط اندازوں کی پیداوار تھی۔ ۱۹۵۶ء کے برعکس اس مرتبہ امریکا اور روس کے علاوہ برطانیہ اور فرانس بھی جنگ کے مخالف تھے اس لیے ناصر یہ سمجھتا تھا کہ وہ تنہا اسرائیل کو دبا لے گا اور اس کی مدد کو کوئی نہ آئے گا۔ اس چھ روزہ جنگ کی ایک وجہ شام کی اسرائیل کے خلاف انتہائی معاندانہ مہم بھی تھی۔ شام نہ صرف فدائین کی مدد کر رہا تھا بلکہ اس نے اردن کی طرف سے آنے والے دریاؤں کا رخ موڑنے کی بھی کوشش کی تھی۔ روسیوں کے رویے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پوڈگورنی نے عربوں کو شہ دی اور کہا کہ ان کی خفیہ اطلاعات کے مطابق اسرائیل حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب صدر ناصر نے صحرائے سینا میں دو ڈویژن فوج کا اضافہ کرتے ہوئے عرب اسرائیل سرحد سے اقوامِ متحدہ کی ہنگامی

فوج ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ جب یہ فوجیں وہاں سے ہٹائی گئیں تو ان کی جگہ فدائین نے لے لی ماہی کو ناصر کے گھر میں مصر کی حکمران جماعت عرب سوشلسٹ پارٹی کی سپریم کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اسرائیلی بندرگاہ ایلات کی ناکہ بندی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کا صاف مطلب یہ تھا کہ جنگ کا نقارہ بجایا جا رہا ہے۔ ناصر کے ان اقدامات سے اسرائیل کو تعجب ہوا۔ ہم جنگ نہیں چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی خلیج عقبہ کی بندش بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

۳۰ مئی کو اردن کے شاہ حسین نے مصر کے ساتھ دفاعی معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے اپنی فوجیں مصر و شام کی مشترکہ کمان میں دے دیں۔ امن کے تابوت میں یہ آخری کیل تھی۔ ۴ جون کو اسرائیل کے گرد محاصرہ اس وقت مکمل ہو گیا جب عراق اور مصر نے بھی مشترکہ دفاعی معاہدہ کر لیا۔ اب ایسی صورت میں جب عرب فوجیں ہمارے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ ہم کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ عربوں کی طرف سے پہلی چوٹ کھانے کے منتظر رہیں، ناکہ بندی کی بنا پر اسرائیل معاشی بحران میں مبتلا ہو رہا تھا اور ہمارے عوام پریشان تھے۔ ادھر اسرائیل کا وجود خطرے میں تھا اور ادھر لیوی اشکول کی حکومت تذبذب کا شکار تھی۔

اس دوران میں نے ایک پرائیویٹ شہری اور اپوزیشن کے رکن پارلیمان کی حیثیت سے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے مصر اور اسرائیل کی مشترکہ سرحد کا دورہ کیا۔ ابھی تک آپریشن کا منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا اور مختلف تجاویز زیر غور تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ تمام تجاویز جنگی نقطۂ نگاہ سے پیچیدہ تھیں۔ ہمارا جنگی منصوبہ ایسا ہونا چاہیے تھا جس کی بنا پر مصریوں کو اپنے منصوبے میں تبدیلی کرنا پڑتی اور چونکہ وہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہی لا سکتے تھے اس لیے اس سے یقیناً ہمیں فائدہ پہنچتا۔

اسرائیلی عوام کا مطالبہ تھا کہ اس بحران کے زمانے میں آزمودہ کار اور محب وطن افراد کو حکومت میں شامل کیا جائے۔ اخبارات بھی اس پر زور دار اداریے تحریر کر رہے تھے۔ جہاں کہیں لوگ مجھے دیکھ لیتے میرے ارد گرد ایک مجمع لگ جاتا اور "زندہ باد" کے نعرے لگنے شروع ہو جاتے۔ میں نے حکومت سے ایک عام سپاہی کی طرح جنوبی محاذ پر لڑنے کی اجازت مانگی جسے قبول کر لیا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم اب بھی مصر کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔

۲۶ مئی لیوی اشکول نے پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے اپوزیشن اور سرکاری پارٹی کے چیدہ ارکان پر مشتمل ایک دفاعی کمیٹی میں شامل ہونے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ایک ایسا کام چاہتا ہوں جہاں میں لڑائی میں عملاً حصہ لے سکوں۔ میں نے حکومت پر واضح کر دیا کہ اب ہمارا مقصد مصر کی جنگی قوت کو تباہ و برباد کر دینا ہونا چاہیے۔ میں غزا کی پٹی پر قبضے کے اتنا حق میں نہ تھا جتنا مصر کے علاقے پر قبضے کے حق میں۔ جہاں تک حملے کی تاریخ اور وقت کا تعین تھا، میں نے انٹیلی جنس کی رپورٹیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان رپورٹوں کے مطابق صحرائے سینا میں مصر کوئی نو سو ٹینک، دو سو جنگی طیارے اور اسی ہزار فوجی جمع کر چکا تھا۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مصر کا مقصد زمینی حملے کے ساتھ ہی ہوائی حملے شروع کر دینا تھا۔

امریکا نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اگر اس کے مشورے کے بغیر جنگ کا آغاز کریں گے تو ہمیں تنہا لڑنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس اثنا میں مصر نے ہم پر حملہ کر دیا تو وہ ہماری مدد کرے گا۔ امریکا سفارتی ذرائع سے مصر کو نرم کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران اشکول کی حکومت کے غیر یقینی رویے کے خلاف اسرائیل میں احتجاج بڑھ رہا تھا اور ایک مضبوط انتظامیہ کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ ایک اخبار نے لکھا کہ مجھے وزیر دفاع اور بن گوریان کو دوبارہ وزیر اعظم بنایا جائے۔

۳۰ مئی کو اشکول نے مجھے بلایا اور نائب وزیر اعظم کے عہدے کی پیش کش کی۔ لیکن میں نے یہ پیش کش یہ کہہ کر

ردکردی کہ میں کسی ایسے عہدے کو قبول نہیں کرسکتا جہاں میرا فرض صرف مشورے دینا ہو۔ میں نے بلکہ یہ کہا کہ مجھے موجودہ چیف آف اسٹاف کے ماتحت مصری محاذ پر ہی سہی لگا دیا جائے۔ اگلے روز شام کے چار بجے اشکول نے مجھے ٹیلی فون کرکے دوبارہ بلایا اور کہا:

"ہم آپ کو وزیرِ دفاع کا عہدہ دینے پر آمادہ ہیں۔" شام کے سات بجے اس فیصلے کی توثیق کردی گئی۔

وزارتِ دفاع کا قلمدان سنبھالتے ہی میں سابق جنگی ماہرین، جرنلوں اور سپہ سالاروں کو اپنے گرد جمع کیا اور ان سے صلاح مشورے شروع کردیے۔ ۲ جون کو کابینہ کا اجلاس ہوا۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں جنگ میں صرف مصر کی جنگی طاقت کو تباہ کرنے کا اصل مقصد بنانا چاہیے۔ ہمیں جغرافیائی فوائد پر نظر رکھنی چاہیے۔ ہمیں نہر سویز پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح ہمارے بعض دوست بھی اپنے مفادات کی بنا پر ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔ میں نے جنگ فوراً شروع کرنے پر زور دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ جنگ تین دن سے پانچ دن کی ہوگی۔ وزیرِ خارجہ کا بیان جنگ کرنے کے متعلق زیادہ پرجوش نہ تھا۔

امریکا کے متعلق ہمیں خبر ملی کہ وہ مصر کو نرم کرنے میں ناکام رہا ہے اور وہ اقوامِ متحدہ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہے۔ تاہم امریکا ہمیں جنگ میں پہل نہ کرنے کا مشورہ اب بھی دے رہا تھا۔ ادھر ہمیں اطلاعات ملیں کہ مصر جنگ میں پہلا قدم اٹھانے کی پوری تیاری کرچکا ہے۔ یہ خبریں بھی ملیں کہ مصر اردن کو اس بات پر آمادہ کرچکا ہے کہ اپنے محاذ پر لڑائی میں پہل کرے۔ ہمیں فوری طور پر شب خون کے انداز میں حملہ کرنے میں یہ فائدہ تھا کہ اس طرح ہمارا جنگی اور مالی نقصان بہت کم ہوتا۔ ہمارے پاس محدود تعداد میں پائلیٹ، فوج اور اسلحہ تھا۔

۴ جون کو بالآخر کابینہ کے اجلاس میں ہم نے امریکی مشورے کے برعکس یہ فیصلہ کرلیا کہ فوج جس قدر جلد ممکن ہو حملے کی تاریخ اور وقت کا تعین کرے

اگلے روز صبح پونے آٹھ بجے کارروائی کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایمرجنسی فوجی ہیڈ کوارٹرز کے ایک کمرے میں اپنا دفتر قائم کرلیا اور رات کو بھی وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ کی مقررہ ساعت سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے اپنی بیوی کے ساتھ پرسکون انداز میں کافی پی، لیکن اسے جنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بعد میں میری بیوی نے گلہ کیا کہ ایسے اہم منصوبے کے متعلق اسے کوئی اشارہ تک نہیں دیا گیا۔

بالآخر ۵ جون ۱۹۶۷ء کو صبح کے ٹھیک آٹھ بجے دھماکہ ہوگیا۔ میرے بنائے ہوئے جنگی منصوبے سے ایک آنکھ نہ بچی۔ کسی کا کان ریڈیائی رابطے سے علیحدہ نہیں ہوا۔ جب ہمارے طیارے اپنے اپنے نشانوں تک پہنچ گئے اور یہ پتہ چل گیا کہ ان کا سراغ کسی کو نہیں ملا تو ایک بڑا پتھر ایک بڑا بوجھ ہمارے سینے سے اتر گیا۔ جنگ کا ابتدائی مرحلہ کامیابی سے طے پاچکا تھا۔ طیارے بمباری کرچکے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر پائلٹوں کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ دشمن کے زیادہ تر طیارے زمین پر ہی تباہ یا ناکارہ کردیے گئے۔ ہمارے طیاروں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ پس ہم نے دشمن کی فضائی طاقت کو تہس نہس کردیا۔ اب ہماری شہری آبادی پر ہوائی حملے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا، اور ہماری زمینی افواج کو اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ ان کے لیے ہوائی چھتری موجود تھی، مصری فوج کے لیے نہیں تھی۔

مصر کے خلاف ہمارے فضائی حملے کے دو مرحلے تھے، ایک مرحلے میں ہمارے ۱۸۳ طیاروں نے حصہ لیا۔ مصر کے گیارہ فوجی ہوائی اڈوں پر حملہ کیا گیا اور اس کے ۱۹۷ طیارے تباہ کردیے گئے۔ اس کے علاوہ مصر کے سولہ راڈار اسٹیشن بھی ناکارہ کردیے گئے۔

اس وقت جب ہماری فضائیہ مصری محاذ پر مشغول تھی، شامی، اردنی اور عراقی فضائیہ نے اسرائیل پر حملے شروع کردیے۔ شامی فضائیہ کے مگ سترہ

جہازوں نے زیادہ تر ہمارے کھیتوں اور زرعی فارموں پر بمباری کی خواہش پوری کی۔ ہم نے ایک دو مگ گرالیے عراقی اور اردنی فضائیہ بھی کسی ہوائی ٹھکانے کو نشانہ نہ بنا سکی اور واپس چلی گئی۔

دوپہر سوا بارہ بجے ہوائی حملے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس حملے میں ہم نے اردنی فضائیہ جو صرف ۲۸ طیاروں پر مشتمل تھی کا بالکل صفایا کر دیا۔ شام کی آدھی فضائیہ برباد کر دی گئی۔ اس کے ۱۱۲ میں سے ۵۳ جہاز فضا میں اور ۱۰ زمین پر برباد کر دیے گئے۔

اس دن میں نے زیادہ تر وقت ہوائی کمان کی پوسٹ پر گذارا۔ فضائی جنگ نہایت منظم انداز میں لڑی گئی۔ کمان پوسٹ کے افسروں کو فضا میں کام کرنے والے ہر شخص سے ذاتی واقفیت تھی۔ اسی اثناء میں ریڈیو قاہرہ نے اعلان کیا کہ مصری فضائیہ نے اسرائیل کے ۴۰ طیارے مار گرائے ہیں۔ مجھے اس جھوٹ پر ہنسی تو آئی — لیکن میں نے اپنے ذرائع ابلاغ سے کہا کہ وہ جنگ کے پہلے روز اپنی کامیابی کا اعلان نہ کریں۔

جہاں تک صحرائے سینا کے محاذ جنگ کا تعلق ہے اس حملے میں ہماری تین ڈویژن ٹاسک فورس نے میجر جنرل یسرائیل کی زیر کمان حصہ لیا۔ شام تک ہماری فوجیں بحیرۂ روم کے کنارے واقع مصری بندرگاہ العریش تک پہنچ گئیں۔ بندرگاہ العریش سے ہماری فوج کے بکتر بند یونٹوں نے تیزی سے صحرائے سینا کے وسط کی طرف پیش قدمی کی اور مرکزی سیکٹر کو عبور کر کے آنے والی دوسری یونٹوں سے جا کر مل گئیں۔ ام قطیف کے مقام پر دشمن کی مضبوط قلعہ بندیوں کو رات کے وقت توڑ دیا گیا۔ جب ہمارے پیرا ٹروپ دستے ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ ان قلعہ بندیوں کے عقب میں اتر کر حملہ آور ہوئے۔ اس مورچے پر مکمل قبضہ دو دن میں ہوا۔ اس کے بعد میدان صاف تھا اور ہماری افواج نہر سویز کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ زمینی جنگ میں ہماری فتح دو باتوں کا نتیجہ تھی۔ ایک یہ کہ ہماری فوجیں تمام تر مشکلات کے باوجود آگے بڑھتی چلی گئیں۔ دوسرے ہتھ دستہ جات بکتر بند، توپ خانہ بردار، پیدل اور انجینئرنگ دستوں کے درمیان قریبی رابطہ اور تعاون، فائرنگ میں مہارت اور جنگی اندازوں میں لچک۔

صحرائے سینا میں جنگ کے دوسرے روز جو مصری فوجی ابھی تک ہمارے نرغے میں نہیں آئے تھے انہوں نے قاہرہ سے احکام وصول کرنے کے بعد پسپا ہونا شروع کر دیا۔ جب ہمیں اس پسپائی کا علم ہوا، ہم نے شرم الشیخ پر قبضے کے لیے مقرر کردہ تاریخ بدل دی اور اس پر زمینی فوج کے ذریعے قبضے کی بجائے وہاں ہیلی کاپٹروں پر اپنے پیرا ٹروپ دستے بھیج دیے۔ سات جون کو وہاں ہمارا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی مصری ناکہ بندی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ روسی دباؤ پر سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس بلایا جا رہا ہے جس میں ہم سے جنگ بندی کا مطالبہ کیا جائیگا اس اطلاع کے بعد ہم نے نہر سویز کی طرف اپنی پیش قدمی کی رفتار اور تیز کر دی۔ دریائے مطلا کے پاس مصر اور اسرائیل کے درمیان قبضے کے لیے ٹینکوں کی شدید جنگ ہوئی۔ لیکن ہمارے ٹینک آگے ہی بڑھتے چلے گئے اور دس جون کو ہم نے صحرائے سینا پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ سینا میں جنگ اچانک ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ سے پہلے مصری مکمل طور پر خبردار ہو چکے تھے اور انہوں نے مزاحمت کی پوری کوشش کی۔

ناصر نے ۸ جون کو شکست تسلیم کرتے ہوئے جنگ بندی مان لی۔ مصر پر اس شکست کا نفسیاتی صدمہ ہوا تھا۔ مصریوں کو دوران جنگ یہ خدشہ لاحق رہا کہ ان کے جہازوں کی تباہی کے بعد ہم ان کے شہروں کو بمباری کا نشانہ بنا دیں گے لیکن ہم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اگر مصر کے بکتر بند دستے چاہتے تو وہ فضائی مدد کے بغیر جنگ کر سکتے تھے۔

مصر کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان ڈرامائی

انداز میں ہوا۔ سات جون کو ناصر نے اعلان کیا کہ جب تک مصر کی سرزمین پر ایک بھی اسرائیلی موجود ہے وہ جنگ جاری رکھے گا۔ لیکن اسی دن اسے معلوم ہوا کہ صحرائے سینا میں اس کی فوجیں بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہی ہیں اور ان کے لیے دفاعی مورچے بنانا ممکن نہیں۔ چنانچہ ۸ جون کو اس نے غیر مشروط جنگ بندی کے لیے کہا۔ اس عرصے میں ہماری فوجیں نہر سویز کے کنارے تک پہنچ چکی تھیں۔

اردن کے خلاف جنگ کرنے میں ہم نے کوئی پہل نہیں کی۔ لیکن جب ہماری بار بار درخواست کے باوجود اردن نے مصر کی حمایت میں لڑنے کا فیصلہ کیا تو ہمیں بھی جواب دینا پڑا۔

ہم نے اردنی فضائیہ کو تباہ کرنے کے بعد اردنی۔ یروشلم پر قبضے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے آگے بڑھتے ہوئے فوجیوں کو قدم قدم پر مضبوط مورچوں سے پالا پڑا لیکن بالآخر ہم نے سات جون کو دشمن کی آخری چوکی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہم نے رملہ اور جریشو کے قصبوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ آگے دریائے اردن تھا۔ دریائے اردن کے پار عمان، اردن کا دارالحکومت تھا۔ ہمارے سپاہیوں نے جیسے ہی دریائے اردن پار کیا امریکی سفیر بھاگتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہا کہ ہم دریائے اردن کے مغربی کنارے پر ہی رہیں۔ یہ درخواست ان سے اردن کے شاہ حسین نے کی تھی۔ چنانچہ دریائے اردن کے کنارے پر ہی ہماری فوجیں رکی رہیں۔ جیسے ہی ہماری فوجیں یروشلم کے پرانے شہر میں داخل ہوئیں۔ ہم پر تہذیبی جذبات غالب آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی جھنڈا لہرا دیا گیا ہے۔ میں نے حکم دیا کہ یہ جھنڈا اتار دیا جائے کیونکہ مقدس مقامات کی اہمیت ان باتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اردن کے ساتھ جس تیزی سے جنگ کا خاتمہ ہوا، اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچا کہ ہم پوری توجہ کے ساتھ شامی محاذ پر لڑنے لگے۔

شام نے اول اول جنگ میں زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ لیکن اپنی نصف فضائیہ کنوانے کے بعد شام نے اسرائیلی سرحدوں پر شدید گولہ باری شروع کر دی۔ ۹ جون کو ہم اردن اور مصر سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہماری فوجوں نے اب شام کا رخ کیا اور اس کی سرحدی حفاظتی بندیوں پر شدید حملہ کیا۔ جیسے ہی شام کو محسوس ہوا کہ گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ ہو جانے کا خطرہ ہے اس نے سیاسی اور سفارتی سطح پر جنگ بندی کی کوشش شروع کر دی۔ فوجی محاذ پر انہوں نے گولان کی پہاڑیوں سے فوجیں ہٹا کر پیچھے دمشق کے دفاعی مورچوں پر لگا دیں۔

چنانچہ گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ شامی فوجیں ابتری کی حالت میں دمشق کی طرف بھاگنے لگیں۔ گولان کے مورچوں سے آگے زعورا اور کالا کے مورچوں پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اور ہمارا کافی جانی نقصان ہوا۔ بالآخر فضائی کمک پہنچنے کے بعد ہم نے ان مورچوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ دس جون کو ہم نے جنگی نقطۂ نگاہ سے شام کے نہایت اہم شہر قنیطرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو شامی فوجیں اپنے مورچے خالی کر کے پہلے ہی جا چکی تھیں۔ یہیں بعد میں جنگ بندی لائن قائم ہو گئی۔ یہ جگہ دمشق سے صرف چالیس میل دور تھی۔

گولان کی پہاڑیوں کے بعد ہمارے لیے دمشق پہنچنا ہرگز مشکل نہیں رہا اور ہم جب چاہیں سیدھی سڑک کے راستے دمشق کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں حالانکہ ابتدا میں ہمارا مقصد شمالی محاذ کے صرف ان علاقے پر قبضہ کرنا تھا جس سے کہ ہماری نوآبادیاں شامی توپ خانے کی زد سے باہر آ جائیں۔ لیکن جب شام نے خود ہی اپنے مورچے پیچھے خالی کر دیے تو ہم نے آگے بڑھ کر ان پر قبضہ کر لیا۔ دس جون تک شام نے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے اور ساتھ ہی مشرق وسطیٰ میں یہ چھ روزہ جنگ اختتام کو پہنچ گئی۔

نئے حالات جنگ ختم ہوتے ہی میں نے حکم دیا کہ قدیم اور جدید، عرب اور یہودی یروشلم کو آپس میں
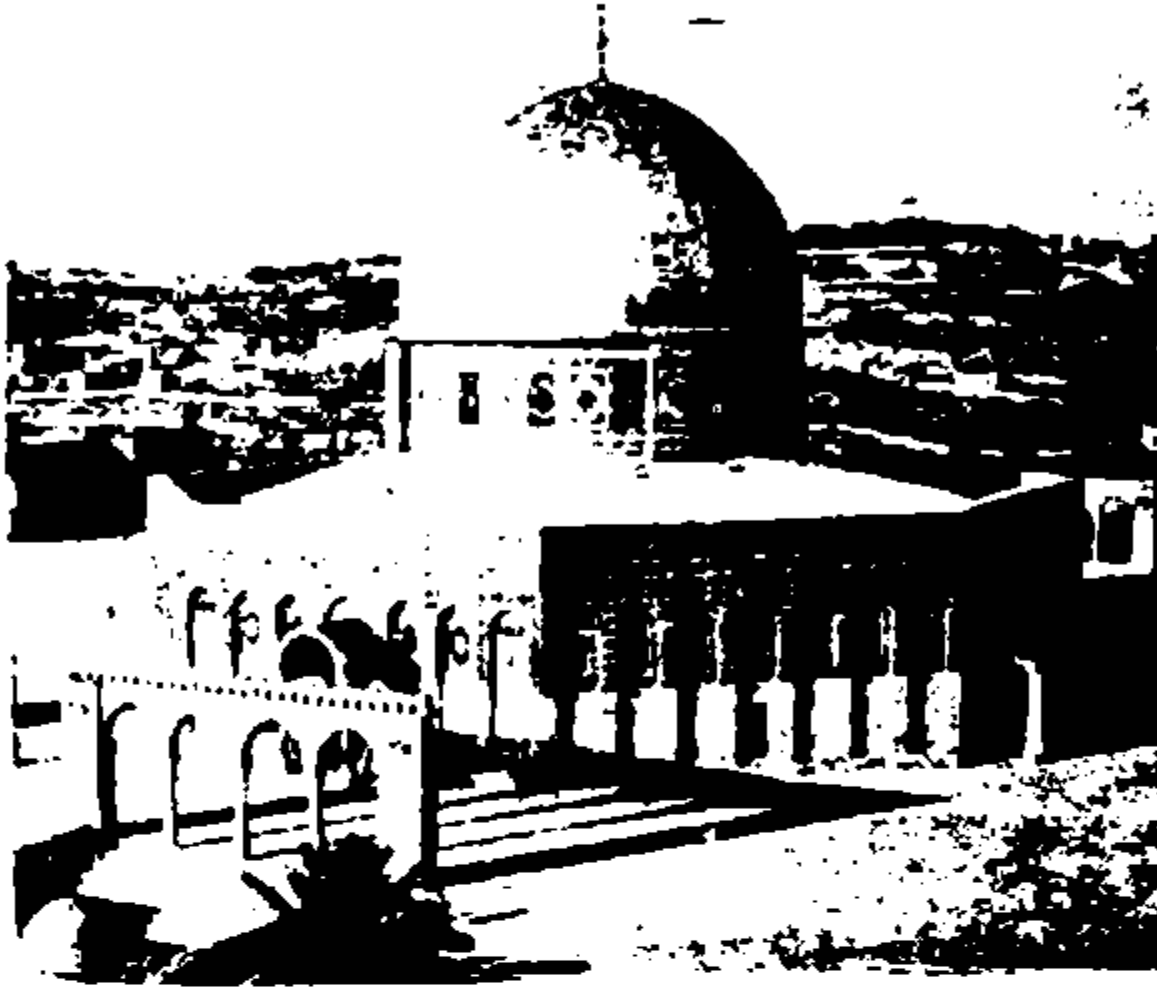
مشرقی یروشلم پر قبضہ کے فوراً بعد ناپاک یہودیوں کی بیت المقدس پر پیش قدمی

ملا دیا جائے۔ میرے اس حکم کی وزارت داخلہ نے زبردست مخالفت کی، لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ دونوں طرف سے رکاوٹوں کے ختم ہوتے ہی دونوں حصّوں کے شہری ایک دوسرے کی طرف آنے جانے لگے۔ عرب یہودی حصّے کی طرف اور یہودی عرب حصّے کی طرف۔ بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ ٹریفک جام ہونے لگی۔ مقدس دیوارِ گریہ اور مقام انبیا تک یہودیوں کی رسائی پر صدیوں سے پابندی چلی آرہی تھی۔ اب یہ پابندی ختم ہو چکی تھی۔ مشرقی یروشلم پر قبضہ کے فوراً بعد میں مسجد اقصےٰ کی طرف گیا۔ جہاں مفتی بیت المقدس اور مسجد کی انتظامیہ نے بجھے بجھے چہرے کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنے جوتے اور ہتھیار باہر رکھ دیں۔ اس کے بعد میں نے مسجد کے منتظمین کو یقین دلایا کہ آئندہ جمعہ سے مسجد میں دوبارہ عبادت کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ اس کی بجلی اور پانی بحال کر دیا جائے گا

اس سے پہلے جمعہ کا ہر خطبہ اردنی حکومت کی پیشگی منظوری کے بعد سنایا جاتا تھا۔ میں نے یہ پابندی ختم کر دی۔ میں نے فاتح فوج کو مسجد کی حدود سے باہر رہنے کا حکم دیا تاہم حرم الشریف کے دالان تک یہودیوں کی رسائی بحال کر دی گئی۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں کبھی ہیکل سلیمانی ہوا کرتا تھا اور یہ مقام نہایت مقدس خیال کیا جاتا تھا۔

اب جبرون میں واقع اس غار کا مسئلہ تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ اور دیگر انبیاء کے مقدس مزار ہیں۔ یہاں کے مسلمان پانچ وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے نزدیک بھی یہ مقام زبردست تقدس اور مذہبی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ دونوں مذاہب کے افراد کے لیے اس مقام کی زیارت اور یہاں عبادت کے اوقات مقرر کر دیے۔ البتہ دونوں کے آنے جانے کے لیے دروازے الگ کر دیے گئے۔

ہودیوں کو جو توں سمیت داخلہ کی اجازت دے دی گئی۔

شریکہ بود و باش

میں نے حکم دیا کہ مقبوضہ علاقوں کے عرب باشندوں اسرائیل میں گھومنے پھرنے کی پوری آزادی دی ئے حالانکہ اس سے ہماری سلامتی کو خطرہ بھی لا ق ہو سکتا تھا۔ لیکن آزادی کا ایک فائدہ یہ تھا س طرح عرب اور یہودی دونوں اچھے ہمسایوں طرح گھل مل کر رہ سکتے تھے۔ میں نے اپنے فوجی۔ ستوں کو عرب شہروں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ہمیں ڈن کے مغربی اور مشرقی کناروں کے درمیان جہاز رانی ورفت اور تجارت پر بھی ہم نے کوئی پابندی عائد نہیں

۔ اسرائیل کی پیداوار، تیار شدہ مصنوعات، سبزی اور ل اعلانیہ اردن کی طرف جانے لگے۔ باہمی آمد و رفت کو ید آسان بنانے کے لیے اردن اور اسرائیل کی حکومتوں باہمی اتفاق سے دریائے اردن پر پختہ پل بھی تعمیر کیے۔

جنگ کے بعد اردن کے شاہ حسین نے میانہ روی مصلحت کی پالیسی اختیار کر لی۔ لیکن دہشت پسند سطینی انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے تھے۔ اردن سرحد سے وہ اسرائیل کے اندر کارروائیاں کیا کرتے ے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ جنگ کے فوراً بعد یاسر عرفات اپنا کچھ وقت دریائے اردن کے مغربی کنارے پر گزارا اور یہاں باغی سرگرمیاں بھی منظم کرنے کی کوشش ی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اور وہ اردن چلا گیا۔

دہشت پسندوں کی کارروائیوں اور اسرائیل طرف سے جوابی کارروائیوں کا سلسلہ تین سال بعد ۱۹۷۰ء (بلیک ستمبر) میں ختم ہوا۔ اس عرصے میں۔ رائیل کے خلاف ۵۸۴۰ گوریلا کارروائیاں کی گئیں کے نتیجے میں ہمارے ۱۴۱ آدمی ہلاک اور ۱۸۰۰ زخمی) ہوئے۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں ہم نے اردن کے شاہ حسین بور کر دیا کہ وہ فدائین کے خلاف مناسب کارروائی ے کیونکہ فدائین نے اردن کے اندر اپنی الگ ریاست ائم کر رکھی تھی۔

بلیک ستمبر ۱۹۷۰ء کے آغاز میں فدائین نے شاہ حسین کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی اردن کی فوج کے ساتھ ان کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ چھ ستمبر کو فدائین نے یورپ کی فضا میں چار مسافر جہازوں کو اغوا کر لیا۔ صرف ایک طیارہ ان کے ہاتھ سے بچ نکلا جو اسرائیل کا تھا۔ اسے اغوا کرنے والی لڑکی لیلیٰ خالد کو ہم نے گرفتار کر لیا۔ پان امریکن بوئنگ جمبو کو قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اتارا گیا تھا... مسافروں سے خالی کرا کے اڑا دیا گیا۔ دو طیارے اردن میں زرقا کے مقام پر اتار دیے گئے۔ بہت جلد ایک اور طیارے کو اغوا کر کے وہاں اتار لیا گیا۔ فدائین کے پاپولر فرنٹ نے ان کارروائیوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے، اسرائیل، مغربی جرمنی، امریکا، برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے ساتھیوں کو جو وہاں قید میں ہیں رہا کر دیں۔ ورنہ ان جہازوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ اردن کی حکومت اور سلامتی کونسل کی بار بار اپیلوں کے بعد بالآخر ۱۲ ستمبر کو انہوں نے مسافروں کو جہاز سے اترنے کی اجازت دے دی۔ اور پھر بعد میں ان کے ......

اردنی فوج کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کی بنا پر فدائین کے خلاف اردن میں نفرت بڑھتی گئی اور ملک کے طول و عرض میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور شاہ حسین نے فوجی جرنیلوں پر مشتمل نئی کابینہ کی تشکیل دی۔ اردنی فوج کے ساتھ تصادم میں فدائیوں کو بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔ عمان کے آس پاس موجود زیادہ تر فدائین مارے گئے، شام نے فدائین کی مدد کے لیے اردن کی سرحد پار کر کے ایک بکتر بند فوج روانہ کی۔ اردن نے امریکا سے مدد کی درخواست کی۔ امریکا نے اپنی فوج کو خبردار رہنے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ شام کو بھی باز رہنے کی تنبیہ کی۔ ادھر اسرائیلی فوج کے دستے کڑائی کے مقام کے قریب جمع کر دیے گئے۔ اردنی فوج نے شامی فوج پر حملہ کر کے اسے

پیچھے دھکیل دیا۔ جب شاہ حسین کو یقین ہو گیا کہ فدائین کی کمر توڑی جا چکی ہے تو انہوں نے مصر کے صدر ناصر کی دعوت پر یاسر عرفات سے سمجھوتے کی بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ ۲۷ ستمبر کو قاہرہ میں یاسر عرفات اور شاہ حسین کے مابین کاغذی سمجھوتہ ہو گیا مگر اگلے روز ۲۸ ستمبر کو صدر ناصر دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے۔

اردن کی فوج نے فدائین کی سرگرمیوں کا مکمل صفایا کر دیا۔ اپریل ۱۹۷۱ء تک کوئی دہشت پسند اردن کی حدود میں باقی نہ رہا۔ جو فدائین گولی اور ٹینک کی زد میں نہیں آئے وہ پکڑے گئے۔ ایک سو فدائین نے سرحد عبور کر کے خود کو اسرائیلی حکومت کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی زندگی معمول پر آ گئی۔

اردن اور اسرائیل کے درمیان سرحدوں پر واقع دیہات کے عرب باشندے پناہ گاہوں کے بجائے اپنے گھروں میں امن و سکون کے ساتھ رہنے لگے۔

بطور وزیر دفاع

بطور وزیر دفاع مجھے جو دفتر دیا گیا وہ بہت فراخ تھا۔ میں نے اسے دو حصوں میں منقسم کر کے ایک حصے کو کانفرنس روم میں تبدیل کر دیا۔ میری میز پر چپل ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ چائے بھی ملنے والوں کو پلائی جاتی تھی۔ ہر جمعہ کے روز فوجی افسروں سے ملاقات کرتا تھا، باقی دنوں میں میں اکثر دفاعی یونٹوں، مورچوں اور مقبوضہ علاقوں کا دورہ کیا کرتا تھا۔ میرے دفتر کا وقت صبح ساڑھے سات بجے سے شام تک جاری رہتا۔ میں نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ میرے دفتر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ جب کوئی سیکرٹری، چیف آف اسٹاف یا دوسرا افسر کسی نکتے کی وضاحت چاہتا، بے دھڑک اندر آ کر پوچھ لیتا۔

فوجی یونٹوں کا میرا دورہ ہمیشہ کسی قسم کے طمطراق یا آن بان سے خالی ہوتا۔ مجھے گارڈ آف آنر کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے اس قسم کی رسوم ختم کر دینے کے احکام جاری کر دیے۔ مجھے تو فوجیوں کی تربیت

...ریزی سے اصل دلچسپی تھی۔ مجھے صاف ستھرے شیو، دھلے ہوئے لباس اور پالش شدہ جوتوں سے ہمیشہ رغبت رہی ہے۔ میں اپنے جوتے خود پالش کرتا ہوں۔ جوتے پالش کرنے کا فن میں نے ایک انگریز سے سیکھا تھا اور میں اس فن کو خوب جانتا ہوں۔

بطور وزیر دفاع اپنے چھ سالہ دور میں، میں نے فوج کے ہتھیاروں کے نظام کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ہم اہم ہتھیاروں کی ترسیل کے معاملے میں بیرونی مغربی طاقتوں پر انحصار نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے سے ہتھیار خود بنانا شروع کر دیے۔ مثلاً ہم نے ...ثانی ایک جنگی طیارہ بنایا، درمیانی اور لمبی میدان... بنائیں۔ فضا سے فضا میں مار کرنے والی میزائلیں بنوائیں۔ فضا سے زمین تک مار کرنے والی میزائلیں بنائیں۔ بحری میزائلیں تیار کیں، میزائل بوٹ...

بنائی۔ ہمارے دفاعی بجٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ دفاعی بجٹ میں زیادہ تر زور ہوائی فوج کی تعمیر پر دیا گیا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں وزیراعظم لیوی اشکول مر گئے۔ ان کی جگہ لیبر پارٹی نے گولڈا میئر کو وزیراعظم کے عہدے کے لیے نامزد کر دیا۔ ان کی درخواست پر میں نے وزارت دفاع کا قلمدان اپنے پاس برقرار رکھا۔ اگرچہ پہلے ہم دونوں ایک ہی کابینہ میں کام کر چکے تھے۔ لیکن بطور وزیراعظم مجھے ان کی اہلیت پر شبہ تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی نامزدگی کے سلسلے میں ووٹنگ میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔ بعد میں جب ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو میرے اور ان کے شک و شبہات دور ہو گئے۔ وہ واضح ذہن کی مالک خاتون ثابت ہوئیں اور میری وزارت کے اندرونی معاملوں میں کوئی مداخلت نہیں کرتی تھیں۔

انتقامی جھڑپیں

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عربوں کا رویہ اور زیادہ انتہا پسندانہ ہو گیا تھا اور انہوں نے ایک اور جنگ کے لیے تیاری شروع کر دی۔ جنگ کے فوراً بعد ایک اعلیٰ سطح کا روسی فوجی وفد مصر کی شکست کا تجزیہ کرنے کے لیے مصر پہنچا۔ وفد نے مختلف دفاعی مقامات کا دورہ کیا اور اپنے دو ماہ کے قیام کے بعد یہ رائے دی کہ صحرائے سینا میں موجود بے شمار روسی ٹینکوں میں سے ہر ایک اگر صرف دس گولے بھی پھینکتا تو عرب یہ جنگ جیت لیتے۔ حقیقت یہ تھی کہ بیشتر ٹینکوں نے ایک گولہ بھی نہیں چلایا تھا۔ روسیوں نے کہا، "اب ہم تمہیں لڑنا سکھائیں گے۔" جنگ کے بعد اٹھارہ مہینوں کے اندر اندر روسیوں نے مصر کا سارا جنگی نقصان، پورا کرنے کے بعد اس کی فضائی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ شام کو بھی مصر کی طرح بھرپور جنگی امداد فراہم کی گئی۔ ہزاروں روسی ماہرین نے مصریوں اور شامیوں کو جنگ کی تربیت دینی شروع کر دی۔ چند ماہ بعد مصریوں نے میزائل سے حملہ کر کے اسرائیلی جہاز ایلات کو ڈبو دیا۔ اس کے بعد نہر سویز کے دونوں کناروں پر جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ مصری باشندوں نے گولہ باری سے گھبرا کر، سویز، اسماعلیہ، اور قنطارہ وغیرہ شہر خالی کر دیے۔ ہم نے فضائی حملے بھی کیے اور دریائے نیل پر واقع متعدد پلوں کو بھی اڑا دیا۔ ان حملوں سے مصریوں کے علاوہ ان کے روسی مشیر بھی حیران رہ گئے۔

اب ہم نے نہر سویز کے مشرقی کنارے کے پاس بارلیولائن پر مضبوط مورچے بنانے کی طرف توجہ دی۔ ان مورچوں کو سیمنٹ اور پتھر کی دبیز تہوں سے تعمیر کیا گیا۔ جگہ جگہ قلعے بنائے گئے۔ ہر قلعے میں چند ٹینک سما سکتے تھے۔ لیکن ابھی ہم نے قلعہ بندیوں کی تعمیر مکمل نہیں کی تھی کہ مصریوں نے ۱۹۶۹ء میں شدید جھڑپوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک جھڑپ میں ہمارے ۲۹ آدمی ہلاک ہو گئے۔ ہم نے فضا سے جواب دیا اور پانچ گھنٹوں کے فضائی حملے کے نتیجے میں ہم نے قنطارہ سے پورٹ سعید تک مصر کے فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ ان کے پانچ طیارے بھی مار گرائے۔ جولائی کے آخر میں ایک اور فضائی معرکے میں ہم نے مصر کے بارہ ہوائی جہاز نیچے گرا لیے۔ اس پر مصری فضائیہ کا کمانڈر سبکدوش کر دیا گیا۔ پھر تھوڑے عرصوں بعد صدر ناصر نے اپنے چیف آف اسٹاف کو برطرف کر دیا۔ ۱۹۷۰ء کے ابتدائی تین مہینوں میں ہم نے بیس مصری فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ اس کے بعد مصر نے اپنا تمام طیارہ شکن دفاعی نظام جس میں سام میزائلیں بھی شامل تھیں روسی کمان کے تحت دے دیا۔ جولائی ۱۹۷۰ء روسی اور اسرائیلی طیاروں کے درمیان فضا میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس لڑائی میں آٹھ روسی مگ ۲۱ طیاروں نے حصہ لیا۔ ہم نے پانچ طیارے مار گرائے۔ ان کے روسی پائلٹ مصری سرزمین پر اترے۔ ان میں سے دو بعد میں مر گئے۔ ہمارے پائلٹوں نے بتایا کہ روسی پائلٹوں کا لڑائی کا انداز ظاہر کرتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی تربیت سے لوٹ کر آئے ہوں اور کتاب دیکھ کر عمل کر رہے ہوں۔

بالآخر تین سال کی مسلسل جنگ کی حالت میں رہنے کے بعد ۸ اگست ۱۹۷۰ء کو مصر اور اسرائیل امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ راجرز کی کوششوں کے نتیجے میں جنگ بندی پر متفق ہو گئے۔

اس کے بعد میری نجی زندگی کا سب سے اہم واقعہ راچیل سے ملاقات اور شادی ہے۔ یہ شادی ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ یہ ہم دونوں کے لیے دوسری شادی تھی۔ روتھ کے ساتھ میری شادی ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی۔ جو باہمی محبت کا نتیجہ تھی۔ لیکن آگے چل کر یہ شادی کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں روتھ نے طلاق کا مطالبہ کیا اور ہمارے درمیان قانونی طور پر علیحدگی عمل میں آ گئی۔

جنگِ رمضان

۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء صبح چار بجے میرے بستر کے پاس موجود سرخ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی چلی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے مصر اور شام جنگ شروع کر دیں گے۔ میں نے اپنی وزارت کے سینئر اسٹاف کو خبردار کرنے کے لیے کہا اور اس کے بعد اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔ اسی روز "یوم کفارہ" منایا جا رہا تھا جو یہودیوں کے نزدیک بہت ہی مقدس دن ہوتا ہے۔ چنانچہ گلیاں سنسان اور سڑکیں ویران تھیں۔

اطلاع کا ذریعہ معتبر تھا۔ ایسی اطلاعات ہمیں پہلے بھی ملتی رہی تھیں۔ لیکن بعد میں صدر سادات نے آخری وقت میں اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ ہم نے فوراً اپنے اعلیٰ فوجی افسروں کا اجلاس بلایا۔ پہلے خیال یہ تھا کہ جون ۱۹۶۷ء کی طرح اس بار بھی عربوں کو حیرت اور دہشت میں مبتلا کر دیا جائے۔ لیکن یہ تجویز اس خدشے کے پیش نظر ترک کر دی گئی کہ شاید اس طرح ہم امریکہ کی ہمدردی کھو بیٹھیں گے۔ ہم نے باقاعدہ فوج کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ ریزرو فوج کو بھی تیار رہنے کا حکم دیا اور سرحدوں کے پاس واقع علاقوں سے عورتوں اور بچوں کا انخلا شروع کرا دیا۔

فضائیہ تو ہم پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ شامی محاذ پر ہمارے ۱۸۰ ٹینک، گیارہ توپ خانے کی بیٹریاں اور پانچ ہزار سپاہی تھے۔ مصری محاذ پر ہمارے ۲۷۵ ٹینک، ۱۲ توپ خانے کی بیٹریاں اور پچاس سو سپاہی تھے اگرچہ ہمیں اطلاع مل گئی تھی۔ لیکن ہم فوج کو اچھی طرح حرکت میں لا چکے تھے۔ ہمیں یہ خبر مل چکی تھی کہ مصری فوج نہر سویز کو چھوٹی کشتیوں کے ذریعے رات کی تاریکیوں میں عبور کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ تاریکی اور نہر کے ساتھ ساتھ سام میزائلوں کی موجودگی میں فضائیہ کی مدد سے ان پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہماری زمینی افواج ہی ان کا مقابلہ کریں گی اور فضائیہ دوسرے دن ان کو روکنے کی کوشش کرے گی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ بکتر بند اگلے روز تک مصری محاذ پر پہنچا دی جائے گی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس بار ہم کسی علاقہ پر قبضہ نہیں کریں گے۔ صرف دشمن کی طاقت تباہ کرنا ہمارا مقصد ہو گا۔ ہم نے امریکہ کو بتا دیا کہ ہماری اطلاع کے مطابق مصر اور شام ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لیکن امریکہ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

سہ پہر ۲ بجکر پانچ منٹ پر ہمیں اطلاع ملی۔ شام اور مصر نے لڑائی شروع کر دی ہے۔ شامی طیارے ہماری فضائی حدود میں داخل ہو گئے تھے اور مصری فوجیوں نے نہر پار کرنا شروع کر دی تھی۔ مصر اور شام کے پاس ۶۲ روسی ٹینک تھے۔ سام میزائل جیسے خطرناک طیارہ شکن ہتھیار تھے اور انہیں روس کی آشیرباد بھی حاصل تھی۔ روسی آشیرباد کا اس بات سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ صرف چند روز پہلے روس نے شام اور مصر سے اپنے فوجی مشیروں کا انخلا کرا دیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہمیں بے خبری میں جنگ کے میدان میں آنا پڑا تھا۔ دراصل ہم اس جنگ کے لیے پوری طرح تیار اور اس کے امکانات سے باخبر تھے۔

جب ہم پر حملہ ہوا

جنگ کے پہلے دن میں ہمارا

جنگی اور جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ مصر اور شام کو اسرائیل کے مقابلے میں یہ سہولت حاصل تھی کہ ایک تو جنگ میں تقدیم ان کی طرف سے ہو چکی تھی۔ دوسرے ان کی فوجی تعداد ہم سے زیادہ تھی، لیکن اس کے باوجود

ہمیں یقین تھا کہ جنگ میں فتح ہماری ہوگی۔ اس روز نصف شب تک مصری اپنے بائیس سو میں سے، تقریباً پانچ سو ٹینک نہر کے مشرقی کنارے پر اتار چکے تھے اور ۱۴۸ توپیں بھی لے آئے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف ۲۷۶ ٹینک اور ۴۸ توپیں تھیں۔ شمالی محاذ پر ہمارے ۱۷۷ ٹینکوں اور ۴۴ توپوں کے مقابلے میں شامی ۱۵۰۰ ٹینک اور ۹۶۰ توپیں لے آئے تھے وہ اس محاذ پر سترہ سو ٹینک اور ۳۰۰ میدانی توپیں جھونکنے والے تھے۔ جب لڑائی کی پہلی گولی چلی عربوں کے دس سپاہیوں کے مقابلے میں ہمارا صرف ایک سپاہی کھڑا تھا۔ ان کے پاس نہایت جدید ہتھیار اور اینٹی ایرکرافٹ میزائل بھی موجود تھے۔ فضا میں صورت حال یہ تھی کہ مصر کے ۶۰۰ اور شام کے ۳۵۰ جنگی طیارے ہمارے خلاف سرگرم عمل تھے۔

آٹھ گھنٹے کی لڑائی کے بعد چیف آف اسٹاف نے مجھے بتایا کہ "دونوں محاذوں پر صورت حال ہمارے حق میں ہے۔ شامیوں کا حملہ روک دیا گیا تھا۔ مصریوں نے البتہ نہر پار کر کے ہمارے کچھ مورچوں پر قبضہ کر لیا تھا ہم نے صورت حال کا بغور جائزہ لیا اور ابتدائی جنگی منصوبے میں کچھ تبدیلی کی۔ شام کے طیارہ شکن نظام پر حملہ کرنے کی بجائے اب ہم نے تمام تر فضائی طاقت مصر کے محاذ پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ مصریوں نے نہر سویز کامیابی سے پار کر لی تھی اور ہمیں سخت نقصان پہنچایا تھا۔ ہمارے مقابلے میں ان کا نقصان بہت معمولی تھا۔

حملے کے آغاز میں شام نے ۱۵۰۰ ٹینک جھونک دیے۔ ہمارے پاس صرف ۱۷۷ ٹینک تھے۔ آدھی رات کے بعد شام تین سو ٹینک مزید لے آیا۔ اس طرح کل ملا کر ان کے آٹھ سو ٹینک ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ جنگ کے آپریشن روم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ صحیح طور پر منصوبہ بندی نہیں کی جا رہی تھی اہم معاملات محاذ پر موجود کمانڈروں ہی کی صوابدید پر چھوڑے جا رہے ہیں لیکن بطور وزیر میں صرف سیاسی اقتدار کا مالک تھا۔ فوجی منصوبہ سازی میں مخل ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ میں نے فضائیہ کے ارباب بست و کشاد سے کہا کہ سب سے پہلے نہر سویز عبور کرنے والی مصری فوجوں پر بمباری کی جائے۔ لیکن انہوں نے مصر میں واقع میزائلوں کے اڈوں پر بمباری کرنے کا پروگرام بنایا۔

اگلے روز صبح چار بجے مجھے بستر سے جگا کر بتایا گیا کہ شامی محاذ پر صورت حال بہت سنگین ہو چکی ہے۔ ایک شامی دستے نے ہمارے مورچوں کو پار کر لیا تھا اور اب وہ قنیطرہ کے جنوب میں ان راستوں کی طرف بڑھ رہا تھا جو گولان کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے بحیرۂ گلیلی کی طرف نکل جاتے ہیں۔ میں فوراً ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر محاذ کی طرف روانہ ہو گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر شامی فوجیں ایک بار دریائے اردن کے قریب پہنچ گئیں تو انہیں روکنا نا ممکن ہو جائے گا۔ میں نے فوراً فضائیہ سے امداد طلب کی۔ کیونکہ اب صرف فضائیہ ہی شامی ٹینکوں کی پیش قدمی روک سکتی تھی۔ شام کے زبردست میزائل سسٹم کے باوجود ہمارے طیارے ان کے ٹینکوں پر جھپٹتے رہے، اور اس صورت حال میں واضح اثر پیدا ہوا۔ شامی فوج نے ایک اور مقام سے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن فضائیہ کی لگاتار بمباری سے ان کی کوشش ناکام رہی۔ لڑائی کے تیسرے روز اس محاذ پر پھر خطرناک صورت حال پیدا ہوئی۔ اس روز شامیوں نے قنیطرہ کو حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت میدان میں جھونک دی۔ یہاں ہمارا ساتواں بریگیڈ دفاع کر رہا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب ہماری فوج پسپا ہونے والی تھی اور حوصلے پست ہو چکے تھے ہمارے ایک دستے نے مغرب میں

ایک اہم چوٹی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی شامی فوج دفاعی پوزیشن میں آنے اور واپس جانے پر مجبور ہو گئی۔ ہم نے شام کے نو سو ٹینک اڑا دیے۔ ہم نے شامیوں کو اپنی حدود سے دھکیل کر اپنے گھر میں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب تقدیم ہمارے ہاتھ میں تھی۔ لڑائی کے ایک ہفتہ کے اختتام پر شامی نہ صرف دفاع کرنے پر مجبور کر دیے گئے بلکہ انہیں اپنی سرزمین پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ شامی محاذ پر ہماری اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہماری فوجیں عمدہ تیاری کی حالت میں تھیں جب کہ مصری محاذ پر صورت حال مختلف تھی۔

اگرچہ مصریوں نے لڑائی کے آغاز میں نہر سویز عبور کر لی تھی لیکن بارلیولائن پر واقع ہمارے سولہ مورچوں میں سے ایک بھی وہ اگلے چوبیس گھنٹے میں گرا نہیں سکے تھے۔ جب وہ ان مورچوں پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تو وہ ان کو محض عبور کر گئے اور پیچھے سے گولہ باری شروع کر دی۔ اس طرح یہ مورچے ایک دوسرے سے کٹ گئے۔ کچھ تنظیمی خرابیاں بھی یہاں ہماری مشکل کا باعث بنیں۔ مثلاً ہمارے ٹینک بارلیولائن سے چھ میل پیچھے کھڑے تھے۔ جب بالآخر انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انہیں پتہ چلا کہ مصری پہلے ہی ان کے منتظر ہیں۔ بارلیولائن پر ہلاک ہونے والے زیادہ تر ہمارے فوجی افسران تھے جو کھلی گولہ باری کی زد میں آ گئے تھے۔ علاوہ ازیں جنگ کے متعلق بھی ہمارے کمانڈروں سے لے کر حکومت تک غلط فہمی کا شکار تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم نہ صرف مصریوں کو نہر پار دھکیل دیں گے بلکہ چند دنوں تک لڑائی کا پانسہ پلٹ دیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ہمارے ایک ٹینک یونٹ نے ایک مورچے سے ہمارے آدمیوں کو بچانے کی کوشش کی تو ہمیں ٹینکوں کا زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ بعد میں ہمارے ٹینک بریگیڈیوں نے میجر جنرل البرٹ کی رہنمائی میں مصری فوج کی بکتربند طاقت کا زبردست مقابلہ کیا۔ لیکن ہمیں بے پناہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ہمارے جوان ٹینکوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ اگرچہ ہم مصریوں کو نہر پار دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن ان کی پیش قدمی روک دی گئی۔ اگلے روز ہماری ریزرو فوج بھی محاذ پر پہنچ گئی۔ ذکھ کا احساس مٹانے

ے لیے میں نے اس محاذ کے جی او سی کے ساتھ سیاہ کافی کے کئی پیالے پیے۔ لیکن میری بے چینی پھر بھی کم نہ ہوئی! زندگی میں مجھے کبھی اس قدر اضطراب کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا مجھے احساس تھا کہ اگر ہم نے اپنے جنگی منصوبے میں مناسب تبدیلی نہیں کی تو اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ میں نے مسز گولڈا میئر سے کہا کہ ـــــ ہم نہر سویز کی لائن کو چھوڑ دیں اور کچھ فاصلے پر دوسرا مورچہ قائم کر دیں جسے ہر قیمت پر برقرار رکھیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اپنے نقصان کو پورا کرنے کے لیے ہم فوراً امریکہ سے ٹینک اور طیارے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ جب میں نے یہ تجاویز ارکانِ کابینہ کے سامنے رکھیں تو وہ اسے میری ذاتی کمزوری سمجھے۔ حالانکہ جو کچھ میں نے کہا وہ ایک حقیقت تھی اور ہمارے لیے موجودہ پلان کے مطابق مصر کا مقابلہ کرنا یا اس کی فوجوں کو پیچھے دھکیلنا ممکن نہ تھا۔ اس جنگ میں اگرچہ فضائی لڑائی میں عربوں پر فوقیت حاصل تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ عرب اپنے طیارے اڑا ہی نہیں رہے تھے۔ اولین چوبیس گھنٹوں میں ہم نے عربوں کے چالیس طیارے مار گرائے۔ لیکن ساتھ ہی ہمارے پچیس طیارے بھی ان کے طیارہ شکن میزائلوں کی زد میں آ کر تباہ ہو گئے۔ آٹھ اکتوبر کو میری تجاویز کے برعکس فوجی ہائی کمان نے مصری محاذ پر ٹینکوں کے ذریعے جوابی حملے کا منصوبہ بنایا۔ سینکڑوں ٹینک محاذ پر روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ حملہ سراسر ناکام رہا۔ ٹینکوں پر مصریوں نے اینٹی ٹینک میزائلوں اور راکٹوں سے بھرپور حملہ کر کے انہیں ناکارہ کر دیا۔ اسی روز شام کو ہم نے فیصلہ کیا کہ نہر سویز عبور کر کے دوسری اور تیسری مصری فوج کو عقب میں جا کر تباہ کر دیا جائے۔ مسئلہ نہر کے کنارے پہنچنے اور وہاں پل بنانے کا تھا

علاوہ ازیں ہم نے اپنی قوم کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے، سترہ سال تک کے نوجوانوں اور زیادہ سے زیادہ عمر کے شہریوں کی عام لام بندی اور مصر کے محاذ پر نئے کمانڈروں کا تقرر، امریکہ کے صدر نکسن سے مسز گولڈا میئر کی خفیہ ملاقات اور ان سے فوری طور پر ہتھیاروں کی سپلائی کی درخواست کا فیصلہ کیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ شمالی محاذ پر اپنی فوجوں کو ہرگز پیچھے نہ ہٹنے کا آخری حکم دیا جائے خواہ اس میں ہمارا آخری سپاہی اور آخری ٹینک ہی تباہ کیوں نہ ہو جائے۔

دس اکتوبر جنگ کا پانچواں دن تھا۔ اب ہماری فوجیں عربوں کے نئے ہتھیاروں کی عادی ہو چکی تھیں اور ان کا دفاع سمجھ چکی تھیں۔ ہمارے فوجیوں نے نئے اور مضبوط مورچے قائم کر لیے تھے۔ عرب افواج اس کشمکش میں تھیں کہ ان کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ اگلے قدم کے لیے ان کے پاس پہلے سے کوئی منصوبہ ہی نہ تھا۔

عربوں کے ساتھ ہماری پچھلی جنگوں اور موجودہ جنگ کے درمیان اہم فرق یہ تھا کہ اس مرتبہ عربوں کے پاس بے پناہ طاقت اور وسائل تھے۔ چھ روزہ جنگ کے مقابلے میں اب عربوں کی طاقت تین گنا بڑھ چکی تھی۔ پچھلی جنگوں میں ان کے پاس تین لاکھ سپاہ تھی لیکن اب دس لاکھ تھی۔ پہلے ان کے پاس سترہ سو ٹینک تھے، اب پانچ ہزار تھے۔ پہلے ان کے پاس ۵۰۰ طیارے تھے اب ایک ہزار سے بھی زیادہ تھے۔ پہلے ان کے پاس ۱۳۵۰ میدانی توپیں تھیں اب ۴۰۰۰ تھیں۔ تعداد میں اس اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی لڑائی کی مہارت اور اہلیت بھی بڑھ چکی تھی۔ ان کے پاس قیمتی اور بڑھیا سے بڑھیا ہتھیار اور خوفناک میزائل آ چکے تھے جن کا استعمال انہیں معلوم تھا۔ اس مرتبہ عرب سپاہیوں کی بہادری بھی قابل داد تھی پہلے کی طرح وہ میدان سے بھاگے نہیں۔ بعض مقامات پر عربوں نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا وہ آخر دم تک لڑتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس مرتبہ ہم کامیاب ہوئے بھی تو عرب افواج کو ختم نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں امریکہ کے صدر نکسن کی طرف سے بھی یہ شکایت رہی کہ

ہماری بار بار کی اپیلوں اور التجاؤں کے باوجود انہوں
نے فوری طور پر ہمیں دو فینٹم طیارے فراہم کیے۔ تاہم
مریکا نے وعدہ کیا کہ ہمارا تمام جنگی نقصان پورا کر دیا
جائے گا۔ اور اس وعدہ کی تکمیل میں ۱۴، اکتوبر سے ۱۴
ؔ برتک روزانہ امریکا کی طرف سے اسلحہ اور گولہ بارود
ہاری بھر کم طیاروں کے ذریعے اسرائیل بھیجا گیا۔ یورپ
بسی ملک نے ہماری مدد نہیں کی۔

جنگ کے ہفتہ بھر بعد مصری محاذ پر صورت حال
تر ہو گئی۔ شامی محاذ پر ہم نے شامیوں کو ۱۹۶۷ء کی
ل بندی لائن سے بھی پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اب ہم
ی توجہ سینا پر مرکوز کر سکتے تھے، ہم نے اپنی کچھ فوج
امی محاذ سے مصری محاذ کی طرف منتقل کی۔ یہ طے ہوا
جنگ بندی کا اعلان تو کسی وقت ہو سکتا ہے۔۔۔
ل بند ہونے سے پہلے پہلے ہمارے پاس مصر کا کچھ
اعلاقہ ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر ہم سودے
ی کی بہتر پوزیشن میں آجائیں۔ ہمیں ایسے علاقے پر قبضہ
تھا جو کسی پختہ پل کے ذریعے ہماری عقبی فوج سے
وط ہو۔ شام کو مزا چکھانے کے لیے ہم نے دمشق کی
ف پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقصد دمشق پر
مہ کرنا نہ تھا بلکہ اُسے خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس
ے میں شام کی دوتہائی طاقت تباہ کی جا چکی
ی۔ منصوبے کے مطابق گیارہ اکتوبر کو دن کے گیارہ
ہ طیاروں کے پیش رو حملوں کے ساتھ ہم نے شامی
ؤں پر نیا زوردار حملہ شروع کر دیا۔ تین دن تک
ں قدمی جاری رہی اور بالآخر دمشق سے دس میل
اصلے پر ہم نے نئے مورچے قائم کر لیے اور پیش قدمی
ل دی۔ ہمارا مقصد دمشق کو توپوں کی زد میں
اور شامیوں کو لڑائی سے ہمیشہ کے لیے باز رکھنا
۔ ہمیں اس لیے بھی دمشق میں داخلے کی کوئی خواہش
ی کہ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ عربوں کی مدد کے لیے روس
ی فوجی فارمیشنیں طیاروں کے ذریعے بھیجنے کا اہتمام
ا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ریچھ جنگل سے باہر نہ آئے۔

بہرحال ہمیں اب مصری محاذ پر پوری توجہ مرکوز
کرنا تھی اور اس امر کے باوجود کہ ابھی شام کے پاس
۹۰۰ ٹینک اور عراقی، مراکشی اور اردنی دستوں کی
مدد موجود تھی، ہم نے شامی محاذ سے اپنی کافی فوج۔
مصری محاذ کی طرف منتقل کر دی۔ ہمیں اس بات کا
اہتمام کرنا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو اس جنگ سے مصر کو کوئی
خاص منافع نہ ہو۔ مکمل غور و خوض کے بعد ہم نے نہر سویز
عبور کرنے اور خاص مصری سرزمین پر قاہرہ کی طرف جانے
والی سڑک پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہم مصری
اس فوج کے عقب میں پہنچ جاتے جو نہر کے مشرقی کنارے
پر آ چکی تھی۔ تاہم ہم نے اس منصوبے پر عمل درآمد
میں دو تین روز کی تاخیر کر دی۔ کیونکہ ہمیں امید تھی
کہ جلد ہی مصر نہر سویز کے مشرقی کنارے پر ہمارے
خلاف ایک بھرپور حملہ کرے گا اور ہم چاہتے تھے کہ مصر
کو پہلے اچھی طرح سے تھکا دیا جائے اور پھر نہر عبور کی
جائے۔ توقع کے مطابق تیرہ چودہ اکتوبر کو مصر نے ہم پر
ایک بھرپور حملہ کیا جس میں اس کے دو سو ٹینک
ضائع ہو گئے۔ ۱۵ اکتوبر شام کے سات بجے ہم نے
دیورسا کے پاس نہر عبور کر لی، ہماری دو ڈویژنوں نے
مصریوں کو جنگ میں الجھائے رکھا اور دو ڈویژنوں
نے نہر عبور کر لی۔ ہماری ایک پیرا ٹروپ پہلے ہی پار جا کر
پل تعمیر کر چکی تھی۔ نہر کے مغربی کنارے مصر کے سات سو
اور مشرقی کنارے پر چھ سو ٹینک تھے۔ فضا میں اس
کے پاس ۵۰۰ طیارے تھے۔ ہمیں نہر کے پار اترنے
کے لیے پل تعمیر کرنے میں کافی دشواری پیش آئی، کیونکہ
مصری فوج حملے کر کے انہیں تباہ کر دیتی تھی۔ تاہم ہم نے
کشتیوں کی مدد سے کافی ٹینک نہر کے دوسرے کنارے
پر پہنچا دیے۔ دراصل مصریوں کو نہر پار کرنے کے لیے ہمارے
اصل منصوبے کا علم بہت بعد میں ہوا۔ پہلے انہوں
نے ہماری اس کارروائی کو محض نئے حملے کی ایک کوشش
تصور کیا۔

اب ہمیں نہر کے دونوں کناروں پر لڑائی کرنا پڑی

گئی۔ نہر کے پاس سڑک پر مصریوں کا اژدہام تھا۔ ہمارے پیدل فوجی کا راستہ پیدا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اگلے روز صبح تک ہمارے بکتر بند دستے مصریوں کو پسپائی پر مجبور کر چکے تھے۔ یہ کارنامہ جنرل اوزی اور جنرل برین نے رات بھر کی خونریز جنگ کے بعد انجام دیا تھا۔ لیکن یہاں مصریوں کا دفاعی نظام اس قدر مضبوط تھا کہ جب بڑی سخت جنگ کے بعد ہم انہیں ایک مورچے کو چھوڑنے پر مجبور کرتے تو وہ دوسرے مورچے سے فائرنگ شروع کر دیتے۔ ہم نے اپنے کچھ پیرا ٹروپ دستے مصری مورچوں کے پیچھے بھیج دیے۔ جب مصری ان سے الجھے تو ہمارے ٹینکوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس عرصے میں ہماری مزید فوجیں مغربی کنارے پر پہنچ گئیں۔ اب مصری دفاعی حالت میں آ چکے تھے۔ مصری فوجیں سینکڑوں میل تک پھیل چکی تھیں۔ ۱۹ اکتوبر کو ہم پہل کرنے کی پوزیشن میں آ چکے تھے اور مصری روس کی وساطت سے جنگ بندی کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے اپنے کمانڈروں سے کہا کہ جنگ بند ہونے سے پہلے ہمیں اپنے ناگزیر مقاصد حاصل کر لینے چاہئیں۔ ۲۱ اکتوبر کو مجھے وزیر اعظم نے بلایا اور کہا کہ ہمیں امریکا نے خبر دی ہے کہ آج رات تین بجے سلامتی کونسل کا اجلاس ہونے والا ہے جس میں امریکا اور روس کی طرف سے جنگ بندی کے لیے کہا جائے گا لہٰذا ہمیں چاہیے کہ جلدی جلدی اپنا کام مکمل کر لیں۔ ۲۲ اکتوبر کی صبح ابتدائی ساعتوں میں، میں نے جنرل بارلیو سے کہا کہ ہمیں خلیج سویز کے مغرب میں واقع جبل عاتکہ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ اس علاقے پر قبضے کا مطلب یہ تھا کہ ہم اسماعلیہ سے لے کر خلیج سویز تک مصری علاقے پر مکمل فوجی اختیار حاصل کر لیتے۔ شہر سویز اور تیسری مصری فوج کو کاٹ دیتے اور نہر سویز کے مغربی کنارے پر موجود ہماری فوج کو گھر جانے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہتا۔ اسی روز صبح ڈھائی بجے مصر نے جنگ بندی قبول کر لی جس پر تقریباً شام سات بجے سے عمل درآمد ہونا تھا۔ اس اعلان کے باوجود مصر ہماری فوجوں پر حملے اور گولہ باری جاری رکھی لیکن وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ اگلے روز شام نے بھی جنگ بندی قبول کر لی۔ لیکن جنگ بندی موثر ہونے تک ہم بحیرہ احمر اور بریٹے کی مدد سے نہ صرف مصر کی تیسری فوج بلکہ بندرگاہ سویز کو بھی گھیرے میں لے چکے تھے۔

سفارتی بحران

تیسری مصری فوج کے گھر جانے کے ساتھ ہی ایک بھونچال آ گیا۔ روس نے امریکا سے کہا کہ اگر اسرائیل نے اپنے قدم پیچھے نہ ہٹائے تو وہ خود اپنی فوجیں بھیج کر اس مصری فوج کو چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ روسی فوجوں کا کام پہلے قاہرہ پہنچنا اور اس کے بعد نہر سویز کے مغرب میں ہماری فوجوں پر حملہ کرنا تھا۔ امریکا کو اس ممکنہ روسی مداخلت پر خاصی تشویش تھی اور اس نے اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ امریکا کو روس نے بتایا کہ وہ مصر کی تیسری فوج کو بھوک و پیاس سے ہلاک ہونے یا اسے قیدی بنائے جانے کی اجازت نہ دے گا۔ امریکا نے ہم سے کہا کہ ہر صورت میں تیسری کو بچایا جائے۔ امریکا اور روس کے درمیان بار بار ٹیلی فون ہو رہے تھے۔ مسلسل کابینہ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ بالآخر امریکا نے ہمیں الٹی میٹم دے دیا کہ ہم اپنی صفوں سے مصری فوج کو قاہرہ سے خوراک کی سپلائی کا راستہ دے دیں۔ ہم نے ایک سو مصری ٹرکوں کی سپلائی منظور کر لی اور بعد میں یہ تعداد بڑھا دی گئی۔ اس طرح مصری فوج کا گھیراؤ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اقوام متحدہ کی زیر نگرانی فریقین کے درمیان جنگ بندی لائن کے تعین کے متعلق مذاکرات شروع ہوئے۔ مصر چاہتا تھا کہ ہم ۲۲ اکتوبر کی لائن پر واپس آ جائیں لیکن ہمیں یہ بات منظور نہ تھی۔

مصر اور اسرائیل کے درمیان ڈاکٹر ہنری کسنجر کے توسط سے پہلا سمجھوتہ گیارہ نومبر کو ہوا جو صرف

یوں کے تبادلے اور تیسری مصری فوج کو اشیاء
ذ و نوش کی فراہمی سے متعلق تھا، ہماری طرف
جنرل عماصی نے مذاکرات میں حصّہ لیا۔ مجھے یہ
بات پسند نہ تھی۔ کیونکہ اس طرح جو کچھ ہم نے اس
ےمیں جیتا تھا اُسے مذاکرات کی میز پر کھو رہے
۔ لیکن بد قسمتی سے میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں سمجھتا
۔ ہمیں صرف اس وقت نہر کے مغربی کنارے
ں ہٹنا چاہیئے جب مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی صورت
ت عمومی سمجھوتہ ہو جائے۔ جس کے مطابق
ں نہر سویز سے جہاز رانی کا حق مل جائے۔ فریقین
یوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے مذاکرات
ں تھے کہ بن گوریان یکم دسمبر ۱۹۷۳ء کو چل بسا۔

شنگٹن یاترا

۲۷ دسمبر کو واشنگٹن میں ہنری
کسنجر سے دوبارہ ملاقات ہوئی
ے مذاکرات کا اہم موضوع اسرائیل کو امریکی
ہ وں کی فراہمی تھی۔ ہنری کسنجر نے مسکراتے ہوئے
۔ ہا ہے اسرائیلی سفیر دن میں دس مرتبہ ہمیں
روں کے متعلق یاد دہانی نہ کرائے تو اس کی
۔ بند کر دی جاتی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ
ہ براہِ راست امریکی کارخانوں سے اسلحہ اور
ے خریدنے کی اجازت دے دی جائے۔ کسنجر نے
مریکی حکومت ہماری کچھ درخواستوں کو منظور
ی اور دیگر درخواستوں پر غور کیا جائے گا۔ میں
یکا سے کہا کہ اگر مصر اور اسرائیل کے درمیان
ں کو پیچھے ہٹنا ہے تو پھر دونوں کے درمیان ایک
سمجھوتہ ہونا چاہیئے۔ اور فریقین کے زیرِ قبضہ
ں کے درمیان ایک غیر جانبدار علاقہ قائم کیا
۔ جہاں اقوامِ متحدہ کی فوجیں متعین کی جائیں۔
ے آبنائے باب المندب میں جہاز رانی کی آزادی
نت دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ امریکا نے
کی سرحدوں پر واپس آنے کے مصری مطالبے
ت نہیں کی۔ میرے دورۂ واشنگٹن سے واپس

وطن لوٹنے کے چار دن بعد کسنجر اسرائیل آئے۔ ہم نے
ان کے ساتھ ملاقات میں ایک بار پھر فراہمیٔ اسلحہ
کا معاملہ اُٹھایا لیکن کوئی نئی بات سامنے نہیں آسکی۔
امریکا کے سر پر عربوں کے تیل کے بائیکاٹ کا بھوت
بھی بہت بُری طرح سوار تھا۔ دنیا کو انصاف سے
کم اور عربوں کے تیل سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یورپ
کی حکومتیں اور جاپان تیل کے ہتھیار کے آگے گھٹنے ٹیک
۔ سمجھتے۔ اگرچہ ہمیں نہر سویز کے مغربی کنارے پر رہنے میں کوئی دلچسپی
نہ تھی اور ہم نہر سویز کھولنے اور اپنی فوجیں مشرقی کنارے
سے دُور لے جانے پر بھی آمادہ تھے لیکن یہ تمام معاملات
ہم کسی باہمی سمجھوتے کے مطابق طے کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

سیاست کسنجر اسٹائل

مشرقِ وسطیٰ کی سیاست
میں تیل اور کسنجر نے بہت
اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کسنجر کو بین الاقوامی امور کا
ماہر کہا جاتا ہے۔ جنوری ۱۹۷۴ء کے اوائل میں کسنجر پھرکی
کی طرح یروشلم اور قاہرہ کے درمیان گھومتا رہا۔ کبھی وہ

ہنری کسنجر

سادات سے ملتا اور کبھی گولڈا میئر سے۔ مذاکرات میں اب اصل اختلاف مطلا اور جدی کے درّوں پر قبضے اور فریقین کی فوجوں میں تخفیف کا تھا۔ ہم ان درّوں کو مصر کے حوالے کرنے پر کسی صورت میں تیار نہیں تھے۔ بالآخر مصر اور اسرائیل کے جرنیلوں کے درمیان ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۶ جنوری کو یہ سمجھوتہ ہوا کہ ہم خلیج سویز کے مشرقی کنارے پر سمندر گاہ سویز سے بارہ میل دُور تک اپنی فوجیں ہٹا کر لے جائیں گے۔ ۱۸ جنوری کو معاہدہ پر دستخط ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اِس محاذ پر توپیں مکمل طور پر خاموش ہو گئیں۔ اسی زمانے میں چیف آف اسٹاف جنرل شازلی کو سبکدوش کر دیا گیا اور مصری فوج میں بعض دیگر تبدیلیاں بھی لائی گئیں۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو سادات کی مصالحتی پالیسی کے خلاف تھے اور ہر صورت میں اسرائیل کے خلاف جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ مصر اور اسرائیل کے اس سمجھوتے کے مطابق مصر نے بھی اسرائیل کو کچھ مراعات دینی قبول کر لیں ان میں جہاز رانی کا حق اور باب المندب کی ناکہ بندی کی دھمکی کا خاتمہ وغیرہ شامل تھے۔ نہر سویز کو ایک سال کے بعد کھلنا تھا۔

آخری رکاوٹ

مشرقِ وسطیٰ کے بحران کے حل میں آخری رکاوٹ شام کا رویّہ تھا۔ شامی چاہتے تھے کہ جنگی قیدیوں کی فہرست فراہم کیے بغیر مذاکرات ہونے چاہئیں۔ ہمارا موقف اس کے برعکس تھا۔ یہ تعطل ۲۷ فروری ۱۹۷۴ء کو دور ہوا۔ جب ہنری کسنجر شام سے ہمارے جنگی قیدیوں کی فہرست جیب میں ڈالے بیت المقدس پہنچا۔ اس فہرست میں ۶۵ نام شامل تھے۔ شام نے کہا تھا کہ اسرائیلی قیدی بالکل عمدہ حالت میں ہیں، اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی۔ اسرائیل کا مطالبہ تھا کہ جب تک ان تمام قیدیوں کو رہا نہیں کیا جاتا شام سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ کسنجر نے کہا اگر شام اور اسرائیل کے درمیان مصالحت کردار ادا کرنے میں امریکا کو ناکامی ہوئی تو اس کی مشرقِ وسطیٰ میں ساکھ جاتی رہے گی اور اسرائیل ایک دشوار صورتِ حال سے دوچار ہو جائے گا۔ میں نے امریکا سے کہا کہ اگر اپنی مصالحتی کوششوں کی کامیابی کا اتنا ہی خیال ہے تو وہ ہمیں جدید ترین طیارے، میزائل اور ہتھیار فوراً فراہم کر دیں۔

مئی ۱۹۷۴ء کا پورا مہینہ کسنجر دمشق اور بیت المقدس کے درمیان روزانہ پھرکی کی طرح چکر کاٹتے رہے اس زمانے میں کسنجر نے سخت محنت سے کام کیا۔ شام کا مطالبہ تھا کہ ہم کم از کم گولان کی پہاڑیوں کے نصف حصّے سے دست بردار ہو جائیں اور جبل ہرمن کو بھی واگزار کر دیں۔ جہاں اس کے بیان کے مطابق ہم نے جنگ بندی اعلان کے بعد قبضہ کیا تھا۔ انہوں نے اس علاقے میں اقوامِ متحدہ کی فوج رکھنے کی تجویز بھی رد کر دی۔ دراصل وہ مصر سے ذرا مختلف سمجھوتہ کرنا

چاہتے تھے۔

شام کے ساتھ مذاکرات انتہائی دشوار ثابت ہوئے۔ بالآخر ہم نے بہت سی مراعات دینا منظور کر لیا ہم نے قنیطرہ شہر کو واپس کر دیا، شام نے جبل ہرمن کو اقوام متحدہ کی فوج کی زیر نگرانی دینا منظور کر لیا مذاکرات کی کامیابی کے اعلان تک شام نے کئی بار جبل ہرمن کو دوبارہ قبضہ میں لانے کی کوشش کی، لیکن ہر مرتبہ اسے ناکامی ہوئی۔ مذاکرات کا آخری دور جنیوا میں ہوا جہاں صرف فوجوں کی علیحدگی کے نام تفصیل پر بات چیت ہوئی۔ سمجھوتے پر ۵ جون ۱۹۷۴ء کو دستخط کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی شامی محاذ پر گذشتہ آٹھ ماہ سے بھڑکنے والی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

نئی زندگی ہمارے پارلیمانی الیکشن ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ہونے والے تھے۔ یہ الیکشن اکتوبر میں ہونے والے تھے لیکن جنگ کی بنا پر ملتوی کر دیے گئے۔ انتخابی نتائج کا انحصار لوگوں کی اس رائے پر تھا جو موجودہ واقعات کے بارے میں رکھتے تھے۔ عام طور پر لوگ عربوں کے ساتھ امن مذاکرات کے سلسلے میں حکومت کی پالیسی سے خوش نہیں تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ جنگ میں اسرائیلیوں کی دشواریاں کا ذمہ دار میں ہوں۔ چنانچہ مجھے تنقید اور احتجاج کا نشانہ بنایا گیا۔ اس پر حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جو اگرانات کمیشن کہلایا۔ کمیشن کا کام یہ کھوج لگانا تھا کہ جنگ کا آغاز ہونے سے پہلے کیا ہمارا اسراغرسانی محکمہ صحیح اطلاعات فراہم کرتا رہا ہے اور ذمہ دار افسروں اور رہنماؤں نے کیا فیصلے کیے تھے۔ علاوہ ازیں جنگ کے بعد فوجوں کی تیاری اور استعداد کے متعلق بھی تحقیق کرنا تھی۔ کمیشن کا چیئرمین سپریم کورٹ کا چیف جسٹس اگرانات تھا۔ اسرائیلی حکومت کا اعتماد لیبر پارٹی حکومت سے اٹھ چکا تھا اور وہ حالات میں تبدیلی چاہتے تھے۔ ہر روز مظاہرے ہوتے تھے اور ان مظاہروں کو باقاعدہ ٹی وی پر دکھایا جاتا تھا۔ مجھے

اسرائیلی وزیراعظم گولڈا مئیر

احساس تھا کہ اسرائیل کے اندر شکست خوردگی کا احساس جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔

الیکشن کے نتیجے میں لیبر پارٹی کو پہلے سے سات نشستیں کم ملیں، لیکن اب بھی اپوزیشن میں کوئی پارٹی تنہا حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ نئی مخلوط حکومت بنانے میں دو ماہ صرف ہو گئے۔ بالآخر گولڈا مئیر نے نئی حکومت کے ارکان کی فہرست اسمبلی میں پیش کر دی۔ لیبر پارٹی کی مخلوط حکومت کے پاس اسمبلی کی کل ایک سو بیس میں سے اکسٹھ نشستیں تھیں۔ اپنوں اور بے گانوں کا مخالفانہ رویہ دیکھتے ہوئے میں نے حکومت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے اس ارادے سے گولڈا مئیر کو مطلع کر دیا اور اخبارات میں بھی یہ خبر چھپا دی۔ اس دوران میں لیبر پارٹی میں زبردست پھوٹ پڑ گئی اور گولڈا مئیر نے حکومت بنانے کی

ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مارچ میں ہمیں ایک خفیہ ذریعے سے معلوم ہوا کہ ہماری اندرونی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر شام ہم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ اس خبر کے بعد سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اور حکومت بنانے کا مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا لیکن شامی حملے کی خبر جھوٹی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ایک بار پھر کابینہ میں اختلاف پیدا ہوا اور دو وزراء نے حکومت کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو گولڈا مئیر نے وزارتِ عظمیٰ استعفیٰ دے دیا اور اس کا یہ فیصلہ اٹل تھا۔ اس اثناء میں تحقیقاتی کمیشن کی ادھوری رپورٹ شائع کر دی گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق چیف آف اسٹاف سمیت بہت سے سینئر فوجی افسران کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ انہیں ان کے عہدے سے فوراً سبکدوش کر دیا گیا۔ میرے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ بطور وزیرِ دفاع میں جو کچھ کر سکتا تھا، اسے میں نے صحیح طریقے سے سرانجام دیا۔

۳ جون ۱۹۷۴ء کو مسٹر رابن کی سربراہی میں نئی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ جس میں شمعون پیریز کو وزیرِ دفاع بنایا گیا۔ جب میں نے وزارتِ دفاع سے سبکدوشی اختیار کی۔ اسرائیل فوج کی طاقت جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

عرب اِس جنگ میں کیوں کودے..؟

بات یہ تھی کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہار جانے کے بعد عربوں کے دل میں یہ بات بیٹھتی چلی گئی کہ وہ اپنے مقاصد صرف جنگ کے ذریعے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ امریکا مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے پر اپنا بھاری بھرکم کردار ادا کر سکتا تھا۔ لیکن وہ واٹر گیٹ اسکینڈل اور جنگِ ویت نام وغیرہ جیسے مسائل کی بنا پر داخلی الجھنوں میں کھویا رہا۔ جون ۱۹۶۷ء میں ہمارا موقف یہ تھا کہ ہم عرب علاقے خالی کر دیں گے۔ لیکن خرطوم کانفرنس کے بعد عربوں کا منفی رد یہ دیکھ کر ہم نے اپنی پیشکش واپس لے لی اور ہم نے اعلان کر دیا کہ ہم کبھی یہ علاقے خالی نہیں کریں گے۔

عربوں کے پاس بے پناہ ہتھیار جمع ہو چکے تھے ان کے پاس بھاری فوج تھی۔ اتنی زبردست فوج پر اٹھنے والے اخراجات عربوں خصوصاً مصر کے لیے ایک بھاری اقتصادی بوجھ ثابت ہو رہے تھے۔ سادات زیادہ دیر تک اس صورتِ حال میں حکومت نہیں چلا سکتے تھے۔ چنانچہ متوقع بحران سے بچنے کے لیے انہوں نے جنگ کا راستہ اختیار کیا۔

اسرائیل کے لیے یہ جنگ ایک اچانک برپا ہونے والا واقعہ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں سادات نے اعلان کیا تھا کہ یہ سال اسرائیل کے ساتھ فیصلے کا سال ہوگا لیکن دو سال کے بعد بھی کوئی واقعہ پیش نہ آسکا۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ شاید مصر اب جنگ نہیں کریگا۔ جس تاریخ کو جنگ شروع ہوئی اس سے ایک دن پہلے ہی ہماری خفیہ ایجنسی نے ہمیں رپورٹ دی تھی کہ مصر اور شام معمول سے ذرا زیادہ سرگرمی کے ساتھ فوجی مشقیں کر رہے ہیں۔ امریکی سی آئی اے کی بھی یہی رپورٹ تھی، کسی کو آخری وقت تک یہ علم نہ ہو سکا کہ مصر اور شام فی الواقعہ جنگ شروع کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نہر کے کنارے واقع ہمارے مورچوں پر مصری فوج کا راستہ روکنے والی کوئی بکتر بند فوج نہ تھی اور بعد میں جو کمک اس محاذ پر روانہ کی گئی وہ اس قدر کم تھی اور وقت اس قدر کم تھا کہ جوابی حملے کے لیے کوئی تیاری نہ کی جا سکی۔

اس جنگ میں عربوں کا مقصد محض اپنے مقبوضہ علاقوں کی آزادی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ غزہ، اکی پی اور درّہ متلا پر قبضہ کر کے اسرائیل کو اپنا من مانی شرائط پر جنگ بندی پر مجبور کرنا چاہ رہے تھے۔ لیکن عربوں کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ سادات نے اس وقت صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کیا جب اُسے روسی فضائی سروے اور تصاویر سے معلوم ہوا کہ اسرائیلی

نے نہ صرف اس کی دوسری اور تیسری فوج کے درمیان رابطہ منقطع کر دیا ہے بلکہ قاہرہ ان کی توپوں کی زد میں آنے والا ہے۔ چنانچہ سادات نے روسی لیڈر برزنیف کو تار دیا کہ وہ فوری طور پر جنگ بند کرنے پر آمادہ ہے اور جب جنگ بند ہوئی تو بھی سادات ہر گھنٹے بعد نکسن اور برزنیف کو پیغام پر پیغام دیے جا رہا تھا کہ اسرائیلی فوج کی پیش قدمی روکی جائے۔

شام کا یہ حال تھا کہ ہماری فوج دمشق کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی اور صدر اسد نے دارالحکومت کے گرد خندقیں کھودنے کا حکم دے دیا تھا۔

ہماری معلومات کے مطابق روس کو تو یہ احساس تھا کہ کہیں اس کا اتحادی ملک مکمل شکست سے دوچار نہ ہو جائے اور امریکا کا یہ خیال تھا کہ اس طرح وہ مصر کی خوشنودی حاصل کر کے نہ صرف تیل پیدا کرنے والے ممالک کے دل میں نرم گوشہ بنا لے گا بلکہ مشرق وسطیٰ میں اپنے اثر و رسوخ میں بھی اضافہ کر سکے گا۔

جنگ کے بعد سادات نے مصر کی پرانی جنگجویانہ پالیسی ترک کر کے امن کی پالیسی اختیار کرلی اور سیاسی مذاکرات کی طرف توجہ مرکوز کی۔

۱۹۷۳ء کی جنگ سے ثابت ہوا کہ ہماری توقعات کے برعکس عرب خوب لڑائی کر سکتے ہیں۔ اس سے ہماری فضائیہ اور جنگی منصوبہ سازی کے بعض کمزور پہلو آشکارا ہو گئے۔ پہلی جنگوں کے مقابلے میں اس جنگ میں ٹینک بڑی آسانی سے تباہ کر دیے گئے۔ عربوں کے جس قدر ٹینک ضائع ہوئے ان کی تعداد یورپ میں موجود تمام امریکی ٹینکوں سے زیادہ تھی۔ ہماری فضائیہ کو سام میزائلوں نے زبردست نقصان پہنچایا اور ہمارے ہوا باز صحیح نشانہ لگانے میں ناکام رہے۔ ہماری فضائیہ نہر سویز پر مصری پلوں کو اڑانے اور ان پر سے گزرنے والی فوجوں کو تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس جنگ میں عربوں نے ۵۵۰۰ ٹینک اور ایک ہزار سے زیادہ طیارے استعمال کیے۔ یہ صحیح ہے کہ آبادی

صدر اسد نے دارالحکومت کے گرد خندقیں کھودنے کا حکم دے دیا تھا

اور رقبے کے مقابلے میں ہمارے پاس زیادہ دفاعی سلاح و سامان ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔ جنگی مطالعات کے ادارے کی رپورٹ ۱۹۷۵ء کے مطابق برطانیہ اپنی ۵ کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی کے ساتھ ۹۰۰ ٹینک اور ۵۰۰ جنگی طیارے رکھتا ہے۔ فرانس اپنی پانچ کروڑ ۲ لاکھ آبادی کے ساتھ ۹۵۰ ٹینک اور ۴۶۱ جنگی طیارے رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس سے زیادہ بڑی فوجی طاقت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جنگی خاتمے کے باوجود ناموافق حالات کا رخ تبدیل نہیں ہوا۔ ہم نے اس جنگ میں ڈھائی ہزار افراد کی قربانی دی جو بہت بڑی قربانی ہے۔ لیکن اپنے وطن کے اندر یہودی قوم کے احیاء کے لیے آخری دم تک لڑنا اور دنیا میں جرات کے ساتھ زندہ رہنا ہمارا نصب العین بن چکا ہے۔ (تلخیص: میاں محمد افضل) ★★

خاندان گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنیے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دکان کرتے تھے لیکن تین پشتوں سے یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرے دادا اتم چند گاندھی عرف اوتا گاندھی اپنے اصول کے بڑے پکے تھے۔ اوتا گاندھی کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دوسری شادی کی۔ پہلی بیوی سے ان کے چار لڑکے تھے اور دوسری سے دو لڑکے۔ ان چھ بھائیوں میں تلسی داس گاندھی سب سے چھوٹے تھے اور ان سے بڑے کرم چند گاندھی عرف کبا گاندھی تھے۔ یہ دونوں بھائی آگے پیچھے پوربندر کے دیوان رہے۔ کبا گاندھی میرے والد تھے۔ وہ راجستانی عدالت کے رکن بھی تھے۔ وہ کچھ دن راجکوٹ میں دیوان رہے اور اس کے بعد میں بھی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ چوتھی بیوی سے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہوئے جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں۔

والدہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت اور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دیندار تھیں۔ انہیں ریاست کے معاملوں کے متعلق اچھی معلومات تھیں اور محل کی خواتین ان کی ذہانت کو بہت مانتی تھیں۔

ولادت میں ان ماں باپ کے گھر ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بمقام پوربندر پیدا ہوا۔ میرا بچپن کا زمانہ پوربندر ہی میں گزرا۔ مجھے یاد ہے کہ میں مدرسے میں بٹھایا گیا تھا مجھے پہاڑے یاد

پانچ پیر کی گائے

از
مہاتما گاندھی

کرنے میں کسی قدر دقت ہوئی۔ مجھے اس زمانے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میرا ذہن کند تھا اور حافظہ کمزور۔

میری عمر سات برس کی ہوگی کہ میرے والد راجستانی عدالت کے رکن ہو کر راجکوٹ چلے گئے۔ وہاں ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کیا گیا میں بہت شرمیلا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ سوا میری کتابوں اور میرے کام کے کوئی رفیق نہ تھا۔ ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقعے پر ایک واقعہ پیش آیا جو قابل ذکر ہے۔ مسٹر جائلس انسپکٹر اسکول معائنے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہجے کی مشق سے پانچ لفظ لکھوائے میں نے ہجے غلط لکھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھوکا کر آگاہ کرنا چاہا مگر میں باخبر نہ ہوا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کروں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی بیوقوف ثابت ہوا۔

میں سبق یاد تو کر لیتا تھا لیکن بے دلی سے۔ غرض جب سبق ہی جیسا چاہیئے یاد نہ ہوتا تھا تو اور کتابوں کے پڑھنے کا ذکر ہی کیا ہے۔ مگر خدا جانے کیونکر میری نظر ایک کتاب پر پڑی یہ شروَن کا ر پتر بھگتی ناٹک تھا۔ میں نے اسے بے حد شوق سے پڑھا۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں سفری ناٹک والے آئے ہم نے جو سین دیکھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ شروَن اپنے کندھوں پر ایک بہنگی رکھے اپنے اندھے ماں باپ کو یاترا کے لئے لے جا رہا ہے یہ کتاب اور منظر میرے دل پر ایسے نقش ہو گئے کہ مٹائے نہ مٹے۔ میں نے اپنے دل میں کہا دیکھ یہ مثال ہے جس کی تجھے تقلید کرنا چاہیئے۔ اسی قسم کا واقعہ ایک اور ناٹک کا ہے۔ اپنے والد کی اجازت سے میں ایک ناٹک کمپنی کا تماشا دیکھنے گیا۔ اس تماشے۔ ہریش چندر۔ نے میرے دل کو موہ لیا۔ میں اسے بار بار دیکھتا تھا اور نہ تھکتا تھا۔ "سب لوگ ہریش چندر کی طرح سچے کیوں نہ ہو جائیں" یہ سوال میں اپنے دل میں دن رات کیا کرتا تھا۔ حق کی پیروی کرنا اور سب کچھ سہنا۔ بس یہی ایک نصب العین تھا جس کی لگن اس تماشے نے میرے دل کو لگا دی تھی۔

پوربندر میں وہ تاریخی مکان جہاں گاندھی جی پیدا ہوئے تھے

شادی

میرا دردناک فرض ہے کہ اپنی شادی کا بیان کروں جو تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی جب میں اس عمر کے لڑکوں کو دیکھتا ہوں جو میری نگرانی میں رہتے ہیں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں مبارک باد دوں میری منگنی تین بار ہوئی حالانکہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ یہ کب ہوا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا کہ دو لڑکیاں جو میرے لئے پسند کی گئی تھیں مر گئیں۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے۔ ڈھولک بجے گی۔ بارات نکلے گی عمدہ عمدہ کھانے پکیں گے اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی

جب میری شادی ہوئی اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے ایک پیسہ یا ایک پائی کو بکا کرتے تھے جن میں بیوی میاں کی محبت، کفایت شعاری، بچپن کی شادی اور اسی قسم کی اور باتوں پر بحث ہوتی تھی جب مجھے کوئی اس قسم کا رسالہ ملتا تو میں شروع سے آخر تک پڑھتا تھا اور میری عادت تھی کہ جو بات پسند نہ آتی اسے بھول جاتا اور جو پسند آتی اس پر عمل کرتا ان رسالوں میں شوہر کا یہ فرض بتایا گیا تھا کہ عمر بھر بیوی کا وفادار رہے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گئی اس کے علاوہ حق

• گاندھی جی (عمر ۱۰ سال)
اپنے بڑے بھائی لکشمی داس کے ساتھ

کا عشق میرے خمیر میں تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں۔ مگر اس وفاداری کے سبق کا ایک برا نتیجہ بھی ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اپنی بیوی سے وفاداری کرنے کا پابند ہوں تو انہیں بھی اس کا پابند ہونا چاہیئے کہ مجھ سے وفاداری کریں۔ اس خیال نے مجھے بدگمان شوہر بنا دیا۔ مجھے اپنی بیوی کی پاکدامنی پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بدگمانی وجہ اور سبب کی پابند نہیں۔ میں ہمیشہ ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی کیا کرتا اس نے ہمارے آپس میں سخت نزاع کا بیج بو دیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جس زمانے میں میری شادی ہوئی میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں کودن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی۔ مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا بلکہ دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی پائے میں کسی ورزش یا کرکٹ فٹبال میں ان کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اس علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں جھینپتا تھا مگر ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آئی تھی اس لئے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی جو اب تک ہے پابندی سے ٹہلنے سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو لیا۔

غفلت کی سزا

ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک غفلت کی سزا میں اب تک بھگت رہا ہوں خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آگیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جزو نہیں۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب میں نے وہاں کے وکیلوں اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوبصورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا مجھے معلوم ہو گیا کہ برے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن وقت گذر چکا تھا۔ لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔

ہائی اسکول میں جن لڑکوں کی مجھ سے مختلف اوقات دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک المناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ میرا یہ رفیق اصل میں میرے منجھلے بھائی کا دوست تھا۔ جن دنوں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی راجکوٹ میں ریفارم کا بڑا زور تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے کہا "ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لئے کمزور ہے۔ انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں اسی لئے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ میری غذا گوشت ہے" وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ پر ہاتھ رکھ سکتا ہوں۔ چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں یہ سب گوشت کھانے کی برکت ہے" ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیئے مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر بنوں

اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ آخر کار وہ دن آگیا ہم نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشۂ تنہائی ڈھونڈا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت دیکھا۔ مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا مجھے قے ہو گئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ اس کے بعد کی رات بڑی بری طرح گذری مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا جب آنکھ لگتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ میں ممیا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ کھانا کھانے کے لئے اب ہمیں دریا کے کنارے سونی جگہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ریاست کے ایک مکان میں کھاتے تھے۔ میرے دوست نے وہاں کے باورچی سے ساز باز کر کے یہ انتظام کیا تھا میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا گوشت کھانے سے بھی بدتر ہے جب تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں اس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی۔ اس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہیں کھایا۔

گاندھی جی اور ان کی کمسن بیوی کستوربا بائی

شرم اور درد

میرے والد ناسور میں مبتلا اور صاحب فراش تھے۔ زیادہ تر میری والدہ۔ گھر کا ایک پرانا نوکر اور میں ان کی خدمت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ ادھر میرے والد کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخر وہ خوفناک رات آگئی۔ میرے چچا اس دن کوٹ ہی میں تھے۔ مجھے خفیف سا خیال ہے کہ وہ بری خبر سن کر کہ میرے والد کی طبیعت گرتی جاتی ہے راجکوٹ آئے تھے۔ کوئی ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔ میں پیر دبا رہا تھا میرے چچا نے کہا اب تم جاؤ میں دباتا ہوں۔ میں خوش ہوا۔ سیدھا سونے کے کمرے میں پہنچا۔ میری بیوی بے چاری غافل سو رہی تھی مگر بھلا جب میں پہنچ گیا تو وہ کب سونے پاتی تھیں میں نے انہیں جگا دیا ابھی پانچ چھ منٹ ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے دروازے پر دستک دی میں ڈر سے چونک پڑا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرا دل شرم اور درد سے معمور تھا۔

اہنسا کا سبق

میں وشنو ماں باپ کے یہاں پیدا ہوا اس لئے مجھے اکثر حویلی جانا پڑتا تھا لیکن یہ مندر میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔ اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے بھائی نے جو راماین پر بڑا گہرا عقیدہ رکھتے تھے میرے اور میرے بھائی کے لئے رام رکھشا سیکھنے کا انتظام کیا۔ ہم نے اسے زبانی یاد کر لیا ہی تو اسے ایک حد تک اس لئے پڑھتا تھا کہ مجھے رام رکھشا صحیح تلفظ سے ادا کرنے پر گھمنڈ تھا۔ جس چیز نے میرے دل پر گہرا اثر کیا وہ راماین کی تلاوت تھی جو والد صاحب کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ راجکوٹ میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ابتدا ہی سے ہندو مذہب کی تمام شاخوں اور مذہبوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تربیت ملی۔ میرے والد کے پاس جین سادھو بھی آیا کرتے تھے وہ میرے والد سے

دینی اور دنیوی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کے مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جو ان سے اپنے اپنے مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ادب سے اور اکثر دلچسپی سے سنا کرتے تھے میں ان کا تیماردار تھا اس لئے مجھے اکثر یہ باتیں سننے کا موقعہ ملتا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر مجھے سب مذہبوں سے رواداری کرنا سکھایا بلکہ میرے دوسرے مذہبوں سے رواداری کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں خدا پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں میری نظروں سے منوسمرتی گزری جو میرے والد کے کتب خانہ میں تھی۔ اس میں تخلیق اور اسی قسم کے دوسرے مسائل کا ذکر پڑھ کر میں زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس میرا رجحان دہریت کی طرف ہو گیا۔ بہرحال منوسمرتی سے مجھے اس زمانے میں "اہنسا" کا سبق نہیں ملا۔ میں اپنے گوشت کھانے کا قصہ بیان کر چکا ہوں منوسمرتی سے بظاہر اس فعل کی تائید ہوتی تھی۔

تعلیم میں نے میٹرک کا امتحان ۱۸۸۷ء میں پاس کیا میرے بزرگ چاہتے تھے کہ میں میٹرک پاس کرنے بعد کالج میں پڑھوں۔ کالج بھاؤنگر میں تھا۔ میں نے طے کیا کہ وہاں جا کر کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لئے مشکل تھی۔ پہلی ٹرم ختم ہوتے ہی گھر چلا آیا۔

ماوجی دیو ایک عالم اور دانشمند برہمن اور ہمارے خاندان کے قدیم دوست اور مشیر تھے وہ میری تعطیل کے زمانے میں ایک دن آئے اور والدہ اور بڑے بھائی سے باتیں کرنے لگے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں سامل داس کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میری رائے میں اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اسے انگلستان بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام کہتا ہے کہ بیرسٹری کا امتحان بہت سہل ہے تین سال میں لوٹ آئے گا۔ خرچ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ میری ماں سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا جو بات میں نے کہی ہے مہربانی سے اس پر غور کیجئے۔ اب کی میں یہاں آؤں گا تو امید ہے کہ انگلستان کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ میرے بڑے بھائی بہت متفکر تھے کہ مجھے انگلستان بھیجنے کے مصارف کہاں سے آئیں یہ تردد بھی تھا کہ میرے جیسے کمسن لڑکے کو پردیس بھیجنا مناسب ہے یا نہیں۔ ادھر میری والدہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھیں۔ بچارجی سوامی بھی جوشی جی کی طرح ہمارے خاندان کے مشیر تھے انہوں نے میری مدد کی۔ مجھ سے قسم کھلوائی اور یہ عہد لیا کہ میں شراب، عورت اور گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب یہ ہو گیا تو میری ماں نے جانے کی اجازت دے دی میں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوا اور خدا خدا کر کے ۴ ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔ ہم ٹلبری پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سب نے اپنا اپنا سامان مع کنجیوں کے گرنڈلے کمپنی کے ایجنٹ کے سپرد کر دیا اس لئے میں نے بھی یہی کیا۔

جیسے ہی اسباب آیا ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر دیا اور کمروں میں اٹھ گئے جو سندھی دوست نے ہمارے لئے کرائے پر لئے تھے مجھے اپنا گھر اور اپنا ملک بہت یاد آتے تھے۔ ماں کی محبت کا خیال دم بھر دل سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ میں انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل بتدی تھا۔ پھر ترکاری کے سوا کچھ نہ کھانے کا عہد ایک اور مصیبت تھی۔ ابھی میری باقاعدہ پڑھائی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی البتہ میں نے حال ہی میں شکل جی کے کہنے سے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بمبئی کے بنے ہوئے کپڑے جو میں پہنے ہوئے ہوں انگلستان کی سوسائٹی کے قابل نہیں ہیں اس لئے میں نے آرمی اینڈ نیوی کی کوٹھی سے نئے کپڑے خریدنے دس پاؤنڈ ضائع کر کے ایک ایوننگ سوٹ بنوایا مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی جینٹل مین بننے میں کسر تھی اس لئے میں نے دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی۔ میں نے طے کیا کہ ایک رقاصی کلاس میں ناچ سیکھوں گا۔ تین ہفتے میں کوئی چھ بار کلاس گیا لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی کہ جسم کی حرکت میں موزونیت پیدا کروں۔

تنہائی انجمن میں نے فیصلہ کیا کہ الگ کمرے کر رہوں بلکہ اپنے کام کے لحاظ سے تبدیل مقام کرتا رہوں تاکہ کفایت بھی ہو اور تجربہ بھی بڑھے کمروں کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ جہاں مجھے کام کرنا ہو وہاں پیدل چل کر آدھ گھنٹے میں پہنچ جایا کروں۔ غرض میں نے دو کمرے کرایہ

پہلے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی زندگی کو اور سادہ بناؤں مجھے یہ احساس تھا کہ میری زندگی کا معیار ابھی تک میرے خاندان کی محدود آمدنی کی نسبت سے اونچا ہے۔ یقیناً دو کمروں کی بجائے ایک کمرے سے کام چلا سکتا ہوں اور دو ایک وقت کا کھانا گھر پر پکا سکتا ہوں میں نے سادہ زندگی کے متعلق بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ اس تبدیلی کی بدولت میری بیرونی اور اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ میری زندگی زیادہ سچی بن گئی اور میری روحانی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

انگلستان میں ایک نباتاتی انجمن تھی جس کا ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا۔ میں اس اخبار کا خریدار اور انجمن کا رکن ہو گیا اور تھوڑے ہی دن میں اس کی مجلس انتظامیہ میں شامل کر لیا گیا مگر جلسوں میں ہمیشہ خاموش بیٹھا رہتا تھا جب تک میں انگلستان میں رہا مجھ میں یہ حجاب باقی رہا اگر میں کسی سے ملنے بھی جاتا اور وہاں پانچ چھ آدمی ہوتے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔ جنوبی افریقہ پہنچ کر میرا حجاب کچھ کم ہوا۔

میں نے اب تک اس چیز کا ذکر نہیں کیا ہے کہ جس کے لئے میں انگلستان گیا تھا یعنی بیرسٹری کا امتحان۔ اس کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں

باضابطہ بیرسٹر بننے کے لئے دو شرطیں پوری کرنا پڑتی تھیں یعنی تین سال کی حاضری اور امتحانوں میں کامیابی۔ نصاب تعلیم بہت سہل تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ امتحانوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ میرے زمانے میں دو امتحان ہوتے تھے ایک رومی قانون میں اور ایک عام قانون میں۔ ان کے لئے باقاعدہ کتابیں مقرر تھیں جن میں لوگ کئی بار کر کے امتحان دے سکتے تھے۔ مگر شاید ہی کوئی شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہو۔ بہت سے لوگوں نے صرف خلاصہ اور شرح پڑھ کر رومی قانون کا امتحان دو ہفتے میں۔ اور عام قانون کا دو تین مہینے میں پاس کر لیا۔ لیکن میں نے اپنے لئے دشواری پیدا کر ہی لی۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ساری درسی کتابیں پڑھوں میرے نزدیک کتابوں کو نہ پڑھنا دغا بازی تھی۔ میں نے ان کے خریدنے میں بہت روپیہ صرف کیا اور یہ طے

گاندھی جی کے والد: کرم چند اتم چند گاندھی

کیا کہ رومی قانون لاطینی سے پڑھوں گا۔ مجھے نو مہینے تک اچھی خاصی محنت کرنا پڑی اور ۱۰ر جون ۱۸۸۱ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی۔ ۱۱ر جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا اور ۱۳ر جون کو ہندوستان روانہ ہو گیا لیکن باوجود تعلیم ختم کرنے کے مجھ پر خوف اور مایوسی طاری تھی۔ بیرسٹر ہو جانا سہل تھا مگر بیرسٹری کرنا دشوار۔ علاوہ اس کے میں نے ہندوستان کا قانون بالکل نہیں پڑھا تھا۔ مجھے عرضی دعویٰ تک لکھنا نہ آتا تھا۔ غرض دل میں مایوسی کے ساتھ خفیف سی امید لئے ہوئے میں آسام نامی جہاز سے ساحل بمبئی پر اترا۔

پاک دریا میں اشنان

میری برادری کے لوگوں میں میرے پردیس کے سفر کے سبب سے اب تک بل چل مچی ہوئی تھی اس مسئلے نے پوری برادری کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا تھا جن میں سے ایک نے تو مجھے

فوراً پھر سے ذات میں شامل کر لیا مگر دوسرا میرے اخراج پر اڑا ہوا تھا۔ پہلے فریق کو خوش کرنے کے لئے میرے بڑے بھائی مجھے راجکوٹ لے جانے سے پہلے پاک دریا میں اشنان کرانے ناسک لے گئے۔

بیوی سے میرے تعلقات اب تک حسب دل خواہ نہیں تھے۔ انگلستان کے قیام سے بھی میری بدگمانی کی عادت دور نہیں ہوئی تھی۔ میں ذرا ذرا سی بات میں بے جا شک اور چڑچڑے پن سے کام لیتا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ بیوی کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں لیکن میری شہوت پرستی اس میں حائل ہوتی تھی۔

پہلا مقدمہ راج کوٹ میں وکالت شروع کرنا اپنا مضحکہ کرانا تھا۔ میری قابلیت ایک اچھے وکیل کے برابر بھی نہ تھی اور فیس میں دس گنی چاہتا تھا کون ایسا بیوقوف مؤکل تھا کہ میرے پاس آتا! دوستوں نے مشورہ دیا کہ کچھ دن کے لئے بمبئی جاؤں وہاں ہائی کورٹ کے کام کا تجربہ حاصل کروں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور بمبئی چلا گیا۔ بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک طرف تو میں نے ہندوستانی قانون کا مطالعہ شروع کیا اور دوسری طرف غذائیات کے تجربے۔ ہندوستانی قانون سے میری طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ اس زمانے میں پہلی بار میرے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا۔ سیدھا سادھا معاملہ تھا میں نے تیس روپے محنتانہ لیا۔ میں مدعا علیہا کی طرف سے تھا اس لئے میرا کام یہ تھا کہ مدعی کے گواہوں سے جرح کروں میں کھڑا ہو گیا میرا دل بیٹھ گیا۔ میرے سر میں چکر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ جج یقیناً ہنسا ہوگا اور وکیلوں کو اس تماشے سے لطف آیا ہوگا۔ مگر مجھے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور میں نے مختار سے کہا کہ میں پیروی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بمبئی میں ایک کام اور ملا یہ ایک عرضداشت لکھنے کا تھا۔ میں نے مسودہ لکھ کر دوستوں کو دکھایا انہوں نے پسند کیا اور اس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ میں عرضداشت لکھنے کی قابلیت رکھتا ہوں بمبئی میں چھ مہینے قیام کرکے میں بوریا بندھنا اٹھا کر چل دیا اور راجکوٹ آکر اپنا دفتر قائم کیا۔ اب میرا کام خاصا چلنے لگا مگر خرچ تنگی ترشی سے چل رہا تھا مگر اسی زمانے میں مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار رنج اور غصے کا دھچکا لگا۔

میرے بھائی آں جہانی راجہ صاحب پوربندر کے تخت نشین ہونے سے پہلے ان کے سکریٹری اور مشیر رہے تھے آج کل ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں ممدوح کو غلط مشورہ دیا تھا۔ معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچا۔ میں ان صاحب سے انگلینڈ میں مل چکا تھا اور وہاں ان کا برتاؤ مجھ سے خاصا دوستانہ تھا میرے بھائی کا خیال تھا کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر ان کی سفارش کرنا چاہیئے مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی مگر جبراً و قہراً ایجنٹ کے پاس گیا۔ میں نے انہیں پرانی واقفیت یاد دلائی۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا لیکن اس کے یاد دلانے سے وہ مجھ سے کھنچ گئے۔ میں نے اپنا مدعا کہہ ڈالا۔ صاحب جھنجلا کر بولے "تمہارا بھائی بڑا فطرتی آدمی ہے میں تم سے اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا" یہ جواب کافی تھا مگر میں اپنا دکھڑا روتا رہا۔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ"! میں نے کہا "مگر میری پوری بات تو سن لیجئے"۔ یہ کہنا تھا کہ ان کا پارہ اور چڑھ گیا انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازے کے باہر پہنچا دے۔ میں ملول اور دل شکستہ گھر آیا اور بھائی سے بیان کیا۔ انہیں بہت رنج ہوا مگر وہ حیران تھے کہ مجھے کیونکر تسلی دیں۔ میں اس توہین کو چپ چاپ پی گیا اور میں نے اس سے آئندہ کے لئے سبق بھی حاصل کیا۔

سیٹھ عبدالکریم میں بہت پژمردہ رہتا تھا اور میرے بھائی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس عرصے میں ایک میمن نے جن کی دوکان پوربندر میں تھی میرے بھائی کو پیغام بھیجا کہ ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں وہاں ہمارا ایک بڑا مقدمہ ہے اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ان کے لئے بھی اچھا ہے اور ہمارے لئے بھی۔ بھائی صاحب نے مجھے سیٹھ عبدالکریم سے ملوایا۔ میں نے بغیر رد و بدل کے شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں میں جنوبی افریقہ روانہ

ہوا یا اور سی کے آخر میں نٹال پہنچا۔ میں دوکان کی عمارت میں پہنچایا گیا اور جس کمرہ میں عبداللہ سیٹھ رہتے تھے اس کے برابر والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ عبداللہ سیٹھ قریب قریب ان پڑھ تھے۔ مگر ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی علمی واقفیت ہو گئی۔ میرے آنے کے دوسرے یا تیسرے روز وہ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے وہاں کئی آدمیوں سے ملوایا اور اپنے وکیل کے پاس بٹھایا مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا آخر میں اس نے کہا۔ پگڑی اتار ڈالو۔ میں نے انکار کیا اور عدالت سے اٹھ کر چلا آیا۔ پگڑی اتارنے کے معنی یہ تھے کہ گویا چپ چاپ ذلت سہہ لی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اب ہندوستانی پگڑی کو خیرباد کہہ کر انگریزی ہیٹ استعمال کرنا چاہیئے تاکہ ذلت نہ ہو۔ مگر عبداللہ سیٹھ نے اس خیال کو ناپسند کیا۔ میں نے اخباروں میں اس واقعہ کا حال لکھا اور پگڑی باندھ کر عدالت میں جانے کو جائز ثابت کیا۔

ادھر میں اپنے حلقۂ ملاقات کو وسیع کر رہا تھا اور ادھر ہماری دوکان کے نام وکیل کا خط آیا جس میں اطلاع ملی کہ اب مقدمے کی تیاری کرنے کا وقت ہے اور عبداللہ سیٹھ کو چاہیئے یا تو خود پریٹوریا جائیں یا اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں۔ عبداللہ سیٹھ نے مجھے یہ خط پڑھنے کو دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم پریٹوریا جاؤ گے میں نے کہا یہ میں اس وقت کہہ سکتا ہوں جب آپ سے مقدمہ سمجھ لوں اس پر انہوں نے محرروں کو حکم دیا کہ مجھے مقدمہ سمجھائیں۔ ڈربن آنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے روانہ ہو گیا اس زمانے میں چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان ریل نہ تھی بلکہ شکرم چلتی تھی۔ شام کو آٹھ بجے گاڑی پریٹوریا پہنچی۔

پہلی تقریر

سیٹھ طیب حاجی خان محمد کی پریٹوریا میں وہی حیثیت تھی جو نٹال میں دادا عبداللہ کی تھی۔ کوئی عام تحریک بغیر ان کے نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے پہلے ہی ہفتے ان سے واقفیت پیدا کر لی میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں

گاندھی پہلی دفعہ پگڑی میں

کے حالات کا جائزہ لوں اور ان سے مدد چاہی۔ انہوں نے بڑی خوشی سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے سوچا کہ پہلا قدم یوں اٹھاؤں کہ پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کروں جس سے انہیں یہ اندازہ ہو کہ ٹرانسوال میں ان کا کیا حال ہے۔ یہ جلسہ سیٹھ حاجی محمد کے یہاں ہوا اس میں زیادہ تر میمن تھے مگر اکا دکا ہندو بھی نظر آتے تھے۔ پریٹوریا میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم تھی میں نے اس جلسے میں جو تقریر کی وہ ہماری عمر میں میری پہلی تقریر کہی جا سکتی ہے میں نے تاجروں کے دل میں ان کے دہرے فرض کے احساس کو ابھارا میں نے کہا غیر ملک میں رہ کر ہم پر سچائی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ

یہاں کے رئیس ہم چند ہندوستانیوں کو دیکھ کر ہمارے ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔ میں نے انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی اور زور دیا کہ ہندو مسلمان، پارسی، عیسائی، گجراتی، مدراسی، پنجابی وغیرہ کا امتیاز مٹا دینا چاہیئے میں جلسے کے نتیجے سے مطمئن تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ طے ہوا کہ اس قسم کے جلسے مہینے میں ایک بار ہوا کریں۔ یہ جلسے کم و بیش پابندی سے ہوا کرتے تھے۔

اب میں نے مناسب سمجھا کہ مسٹر جیکونس ڈی ویٹ سے جو یہاں برطانوی ایجنٹ تھے ملوں انہیں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی مگر ان کا اثر بہت کم تھا بہر حال وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جہاں تک ہو سکے گا ہماری مدد کریں گے اور مجھے دعوت دی کہ جب ضرورت ہو مجھ سے آ کر مل لیا کرو۔ ایجنٹ نے مجھے کچھ کاغذات دکھائے۔ طیب سیٹھ نے بھی مجھے اس قسم کے کاغذات دیئے تھے ان سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہندوستانی کس مپرسی سے اورینج فری اسٹیٹ سے نکالے جا رہے ہیں۔ پریٹوریا کے قیام سے مجھے یہ موقع ملا کہ ٹرنسوال اور اورینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کا گہرا مطالعہ کروں۔ یہاں ٹرانسوال اور اورینج فری اسٹیٹ کے ہندوستانیوں کی حالت تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں جو لوگ اس سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں وہ میری کتاب "جنوبی افریقہ کے ستیہ گرہ کی تاریخ" پڑھیں۔ اس طرح مجھے نوآباد ہندوستانیوں کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خوددار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اس حالت میں اصلاح کرنے کی کیا صورت ہے۔ پریٹوریا میں ایک سال کا قیام میری زندگی میں سب سے زیادہ قابل قدر تجربہ تھا۔ یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقعہ ملا۔

لڑائی کا بیج اب مقدمہ طے ہو چکا تھا اور مجھے پریٹوریا میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے میں ڈربن واپس آیا اور وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگا مگر بھلا عبداللہ سیٹھ مجھے بغیر رخصتی جلسے کے کب جانے دیتے انہوں نے مجھے رخصت کرنے کے لئے سڈنہم میں جلسہ منعقد کیا۔ ہم لوگ وہاں دن بھر رہنے کے ارادے سے گئے۔ میں بیٹھا کچھ اخباروں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اتفاق سے ایک اخبار کے ایک کونے میں میری نظر ایک پیراگراف پر پڑی جس کا عنوان تھا "ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق" - یہ اس مسودۂ قانون کے متعلق تھا جو ان دنوں مجلس قانون ساز میں پیش تھا اور جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستانی نٹال کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب کرنے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں۔ میں نے عبداللہ سیٹھ سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے کہا بھلا ہم لوگ ان معاملات کو کیا جانیں۔ میں نے عبداللہ سیٹھ سے صرف اتنی بات کہی کہ اگر یہ مسودۂ قانون پاس ہو کر قانون بن گیا تو ہماری زندگی دشوار ہو جائے گی۔ یہ ہمارے لئے موت کا پیغام ہے اور مہمان اس گفتگو کو غور سے سن رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ اپنا جہاز کا ٹکٹ منسوخ کرا دیجئے اور یہاں ایک مہینہ اور ٹھہریئے ہم آپ کی ہدایت کے مطابق لڑیں گے۔ سب کے سب بول اٹھے - بالکل ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ عبداللہ سیٹھ آپ گاندھی بھائی کو ہرگز نہ جانے دیجئے۔ اس طرح خدا نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور اس لڑائی کا بیج بویا جو قومی خودداری کے لئے لڑی گئی۔

سیٹھ حاجی محمد دادا ۱۸۹۳ء میں نٹال کے ہندوستانیوں کے ممتاز ترین رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دولت کے اعتبار سے سیٹھ عبداللہ حاجی آدم سب سے بڑھے ہوئے تھے لیکن پبلک معاملات میں وہ اور دوسرے لوگ حاجی محمد ہی کو اپنا سردار مانتے تھے۔ اس لئے ان کی صدارت میں ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسودۂ قانون حق رائے دہندگی کی مخالفت کی جائے۔ چنانچہ رضاکار بھرتی کئے گئے جلسہ میں وہ ہندوستانی بھی بلائے گئے جو نٹال میں پیدا ہوئے تھے۔ جن میں اکثر نوجوان عیسائی تھے۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مجلس قانون ساز کے صدر کے نام تار بھیجا کہ مہربانی کر کے اس مسودے پر مزید بحث ملتوی کر دیجئے اسی قسم کا تار وزیر اعظم کو دیا گیا۔ صدر نے فوراً جواب دیا کہ بحث دو دن کے لئے ملتوی کر دی گئی اس لئے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔

رابندرناتھ ٹیگور اور گاندھی جی

دس ہزار دستخط

اس تحریک کے جوش و خروش نے نٹال کے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلایا کہ انکی جماعت ایک متحدہ جماعت ہے۔ اسی زمانے میں لارڈ رپن برطانیہ کے وزیر نوآبادیات تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کو ایک عرضداشت بھیجی جائے جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط ہوں۔ میں نے اس عرضداشت کے تیار کرنے میں بڑی محنت کی۔ اس موضوع پر جتنا مواد مل سکتا تھا سب کا مطالعہ کیا۔ دو ہفتے کے اندر دس ہزار دستخط کئے گئے۔ درخواست بھیجی گئی گشت کرانے اور تقسیم کرانے کے لئے اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ اس کے ذریعہ ہندوستان کے لوگوں کو پہلی بار نٹال کے حالات معلوم ہوئے۔ میں نے اس کی کاپیاں ہندوستان کے سب اخباروں اور سیاسی مضمون نگاروں کو جن سے میں واقف تھا بھیجیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے اس عرضداشت پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبات کی زوردار تائید کی۔ ہم نے انگلستان کی مختلف پارٹیوں کے اخبارات کو بھی اس کی کاپیاں بھیجیں۔ لندن ٹائمز نے بھی ہماری تائید کی

اب میرے لئے نٹال سے جانا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہاں مستقل قیام کروں۔ ہندوستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کرنے والے قانون کے خلاف محض عرضداشت بھیج دینا کافی نہ تھا وزیر نوآبادیات کو متاثر کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں میں جوش پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ یہ قرار پایا کہ اس مقصد کے لئے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہیئے۔ میں نے سیٹھ عبداللہ اور دوسرے دوستوں کے مشورے سے ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ نئی انجمن کا نام کیا رکھا جائے۔ ایسے نام کی ضرورت تھی جس کا تعلق کسی خاص پارٹی سے نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں سے ظاہر کرتا ہو اس لئے میں نے مفصل دلائل کے ساتھ یہ تجویز کی کہ اس کا نام نٹال انڈین کانگریس رکھا جائے۔ اس طرح ۲۲ مئی کو یہ انجمن وجود میں آئی۔ ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بہت سے دوست پیدا ہو گئے اور ہندوستان کی سب پارٹیوں کو اس مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی۔ اس کے علاوہ خود افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک معینہ راہ عمل نظر آنے لگی۔

۱۸۹۴ء میں حکومت نٹال نے ارادہ کیا کہ پابند مزدوروں پر پچیس پاؤنڈ سالانہ محصول لگائے مجھے اس تجویز نے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے فوراً اس مسئلے کو کانگریس کے سامنے پیش کیا اور یہ تجویز منظور کرائی کہ اس محصول کی مخالفت کے لئے ضروری انتظام کیا جائے۔ وائسرائے اس زمانے میں لارڈ ایلگن تھے۔ انہوں نے پچیس پاؤنڈ کے محصول کو پسند نہیں کیا مگر اس پر راضی ہو گئے کہ فی کس تین پاؤنڈ محصول لگایا جائے۔ کانگریس کے کارکنوں کو اب بھی یہ قلق تھا کہ وہ پابند مزدوروں کے حقوق کی پوری حفاظت نہیں کر سکے وہ ہمیشہ اس ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی کہ محصول کو معاف کرائے مگر اس کا یہ ارادہ بیس سال بعد پورا ہوا ہندوستانیوں نے

جو تکلیفیں برداشت کیں وہ گویا حق کی آواز تھی لیکن اگر اسی کے ساتھ استوار عقیدہ، انتہائی صبر اور ان تھک کوشش نہ ہوتی تو یہ آواز غالب نہ آتی۔

معمولی انصاف

اب مجھے جنوبی افریقہ آئے تین سال ہو چکے تھے میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا ۱۸۹۶ء میں میں نے چھ مہینے کی اجازت مانگی کیونکہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں مجھے بہت دن تک رہنا ہے میں نے یہ بھی سوچا کہ وطن جا کر لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے آگاہ کروں اور یہاں کے ہندوستانیوں کا ہمدرد بناؤں تو کچھ قومی خدمت بھی ہو گا۔ ۱۸۹۶ء کے وسط میں وطن روانہ ہوا۔ چوبیس دن بعد کلکتے پہنچ گیا اور اسی دن بمبئی روانہ ہو گیا۔ بمبئی جاتے ہوئے میری ریل الٰہ آباد میں ٹھہری میں نے سوچا اتنی دیر میں شہر کی سیر کر آؤں مگر جب اسٹیشن پہنچا تو میری ریل سامنے سے چل گئی۔ میں نے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور یہ قصد کر لیا کہ اپنا کام فوراً شروع کر دوں گا میں نے الٰہ آباد پانیر کا نام بہت سنا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا مخالف ہے۔ میں نے ایڈیٹر کو ایک پرچہ لکھا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کے لئے وقت دیں وہ مجھ سے اسی وقت ملنے پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے میری داستان صبر سے سنی انہوں نے کہا تم جو کچھ لکھو گے میں اس پر اپنے اخبار میں تبصرہ کروں گا میں نے کہا میرا مطالبہ بس اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ معمولی انصاف کیا جائے جو ہمارا حق ہے۔

میں بغیر بمبئی ٹھہرے سیدھا راجکوٹ پہنچا اور جنوبی افریقہ کے حالات پر ایک پمفلٹ لکھنے کی تیاری کرنے لگا اس کا سرورق سبز تھا اس لئے آگے چل کر اس کا نام سبز پمفلٹ پڑ گیا۔ میں نے اس کی دس ہزار کاپیاں چھپوائیں اور سارے اخباروں اور مشہور لیڈروں کو بھیجیں۔ سب سے پہلے پانیر کے ایڈیٹر نے تبصرہ کیا رائٹر نے اس کے مضمون کا خلاصہ تار کے ذریعہ لندن بھیجا ہندوستان کے ہر معقول اخبار میں اس پر بحث کی گئی۔

جن دنوں میں راجکوٹ میں پمفلٹ لکھنے میں مشغول تھا مجھے ایک آدھ روز کے لئے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا میرا یہ ارادہ تھا کہ سب شہروں میں جلسے کر کے لوگوں کو جنوبی افریقہ کے حالات سے واقف کروں اور ابتدا میں نے بمبئی سے کی۔ سب سے پہلے جسٹس رانا ڈے سے ملا انہوں نے میری گفتگو غور سے سنی اور مجھے سر فیروز شاہ مہتہ سے ملنے کی ہدایت کی اس کے بعد طیب جی سے ملا انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ کچھ دن بعد میں ان کے پاس حاضر ہوا۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا جسے وہ غور سے سنتے رہے آخر میں انہوں نے کہا "گاندھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیئے"۔

سر فیروز شاہ نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔ بمبئی سے میں پونا پہنچا جہاں دو پارٹیاں تھیں۔ میں ہر خیال کے لوگوں کی مدد چاہتا تھا پہلے میں لوکمانیہ تلک سے ملا۔ مجھے ان سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ ان کی ہردلعزیزی کا راز کیا ہے۔ اس کے بعد گوکھلے کے پاس گیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور ان کے اخلاق نے دل کو جیت لیا۔ میرے دل کو جو تعلق گوکھلے سے ان کی زندگی میں تھا اور اب تک ہے اور کسی سے نہیں۔

اس کے بعد میں مدراس گیا یہاں لوگوں میں بے حد جوش تھا۔ مدراس سے کلکتہ گیا۔ یہاں مجھے بڑی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے "بنگال کے دیوتا" سر سریندر ناتھ بنرجی سے ملنا تھا جب ان کے پاس پہنچا تو وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے میری درخواست سن کر کہنے لگے۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں لوگوں کو آپ کے کام سے دلچسپی نہ ہوگی"۔ میں اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملتا رہا "اسٹیٹس مین" اور "انگلش مین" نے اس مسئلے کی اہمیت محسوس کی میں نے ان سے طویل گفتگو کی اور انہوں نے یہ پوری گفتگو چھاپ دی۔ "انگلش مین" کے ایڈیٹر نے اپنا اخبار اور دفتر میرے لئے وقف کر دیا بلکہ یہاں تک کیا کہ اس مسئلے پر جو ایڈیٹوریل لکھا تھا اس کے پروف میرے پاس بھیج دیئے اور اجازت دی کہ حسب دل خواہ کمی بیشی کر دوں۔ انہوں نے حتی الامکان مدد دینے کا وعدہ کیا

اور لے پورا کیا۔ انہیں میرا یک بولتا اور مبالغہ سے پرہیز کرنا بہت پسند آیا۔ مجھے تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ دوسروں سے انصاف چاہنے کا سب سے زود اثر طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود دوسرے کے ساتھ انصاف کرے۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ تعجب نہیں کہ ملک میں جلد ہی جلسہ کرنے کی صورت نکل آئے کہ میرے پاس ڈربن سے تار پہنچا کہ "پارلیمنٹ کا اجلاس جنوری سے شروع ہو رہا ہے فوراً واپس آؤ۔"

اس لئے میں نے ایک خط کے ذریعے اخباروں کو اطلاع دی اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ اور شروع دسمبر میں اپنی بیوی دونوں لڑکوں اور بیوہ بہن کے اکلوتے لڑکے کو ساتھ لے کر جنوبی افریقہ روانہ ہو کر ۱۸ یا ۱۹ کو ڈربن پہنچا۔ مسٹر ایسکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو یورپی تم سے سخت بیزار ہیں۔ تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے۔ جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی گاندھی" پکارنے لگے پانچ چھ آدمی اور دوڑے آئے اور انہوں نے لڑکوں کو ساتھ لے کر چلانا شروع کیا۔ جوں جوں ہم بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا۔ ایک شخص میری پگڑی لے کر بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں ادھر سے گذر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لئے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ان سے لوگوں کا بل کچھ کم ہوا اس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا کوتوالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا۔ یہ سپاہی عین وقت پر پہنچے۔ کوتوالی ہمارے راستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تم یہیں کوتوالی میں پناہ لو مگر میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

عظیم الشان درخت

جنوبی افریقہ میں جو خدمت میں نے ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے۔ اسے جتنا زیادہ سینچئے اتنا ہی زیادہ وہ پھل دیتا ہے۔ حق کے معدن کو جتنا زیادہ کھودیئے اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں۔ یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے رہیں۔

جنگ کی خدمت سے فرصت پانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اب جنوبی افریقہ میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جنوبی افریقہ میں اب کچھ کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں میرے وقت کا زیادہ حصہ روپیہ کمانے میں صرف ہو جائے۔ وطن میں میرے احباب میری واپسی پر مصر تھے اس لئے میں نے اپنے رفیقوں سے رخصت کی درخواست کی یہ درخواست بڑی مشکل سے اس شرط پر منظور ہوئی کہ اگر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ایک سال کے اندر ضرورت پڑی تو مجھے واپس آنا پڑے گا۔

جب میں پہلی بار یہاں سے جا رہا تھا تب بھی مجھے تحفے دیئے گئے تھے مگر اس مرتبہ تحفوں میں سونے چاندی کی چیزوں کے علاوہ بعض جڑاؤ چیزیں بھی تھیں۔ مجھے ان کے قبول کرنے کا حق تھا! اگر میں انہیں قبول کر لیتا تو اپنے دل میں کیونکر سمجھتا کہ اپنے بھائیوں کی خدمت بلا معاوضہ کر رہا ہوں۔ ایک سونے کا کنٹھا جس کی قیمت پچاس گنی تھی میری بیوی کو دیا گیا تھا۔ یہ بھی میری قومی خدمات کی وجہ سے ملا تھا۔ جس شام کو یہ تحفے دیئے گئے تھے اس کے بعد کی رات مجھے جاگتے گذری۔ میں الجھن اور پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا مگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی، سیکڑوں کی قیمت کے تحفوں کو پھیر دینا کچھ سہل نہ تھا مگر انہیں رکھ لینا اس سے زیادہ دشوار تھا۔ میں نے سوچا اگر میں ان کو رکھ لوں تو میرے بچوں پر اور میری بیوی پر اس کا کتنا خراب اثر پڑے گا انہیں میں یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اپنی زندگی قومی خدمت میں گذاریں اور خدمت کو معاوضے سے بے نیاز سمجھیں۔ آخر میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا میں نے بیٹھ کر خط کا مسودہ لکھا کہ میں ان چیزوں کو قومی کاموں کے لئے وقف کرتا ہوں۔ صبح کو میں نے اپنی بیوی بچوں سے مشورہ کیا اور خدا خدا کر کے اس بوجھ کو اپنے سر سے ہٹایا مجھے آج تک کبھی اپنے اس فعل پر افسوس نہیں ہوا اور میری بیوی کو بھی رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ دانشمندی کا فعل تھا

غرض پھر وطن روانہ ہو گیا۔ ہندوستان

کانگریس کی محرری

پہنچ کر میں کچھ دن سارے ہندوستان کا دورہ کرتا رہا۔ ۱۹۰۱ء میں کانگریس کلکتے میں ہو رہی تھی اس کے صدر مسٹر ڈنشا واچا تھے۔ میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میرے لئے کانگریس کی شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے پہلے سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی خدمات کانگریس کے دفتر کے لئے پیش کروں گا تاکہ کچھ تجربہ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ کلکتے پہنچ کر میں سیدھا کانگریس کے دفتر پہنچا بابو بھوپندر ناتھ باسو اور گھوشال بابو سکریٹری تھے میں نے بھوپندر بابو کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر فرمایا "میرے یہاں تو کوئی کام نہیں مگر ممکن ہے گھوشال بابو آپ کو کوئی کام دے دیں۔ میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا "میں تمہیں صرف محرری کا کام دے سکتا ہوں تم کرو گے؟" میں نے جواب دیا ضرور کروں گا میں اسی لئے آیا ہوں کہ جو کام بھی ملے اسے انجام دوں چند روز میں میں کانگریس کے طور طریقے سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے اکثر لیڈروں سے ملنے اور گوکھلے اور سریندر ناتھ جیسے بڑے مردوں کے طرز عمل کو دیکھنے کا موقع ملا۔

خدا خدا کرکے میں کانگریس پہنچا اس ڈل بادل فوج کو، رضاکاروں کی صفوں کو اور ڈائس پر بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نقار خانے میں بھلا طوطی جیسی آواز کون سنتا۔ جب میں نے دیکھا کہ رات ہونے آئی اور وہ ریزولیشن (جنوبی افریقہ کے بارے میں) اب تک پیش نہیں ہوا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آخری ریزولیوشن بہت جلدی جلدی نپٹائے جا رہے تھے میں گوکھلے سے مل کر ان کو اپنا ریزولیوشن دکھا چکا تھا اس لئے ہمت کر کے ان کی کرسی کے پاس جا کر کہا "مہربانی کرکے میرے معاملے میں کچھ کیجئے۔ انہوں نے کہا میں تمہارے ریزولیوشن کو بھولا نہیں ہوں۔ تم دیکھتے ہو کتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے دم لینے کی فرصت نہیں مگر میں اس کا خیال رکھوں گا کہ تمہارا ریزولیوشن نظرانداز نہ ہونے پائے۔" اتنے میں سر فیروز شاہ مہتہ نے کہا "اب تو سب ریزولیوشن ختم ہو گئے!" گوکھلے چلا اٹھے "نہیں نہیں ابھی جنوبی افریقہ والا باقی ہے" سر فیروز شاہ نے پوچھا "آپ نے وہ ریزولیوشن دیکھا ہے؟" "جی ہاں دیکھا ہے" "آپ کو پسند ہے؟" "ہاں اچھا خاصا ہے" "اچھا گاندھی اپنا ریزولیوشن پڑھ کر سناؤ" میں نے کانپتے ہوئے وہ ریزولیوشن پڑھا۔ گوکھلے نے تائید کی سب چلا اٹھے "بالاتفاق منظور" میرے لئے یہی کچھ کم خوشی کی بات نہ تھی کہ اسے کانگریس نے پاس کر دیا اور پھر کیا موقوف ہے جس کو یہ علم ہوتا وہی اس بات پر خوش ہوتا۔

تیسرے درجے میں

میں گوکھلے کے یہاں جا کر رہا تو وہ مجھ سے اس طرح پیش آئے کہ میں پہلے ہی دن سے بے تکلف ہو گیا۔ وہ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ ٹھہرنے کی بدولت مجھے کلکتے میں اپنا کام کرنے میں بڑی آسانی ہوئی اور بنگال کے ممتاز خاندانوں سے میل جول کرنے کا موقع ملا کلکتے سے میں چند دن کے لئے برما گیا اور وہاں کے پھونگیوں سے ملا۔ برما سے لوٹ کر میں گوکھلے سے رخصت ہو گیا۔ ان سے جدا ہونا مجھ پر بہت شاق تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی جگہ مستقل قیام کرنے سے پہلے تیسرے درجے میں ہندوستان کا سفر کروں اور یہ معلوم کروں کہ تیسرے [illegible] کے مسافروں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ گوکھلے اور رائے اشرا نے مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے میں صبح کے وقت بنارس پہنچا۔ میں نے طے کیا کہ کسی پنڈے کے یہاں ٹھہروں گا۔ جیسے ہی گاڑی سے اترا۔ مجھے بہت سے برہمنوں نے گھیرا میں نے ان میں سے ایک کا انتخاب کیا جو دوسروں کے مقابلے میں صاف ستھرا اور معقول معلوم ہوتا تھا۔ میں درشن کے لئے کاشی وشواناتھ پہنچا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ مندر کی زیارت کے بعد میں مسز اینی بیسنٹ کے درشن کے لئے گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہیں۔ میری اطلاع ہوتے ہی وہ باہر تشریف لے آئیں گوکھلے کا اصرار تھا کہ میں بمبئی میں بس جاؤں اور وکالت کے ساتھ ساتھ قومی کام بھی کروں۔ مجھے گوکھلے کا مشورہ پسند آیا مگر وکالت چلنے کی کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے راجکوٹ میں کام شروع کروں۔ وہاں پرانے

مہاتما گاندھی اور سبھاش چندر بوس

عنایت فرما کیول رام جی موجود تھے۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی دن مقدمے لا کر دیئے۔ میرا قصد ابھی کچھ دن راجکوٹ ہی میں رہنے کا تھا مگر ایک دن کیول رام دیو آ کر مجھ سے کہنے لگے "بھئی گاندھی ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم راج کوٹ میں پڑے سوکھا کرو۔ اب تو تمہیں بمبئی جا کر رہنا چاہیئے۔" میں نے پوچھا "مگر وہاں میرے لئے کام کون فراہم کرے گا؟" انہوں نے جواب دیا "میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔" میں نے کہا "مجھے فی الحال سے ایکمشت رقم کا انتظار ہے اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا۔" کوئی دو ہفتے میں روپیہ آ گیا اور میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ ادھر تو میری وکالت میں کسی قدر اطمینان کی صورت پیدا ہو رہی تھی اور ادھر گوکھلے جو ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے میرے لئے کچھ اور ہی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ عین اس وقت جب میں یکسوئی سے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا تھا جنوبی افریقہ سے تار پہنچا کہ "چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے مہربانی کر کے فوراً چلے آیئے" میں نے اس مضمون کا تار دیا کہ "میں آنے کو تیار ہوں۔" تار پہنچتے ہی روپیہ آ گیا اور میں جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا اور عین وقت پر ڈربن پہنچا۔ میرے لئے کام تیار تھا۔ مسٹر چیمبرلین کی خدمت میں وفد کے جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی مجھے ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے عرضداشت مرتب کرنا تھی اور وفد کے ساتھ جانا تھا۔

پروانہ راہ داری

مسٹر چیمبرلین جنوبی افریقہ سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ نذر لینے اور سا گریزوں اور بوئروں کی دلجوئی کرنے آئے تھے اس لئے انہوں نے ہندوستانی وفد کو سوکھا ٹال دیا۔ وفد کے ارکان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مجھے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ نٹال سے ٹرانسوال گئے۔ مجھے ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے مطالبات بھی مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنا تھے۔ وہاں جانے کے لئے پروانہ راہ داری لینا پڑتا تھا جو گوروں کو آسانی سے مل جاتا تھا مگر ہندوستانیوں کے لئے بڑی دشواریاں تھیں۔ میں نے اپنے پرانے دوست بمبئی ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ سے جا کر کہا۔ "مہربانی کر کے پرمٹ کے افسر سے میرا تعارف کرا دیجئے" انہوں نے فوراً ہیٹ سر پر رکھی اور میرے ساتھ جا کر مجھے پروانہ دلوا دیا۔ میں نے انگریز مہتمم کا شکریہ ادا کیا اور پریٹوریا روانہ ہو گیا۔ پہنچتے ہی میں نے عرضداشت مرتب کر لی۔ پریٹوریا کے

ہندوستانیوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ اس محکمے کے افسر ان کا نام وفد
سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ نئے محکمے کے افسر حیران تھے کہ میں
ٹرانسوال میں کیونکر داخل ہوا۔ انہوں نے ڈربن تار دے کر
پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں پروانہ لے کر آیا ہوں۔ مگر یہ ہار ماننے
والے نہ تھے انہوں نے کہا یہ شخص ٹرانسوال آگیا تو آجائے۔
اسے چیمبرلین سے ملنے نہ دیں گے۔ ہندوستانی لیڈر اکثر اس محکمے
کے افسروں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار طیب جی، حاجی
خان محمد "افسر اعلیٰ" سے ملنے گئے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ گاندھی
کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟" سیٹھ طیب جی نے کہا "وہ
ہمارے مشیر ہیں اور ہمارے بلانے پر آگئے ہیں۔" صاحب
بہادر نے پوچھا "پھر ہم لوگ کس لئے ہیں؟ گاندھی کو یہاں
کے حالات کی کیا خبر!" صاحب بہادر نے طیب سیٹھ کو حکم
دیا کہ مجھے ان کے سامنے پیش کریں۔ میں طیب سیٹھ وغیرہ
کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب نے پوچھا "تم
یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے جواب دیا "اپنے ہم وطنوں
کے کہنے سے آیا ہوں کہ انہیں مشورہ دوں" "مگر کیا تمہیں معلوم
نہیں کہ تمہیں ٹرانسوال آنے کا کوئی حق نہیں۔ جو پروانہ
تمہارے پاس ہے وہ غلطی سے دے دیا گیا تھا۔ تمہیں
واپس جانا پڑے گا۔" مجھے اس توہین سے بڑی تکلیف
ہوئی۔ میں نے طے کیا کہ یہ ذلت بھی چپ چاپ سہہ لوں گا
افسر اعلیٰ کے محکمے (ایشیائی محکمے) کے یہاں سے ایک خط آیا
چونکہ گاندھی ڈربن میں مسٹر چیمبرلین سے مل چکے ہیں اس لئے
ان کا نام وفد سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر
میرے رفیقوں میں ضبط کی تاب نہ رہی مگر میں نے صلاح
دی کہ میری جگہ مسٹر گاڈ فرے کو لے جائیں چنانچہ مسٹر گاڈ
فرے کی سرکردگی میں وفد گیا۔ میں نے ہرچہ باداباد کہہ کر
کام شروع کر دیا اور جوہانسبرگ میں اپنا دفتر قائم کیا
ایشیائی محکمے کے عہدہ داروں کا جتنا زور جوہانسبرگ
میں تھا اور کہیں نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں
چینیوں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے بجائے اور الٹا
انہیں چوس رہے ہیں اس لئے میں نے ان شکایتوں کے
ثبوت فراہم کرنا شروع کئے اور جب کافی مسالہ جمع ہو گیا
تو میں پولیس کمشنر کے پاس پہنچا وہ منصف مزاج آدمی
نکلا۔ مجھے بہت سے عہدہ داروں پر شبہ تھا مگر چونکہ
میرے پاس ان کے خلاف قطعی شہادت نہیں تھی اس لئے
میں نے صرف دو شخصوں کے نام وارنٹ جاری کرائے
جن پر جرم بالکل ثابت تھا۔ ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا
تھا۔ کمشنر پولیس نے اس کے لئے وارنٹ جاری کرا کر دوسری
حکومتوں کے پاس بھیجا اور وہ گرفتار کر کے ٹرانسوال لایا
گیا۔ ان دونوں کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور باوجودیکہ
ان کے خلاف کافی شہادت تھی مگر بے قصور قرار دے کر
بری کر دیئے گئے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی کمشنر پولیس کو
بھی بہت رنج ہوا مگر ان کے بری ہو جانے پر بھی حکومت
انہیں اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکی اور برخاست کر دیئے
گئے اس واقعے سے میری دھاک بیٹھ گئی

اسی زمانے میں مدن جیت جی نے میرے سامنے ایک
اخبار "انڈین اوپینین" (INDIAN OPINION)
کے نام سے نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس بارے میں میری
رائے پوچھی۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا اور من سکھ
لال نظر ایڈیٹر ہوئے مگر زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا
اس اخبار نے ہماری برادری کی مفید خدمت انجام دی
اس کے بیچے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا اگر
یہ نہ ہوتا تو ستیہ گرہ کبھی نہ چل سکتی۔

اب میرے ہندوستان جلد واپس جانے کی کوئی
امید نہیں رہی تھی اس لئے میں نے طے کیا کہ بیوی بچوں
کو اپنے پاس بلاؤں جس طرح میں نے فرنگی دوستوں کو
شادی کی ترغیب دی اسی طرح ہندوستانی دوستوں کو
بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے بال بچوں کو وطن سے
بلا لیں۔ فینکس آہستہ آہستہ چھوٹا سا گاؤں بن گیا۔ اب
وہاں چند خاندان بس گئے تھے۔ بظاہر میں جوہانسبرگ میں
بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہ تھی
عین اس وقت جب میں یہ سمجھتا تھا کہ ذرا اطمینان سے
بیٹھوں گا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بالکل توقع نہ تھی
اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو بغاوت شروع

ہو گئی ہے۔ مجھے زولو قوم سے کوئی خلش نہیں تھی مگر اس زمانے میں میرا یہ عقیدہ تھا کہ دولت برطانیہ دنیا کی بہبود کے لئے قائم ہے۔ میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولنس کور قائم کرنے کو تیار ہوں انہوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔ میں نے ڈربن جا کر رنگروٹوں کے لئے تحریک شروع کی بہت بڑے دستے کی ضرورت نہیں تھی ہم کل چوبیس آدمی تھے۔ چیف میڈیکل افسر نے دستور کے مطابق مجھے سرجنٹ میجر کا عارضی منصب دے دیا۔

زولو بغاوت کے سلسلے میں مجھے نئے نئے تجربے ہوئے جنگ بوئر میں مجھے لڑائی کے خوفناک نتائج کا اندازہ نہیں تھا جتنا اس بغاوت میں ہوا۔ یہ نام کی لڑائی تھی مگر اصل میں آدمیوں کا شکار تھا۔ جنوبی افریقہ کی اور بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں مگر مجبوراً ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ ۱۹۱۴ء میں جب ستیہ گرہ کی جدوجہد ختم ہو گئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آجاؤ۔ اس لئے میں انگلستان روانہ ہو گیا۔ لڑائی کا اعلان ۴ر اگست کو ہوا تھا ہم ۶ر اگست کو لندن میں داخل ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم

انگلستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ گوکھلے جو علاج کے لئے پیرس گئے تھے آمدورفت کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وہیں رہ گئے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب لوٹیں گے۔ میں ان سے ملے بغیر ہندوستان نہیں جانا چاہتا تھا میری یہ رائے تھی کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہیئے اس پر بہت سے اعتراض کئے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ہمیں تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیئے۔ اس وقت اس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی۔ جو لوگ میری رائے کے مخالف تھے ان کا قول تھا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات پر زور دینے کا یہی وقت ہے۔ میں کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ شرافت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے اختتام تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوا دے۔ مجھے اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ میں نے لارڈ کریو کو خط لکھا۔ انہوں نے ہماری خدمات کچھ تامل کے بعد قبول کر لیں اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔ لندن کی حالت اس زمانے میں دیکھنے کے قابل تھی۔ شہر میں ذرا بھی ہیجان نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے میں مصروف تھے۔ جتنے مضبوط جوان تھے وہ تو فوجی قواعد سیکھ ہی رہے تھے مگر ضعیف اور بیمار لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی بیکار نہ تھیں

مجھے امید تھی کہ میں برطانوی سلطنت کے ذریعے سے اپنی اور اپنی قوم کی حیثیت بڑھا سکوں گا میں سوچتا تھا کہ جب تک انگلستان میں ہوں برطانوی بیڑے کی حفاظت سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اس مسلح قوت سے فائدہ اٹھا کر گویا اس تشدد میں شریک ہوتا ہے جو اس کے ہاتھ سے عمل میں آسکتا ہے۔ اس لئے اگر میں سلطنت برطانیہ سے تعلق قائم رکھوں اور اس کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے ان تین طریقوں میں سے ایک اختیار کرنا چاہیئے یا تو میں کھلم کھلا لڑائی کی مخالفت کروں اور ستیہ گرہ کے اصول کے مطابق سلطنت برطانیہ سے اس وقت تک ترک موالات کروں جب تک وہ اپنی فوجی پالیسی نہ بدل دے۔ یا میں اس کے قابل اعتراض قوانین کی خلاف ورزی کر کے جیل چلا جاؤں یا لڑائی میں سلطنت کا ساتھ دے کر لڑائی کو روکنے کی قابلیت اور قوت حاصل کروں۔ میں جانتا تھا کہ اب تک مجھ میں یہ قابلیت اور قوت نہیں ہے اس لئے مجھے سوائے لڑائی میں شامل ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

انگلستان پہنچ کر میں پسلی کے درد میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد گوکھلے لندن واپس آ گئے ہم دونوں میں زیادہ تر لڑائی کے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جب میرے مرض نے شدت پکڑی تو یہ بھی روزمرہ کی گفتگو کا موضوع بن گیا میرے غذائی تجربے اس زمانے میں بھی جاری تھے۔ میری غذا مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے، میٹھے لیموں، زیتون کا تیل، ولایتی بینگن اور انگور وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر جیوراج مہتہ میرے معالج تھے ان کا اصرار تھا کہ اناج اور دودھ استعمال کرو مگر میں راضی نہیں ہوتا تھا۔ پسلی کا ورم کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا اس لئے

مجھے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا۔ جب نے ڈاکٹر ایلین سے رجوع کیا جو محض غذا کی تبدیلی سے علاج کیا کرتے تھے ان کے علاج سے میں بالکل اچھا ہو گیا مگر پوری صحت نہیں ہوئی۔ اس اثنا میں ایک دن مسٹر دابرٹس مجھے دیکھنے آئے اور انہوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ آپ وطن چلے جائیے پوری صحت آپ کو وہیں ہو سکتی ہے اگر اس وقت تک لڑائی جاری رہی تو وہاں بھی آپ کو سلطنت کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ میں نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ چنانچہ چند روز بعد ہم بمبئی پہنچ گئے۔ دس سال کی جلاوطنی کے بعد وطن کی صورت دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ دل ہی جانتا ہے۔

جیسے ہی میں بمبئی میں داخل ہوا گوکھلے کا پیغام پہنچا کہ گورنر تم سے ملنا چاہتے ہیں پونا آنے سے پہلے ان سے مل لو چنانچہ میں ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد انہوں نے فرمایا "میں آپ سے ایک بات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ جب کبھی کوئی تجویز سوچیں جس کا تعلق گورنمنٹ سے ہو تو مجھ سے ضرور مل لیا کریں" میں نے جواب دیا "مجھے یہ وعدہ کرنے میں کوئی تامل نہیں" "لارڈ ولنگڈن نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "آپ کا جب جی چاہے میرے پاس چلے آیا کیجئے آپ دیکھ لیں گے کہ میری گورنمنٹ جان بوجھ کر برائی نہیں کرنا چاہتی" میں نے اس کے جواب میں عرض کیا "اس عقیدے کی بدولت میری ہمت بندھی ہوئی ہے"

آشرم اس کے بعد میں پونا گیا، گوکھلے اور "سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی" کے ممبروں نے مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ گوکھلے دل سے چاہتے تھے کہ میں انجمن سوسائٹی کا ممبر بن جاؤں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ خواہ میں انجمن میں داخل کیا جاؤں یا نہ کیا جاؤں دونوں صورتوں میں اپنا ایک الگ آشرم گجرات کے کسی حصے میں قائم کروں۔ گوکھلے کو یہ تجویز پسند آئی انہوں نے کہا تم ضرور آشرم قائم کرو تمہارے آشرم کو میں اپنا آشرم سمجھوں گا اور اس کا کل خرچ دوں گا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ چندہ جمع کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہوں پونا سے میں راجکوٹ اور پوربندر گیا۔ اس زمانے میں طاعون پھیلا ہوا تھا اور ویرگام یا دھوان میں تیسرے درجے کے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا تھا۔ مجھے خفیف سی حرارت تھی انسپکٹر نے یہ دیکھ کر میرا نام لکھ لیا اور مجھ سے یہ کہا کہ تم راجکوٹ کے میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو جانا۔ غرض میں راجکوٹ پہنچ گیا اور دوسرے دن صبح کو میڈیکل افسر کے پاس حاضر ہو وہاں لوگ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور انہیں انسپکٹر پر بڑا غصہ آیا۔ ایسے موقعوں پر تیسرے درجے کے مسافروں کا طبی معائنہ حفظان صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ سرکاری ملازم تیسرے درجے کے مسافروں کو اپنا ہم جنس نہیں بلکہ بھیڑ بکری سمجھتے ہیں وہ ان کے ساتھ حقارت آمیز گفتگو کرتے ہیں بیچارے مسافر نوکروں کی طرح ان کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ بے تکلف انہیں مار بیٹھتے ہیں ان سے ذرا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں اور انہیں ٹکٹ تک رلا رلا کر دیتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں جہاں کہیں گیا میں نے یہی شکایت سنی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس مسئلے کے متعلق جتنا مواد مل سکا میں نے جمع کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوگوں کی شکایتیں بجا ہیں تو میں نے حکومت بمبئی سے خط و کتابت شروع کی۔ خود ہز ایکسی لینسی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ موصوف نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن اس معاملے میں اپنی مجبوری ظاہر کر کے دہلی کے حکام کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ میں نے حکومت ہند کو لکھا لیکن سوائے خط کی رسید کے کوئی جواب نہیں ملا بہت دنوں بعد جب مجھے لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے کا اتفاق ہوا تب جا کر شنوائی ہوئی اور چند روز کے بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ویرگام کی چنگی کی چوکی اٹھا دی گئی۔

ناخدا کی ضرورت پونا پہنچ کر شرادھ کی رسم سے فراغت پانے کے بعد یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انجمن کا مستقبل کیا ہوگا اور مجھے اس میں شرکت کرنا چاہیئے یا نہیں میرے لئے یہ مسئلہ بہت نازک تھا۔ جب تک گوکھلے زندہ تھے مجھے انجمن SERVANTS OF INDIAN SOCIETY کا رکن بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی میری رہنمائی کے لئے ان کی

سردار پٹیل، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو

ذلت کافی تھی۔ ہندوستانی سیاست کے تلاطم خیز سمندر میں سفر کرنے کے لئے مجھے ایک ناخدا کی ضرورت تھی اور گوکھلے کا دامن تھام لینے سے یہ مشکل حل ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں بے کس و تنہا رہ گیا اور اب میں نے اپنا فرض سمجھا کہ انجمن کا رکن بن جاؤں۔ میں انجمن کا باضابطہ ممبر نہیں بنا مگر روحانی حیثیت سے میں اپنے آپ کو اس کا رکن سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۵ء میں ہردوار میں کمبھ کا میلا تھا جو بارہ سال کے بعد ہوا کرتا ہے۔ مجھے میلا دیکھنے کا شوق نہیں تھا مگر میں ژکل میں بسا تماشی رام جی کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے رضا کاروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا تھا پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس دستے کے سردار تھے۔ میرا کام تو زیادہ تر یہی تھا کہ خیمے میں بیٹھا "درشن" دیا کروں اور ان یاتریوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس آئے تھے مذہبی بحثیں کیا کروں۔ یہ "درشن" کے بھوکے گھاٹ تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ غرض ہردوار میں مجھے معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں جو ناچیز خدمات میں نے انجام دی ہیں ان کا اثر سارے ہندوستان میں کس قدر گہرا ہے۔ میری یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی کو رشک آئے کیونکہ میری جان پر دو طرفہ عذاب تھا۔ جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہیں تھا مثلاً ریل کے سفر میں وہاں مجھے اپنے کروڑوں بھائیوں کی طرح سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں اور جہاں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو میری شہرت سن چکے تھے وہاں "درشن" کی مصیبت تھی۔ ان دنوں میرے جسم میں طاقت تھی اور میں دور دور تک چکر لگایا کرتا تھا۔ میں نے یاتریوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا مجھے ان میں بے حسی، ریاکاری اور بدتمیزی زیادہ نظر آئی

پانچ پیر کی گائے

یہاں میں نے ایک گائے دیکھی جس کے پانچ پیر تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر واقف کار لوگوں نے مجھے اس کا بھید بتا دیا۔ یہ بیچاری سنگدل انسانوں کی حرص و طمع کا شکار تھی۔ یہ پانچواں پیر اصل میں ایک زندہ بچھڑے کے جسم سے کاٹ کر اس غریب کے کندھے پر کھال چیر کر لگا دیا گیا تھا۔ اس دوہرے ظلم سے جاہلوں کو ٹھگنے کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا تھا۔ یہ پاپی جانتے تھے کہ ہندو یقیناً ایسی گائے دیکھنے کے شوق میں دوڑا آئے گا اور اس زندہ معجزہ پر حسب حیثیت چڑھاوا چڑھائے گا۔

ستیہ گرہ آشرم ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو قائم ہوا۔ شردھا نندجی چاہتے تھے کہ میں ہردوار میں سکونت اختیار کر لوں کلکتے کے بعض احباب نے میرے لئے ویدیا ناتھ دھام تجویز کیا تھا اور دوستوں کا اصرار تھا کہ راج کوٹ میں رہوں۔ مگر احمد آباد سے نکلتے وقت وہاں کے لوگ پیچھے پڑ گئے کہ یہیں بس جاؤ اور انہوں نے ہم لوگوں کے لئے ایک مکان اور آشرم کے کل مصارف دینے کا وعدہ کیا۔ میں احمد آباد ہی کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ گجرات میرا وطن ہے گجراتی زبان کے ذریعے سے میں ملک کی اچھی خدمت کر سکتا تھا۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ احمد آباد دیار رچہ بافی کا قدیم مرکز ہے یہاں چرخے کا کام بہت اچھی طرح چلے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آشرم احمد آباد میں قائم کروں۔ میں نے سوچا کہ ہم حق کے پرستار ہیں اور ہمارا کام حق کی تلاش اور حق کی پیروی ہے ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ستیہ گرہ کی تحریک کو ہندوستان میں چلا کر دیکھیں اس لئے ہمیں آشرم کا نام ستیہ گرہ آشرم رکھنا چاہئے۔ میرے دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اس لئے یہی نام رکھا گیا۔ ان دنوں ہماری جماعت میں پچیس آدمی تھے پانچ نوجوان تامل جنوبی افریقہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور باقی آٹھ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر شامل ہوئے تھے۔ ہم پچیس تھے جن میں چند عورتیں بھی تھیں۔ ہم سب اکٹھے کھانا کھاتے اور عزیزوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

ابھی آشرم کو قائم ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ہمیں ایک بڑا سخت امتحان پیش آیا۔ میرے پاس امرت لال ٹھکر کا خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "اچھوتوں کا ایک غریب اور دیانت دار خاندان آپ کے آشرم میں آنا چاہتا ہے کیا آپ اسے داخل کرنے کو تیار ہیں؟" میں نے اپنے رفیقوں کو سنایا انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہ خاندان تین نفوس پر مشتمل تھا۔ ان تینوں نے ضابطوں کی پابندی منظور کر لی اور آشرم میں داخل کر لئے گئے۔ مگر ان کے داخلے سے آشرم کے سرپرستوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہمیں جو مالی امداد ملتی تھی بند ہو گئی۔ ادھر امداد بند ہوئی ادھر افواہیں سننے میں آئیں کہ ہم ذلت سے باہر کر دیئے جائیں گے میں نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم احمد آباد چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جائیں گے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن مگن لال گاندھی نے مجھے اطلاع دی کہ "ہمارا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اگلے مہینے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا" تو ہم اچھوتوں کے محلے میں اٹھ چلیں گے۔"

اس معاملے میں یہ میرا پہلا امتحان نہیں تھا جب کبھی ایسا موقع آیا خدا نے عین وقت پر میری مدد کی میری اور مگن لال کی گفتگو کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ایک روز صبح کو ایک بچے نے آکر کہا کہ ایک سیٹھ موٹر میں آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو لینے گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا میں آشرم کی مدد کروں تو آپ قبول کریں گے میں نے کہا بڑی خوشی سے سچ پوچھئے تو میں آج کل بالکل خالی ہاتھ ہوں: سیٹھ بولے میں کل اسی وقت یہاں آؤں گا۔ کیا آپ یہاں ہوں گے۔ میں نے کہا "جی ہاں" سیٹھ چلے گئے دوسرے دن ٹھیک اسی وقت موٹر ہمارے گھر کے سامنے رکا سیٹھ اندر نہیں آئے بلکہ مجھے باہر بلا لیا انہوں نے تیرہ ہزار روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں دیئے اور رخصت ہو گئے۔ اس مدد کے مل جانے سے ہم نے اچھوتوں کے محلے میں اٹھ جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب ہمیں ایک سال کے لئے اطمینان ہو گیا۔

پابند مزدوری

مارچ ۱۹۱۶ء میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے مرکزی مجلس قانون ساز میں پابند مزدوری کو منسوخ کرنے کی تحریک پیش کی اس تحریک کو قبول کرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ طریقہ کچھ عرصے بعد موقوف کر دیا جائے گا وائسرائے نے صاف کہہ دیا کہ کچھ عرصے بعد منسوخی کے معنی یہ ہیں کہ اتنے دنوں کے بعد کہ آجروں کو کوئی دوسرا انتظام کرنے کی مہلت مل جائے۔ فروری ۱۹۱۷ء میں مالوی جی نے پابند مزدوری کی منسوخی کے لئے ایک مسودہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب وقت آگیا کہ میں سارے

ہندوستان میں احتجاج کا شور برپا کرانے کے لئے دورہ کروں مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے وائسرائے سے مل لوں۔ لارڈ چیمسفورڈ سے جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان تھی انہوں نے کوئی صریح بات تو نہیں کی مگر یہ کہا کہ میں مدد کروں گا۔ میں نے اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ ہم نے طے کیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ۳۱ جولائی تک منسوخی کا اعلان کر دے۔ جلسہ عام میں اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا گیا اور سارے ہندوستان میں اس کی تائید میں جلسے کئے گئے۔ میں نے کراچی، کلکتہ اور بہت سے شہروں کا دورہ کیا۔ ہر مقام پر شاندار جلسے ہوئے اور بے انتہا جوش کا اظہار کیا گیا۔ مجھے اس تحریک کے شروع کرتے وقت اتنی کامیابی کی توقع نہ تھی۔

خفیہ پولیس ان دنوں میں تنہا سفر کرتا تھا۔ خفیہ پولیس والے ہمیشہ میرے پیچھے لگے رہتے تھے ایک بار خفیہ پولیس والوں نے مجھے کئی اسٹیشنوں پر آکر پریشان کیا۔ بار بار میرا نام پوچھتے اور ٹکٹ کا نمبر لکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں بڑی خوشی سے ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میرے ہم سفر مجھے یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی سادھو یا فقیر ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ خفیہ پولیس والے مجھے ہر اسٹیشن پر تنگ کرتے ہیں غصہ آگیا اور انہوں نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ مجھے خفیہ پولیس والوں کے سبب سے کوئی تکلیف نہیں تھی البتہ تیسرے درجے کے سفر میں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں۔

۳۱ جولائی سے پہلے حکومت نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان سے پابند مزدوروں کا بھیجنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں میں نے پابند مزدوری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے پہلی درخواست لکھی تھی اور مجھے اس زمانے میں پوری امید تھی کہ یہ طلسم کسی نہ کسی دن ٹوٹ کر رہے گا۔

مظہر الحق مجھ سے اور مولانا مظہر الحق سے اس زمانے کی ملاقات تھی جب وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک رقعہ بھیجا وہ فوراً اپنی موٹر میں پہنچے اور بڑا اصرار کرنے لگے کہ میرے یہاں چل کر ٹھہرو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ مجھے سب سے پہلی گاڑی میں چمپارن جانے کو بٹھا دیں۔ چنانچہ شام کو انہوں نے مجھے مظفر پور کی گاڑی سے روانہ کر دیا۔

میرا مقصد یہ تھا کہ چمپارن کے کسانوں کی حالت کا مطالعہ کروں اور یہ معلوم کروں کہ انہیں نیل کی کوٹھی والوں سے کیا کیا شکایتیں ہیں۔ یہ تحقیقات شروع کرنے سے پہلے میں نے کوٹھی والوں کے خیالات سے واقف ہونا اور اس جگہ کے کمشنر سے ملنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ میں نے کوٹھی والوں کی انجمن کے سکریٹری اور ترہٹ کے کمشنر سے ملنے کی درخواست کی جسے دونوں نے منظور کر لیا۔ انجمن کے سکریٹری نے مجھ سے صاف کہا کہ تم باہر کے آدمی ہو تمہیں ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے نرمی سے جواب دیا کہ جب کسان خود چاہتے ہیں کہ میں ان کے حالات کی تحقیقات کروں تو مجھے اس کا پورا حق ہے۔ کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے مجھے بہت دھمکایا کہ تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔ چمپارن ترہٹ کی قسمت کا ایک ضلع ہے اور اس کا صدر مقام موتی ہاری ہے میں اپنے رفیقوں کے ساتھ موتی ہاری روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم بابو گورکھ پرشاد کے مہمان ہوئے ایک شخص سپرنٹنڈنٹ کا پیغام لایا کہ صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا جو سپرنٹنڈنٹ کا آدمی لایا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کا حکم دکھایا کہ چمپارن سے فوراً چلے جاؤ میں نے لکھ دیا کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ اس پر میرے پاس سمن پہنچا کہ کل تمہیں عدالت میں خلاف ورزی کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ قانون کے مطابق میرے مقدمے کی تحقیقات در پیش تھی مگر سچ پوچھئے تو حکومت کا امتحان ہو رہا تھا کمشنر نے جو جال میرے لئے پھیلایا تھا اس میں خود حکومت پھنس گئی کارروائی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ وغیرہ بڑی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ سرکاری وکیل زور ڈال رہا تھا کہ پیشی بڑھا دی جائے مگر میں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں میں خود اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے چمپارن سے چلے جانے کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ دوسری پیشی سے پہلے مجسٹریٹ کی تحریر پہنچی کہ لفٹنٹ گورنر نے مقدمہ واپس لینے کا حکم دیا ہے اس طرح ہندوستان نے سول نافرمانی کا پہلا عملی سبق سیکھا۔ چمپارن کے معرکے سے ثابت ہو گیا کہ لوگوں کی بے غرض خدمت سے

خواہ وہ کسی شعبے میں کی جائے ملک کو ایک نہ ایک دن سیاسی فائدہ بھی ضرور پہنچتا ہے۔

بہار سے زیادہ واقفیت ہو جانیکے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ جب تک یہاں کے دیہات میں تعلیم نہ ہو کوئی مستقل کام نہیں کیا جا سکتا۔ برج کشور بابو اور راجندر بابو جیسے ساتھی مشکل سے ملیں گے۔ ان کے خلوص اور انہماک کا نتیجہ یہ اثر ہوا کہ میں کوئی کام ان کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ پروفیسر کرپلانی بھلا ہمارا ساتھ دیئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ ہونے کو وہ سندھی تھے مگر اصل میں بہاریوں سے زیادہ بہاری تھے مولانا مظہر الحق نے اپنا نام امیدوار رضاکاروں میں لکھوا دیا تھا کہ جب ضرورت ہو ان سے مدد لوں۔

اپنے رفیقوں کے مشورے سے میں نے طے کیا کہ چھ گاؤں میں ابتدائی مدارس کھولے جائیں۔ اب سوال یہ تھا مدرس کہاں سے آئیں۔ مقامی لوگوں میں ایسے مدرس ملنا مشکل تھے جو بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر کام کریں اس لئے میں نے رضاکار مدرسوں کے لئے عام اپیل کیا اور اس کا فوراً اثر ہوا۔ ایک طرف تو یہ اصلاحی کام ہو رہا تھا اور دوسری طرف کسانوں کے بیانات لکھے جا رہے تھے۔ ایک میرے پاس گورنر کی طرف سے خط آیا کہ آپ کی تحقیقات کو بہت طول ہو گیا ہے کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ اسے جلد ختم کر دیں اور بہار سے رخصت ہو جائیں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس کے ذریعے سے کسانوں کی شکایتیں دور نہ ہو جائیں میں بہار سے نہیں جاؤں گا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ یہ تحقیقات روک دی جائے تو یا تو وہ کسانوں کی شکایتوں کو تسلیم کرے اور چارہ جوئی کرے یا کم از کم ایک سرکاری تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔ گورنر نے مجھے بلا کر گفتگو کی اور کہا کہ میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو بھی اس کا ممبر بنا دوں گا۔ گورنر نے میری شرطوں کو قبول کر لیا اور تحقیقات کا اعلان کر دیا۔ کمیٹی نے کسانوں کے موافق رپورٹ دی اور یہ تجویز کی کہ جو رقمیں کوٹھی والوں نے ناجائز طور پر وصول کی ہیں ان کا کچھ حصہ ان سے واپس دلایا جائے اور "تن کٹھیا" کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے۔

تقدیر نے مجھے دم لینے کی بھی مہلت نہیں دی احمد آباد کے مزدوروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی مجھے کھیڑا کی ستیہ گرہ میں شریک ہونا پڑا جہاں فصل برباد ہو جانے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کے پٹی دار لگان کی وصولی ملتوی کرانے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ یہ ستیہ گرہ خلاف توقع بہت جلد ختم ہو گئی۔ لوگوں میں مقابلے کا دم نہیں رہا تھا اور میں اس خیال سے کہ کہیں یہ غریب بالکل تباہ نہ کر دیئے جائیں لڑائی کو جاری رکھتے جھجکتا تھا بالکل خلاف توقع ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ ہم یاد دیکھتے گئے۔ معاملات دار (تحصیلدار) نے مجھے کہلا بھیجا کہ اگر خوشحال پٹی دار لگان ادا کر دیں تو غریب لوگوں سے وصولی ملتوی کر دی جائے گی۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر یہ سچ ہے تو کسانوں کا عہد پورا ہو گیا یہ احکام بالکل ان کی خواہش کے مطابق تھے اس لئے ہم ان کی تعمیل پر راضی ہو گئے۔

علی برادران

جس زمانے میں کھیڑا کا معرکہ ختم ہوا ہے یورپ کی مہلک جنگ جاری تھی اب اس میں ایک بڑا نازک موقع آن پڑا۔ وائسرائے نے ہر خیال کے لیڈروں کو دہلی میں "وار کانفرنس" میں شریک ہونے کے لئے بلایا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی اور دہلی پہنچ گیا مگر کئی وجوہ سے مجھے کانفرنس کی شرکت سے تامل تھا جن میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں علی برادران نہیں شامل کئے گئے تھے یہ دونوں ان دنوں جیل میں تھے مجھ سے ان سے صرف دو ایک بار کی ملاقات تھی مگر میں نے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر شخص ان کی خدمات اور ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا۔ حکیم صاحب سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک باطن اور نیشنلسٹ لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔

جب میں نے علی برادران کی رہائی کے لئے حکومت سے خط و کتابت شروع کی اس سلسلے میں میں نے اس سے واقفیت حاصل کی کہ خلافت کے مسئلے میں ان دونوں کے خیالات کیا ہیں مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیئے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلہ خلافت کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے میرے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے مجھے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا مطلق افسوس نہیں۔ اگر ایسا موقعہ پھر آئے تو میں پھر وہی طرز عمل اختیار کروں گا۔ غرض جب میں دہلی گیا تو پوری طرح ارادہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات وائسرائے کے سامنے پیش کروں گا۔

میں نے وائسرائے کے نام خط میں لکھا کہ :-

" آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے ۲۶ر اپریل کے خط میں وہ وجوہ عرض کی تھیں جن کی بنا پر مجھے کانفرنس کی شرکت میں تامل تھا۔ مجھے کانفرنس کی شرکت میں سب سے قوی اعتراض یہ تھا کہ لوکمانیہ تلک مسز بیسنٹ اور علی برادران جیسے با اثر لیڈر اس میں نہیں بلائے گئے۔ میری آخری درخواست آپ سے یہ ہے کہ برطانوی وزراء سے کہئے کہ اسلامی ممالک کے بارے میں ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیں میں یقین دلاتا ہوں کہ ہر مسلمان کا دل ان کے درد سے بے چین ہے اور میں بھی ہندو ہونے کی حیثیت سے اس درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان کی مصیبت ہماری مصیبت ہے سلطنت کی حفاظت کی یہی صورت ہے کہ اسلامی ممالک کے حقوق کی دل و جان سے حمایت کی جائے۔ مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام مد نظر رکھا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ ہوم رول کا جلد منصفانہ تصفیہ کر دیا جائے "

رنگروٹوں کی بھرتی میں میں نے اتنی محنت کی کہ میری صحت نے جواب دے دیا۔ ابھی اچھی طرح صحت نہیں ہو پائی تھی کہ اخبار دیکھتے دیکھتے میری نظر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر پڑی۔ اس کی تجویزیں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے

حکیم اجمل خاں

شنکر لال بینکر اور عمر سبحانی نے درخواست کی کہ اس معاملے میں فوری کارروائی کرنا چاہئے۔ میری تحریک پر ایک خاص انجمن "ستیہ گرہ سبھا" کے نام سے قائم کی گئی اور مجھے صدر بنایا گیا۔ ادھر رولٹ رپورٹ کے خلاف شورش بڑھ رہی تھی اور ادھر حکومت کو ضد تھی کہ کمیٹی کی تجاویز پر عمل کر کے رہے گی۔ میں نے وائسرائے کو منت سماجت سے سمجھایا ان کے نام نجی خط بھی لکھے مگر ساری کوششیں بیکار گئیں

حکیم اجمل خاں

مجھے یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں عام ہڑتال کرانا چاہیئے اس لئے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی اپاس (روزہ) کریں۔ مسلمانوں کے یہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لئے اپاس چوبیس گھنٹے کا رکھا جائے۔ ہڑتال کے لئے ۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء رکھی گئی مگر آگے چل کر یہ تاریخ بدل دی گئی اور ۶ر اپریل مقرر ہوئی۔ اس دن سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں میں مکمل ہڑتال ہوئی

مولانا آزاد اور گاندھی جی

دہلی میں ۳۰ مارچ کو ہڑتال ہو چکی تھی وہاں شردھانند جی اور حکیم اجمل خاں کا طوطی بولتا تھا۔ انہیں ہڑتال کے التوا کا تار دیر سے پہنچا۔ دہلی میں جیسی ہڑتال اس دن ہوئی کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک ہو گئے۔ بھلا حکام ایسی باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے! پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور گولی چلائی قریب قریب یہی لاہور اور امرتسر میں گذرا۔ امرتسر سے میرے پاس ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی تاکیدی دعوت آئی میں نے وعدہ کیا کہ دہلی سے امرتسر آؤں گا۔ غرض ۸ اپریل و شام کو میں دہلی اور امرتسر کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ ۹ کو متھرا پہنچ کر میں نے سنا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنے والی ہے۔ پلول کے اسٹیشن پر مجھے گاڑی سے اتار کر پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔

ادھر عدم تشدد کی تحریک آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی۔ اور ادھر حکومت کے جبر و تشدد کا بازار گرم تھا خصوصاً پنجاب میں تو اس نے ظاہرداری کا پردہ بھی اٹھا دیا تھا۔ میں نے وائسرائے کو خط لکھ کر اجازت مانگی۔ تار بھی دیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں حکومت نے مسٹر ہارنیمن کو جن کی ادارت میں بمبئی کرانیکل نے بڑا زبردست اثر پیدا کر لیا تھا ب بدر کر دیا۔ حکومت کا یہ فعل میرے نزدیک اس قدر کریہ تھا کہ مجھے آج تک اس خیال سے گھن آتی ہے۔ جب بمبئی کرانیکل ان کی خدمات سے محروم ہو گیا تو اس کے ڈائرکٹروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیجئے بریلوی صاحب موجود ہی تھے اس لئے میرا کام محض برائے نام تھا مگر حکومت نے کرانیکل بند کر کے مجھے اس مشکل سے بچا لیا

ینگ انڈیا

ان دنوں کرانیکل کا انتظام سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے ہاتھ میں تھا اور ینگ انڈیا کو بھی وہی چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرانیکل تو اب بند ہو گیا۔ اب آپ "ینگ انڈیا" کی ادارت قبول کر لیجئے اور اسے بجائے ہفتہ وار کے سہ روزہ کر دیجئے میں خود بھی یہی چاہتا تھا مجھے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو ستیہ گرہ کے حقیقی اصول سمجھاؤں۔ میرے کام کا خاص میدان گجرات تھا اس لئے مجھے ایک گجراتی اخبار کی بھی ضرورت تھی۔ ان دنوں اندولال جی یا جنگ سیٹھ عمر سبحانی اور شنکر لال بینکر کے حلقے میں شامل تھے وہ اپنے دوستوں کی مالی امداد سے گجراتی میں ایک ماہوار رسالہ "نوجیون" نکال رہے تھے ان دوستوں نے نوجیون میرے حوالے کر دیا۔ دو ہفتہ وار اخبار دو مختلف مقامات سے نکالنے میں مجھے بڑی دقت تھی اور مصارف بھی زیادہ تھے اس لئے میری درخواست پر ینگ انڈیا بھی احمد آباد منتقل کر دیا گیا ❊ ❊

میں نے انگریزوں سے صلح کرنے سے انکار کر دیا

(خان عبدالغفار خان)

ایک قیدی کی آپ بیتی

یہ ان بیتے دنوں کی بات ہے جب میں پشاور جیل
(ا)ہنی سلاخوں کے پیچھے اپنے وطن کو انگریزوں کی غلامی
(آ)زاد کرانے اور خلافت تحریک میں حصہ لینے کے باعث
(بند ک)ر دیا گیا تھا اور جہاں کھانا ایسا ملتا تھا کہ جانور بھی نہ
(کھا)تے۔ ایک دن جیل کا بڑا برطانوی سربراہ آیا تو میں نے
(ا)سے وہ ترکاری دکھائی جو مجھے کھانے میں دی گئی تھی۔ میں
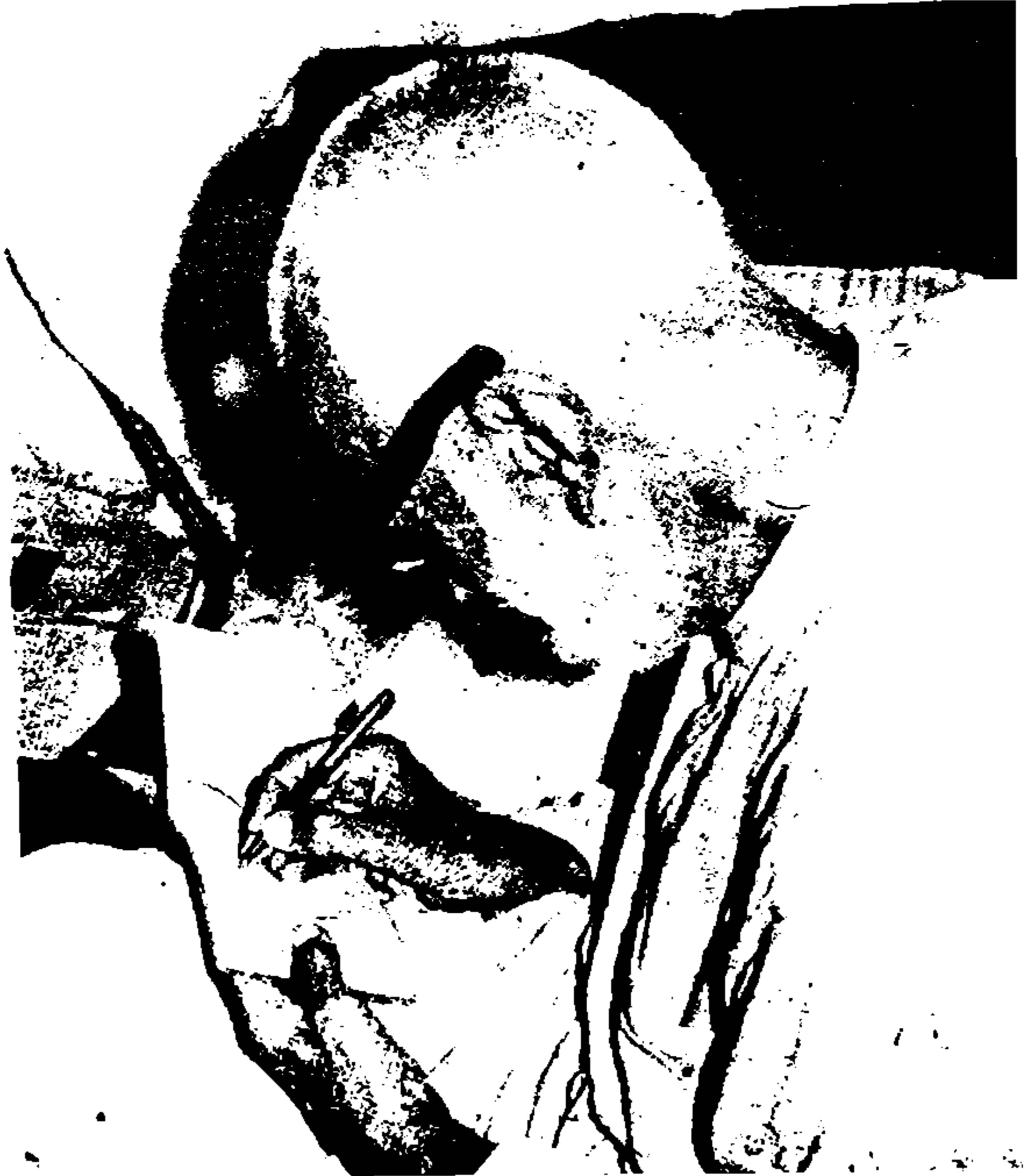
نے اس سے کہا کہ "اسے تو جانور بھی نہیں کھا سکتا۔" اس نے تمہاری کلاس سری معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ سالن تو بہت اچھا ہے۔

اس کے اس جواب کے بعد میں نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ اس سے کہا کہ "مجھے عام مجرموں کی طرح رات کو بیڑیاں پہنادی گئی ہیں۔ کیا تمہارے انگلستان میں بھی سیاسی قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جاتا ہے۔؟"

انگریز جیلر چپ ہو کر چلا گیا اور دوسرے دن مجھے لفافے بنانے کے کام پر ایک کارخانے میں لگا دیا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے کسی دوسری کوٹھری میں منتقل کرا دے گا۔ جس کارخانے میں مجھے لفافوں کا کام دیا گیا تھا وہاں کے بعض قیدی مشقت اور محنت سے جی چراتے تھے اور اس وجہ سے گنگارام وارڈن کو رشوتیں دیا کرتے تھے۔ میں نے جب اس بات پر اعتراض کیا تو گنگارام نے میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنایا اور انگریز آفسر سے کہا کہ یہ شخص ہمیشہ سے خلاف کام کرتا ہوں۔ انگریز کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح تھی کہ یہی سے یہ کام کرانا ہے۔ ڈسپلن کے نام پر کرا لو۔ چنانچہ میرا تبادلہ اس جیل سے جہاں میں پشاور جیل سے دو ماہ قبل آیا تھا ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی جیل میں کرایا گیا۔ میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی اس جیل میں محض دو ماہ ہی گذار سکا تھا لیکن غذائی خرابی کی وجہ سے میرا وزن پینتالیس پونڈ کم ہو گیا اور میرے مسوڑے خراب ہو گئے۔

بہر حال مجھے انتہائی سخت اور کڑی نگرانی میں ایک پردہ نشین عورت کی طرح ایک کار میں پردے کے اندر بٹھا کر ڈیرہ غازی خاں پہنچا دیا گیا۔ اس جیل میں آ کر میری بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ یہ چھوٹا سا جیل خانہ تھا اور یہاں پنجاب کے سیاسی قیدی بند تھے۔ اس جیل میں مجھے سی کلاس میں رکھا گیا لیکن یہاں روٹی اور سالن اچھا ملتا تھا۔ بیڑیوں سے نجات مل ہی چکی تھی۔ یہیں مجھے پنجاب کے لوگوں اور خصوصاً سکھوں اور ہندوؤں سے بات چیت کرنے اور ان کے عقائد کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر مجھے اسپیشل کلاس میں منتقل کر دیا گیا اور چرخہ کاتنے کے کام پر لگا دیا گیا۔

میں بتا چکا ہوں کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی جیل میں میرے دانت خراب ہو گئے تھے۔ اس علاج معالجہ کے لیے مجھے لاہور سینٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔ یہاں خلافت کی تحریک اور کانگریس پارٹی دونوں کے ہی اراکین بند تھے۔ میرا تعلق اُن دنوں بعض تحریک خلافت سے تھا۔ اس لیے حکام نے مجھے قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا۔ جب یہ بات خلافت کے رہنماؤں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے بہت شور و غل مچایا اور احتجاج کیا جس کے نتیجے میں مجھے عام سیاسی قیدیوں کے ساتھ رکھوا دیا۔ اس جگہ میری ملاقات آغا صفدر، لالہ لاجپت رائے، ملک لال خاں اور دوسرے کانگریسی نیتاؤں سے ہوئی۔ یہاں میں نے مسلمان قیدیوں کو درس قرآن دینا شروع کر دیا۔

کچھ دن بعد مجھے ڈیرہ غازی کی جیل بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اور سکھ زیادہ تھے۔ ایک دو ہندو قیدی تو اس وہم میں مبتلا تھے کہ سرحدی پٹھان انسانوں کا خون پی جاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے ان کی غلط فہمی رفع ہوئی۔

ایک دن محکمہ جیل کا انگریز جنرل آیا۔ اسے توہم پرستوں سے نفرت تھی۔ جب اس نے ہندوؤں کو گاندھی کیپ اور سرداروں کو پگڑی باندھے دیکھا تو سخت ناراض ہو کر حکم دیا کہ ان کے سروں سے ٹوپیاں اور پگڑیاں اتار لی جائیں۔ اگرچہ ہم سب نے اس حکم پر سخت احتجاج کیا لیکن ہوا وہی جو جنرل کہہ گیا تھا۔

جیل کے دوران قیدیوں کو تین مہینے کی میعاد میں ایک خط لکھنے اور ایک موصول کرنے کی اجازت تھی۔ اس طرح ہر قیدی کو اس کے لواحقین سے ملنے کی اجازت بھی تین ماہ میں ایک بار ملتی تھی۔ حالات یہ تھے کہ ہمیں باہر کے معاملات کی کوئی اطلاع نہیں ہوتی تھی۔ نہ کوئی اخبار ملتا اور نہ ہی خبریں کسی ذریعہ سے مل پاتیں۔ ۱۹۲۳ء کے اواخر میں میری والدہ جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں انتقال کر گئیں اور انگریز ظالموں نے مجھے کوئی اطلاع نہ ان کی

علالت اور رحلت کے بارے میں دی۔

جیل ڈیرہ غازی خان کے اندر میں ہی ایک علیحدہ قیدی تھا جسے تین برس کی سزا ہوئی تھی۔ ایک دن ایسا آیا کہ سب چھوٹ گئے اور میں تنہا رہ گیا تو مجھے میانوالی قید خانے روانہ کر دیا گیا جہاں کانگریسی بھی تھے اور خلافت والے بھی۔ ہندو مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ سب کے لنگر الگ الگ تھے۔ مسلم لنگر کے انچارج پانی پت کے مولانا اقبال تھے جنہیں زیادہ مرچ کھانے کا شوق تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کا لڑکا اختر علی خاں بھی یہیں بند تھا۔

۱۹۲۴ء میں تین سال قید با مشقت کاٹنے کے بعد مجھے رہائی نصیب ہوئی۔ پولس نے مجھے اپنے ساتھ چارسدہ لا کر چھوڑ دیا جہاں سے میں اپنے آبائی گاؤں چلا آیا۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ میرے گاؤں نے تعلیم کے میدان میں خاصی ترقی کر لی ہے۔ ان لوگوں نے یہ کام میری قید کی وجہ سے کیا تھا۔ اب میری واپسی نے ان کے حوصلوں اور امنگوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔ ایک اسکول کے سالانہ جلسے میں مجھے تمغہ اور "فخر افغان" کا لقب دیا گیا۔

مئی ۱۹۲۶ء میں میری بڑی بہن مجھے اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لے کر حج کو روانہ ہوگئیں۔ اس سال سعودی عرب میں دنیائے اسلام کا موتمر منعقد ہوا تھا۔ ہندوستان سے بھی مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں وغیرہ پہنچے ہوئے تھے۔ ان دنوں وہاں کاریں نہیں تھیں اس لیے ہم نے اونٹوں پر مکہ، مدینہ، جدہ وغیرہ کا سفر کیا۔ ان مقامات کے علاوہ ہم نے براہ سوئز بیت المقدس کی زیارت بھی کی۔ یہاں میری دوسری بیوی اپنے پیچھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد میں نے شادی نہیں کی حالانکہ میں جوان تھا۔ کچھ دن لبنان، شام، عراق، نجف، کربلا، بغداد اور بصرے کی زیارت اور سیاحت کے بعد میں اپنے آبائی گاؤں واپس آ پہنچا اور خدمت خلق میں منہمک ہو گیا۔

یہاں آکر میں نے سب سے پہلا قومی اخبار "پشتون" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں جاری کیا۔ اس اخبار کے ذریعہ پختونوں میں اپنی مادری زبان سے محبت اور آزادی کے لیے عقیدت کے جذبات بیدار کیے۔ اس اخبار نے افغانستان میں ایسی مقبولیت حاصل کی کہ امان اللہ خاں امیر افغانستان بھی اس کے دلدادہ ہو گئے اور بعد میں انہوں نے اسی طرز پر ایک اخبار شروع کیا

سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خاں اور گاندھی جی

(پشتونوں کی آواز) کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا ہر سرکاری ملازم تین سال کے اندر اندر پشتو سیکھ لے کیونکہ تین برس بعد اس زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائیگا۔ ابھی تو پرچے نکلے تھے کہ افغانستان میں انگریزوں نے بغاوت پھیلا کر امان اللہ خاں کو تاج و تخت سے محروم کر کے اٹلی روانہ کر دیا۔

یہ واقعہ میرے لیے جاں گداز تھا اس سلسلے میں افغانستان کے حق میں پروپیگنڈا کرنے اور مالی امداد کے لیے ہندوستان آیا۔ پنجاب میں ملک لال خاں، ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبال سے ملاقاتیں کیں اس کے بعد میں لکھنؤ کانگریس میں شریک ہوا جہاں میں پہلی بار جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے ملا۔ یہ اجلاس ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا جواہر لال نہرو مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ وہ میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کے یونیورسٹی فیلو رہ چکے تھے۔ دونوں نے انگلستان میں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ جلسے کے بعد چودھری خلیق الزماں کے مہمان تھے مجھے بھی اپنے ساتھ ان کے پاس لے گئے اور ہم تینوں کے درمیان افغانستان کے مسئلے پر تا دیر گفتگو رہی۔

لکھنؤ سے میں دلی آیا۔ یہاں مولانا محمد علی سے ملا۔ میری نظر میں وہ ایک اعلیٰ وارفع انسان تھے اور جلد ہی وہ میرے مہربانوں میں سے ایک ہو گئے۔ چند دن بعد جب نادر خاں کی طرف سے فتح کابل کی اطلاع ملی تو ہم خوشی سے مارے پھولے نہ سمائے۔ جشن کئے، جلوس نکالے اور جگہ جگہ جلسے کیے۔ دستان زئی میں ایک جلسے کے اختتام کے بعد چند نوجوان میرے پاس آئے اور انہوں نے قوم کی خدمت اور اصلاح کے لیے ایک جماعت بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ارادہ نیک تھا اور وقت کا تقاضہ بھی تھا۔ اس لئے ہم نے "خدائی خدمت گار" نام کی جماعت کی داغ بیل ڈال دی۔

"خدائی خدمت گار" ایک غیر سیاسی جماعت تھی۔ ہم نے اسے اپنی سماجی کامرانی اور اقتصادی کمزوریوں کو دور کرنے کی خاطر بنائی تھی۔ لیکن انگریزوں کے جبر و تشدد نے انہیں سیاست سے تعلق پیدا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان دنوں پٹھانوں میں پارٹی بازی اور پھوٹ کی وجہ سے تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں انتقامی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے اور اچھے اخلاق اور عادات کا بھی فقدان تھا۔ ۱۹۲۹ء میں قائم کی گئی جس "خدائی خدمت گار" جماعت نے ان تمام برائیوں کو جڑ سے کاٹ ڈالنے کا عزم صمیم کیا تھا اب ان کے علاوہ انگریزوں کی جابرانہ پالیسی نے اس جماعت کو سیاست سے رابطہ پیدا کرنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔

۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس سیشن میں بہت سے سرحدی پٹھان شریک تھے۔ یہاں سے ہم نے کئی سبق لیے۔ اپنے گاؤں واپس آ کر ہم نے اپنی جماعت میں بھرتی کا کام زور شور سے شروع کر دیا۔ جرگے بنائے اور گاؤں گاؤں "خدائی خدمت گار" کے دفاتر قائم کیے اور شاخیں کھولیں۔ غرض سارے صوبہ سرحد میں یہ تحریک پھیل گئی۔ انگریزوں سے دیکھا نہ گیا اور ایک دن انگریز چیف کمشنر نے اس تحریک کو بند کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے چیف کمشنر سے کہا کہ ہماری تحریک خالص سماجی ہے اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور یہ حقیقت بھی تھی لیکن وہ نہیں مانا اور اس نے مجھ سے کہا!

"بے شک یہ تحریک سوشل ہے لیکن جب پٹھان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے تو اس کی ضمانت کیا ہے کہ تم ان سب کو ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے۔؟"

بہر حال ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی میں خدائی خدمت گاروں کا ایک عظیم جلسہ ہوا۔ اور جب میں پشاور جا رہا تھا تو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ غیور پٹھان اس گرفتاری سے بپھر گئے۔ اور پھر مظاہرے ہوئے جنہیں دبانے کے لیے انگریزوں کی رائفلوں سے گولیاں برسنے لگیں۔ اس گرفتاری کی وجہ سے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں ایک بڑا ہنگامہ رونما ہوا۔ بھاری تعداد میں پٹھانوں نے جام شہادت نوش کئے۔ یہ ۲۳ اپریل کا واقعہ اس لیے بھی تاریخ ساز واقعہ ہے کہ اسی دن سے ہم نے سیاست کو اپنی صفوں

میں داخل کر لیا۔ خدائی خدمت گار جو سماجی جماعت تھی اب ایک سیاسی تنظیم کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

گرفتاری کے بعد مجھے تین سال کی قید ہوئی۔ اور مجھے پنجاب کی گجرات جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پہلے سے ہی بہت سے ہندو مسلم اور سکھ سیاسی قیدی موجود تھے۔ یہاں بڑے بڑے عالموں کی جو شائستہ اور مہذب صحبت ملی وہ کسی اور جیل خانے میں مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ ان عالموں میں ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، سیف الدین کچلو، ڈاکٹر گوپی چند، لالہ شیام لال، پنڈت جگت رام ہریانوی، رائے زادہ ہنس راج وغیرہ جیسے لوگ تھے

اس جیل میں کچھ ساتھی مجھ سے ملاقات کرنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ اتمان زئی پر کیا بیتی۔ انگریز فوجیوں نے کس بے دردی کے ساتھ خدائی خدمت گاروں کے دفاتر کو نذر آتش کر دیا۔ سرخ کپڑے پہننے والے تمام رضا کاروں کو گرفتار کر کے کس طرح انہیں شدید جسمانی اذیتوں کا شکار بنایا!!!۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے گاؤں واپس جانے کی بجائے لاہور، شملہ، لکھنو، بمبئی، دلی، وغیرہ جاکر مسلم لیگ کے رہنماؤں کو تمام حالات سے آگاہ کر کے انہیں پٹھانوں کی امداد کے لیے آمادہ کریں۔ ان ساتھیوں نے بعد میں مجھ سے کہا کہ مسلم لیگ انگریزوں سے فی الحال مخالفت مول لینے کے لیے رضامند نہیں ہے اور کسی بھی مسلم لیگی رہنما نے ہماری امداد کے لیے کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارا انڈین نیشنل کانگریس سے کوئی واسطہ اور کوئی سہارا نہ تھا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بڑا سہارا معلوم ہوتا ہے اس لیے میں نے ان سے کہا کہ وہ اب کانگریس لیڈروں سے رجوع کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور کانگریسی نیتا اس شرط پر ہماری امداد و اعانت کے لیے تیار ہو گئے کہ ہم : آزادی کی جنگ میں ان کے شانہ بشانہ قدم بہ قدم شریک رہیں۔ بات معقول تھی۔ جرگے بلائے گئے اور باہمی مشاورت کے بعد خدائی خدمت گار نے کانگریس میں شمولیت کا فیصلہ نافذ کر دیا۔

جب یہ اطلاع انگریز حکام کو ملی تو انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر ہم کانگریس کا ساتھ چھوڑ دیں تو وہ ہمیں بڑی سے بڑی مراعات دینے کو تیار ہیں۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ "تم نے ہم پر بھروسہ نہیں کیا لہذا ہم بھی تم پر اور تمہارے وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔" انگریزی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

(ترتیب: کبیر کوثر) ●●

اسٹالن پچیس لاکھ پارٹی ممبروں کا قاتل تھا

روس کے سابق سربراہ خروشچیف کی یادیں

(آخری دستاویز کی چند جھلکیاں)

• مترجمہ: اشروب ٹائیو

اب میں "آزاد قازق" کا روپ دھار چکا ہوں میری پنشن یافتہ زندگی کے دن ایک ایک کر کے گذرتے جا رہے ہیں۔ ایک مثالی بڑھاپے کی زندگی ہر ایک شخص کی قسمت میں نہیں۔ ہزاروں طوفان دیکھنے اور سیلابوں سے مقابلہ کرنے کے بعد میری کشتیٔ عمر اب ساحل پر آلگی ہے۔ مجھے اب اُس دن کا انتظار ہے جب مجھے آخری سانس لینا نصیب ہوگی لیکن مجھے اپنی بدقسمتی کا کوئی ملال نہیں ہے۔ ہر وہ آدمی جو اس دنیا میں آیا ہے خواہ وہ کتنا ہی عظیم اور بڑا شخص ہو بڑھاپے کی سرحدوں میں آ کر کمزور اور نحیف ہو جاتا ہے لیکن میں اپنے دیگر ہم عمروں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت ہوں کیونکہ اُن کے برعکس میری آنکھوں کی روشنی سلامت ہے۔ میرا ذہن جام نسیاں نہیں بن سکا۔ مجھے آج بھی گزرے ہوئے واقعات من و عن یاد ہیں۔ میں آج بھی اُن منصوبوں کو تشکیل دے سکتا ہوں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضامن ہو سکتی ہیں اور جن سے عسکری

افلاس اور دوسری سماجی، عمرانی اور ثقافتی بیماریوں کا تیر بہدف علاج ہو سکتا ہے۔

آج جبکہ ایک طویل علالت کے بعد میں ہسپتال سے گھر آیا ہوں اپنی سوانح عمری اور آپ بیتیوں کو تحریر کر رہا ہوں۔ جنہوں نے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے لیکن میری یہ آپ بیتی میرے خیال میں اُن لوگوں کے لیے مشعلِ راہ کا فرض انجام دے گی جو ابھی رحمِ مادر سے باہر نہیں آئے ہیں۔ میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ آنے والی نسل، جنگ و جدل، میدانِ کارزار، فاقہ کشی، بے مکانی، اور دوسری ایسی ہی لعنتوں کو آنے والے قیامت کے دنوں تک ختم کر دے گی۔ زندگی کو عدیم المثال بنانا ان ہی لوگوں کا کام ہے اور یہ سہرا وہی لوگ اپنے سروں پر باندھ سکیں گے۔

میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوا۔ کامریڈ اسٹالن کے بعد سوویت کمیونسٹ پارٹی کی جنرل سیکریٹری شپ مجھے اُس وقت ملی جب ۱۹۵۳ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء تک مجھے روس جیسے عظیم ملک اور روسیوں جیسے عظیم باشندوں کی سربراہی کا موقع ملا۔ اس کے بعد پنشن یافتہ زندگی گزار رہا ہوں۔

میرے والد ایک کان میں مزدوری کرتے تھے۔ اس لیے مجھے اور میرے خاندان کو زندگی کی تمام مشکلات اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خصوصاً اُس دوران جب یوکرین میں اسٹالن کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے قحط سالی پھیلی ہوئی تھی۔ میری زندگی کا عملی آغاز تو اُسی وقت ہو گیا تھا جب میں نے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھا۔ اُس کے بعد سے زندگی کے ان آخری دنوں تک آرام نام کی کوئی شے میری زندگی میں نہیں آئی۔

مجھے اپنے فرائض سے سبکدوش کرنے والوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے بھی اسٹالن کی طرح اپنی شخصیت کو نمایاں اور ممتاز بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے بھی مرحوم کی طرح حکومت کی زیادہ سے زیادہ طاقتوں کو اپنے ہی ہاتھوں میں محفوظ کر لیا ہے اور یہ کہ میں نے چین کے ساتھ نظریاتی اختلافات کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیا تھا اور

خروشچیف کی یادیں

اس کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ مجھے ماوزے تنگ سے ذاتی عناد یا بغض تھا۔ ایک الزام یہ بھی تھا کہ میں نے ہند اور چین تنازعہ کے دوران ہندوستانی فضائیہ کو مِگ جیسے خطرناک بمبار ہوائی جہاز فراہم کر دیئے تھے بہرحال مجھے ۱۹۶۴ء میں سبکدوش کر دیا گیا۔

سوانح عمری کے بیان کے لیے اتنے ہی واقعات کا تذکرہ یہاں کافی ہو گا چونکہ میں اپنی آپ بیتی کا خصوصاً سیاسی میدان میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اُن تجربات اور مشاہدات کا آنے والی نسلوں کے لیے تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ جسے صحیح معنوں میں انسانی نسل کا فریضہ انجام دینا ہے اور جن کے لیے میرے یقین اور اعتبار و اعتماد کے مطابق آپ بیتی کے چند واقعات مشعلِ ہدایت کا کردار ادا کریں گے

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں دنیا کو ایک بار نہیں بلکہ بارہا عالمگیر جنگ کے دہانوں سے کھینچ کر صلح و آشتی کے میدان میں لایا ہوں۔ اسی وجہ سے میرے اور چین کے نظریات میں اختلاف ہوا۔ ماوزے تنگ کی نظر میں سامراجی طاقتیں محض کاغذی شیر تھے۔ جن سے وہ بآسانی لوہا لے سکتے تھے۔ لیکن میں نے جب یہ بتایا کہ ان کاغذی شیروں کے دانت ایٹمی ہیں تو وہ ناراض

ہو گئے اور میرے اور ان کے درمیان تعلقات کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

کامریڈ اسٹالن کو روس اور روسی عوام کے تا دم آخر رہنما اور راہبر کی حیثیت سے رہے بلا شبہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن وہ بہ یک وقت بے شمار خوبیوں اور بے انتہا خامیوں کے مرکز تھے وہ عوام کو اپنا تابع فرمان بنانے کے لیے ان سے التفات برتنے کی بجائے انہیں خوف زدہ رکھنا چاہتے تھے۔

میری اور کامریڈ اسٹالن کی پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ اُس وقت میں تیس برس کا ہو چکا تھا۔ یہ ملاقات کمیونسٹ پارٹی کے چودھویں اجلاس میں ہوئی جو روس کی راجدھانی ماسکو میں منعقد ہوئی تھی۔ میں ان دنوں دو بچوں کا باپ تھا۔ میری پہلی بیوی ۱۹۲۱ء میں قحط کا شکار ہو کر داعی اجل کو لبیک کہہ چکی تھی۔ پھر میں نے نینا سے شادی کر لی تھی۔ مجھے اسٹالن کو دیکھنے اور اُن کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنے کا جنون سا تھا اس لیے میں کانگریس کے اجلاس میں قبل از وقت ہی پہنچ گیا تاکہ اگلی نشستوں میں سے کسی ایک پر قابض ہو جاؤں۔ اس اجلاس میں شرکت کے بعد میری رائے اسٹالن کے بارے میں یہی ہوئی کہ وہ بہت سخت گیر انسان اور فولادی جگر کے مالک تھے اور انہیں عوام تو کیا خواص کو بھی اپنے حواریین بنا لینے کے گُر یاد تھے لیکن افسوس کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ جوان اسٹالن اور بوڑھے اسٹالن میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جب میں ماسکو انڈسٹریل اکیڈمی میں زیر تعلیم تھا مجھے سمارا کے علاقے میں مشترکہ زراعتی کھیتی کے سربراہوں کو فراہم کیا ہوا چندہ پہنچانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہاں جا کر میں نے غربت و افلاس، ذلت و نکبت کے وہ مناظر دیکھے جن سے میرا دل لرزنے لگا۔ میرے انگ انگ پر رواں کھڑا ہو گیا۔ کاشت کار قحط سالی اور غلہ کی کمیابی کی وجہ سے بھیڑ بکریوں کی طرح دم توڑ رہے تھے۔ یہ لوگ غلے کو اتنے ترس چکے تھے کہ جب میں نے انہیں حقیر رقم ادا کرنے کی پیش کش کی تو وہ اس خوش خبری سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے ان کے چہروں پر مسرت کی کوئی کرن بھی نمودار ہوتے نہیں دیکھی اور جب میں نے وجہ دریافت کی تو ان کاشتکاروں نے مجھ سے کہا کہ انہیں روپے کی کوئی خاص ضرورت نہیں بلکہ سر دست محض کھانے کے لیے غلہ دستیاب کیا جائے۔

غلہ کی فراہمی کی بجائے کاشت کاروں میں رقم تقسیم کرنے کا یہ اسٹالینی حکم بہت سی حکمتوں سے خالی تھا اس طریقہ کار نے سارے علاقے کو اناج سے محروم کر دیا تھا۔ یوکرین جہاں کا میں رہنے والا۔ اس حکم سے تباہی اور بربادی کے مہیب اور خوفناک غاروں میں پہنچ گیا۔ ہزاروں یوکرین کے باشندے فاقہ کشی کی وجہ سے موت کے فرشتوں کو تو لبیک کہتے رہے لیکن کسی میں بھی اسٹالن کے اس طرزِ عمل کے خلاف انگلی اٹھانے یا لبوں کو جنبش دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ مشترکہ کھیتی کے لیڈر کے سامنے تھرتھراتے تھے۔

اسٹالن کے قہر و غضب سے بچنے کے لیے مجھے خوش بختی سے یہ موقع حاصل ہوا کہ اُس کی بیوی نادیہ جس نے اُس کی بیٹی سوتیلانہ کو جنم دیا تھا میرے ساتھ ہی انڈسٹریل اکیڈمی مذکور میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور میں نے اُس سے اپنے تعلقات بڑھائے تھے اسی نیک نفس خاتون کی سفارش سے میری زندگی کی شمع جلتی رہی جبکہ ہزاروں ورکر اور لیڈر اسٹالن کے عتاب کا شکار ہو کر مٹی کا جزو بنا دیے گئے تھے۔

نادیہ کی پچھلی سفارشات کی وجہ سے مجھے اسٹالن نے ۱۹۳۴ء میں ماسکو کا پارٹی لیڈر چن لیا تھا اگرچہ نادیہ دو سال قبل ۱۹۳۲ء ہی میں خودکشی کے ذریعہ اپنی جان دے چکی تھی۔ لیکن اُس کے دیے ہوئے مشوروں پر اسٹالن کام کرتا رہا۔ نادیہ جیسی نیک اور باعمل خاتون کی اس خودکشی کے بعد ہی میں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسٹالن کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ اُس

نے بنتے روس کے معمارِ اول کامریڈ لینن کی بیوی اور بہن سے بھی کوئی مشفقانہ سلوک نہیں برتا۔ اسٹالن کی وفات کے بعد نہیں ان کی خوابگاہ کی ایک فولادی الماری میں سے ایک ایسا خط دستیاب ہوا ہے جو مرحوم کامریڈ لینن نے انھیں تحریر کیا اور جس میں اس بات کی برملا شکایت کی گئی تھی کہ اسٹالن اگر اُن کا رفیق کار بنا رہنا چاہتا ہے تو اُن کی بیوی سے اپنے رویّہ کی معافی طلب کرے۔ ظاہر ہے کہ اسٹالن نے اپنی سیاسی بقا کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی معافی مانگ لی ہو گی۔

بعض گناہوں کی پاداش میں ہزاروں لوگ یا لاکھوں بے گناہ اور معصوم انسان موت کے گھاٹ اتارے جاتے رہیں۔ دو شہنشاہوں میں ملک گیری کی ہوس کی خاطر کروڑوں انسانوں نے اپنی جانیں گنوا دی ہیں۔ آخر یہ مظالم کب تک ہوتے رہیں گے۔ بے گناہوں، معصوموں اور بے قصور لوگوں کو کب تک موت کے گھاٹ اتارے جانے کے مواقع فراہم کیے جاتے رہیں گے۔ اسٹالن کے دورِ سفاک میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ نمودار ہوا جب محض ایک فرد کی جان کے انتقام کے لیے دس لاکھ پارٹی ممبران کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ دوسرے بے گناہ مقتولوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے کہ مجھے بذریعہ ٹیلی فون مطلع کیا گیا کہ لینن گراڈ میں ٹراٹسکی کے حامیوں نے وہاں کے پارٹی لیڈر سرجی کیرو دکو قتل کر دیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اسٹالن کی خفیہ فوج نے اصل قاتل کو پکڑنے کے دوران دس لاکھ پارٹی ممبران کو قتل کر دیا۔ ان کے علاوہ اُن لوگوں کا بھی صفایا کر دیا گیا جن کا پارٹی یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسے معصوم آدمیوں کا شمار مشکل ہے۔ ان تمام لوگوں کے قتلِ عام کے علاوہ پانچ لاکھ کے قریب عہدہ دار بھی اپنی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے کیا یہ سب کچھ جائز تھا؟ کیا کسی بھی صورت میں ایک فرد کے بیس پچیس لاکھ انسان قاتل ہو سکتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں جنگِ عظیم ثانی کے دوران روس میں غلے اور اناج کی کمی ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر فوجی محاذ پر محسوس کی جانے لگی لیکن یوکرین جیسے غلہ پیدا کرنے والے علاقے میں ایسا ہولناک قحط پڑا کہ بھوکوں اور فاقہ کشوں نے مُردوں کو گور و کفن دینے کی بجائے اپنے پیٹوں میں پہنچا کر اپنی زندگی بچائی۔ ہزاروں آدمی روزانہ مر رہے تھے۔ لیکن کامریڈ اسٹالن کو ان افسوسناک حالات پر کوئی صدمہ نہیں ہوا بلکہ انھوں نے میری اس رپورٹ کو سراسر افواہوں کی بنیاد پر تحریر کیا ہوا تسلیم کیا جس کے ذریعہ میں نے اس خطۂ ارض پر عذاب انگیز حالات کے بارے میں تفصیلی رپورٹ بذات خود ان کے ہاتھوں میں پیش کی تھی۔

آخری دنوں میں کامریڈ اسٹالن نے بے تحاشہ شراب نوشی شروع کر دی تھی اور اُن کی نشیلی حرکتوں نے مجھے یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ شراب کسی صورت میں بھی انسان کے لیے ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتی اسے ترک کر دینا ہی انسانیت کے لیے ایک ایسا قدم ہو گا جس کی افادیت کا اندازہ تک لگانا غیر ممکن ہے بیریا، خروشچیف، مکویان وغیرہ جنھیں وہ شراب نوشی کے دوران اپنا ساتھ دینے کے لیے بلایا کرتے تھے اُن کو اکثر و بیشتر رنگین پانی پینا پڑتا تھا چونکہ وہ زیادہ نشہ میں مدہوش ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ وہاں کے شراب پلانے والے عملے کی مدد سے ہوتا تھا جو ان لوگوں کو شراب تلخ کی بجائے محض رنگین پانی دے دیا کرتے تھے شراب کے نشہ میں ہی اسٹالن نے مجھے گوپک رقص کرنے کے لیے مجبور کر کے مجھے ذلت اور خواری کا محور بنا دیا۔ اُس نے اپنی بیٹی سوتیلانہ تک کو اپنی زندگی کے (آخری) نئے سال پر مہمانوں کے سامنے رقص کرنے کا حکم دیا اور جب اُس نے تعمیلِ حکم میں ذلت محسوس کرتے ہوئے پس و پیش کیا تو اسٹالن نے اس کی چوٹی پکڑ کر اُسے مہمانوں کے سامنے دھکیل دیا۔ دفورِ غم میں سسکیاں بھرتے ہوئے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے آخر کار اُسے ناچنا ہی پڑا۔ آخری دنوں میں

اس کی مجنونانہ حرکتیں اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ مجھ سے کامریڈ بلگانن نے اسٹالن کے دیے ہوئے ایک ڈنر کے دوران کہا تھا کہ "اگرچہ ہم اسٹالن کے کھانے پر ایک نمکسار اور حلیف کی صورت میں شریک ہوتے ہیں لیکن کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا کہ واپسی پر اسے جیل خانہ جانا پڑے گا۔ یا قبرستان ــــ یا صحیح سلامت اپنے گھر"۔

اگرچہ مجھے کامریڈ اسٹالن کی عظمتوں کا اعتراف ہے اگرچہ انہوں نے ہمیشہ ہوش و حواس میں میری عزت کی اور مجھ پر کبھی بداعتمادی اور بے معاملگی کا گمان نہیں کیا لیکن اگر وہ میرے دور اقتدار میں زندہ ہوتے تو میں ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلوا کر ایسی عبرت ناک سزا دلواتا جس سے جابر اور شدّاد جیسے لوگ بھی لرز اٹھتے۔

حکومت روس کی سربراہی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دنیا میں اب جو طاقتیں یا حکومتیں کسی بھی حیثیت سے روس کی خارجہ پالیسی کے دائرے میں آسکتی تھیں اُن میں عرب، ہندوستان، چین اور امریکہ نظرانداز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ میں نے عربوں سے نہایت اچھے تعلقات قائم کرنے کے لیے صدق دل سے کوشش کی۔ اسی کے تحت جب امریکہ وغیرہ نے مصر سے کیے گئے اسوان ڈیم کی تعمیر میں مدد دینے کے وعدوں کو فراموش کردیا تو روس نے صدر جمال ناصر کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے مطلوبہ امداد کی پیش کش کی۔ ہمارے تعلقات مصر سے بہت نزدیکی ہوچکے تھے۔ یہی حال ہندوستان کا تھا۔ ہم نے ہندوستان کو دوست اور رفیق سمجھ کر اُسے اپنانے کی کوشش کی جو سو فیصدی کامیاب ہوئی۔

چین ہمارا ہمدرد سی ملک ہی نہیں بلکہ اعتقادات کی روشنی میں ہمارا ہم مسلک اور ہمراہی منزل ہے لیکن چین کے سربراہ روسی حکومت سے سرحدی معاملات میں متفق اور مطمئن نہیں تھے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ روس کی موجودہ سرحدیں زارِ روس کی ناانصافیوں کی دلیل ہیں اور جو علاقے زار شاہی کے دوران غصب کیے گئے تھے۔ انہیں چین کو واپس لوٹا دینا چاہیے۔

سرحدی تنازعوں کو بھائی چارے کے ماحول میں نپٹانے کے لیے میں نے چین کا سفر کیا تاکہ ہم ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کے ماحول میں مذاکرات کے ذریعہ ان مسائل کو حل کریں۔

ماوزی تنگ عرصہ دراز سے جنگ کے منصوبے بنائے بیٹھے تھے۔ اُن کا یہ بھی مطمع نظر تھا کہ وہ ساری دنیا کے کمیونسٹ ممالک کی لیڈری اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے بظاہر انہیں روسی حکومت کو چیلنج دیے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی سیاست سے میرے ریٹائر ہونے کے بعد ماوزی تنگ کی جدّوجہد میں اور بھی سرگرمی پیدا ہوگئی اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ چینی حکومت نے سرحدوں پر خندقیں کھودنے اور دوسرے دفاعی کام شروع کردیے ہیں۔ اگر روسی رہنماؤں نے ٹھنڈے دل سے کام نہیں کیا تو ایک بہت ہی قیامت خیز اور ہولناک جنگ کا چھڑ جانا ضروری ہے۔

۱۹۵۹ء میں جب میں پہلی بار چین گیا اور ماوزی تنگ سے ملا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی تمام تر دوسری خوبیوں کے باوجود امتیاز رنگ و نسل کے قائل ہیں۔ چینی قوم کو وہ دنیا کی عظیم طاقت اور چینی نسل کو سب سے اعلیٰ اور ارفع سمجھتے ہیں۔ اور یہ خیالات ہماری پالیسی اور پارٹی وژن کے سراسر خلاف ہیں۔ ہم رنگ و نسل کے امتیاز میں یقین نہیں رکھتے ہماری نظر میں ہر قوم، ہر نسل، ہر ملک مساوی درجہ کا مستحق ہے اور دنیا کا ہر فرد اتنی ہی عزت اور احترام کا مستحق ہے جتنی کسی بھی دوسری قوم کا فرد ہمارے نزدیک انسان اپنے نیک اعمال اور انسانی فلاح و بہبود کی خاطر کی گئی مساعی سے ہی ممتاز اور محترم ہوسکتا ہے کسی بڑے گھرانے یا عظیم خاندان کا فرد ہونا بڑے پن کی علامت ہرگز نہیں ہوسکتی۔

ماسکو واپس لوٹنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ ماوزی تنگ کے خیالات اور مستقبل کے منصوبے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ چینی پروپیگنڈہ کرنے والے روس پر الزام لگا رہے تھے کہ اس نے

میرے خیال میں آئزن ہاور امریکہ کے کمزور صدر تھے
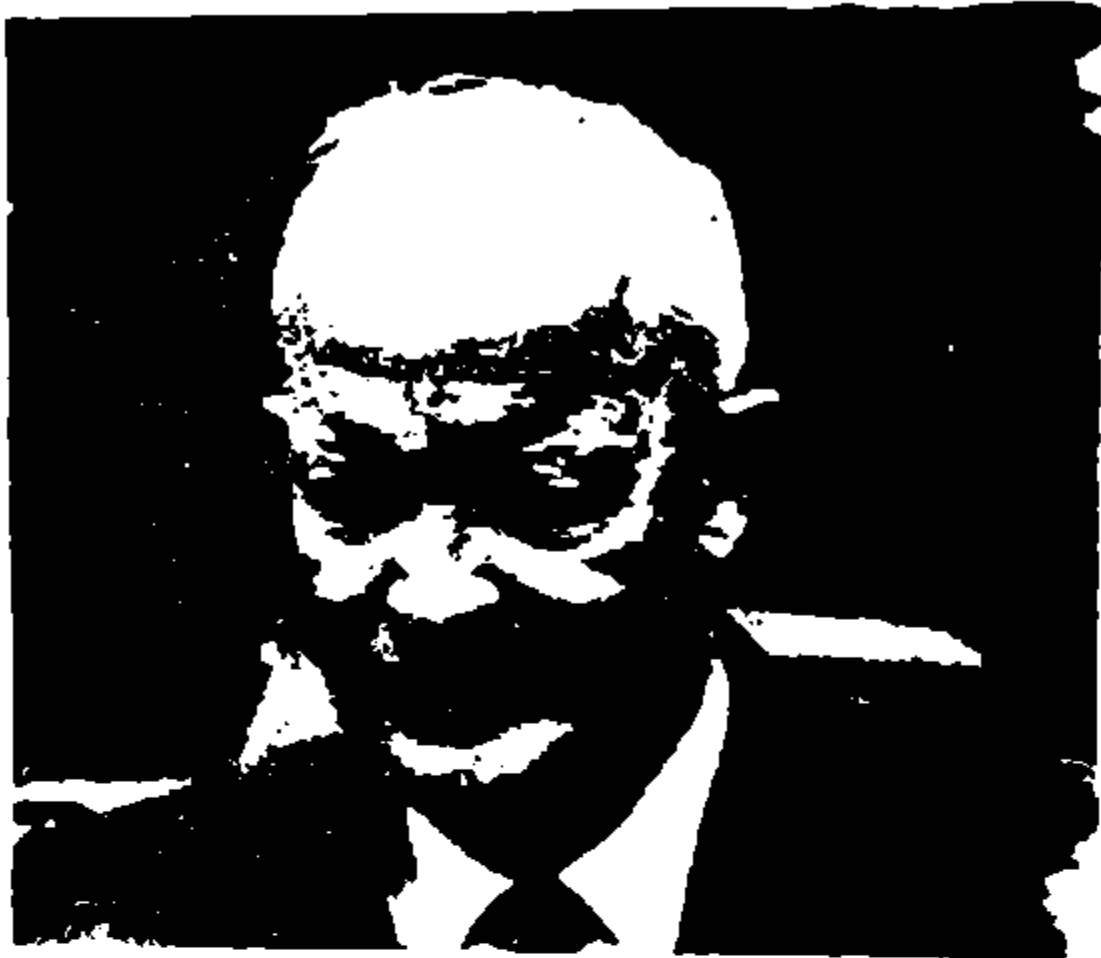
دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے کے بعد یورپ کے کچھ ایسے علاقے ہتھیا لیے ہیں جنہیں اصل مالکوں کو واپس لوٹانا چاہیے۔ کئی بار چین سے مذاکرات کے دوران یہی سرحدی مسئلے زیر بحث آئے اور چینی حکومت ہم سے مطالبہ کرتی رہی کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں کہ زار روس نے چین سے جو علاقے ہتھیا لیے ہیں وہ اُس کا ایک غیر قانونی قدم تھا۔ میری سمجھ سے یہ بات بالا تر تھی کہ ایک جمہوری آزاد حکومت کا سربراہ کس طرح ایسے کاغذ پر دستخط کر سکتا تھا۔ بہرحال یہ کشمکش کل میری حکومت کے دوران جس طرح موجود تھی آج بھی ہے اور میرا تو وہ روسی حکومت کا اس مسئلہ پر وہی طرز عمل ہے جو میری حکومت کے دوران روس کا تھا۔

مجھے امریکہ کے دو صدروں سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آئزن ہاور اور کینیڈی۔ میرے خیال میں آئزن ہاور ایک کمزور صدر تھے۔ وہ نیک انسان ضرور تھے لیکن اُن میں حکومت کے مسائل کو حل کرنے اور انتظامیہ پر قابو پا لینے کی مطلوبہ سختی ہرگز نہیں تھی۔ اسی لیے ان کے زیر دست اُن پر چھائے رہتے تھے۔ جینوا کے علاوہ پیرس میں بھی میں نے یہی دیکھا کہ وہ اپنے مشیروں کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گفتگو کے ہر موڑ پر وہ اپنے ساتھی صلاح کاروں سے مشورے لیتے نظر آتے تھے۔

آئزن ہاور کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کینیڈی ہوئے اور جب میں اُن سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ انتہائی خوش مذاق اور ذہین انسان ہیں۔ امریکہ میں پریس ایک ایسی طاقت ہے جسے نظر انداز کر دینا کسی بھی صدر کے بس کی بات نہیں لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ خود کینیڈی بھی ایک ہستی تھی جو امریکی عوام کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے فیصلوں میں لچک تھی اور وہ آئزن ہاور کے برعکس خارجہ پالیسی کے معاملہ میں تنہا اور بلا شرکت غیرے اپنی مرضی کے مطابق عمل درآمد کرتے تھے۔ امریکی پریس روس اور امریکہ کے سربراہوں کی میٹنگ کے خلاف تھا لیکن صدر کینیڈی نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور انہوں نے روس کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم کرنے کے لیے مجھ سے ملاقات کا اعلان کر دیا۔ اور یہ ملاقات آسٹریا کی راجدھانی ویانا میں ہوئی۔ امریکہ اور سوویت یونین کے تعلقات کے سلسلہ

میں کینیڈی نے ہی پہل کی اور اس کا سہرا ان ہی کے سر رکھا جا سکتا ہے۔

خفیہ طور پر ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ صدر کینیڈی دیانا میں اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس لیے میرے چند ساتھیوں نے اصرار کیا کہ میں بھی اپنے ساتھ اپنی بیوی نینا پیٹرونا کو ساتھ لے جاؤں۔ میں اس بات سے اس لیے متفق نہیں تھا کہ اسٹالن کے دور میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خواتین کو ایسے معاملات میں ساتھ رکھا جائے مولوٹوف کے علاوہ کسی کو بھی اپنی بیوی ساتھ لے جانے کا حکم اسٹالن کے دور میں جاری نہیں ہوا تھا۔ آخر کار مجھے اپنے ساتھیوں کے مشوروں پر عمل کرنا پڑا۔ دیانا میں اپنی شریک حیات کے ساتھ پہنچ گیا۔ حکومت اسٹریا نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

اخباری رپورٹوں میں مسز کینیڈی کے حسن و جمال کی مبالغہ آمیز تعریفیں پڑھ چکا تھا لیکن جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں اُس کے سحر کار حسن سے ذرا بھی مسحور نہیں ہوا۔ بس یہ بات اُس میں ضرور تھی کہ وہ جوان اور ہنس مکھ تھی۔ اُس میں اس کے علاوہ مجھے کوئی اور جمالیاتی خوبی نظر نہیں آئی۔

کینیڈی کے ساتھ ہوتے مذاکرات میں جرمنی کا مسئلہ چھڑا۔ روس اور امریکہ میں کبھی بھی جنگ نہ ہونے کی بات چھڑی۔ بقائے باہمی کی منصوبہ بندی کی کوشش کی گئی جس کا یہ مطلب تھا کہ ہم کسی بھی غیر کمیونسٹ ملک اور سرمایہ داری کے نظام میں مداخلت کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن ہم اپنی پالیسی کے مطابق ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ اب وہ زمانہ گذر چکا تھا جب ڈلس اور ٹرومین نے طاقت کے بل پر ہم پر تسلط جمایا رہنا چاہا۔ اب خود روس ایک عظیم طاقت بن چکا تھا۔ لیکن میں یہ خیال جانتا تھا کہ سرد جنگ میں امریکہ کی ہمیشہ اس لیے جیت ہوگی کہ اُس کے پاس دولت کے ذخیروں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بہر حال ہماری ملاقات اور ایک دوسرا سمجھوتہ کرنے کی کوشش قطعی ناکام ہو گئی البتہ اس ملاقات نے امریکہ اور روس کو قریب تر آنے اور ایک دوسرے کو قریب سے سمجھنے کی مہم میں ضرور مدد کی۔

کینیڈی کے واپس لوٹنے کے دوسرے دن میں بھی ماسکو واپس چلا آیا۔

میرا خاندان سید متقی خاں ابن سید ہادی جوادالدولہ جواد علی خاں راقم کے والد اور خواجہ فریدالدین احمد کے داماد کو دربار شاہی میں پشتینی رسوخ تھا۔ اور اکبر شاہ سے ان کے زمانہ شاہزادگی سے بہت زیادہ راہ و رسم تھی۔ اور بادشاہ کبھی کبھی ان کو بھائی متقی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے۔ اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانہ میں تلف ہو گیا۔ بارہا میں اپنے والد کے ساتھ اور تنہا بھی بادشاہ کے ہاں خاص دربار میں گیا ہوں۔

اکبر بادشاہ نے سید محمد متقی سے چاہا کہ وہ انتظام امور بادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اور شاہزادوں کا اتالیق مقرر ہوں۔ سید متقی نے عذر کیا مگر اپنے خسر خواجہ فرید الدین احمد کا اور ان کی سفارت ایران اور اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دی کہ ان کو بلا کر وزیر مقرر کیا جائے تو مناسب ہو گا انتظام ہو جائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو پسند کیا اور خواجہ فرید کو کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا اور وہ کلکتہ سے اسی سال یعنی سنہ [illegible]
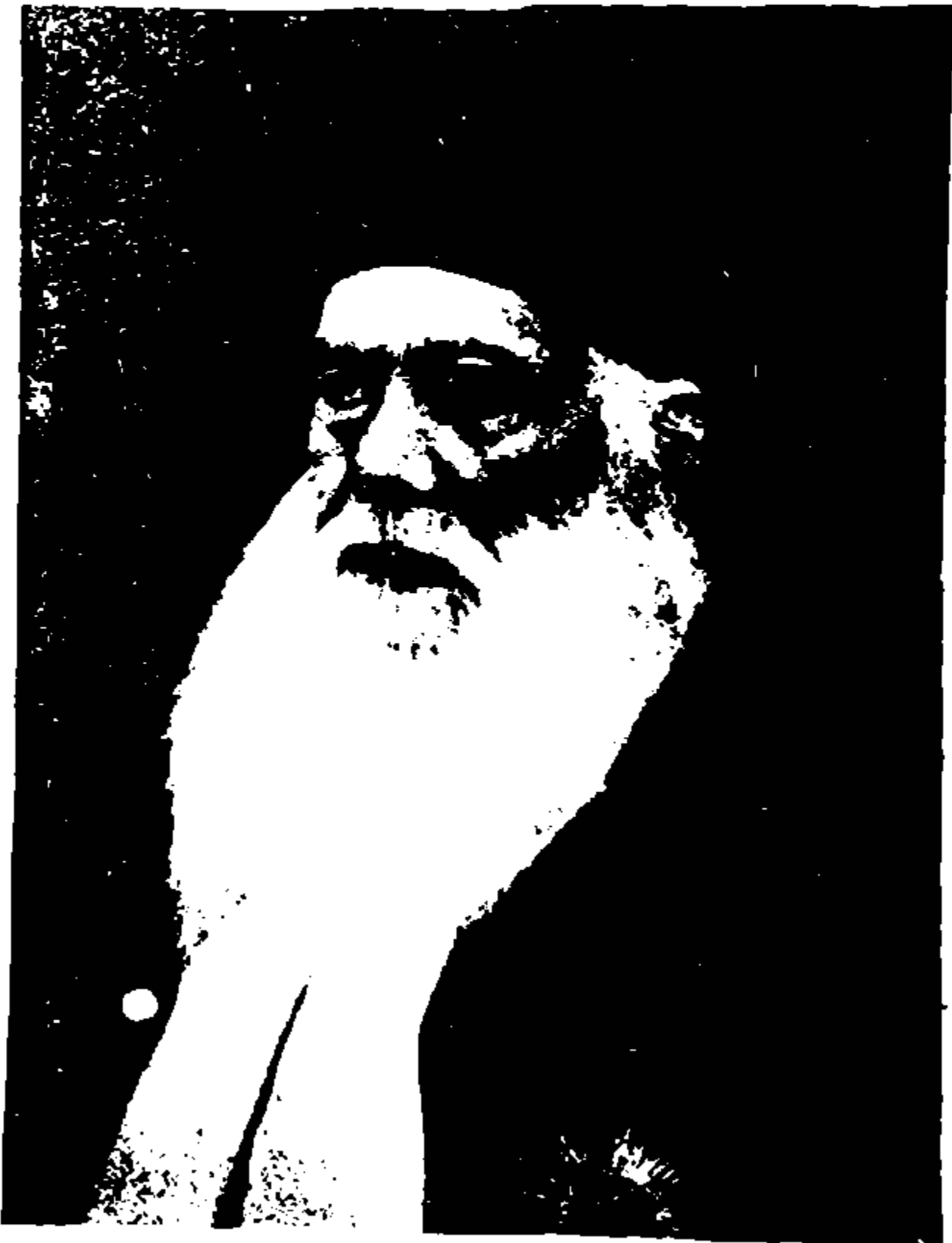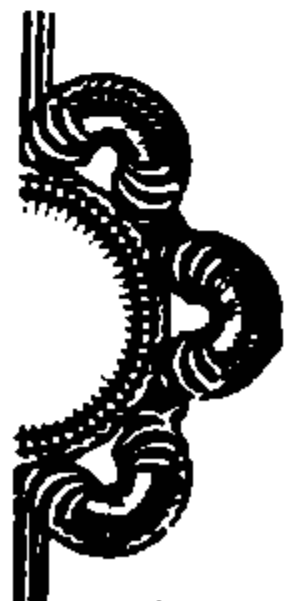
بمطابق ۱۸۱۹ء کو دلی میں آئے۔ بادشاہ کی ملازمت کی۔ اکبر شاہ نے ان کو وزیر مقرر کیا۔ خلعت وزارت اور خطاب دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ کا عطا کیا۔ انہوں نے کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا۔ ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا۔ مگر شاہزادے، بیگمات اور دربار کی سب اس بات سے کہ ان کی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں نہایت ناراض تھے۔ رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر بادشاہ پر بھی ہوا اور دبیرالدولہ نے جو عہدۂ وزارت کو اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے استعفا دے دیا۔ اور چند روز بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔

ان واقعات کے چند روز بعد بادشاہ نے پھر واسطے اضافہ پیشکش کے تحریک کرنی چاہی اور اس باب میں مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا جس میں زیادہ تر شکایت اس بات کی تھی کہ آمدنی واسطے اخراجات کے ضروری نہیں ہے۔ سید محمد متقی خاں نے موقع پاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ دبیرالدولہ کلکتہ میں موجود ہیں اور آمدنی اور اخراجات کا حال ان کو معلوم ہے۔ اگر گورنر جنرل ان سے دریافت کرے تو بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آمدنی اور خرچ برابر ہے۔ بادشاہ کے دل میں اس بات نے جگہ کی اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس کی تدبیر کیا ہے۔ سید محمد متقی خاں نے عرض کیا کہ خواجہ فرید کا علیحدہ کر دینا مصلحت نہیں تھا اگر اس میں کچھ سعی و کوشش ہو سکے گی تو دبیرالدولہ ہی کی تدبیر و کوشش ہو سکے گی۔ بادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیرالدولہ کے کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۳ء کے بدستور اپنے عہدۂ سابق پر مامور ہوئے چنانچہ دبیرالدولہ نے درحقیقت پنشن کے اضافے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء کے دبیرالدولہ نے استعفا دے دیا۔

وزارت سے استعفا دینے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ دبیرالدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ منظور کر لیں مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی والدۂ راقم نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی جو آرام و آسائش آپ کو اب ہے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کو انگریزوں کی عملداری میں دینا اچھا نہیں ہے معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ پس اس زمانہ ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی۔ دبیرالدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا۔

نواب دبیرالدولہ درحقیقت حکیم مشرب یا صوفی مذہب تھے۔ مکھا شاہ کے جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے مرید تھے۔ دو برس قبل اپنی وفات کے ان کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو اپنے مرشد کے طریقے میں پورے طور پر داخل ہونا چاہیے۔ حجام جو حاضر ہوا۔ اس سے کہا ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دے۔ اس نے نورانی اور نہایت خوبصورت ڈاڑھی اور مونچھوں کو مونڈ دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ ایک دفعہ کے سوا پھر ڈاڑھی مونچھ کا قطعاً صفایا نہیں کیا۔

خواجہ فرید الدین احمد کی شادی غالباً ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں خواجہ محمد مراد احراری کی بیٹی سے ہوئی۔ خواجہ محمد مراد احراری نقیب الاولیا کے عہدہ پر مامور تھے۔ خواجہ فرید کی ایک ہی بیوی تھی اور ان سے پانچ اولادیں پیدا ہوئی تھیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور یہ اولادیں تین تین برس کے فاصلے سے غالباً ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کے پیدا ہو چکی تھیں۔ بڑے لڑکے کا نام خواجہ وحید الدین احمد اور چھوٹے کا نام خواجہ زین العابدین خاں تھا۔ بیٹیاں ایک عزیز النسا بیگم (والدۂ راقم کی) دوسری فاطمہ بیگم اور تیسری فخر النساء بیگم۔ خواجہ فرید نے ۱۲ محرم ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء کے انتقال کیا۔

ابتدائی تعلیم مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تاریخ بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے حضرت

شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لاکر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ کہو، بسم اللہ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اوّل کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ پڑھتا گیا۔ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اُٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی۔ اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔

میرا قرآن ختم ہونے پر بدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کبھی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔

عزیزالنساء بیگم نہایت لائق و ذہین اور کمال دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں میں نے خود گلستاں کے چند سبق اُن سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں مجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ تنبیہ کئی دفعہ ہوئی ہوں گی مگر اُن سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔

ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی۔ میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام دستاویزات ثبوت جس سے اس کو فوجی عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آ گئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بھڑکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سنکر مجھ سے کہا اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے اپنے دشمن کو چھوڑا کر ضعیف اور ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ کبھی دور نہ ہوا اور نہ ہوگا۔ اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو۔ انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔

جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر میں گیا۔ تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ "اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رکھنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ "دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا۔ اس سے بھی خفا ہوں گی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں" اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ۔ "دیکھنا آپا جی یعنی میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں" تین دن بعد میری خالہ جن کو میں آپا کہا کرتا تھا میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں انہوں نے کہا کہ "اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی۔" وہ نوکر ڈیوڑھی

پھر بلا یا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

ان کی چند خاص عادتوں میں سے یہ ایک امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں ایک لاوارث بڑھیا زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی۔ بیماری قریب قریب ایک سی تھی جو دوا اس کے لیے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی حکیم معالج نے میری والدہ کے لیے ایک نسخہ معجون کا جو قیمتی تھا۔ تجویز کیا میں اس کو لے کر گھر گیا۔ انہوں نے اس کو لے لیا اور تھوڑی تھوڑی زیبا کو کھلایا اور اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی اسی کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا روپیہ پیسہ گاؤں کا یا ملکوں کا غلہ، مکانوں کا کرایہ، تنخواہ قلعہ کی، باغوں کا میوہ سب میں سے بحساب ۵ فیصد کے خدا کے نام پر علیحدہ کر دیتی تھیں۔ ان کے پاس ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا تھا۔ اور اس میں سے غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں مدد کرتیں۔

میرے ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے بیعت و عقیدت تھی۔ ان کے یہاں گنڈے تعویذ کا پتہ بھی نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے بھی گنڈا پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی تھی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلاتیں وہ لڑکے پراٹھے اور انڈے بہت پسند کرتے تھے۔

میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو کبھی تم سوار ہو جایا کرو کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو" چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب سے بہت دوستی تھی۔ میں بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا۔ مگر انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ "میں سنتی ہوں کہ اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو اس کا کیا سبب ہے؟" میں نے جو بات تھی وہ کہی۔ انہوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے۔ وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسروں کو اپنا فرض ادا کرنا ہے یا نہیں"

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول

ایک یادگار تصویر : سر سید احمد خاں کی گود میں راس مسعود کے علاوہ سید محمود کو پہچانا جا سکتا ہے

بھرہی اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن شریف پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی بجز اس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے، کسی کے سپرد کر جائے نیابت کا قائل نہیں ہوں تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس زمانے کے وہابیوں یا اہل حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ گو وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں۔ مگر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا ان سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے۔ سید محمد خاں ان کے بڑے بیٹے نے سینتیس اڑتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ سب لوگ گریہ و زاری کرنے لگے جو رنج و غم ان کو ہوا ہوگا، ظاہر ہے بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے لیکن اس حالت میں انہوں نے کہا کہ "خدا کی مرضی" اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اٹھیں میں اس زمانہ میں فتحپور سیکری میں منصف تھا اس واقعہ کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرالی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی (دختر) کی شادی اسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار

دن شادی کے باقی رہے تھے۔ سید محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان لوگوں نے شادی ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تعزیت دن رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ "میں تمہاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہو گا۔ شادی کی اجازت دیتی ہوں۔"

"وہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق دانشمند اور دور اندیش فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایک ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔

بچپن مجھے خوب یاد ہے کہ (ہماری انّا) ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی جب وہ مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اُس کی بہت آرام سے گزرتی ہے تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے کا پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اُس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی۔ اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس پہنچ دوں میں نے کہا "ہاں پہنچ دو" والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا

کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آ کر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے "چیند" معلوم ہوتا اس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا چیند کرنا بے ایمانی کی بات ہے کبھی چیند مت کرو اور چیند جو کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔ باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے سہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجود یکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان میں تھی۔ جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اس لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

جنرل اکڑلونی اور وزیر اعظم دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد میں بڑی دوستی تھی۔ ایک دن جنرل اکڑلونی آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً راقم کسی سبب سے وہاں گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انہوں نے بلا لیا اور کچھ بات کی راقم نے جنرل سے جو فل ڈریس (پوری پوشاک یا وردی) پہنے ہوئے تھے۔ پوچھا کہ "آپ نے ٹوپل میں پَر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگائے ہیں"، جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے اُس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس کی ہو گی۔

ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا۔ چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چت کر دیا اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے وہ پتھر لے کر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلتے میں اپنے بھائی رشتہ دار سے لڑ پڑا۔ میرے مکے سے اُس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی۔ اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی جھگڑا، مار کٹائی ہوتی تھی۔ مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔

بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے۔ اُن کی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا جس میں ٹ اور ڈ ہوتی تلفظ

نہیں ہوسکتا تھا۔ جب بخشی محمود خاں آتے تو اکثر ہم لڑکوں کو جو پوتے اور نواسے نواب وزیرالدولہ کے تھے اور مکتب میں پڑھتے تھے بلواتے اور ٹوپلی ٹوپی کی شرط بدکر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمائش کرتے۔ جب وہ پوری طرح بہ تلفظ نہ ہوتا تو اس لڑکے کی ٹوپلی لے لیتے لڑکے بھی اُن سے ہندوستانی لفظوں کی فرمائش کرتے لفظ بھردوتائے ثقیل کا تلفظ اُن سے نہیں ہوسکتا تھا ہمیشہ تو یا لتا کہتے تھے۔ لڑکے شرط جیت جاتے اور ان کی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے بھی ان کی ٹوپلی نہ دیتے۔

پیراکی میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دل کے مشہور پیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا مغل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب پیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دربار کا جانا موقوف ہوگیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی نواب فتح اللہ بیگ خاں۔ نواب سید عظمت اللہ خاں۔ نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروزپور جھرکہ جب دل میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے میں نے بھی اُسی زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور تول سے جاکر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" زین العابدین خاں نے تیراندازی کا فن سید محمد متقی خاں راقم کے والد سے جو اس فن میں بے نظیر تھے سیکھا تھا۔ ایک پیر مرد مسلمان ان کو تیراندازی کا بڑا شوق تھا۔ "میراالاللہ" ان کا نام پڑ گیا تھا کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت الااللہ کہا کرتے تھے۔ ایک ذی عزت ہندو مرصع ساز کو بھی تیراندازی کا بہت شوق تھا۔ اور تیر لگاتے وقت اللہ غنی کہتا تھا۔ اس کا نام اللہ غنی ہی پڑ گیا۔

مرزا صاحب (حضرت میرزا مظہر جان جاناں) کے عرس میں شاہ صاحب (حضرت شاہ غلام علی نقشبندی) ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو میرے والد کو بھی خبر ہوگئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا۔ والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھالاؤ۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھا لیا۔

شاہی خلعت ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہرچند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہوکر وہاں پہنچا۔ مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جاکر

آداب بجا لانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی بار دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ تخت سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت بادشاہ کے پاس ہی تھے پوچھا کہ تمہارا بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا بس اب محل میں چلے جائیں گے، مگر تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا۔ اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ "دیر کیوں کی؟" حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمائے بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیئے۔ لوگوں نے کہا آداب بجا لاؤ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جو اہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ اس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہو گی تقریباً ان ہی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے۔ ان کو اکبر بادشاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا۔ تاکہ اضافہ پنشن، بادشاہی کے لیے ان کو لندن بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے۔ اور ۱۸۳۳ء میں وہاں پہنچے راقم نے راجہ رام موہن رائے کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا ہے۔ دلی کے لوگ یقین کرتے تھے کہ ان کو مذہب اسلام کی نسبت زیادہ رجحان خاطر ہے۔

اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا۔ جنگل میں پھرنا عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ مکھن اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت مزا دیتا تھا۔ وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرمت عام طور پر برملا ہونے نہ پاتی تھی۔ اس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عمل در آمد اس مقولہ پر تھا کہ اپنے جسم کے زخم کو ڈھکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی برائی ہو مگر اس برائی کا برا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی راستہ برائی سے نکلنے کا ہے۔

نواب شتاب رائے پران کشن ایک معزز رئیس اور نہایت ہی وضع دار اور دولت مند تھے اور اس زمانے کی ایک طوائف جو نہایت خوش آواز اور دھرپت خیال گانے اور بین بجانے میں بے مثل تھی۔ اس کا نام "امتیاز" تھا اور اس نے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس بڑے بڑے گویئے اور بہادر خاں ستارن جو ستار بجانے میں بے مثل تھا اور میر ناصر احمد جو بین بجانے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا سب جمع ہوتے تھے۔

بیٹھک کے بیچ صدر کے مقابل بائیں سمت میں مسند تکیہ لگتا تھا۔ اور لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اترتیں اور ان کے پاؤں کے زیور کی آواز آتی تو لوگ زیادہ مشتاق ہوتے تھے وہ نہایت متانت اور غرور سے آکر مسند پر بیٹھتی تھیں اول دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں اور پھر اٹھ کر کوٹھے پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ ان کے گانے بجانے کی نہایت تعریف کرتے تھے نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے راقم بھی متعدد دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔

اس زمانے کی بعض مجلسیں بھی قابل یادگار ہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کے جانشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشاں کیا کرتے تھے

اس میں بڑے بڑے گویئے آتے تھے۔ دھرپت و خیال گاتے اور میر ناصر احمد بین بجاتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ جاتے تھے راقم بھی بہت دفعہ اُن کے ساتھ

ان جلسوں میں گیا ہے تو اجہ محمد نصیر صاحب تو نہایت بزرگ و مقدس تھے۔ اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے۔

ہم اس رنگ میں مست تھے ایسی گہری نیند کرتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہیں تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔ جب زاہد خشک تھے تو نہایت اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے بڑھ کر تھے اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔

ملازمت جب میں دہلی میں منصف تھا تو پنی کل تنخواہ والدہ کو دیتا تھا۔ وہ اس میں صرف پانچ روپیہ مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دے دیتی تھیں باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا۔ اور جیسا کھانا وہ کھلاتی تھیں کھا لیتا تھا۔ میرے پدری اجداد نے سلطنت مغلیہ کی خدمات خصوصاً صیغہ فوج میں ذمہ داری کے معزز عہدوں پر دفاداری اور محبت سے خدمات کیں اور میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں کہ سبارڈینیٹ جوڈیشل عہدہ پر برٹش سروس میں داخل ہوا۔

میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی۔ مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوشش میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔

آثار الصنادید مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ بچہ بہانہ سے اند کے نجات حاصل

شاہجہاں آباد کا قدیم زمانہ

ہو جائے اور کچھ مہلت ہاتھ آئے تو ایک ایسا نسخہ عجیب اور مجموعہ غریب لکھا جائے کہ عمارات سواد شاہجہاں آباد اور مکانات درون شہر اور قلعۂ مبارک کا حال اس میں مندرج اور اطوار و اوضاع ساکنین شہر کا احوال اس میں مندرج ہو اور بسبب کثرت حقائق اور ہجوم عوائق کے یہ امر صورت پذیر نہ ہوتا تھا۔ الحمد للہ والمنہ کہ کارسازی لطف ایسی دستگیر ہوئی اور مراحم یزدان نے اعانت کی کہ یہ آرزو دیدۂ شوق میں جلوہ نما ہوئی۔ عرصہ دراز تک آرام کو آرام نہ سمجھا اور آسائش کو آسائش نہ جانا جب یہ شاہد جادو طراز جلوہ شیریں لبان سحر پرداز سے دلربا تر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکے تھے۔ اُن کے پڑھنے کو

ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کے کتبے کے متوازی بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تو مولانا صہبائیؔ فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا ناظرین انصاف کریں کہ مولف نے اس کی تالیف میں کیا دودِ چراغ کھایا اور کس قدر خونِ جگر پیا ہے۔

ایامِ غدر غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا اور جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔

جس زمانہ میں غدر ہوا میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب عزیز و اقارب دہلی میں تھے اور میں بجنور میں صدر امین تھا۔ وہ (والدہ) زمانہ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ "انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجائیں گے۔ تم سب خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے۔ انگریز ان کو کچھ نہیں کہنے کے" ان کو یقین کامل تھا کہ "انگریز بجز اُن کے جنھوں نے فساد کیا ہے کسی کو کچھ تکلیف نہیں دینے کے" جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے مگر وہ اور ان کی ایک بہن جو نابینا تھی۔ اس یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا۔ اور ایسی نیک بی بی کو آخر عمر میں تکلیف پہنچی۔ جب دلی پر قبضہ ہو گیا تو سپاہی گھروں میں گھس آئے تمام گھر لوٹ لیا وہ مع اپنی بہن کے تو بلی کو چھوڑ کر اس کوٹھڑی میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن انھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔

اس عرصہ میں راقم جو میرٹھ میں آگیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ مل گیا۔ اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں آگئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ ہم پر جو کچھ گزرے گی، گذرے گی" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں" اُن کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن پانی مطلق نہیں پیا ہے۔

میں پانی کی تلاش کو نکلا پانی اُس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار قلعہ گیا ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ ہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے۔ پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا پانی پی لے اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحبہ پیاسی ہیں۔ اس غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے" اُس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کرکے اُن کو میرٹھ لے جاؤں جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا لیٹی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے لیکن کہیں سواری نہ ملی آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے۔ مجھ کو دیدی جائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

منشی الطاف حسین صاحب سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو میرے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے اور ان

کے خاندان اور میرے خاندان میں ارتباط قدیمی تھا میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کو انہوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ انہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہی کہ اُن کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف اُن ہی دنوں کی نمازیں مجھے پڑھنی ہیں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد نمازوں کا حساب کر کے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا۔ دوسرے دن انہوں نے قضا کی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔

جاگیر سے انکار جب ہمارے مرحوم دوست مسٹر شیکسپئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا۔ مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں نہ ہوگا۔ کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو۔ اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی۔ اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی مگر یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا کہ جب کبھی موقع ملے۔ تمام ہندوؤں مسلمانوں سے چندہ لے کر کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو ان کو تعلیم دی جائے لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

مراد آباد میں اسکول کا قیام پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم اس زمانے کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا اُن میں جاری رکھنا آیا درحقیقت اسلام کے برخلاف ہے۔ مجھے جواب ملا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ انگریزوں سے جو ہمارے حاکم ہیں اور عموماً عیسائی ہیں سچی دوستی اور بے ریا اتحاد اور دل کھول کر دوستانہ میل جول اور دوستانہ معاشرت اور آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد کیا اسلام کے خلاف ہے؟ جواب ملا کہ نہیں بس انہیں دونوں اصولوں کو میں نے اختیار کیا۔ قومی بھلائی پر کمر باندھی ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اتحاد و دوستی تو اول ۱۸۵۹ء میں میں نے ایک اسکول مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس زمانے میں کسی قسم کے اسکول کا وجود نہ تھا۔ مگر سر جان اسٹریچی کی مہربانی سے وہاں ایک اردو انگریزی اسکول قائم ہوا اور دونوں کو ملا دیا۔

تبیین الکلام دوم تفسیر بائیبل مقدس لکھی۔ کسی مسلمان نے آج تک بائیبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی جو امر اس کام کے مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے

مرزا اسداللہ خاں غالب

قصوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور طعن کرتے رہے ہیں۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا۔ واجب التعظیم بیان کرتی ہے اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔ میں اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کرکے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اس سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے کہ سچ کہنا اور سچ کرنا میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سؤر یا کوئی اور حرام چیز نہ ہو۔ کچھ تامل نہیں کرتا۔

بجنور پر قبضہ ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے۔ میں نے کہا یہاں چائے کہاں۔ انھوں نے کہا ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا۔ بہت بہتر۔ غرضیکہ ہم نے چائے پی۔ اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چل کر نگینہ میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جاکر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیل دار سے جو نماز میں شریک تھے پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں۔ یہ نماز میں کیوں کر شریک ہوئے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ ان لوگوں نے میری اس رونکی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا

پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھالو۔ اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگادے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھائے گا۔

مرزا غالب جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا (اسد اللہ خاں غالب) نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان میں لے آیا۔

قیام اسکول غازی پور پھر میں غازی پور گیا یہاں کے لوگوں کو اس بات کا خیال تھا کہ اس ضلع میں کوئی عمدہ وسیلہ تربیت کا قائم کیا جائے۔ بعض رئیسوں اور

اہلکارانِ سرکار نے ماہوار چندہ مقرر کر کے ایک ماسٹر انگریزی پڑھانے کو نوکر رکھا تھا۔ ماہواری چندہ کا وصول کرنا اور اس کارخانہ کا جاری رہنا مشکل بلکہ غیر ممکن تھا۔ اس لیے دل میں خیال آیا کہ ضلع سے یکمشت چندہ جمع کر کے اس کے منافع سے ایسا مدرسہ قائم کیا جائے کہ جس میں عمدہ درجہ کی تعلیم انگریزی اور سنسکرت اور عربی اور فارسی اور اردو کی ہو۔ اس ارادہ پر اکثر رئیس جمع کر کے میرے پاس آئے اور مجھ سے یہ بات چاہی کہ اس امر عظیم کے انجام دینے میں میں بھی مشیر ہوں ان کو تدبیر بتاؤں کہ جو چندہ وہ جمع کریں اس سے کس طرح پر منافع حاصل کیا جائے اور طریقہ تعلیم اور قواعد انتظام مدرسہ کس طرح پر مقرر کیے جائیں۔ میں نے اپنے شمول سے صاف انکار کیا لوگوں نے مکرر اور سہ مکرر اصرار کیا میرا انکار اس وجہ سے تھا کہ میں اس ضلع میں ایک سرکاری عہدہ رکھتا ہوں۔ لیکن جب بہت سے لوگوں نے درخواست کی خیال کیا میں بھی ایک ہندوستانی باشندہ ہوں میرا فرض ہے کہ علیحدہ ہو کر سرکاری عہدہ سے اپنے ہم وطنوں کی بھلائی اور بہتری میں سعی کروں اس اسکول کا فاؤنڈیشن اسٹون میرے دوست راجہ دیو نرائن سنگھ بہادر اور جناب مولانا فصیح الدین صاحب کے ہاتھوں رکھا گیا یہ اسکول کامیابی سے چلتا ہے اور وکٹوریہ اسکول کے نام سے موسوم ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی اس زمانے میں میرے خیالات یہ تھے کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں، اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ بذریعہ ترجموں کے جو اردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجہ کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتا ہوں۔ اس پر کوشش کی اور ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کی عالی شان عمارت علیگڑھ میں آپ دیکھتے ہیں بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا اور اس کا ایک اخبار میرے اہتمام سے جاری ہوا۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو انگریز ہندوستان میں بستے ہیں انھوں نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ ایک نہایت عمدہ ایسوسی ایشن یعنی مجلس رعایا کے ذریعہ سے پارلیمنٹ میں اپنا تعلق پیدا کریں اور اس کے فیاض ممبروں کو اپنا حامی بنائیں۔ پس اگر ہم نے بھی اسی طرح پر اپنے لیے راہ نہ نکالی تو ہمیشہ کے لیے پچھتائیں گے چنانچہ ہم سب نے مل ایک ایسوسی ایشن بنانے کی تدبیر کی جو شمالی و مغربی اضلاع کی ایسوسی ایشن کہلائے اور اس ایسوسی ایشن کے ساتھ جو انگلستان میں قائم ہوئی ہے اپنے مطالب و مقاصد کو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچانے کی تدبیر کریں تاکہ آئندہ قوم کو بجز حسرت و افسوس نہ رہے۔ لیکن جس غرض سے یہ کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ ان کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے تھے۔ جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں

یورپ کا سفر اختیار کرنے سے چند روز پیشتر پہلی اپریل ۱۸۶۹ء کو ہم بنارس سے چلے ہمارے دوست مسٹر والٹر اسمتھ نے بنارس اسٹیشن سے بچشم نم رخصت کرتے وقت محمد محمود کو سونے کی نہایت عمدہ گھڑی بطور یادگار دی اور مجھے ایک گھڑی چاندی کی۔ دوسری تاریخ کو الہ آباد میں قیام کیا تیسری اپریل کو ہم سب مسافر جبل پور پہنچے یہاں بیلوں کی دو شکرم کرایہ کیں اور تین دن اور تین رات برابر چلے اور ناگ پور پہنچے۔ ناگ پور سے ریل پر سوار ہوئے اور آٹھویں تاریخ قریب دوپہر کے بمبئی پہنچے۔ الہ آباد سے بمبئی تک کیا گاؤں اور کیا قصبات کیا ریل پر کیا گورنمنٹ کے اہلکاروں سے ہر ایک جگہ اردو میں گفتگو کی سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے اور اردو میں ہی جواب دیتے تھے۔ بمبئی میں بالن جی ہوٹل میں دو کمرے لیے ہم وہاں نہاتے دھوتے کپڑے بدلے اور میں حامد مرزا خداداد بیگ شہر و بازار کو روانہ ہوئے۔ اول ہم گنیش داس کھناجی کی دوکان پر گئے ہنڈیاں دے کر روپیہ لیا۔ پھر ہم پی اینڈ او کمپنی جہاز کے دفتر آئے۔ رسید کرایہ جہاز اور ٹکٹ ہائے ریل عمل داری

مصر جو سویز سے اسکندریہ تک پڑے گی۔ اُن سے لے لیے بمبئی میں مسٹر سہراب جی اور رحمت اللہ خاں سلیمان میمن سے ملاقات ہوئی۔ بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے انھوں نے نہایت عمدہ طرح سے قومی ترقی شروع کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سب سے پیچھے ہیں۔ ہم سب اگن بوٹ پر سوار ہوکر بڑودہ دخانی جہاز میں پہنچے۔ قریب چھ بجے شام کے دسویں اپریل ۱۸۷۶ء جہاز نے لنگر اٹھایا۔ دن رات چلتے چلتے سترھویں اپریل کو عدن پہنچے۔ جہاز میں سب سے اول جن سے ملاقات ہوئی وہ میجر جنرل بینگسٹن تھے یہ صاحب نہایت بااخلاق اور حد سے زیادہ خوش مزاج تھے۔ شمالی حصۂ مدراس کے کمانڈر تھے

عدن مس کارپینٹر سے بھی اسی جہاز میں ملاقات ہوئی۔ جب جہاز عدن میں لنگر کر چکا تو ہم چار دس شخصوں نے ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر کی اور کنارے پر پہنچے۔ ٹمٹم اور بگھی کرایہ کی اور قلعہ و چھاؤنی کو دیکھنے گئے۔ سب سے عمدہ اور عجیب اور نہایت قدیم چیز جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہیں ہے۔ عدن کے حوض ہیں جن کو یہاں کے لوگ "ٹانکہ" کہتے ہیں۔ عدن میں گرمی اس شدت سے ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے کوئی ہرا درخت یا ہری گھاس کہیں دکھائی نہیں دیتی پینے کا پانی گراں قیمت کو بکتا ہے برف نام کو بھی میسر نہیں بازار میں آئے اور خوب سیر کی۔ جہاں ترکاری بکتی ہے وہاں دو دکانیں بھٹے والوں کی تھیں۔ ہم کو اپنا ہندوستان یاد آیا اور چار بھنے ہوئے بھٹے ہم نے خریدے۔ ایک نان بائی پراٹھے پکاتا تھا جیسے قلب صاحب میں پکتے ہیں۔ عدن میں متعدد قومیں موجود ہیں عرب اور مصری اکثر ہیں شمالی قوم سب سے زیادہ ہے یہ عربی بولتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا دلاوری ہماری قسمت کہ یہاں کے بازار کے لوگ اور شمالی قوم بھی کسی قدر اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا سب اردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ عدن میں تین مندر بھی ہیں۔ قلعہ جو کہلاتا ہے وہ حقیقت میں پہاڑ ہے چاروں طرف سے بلند پہاڑ ہے اور اس کے حلقے کے اندر جو جگہ ہے وہاں چھاؤنی اور بازار وغیرہ ہیں۔

سترھویں اپریل ۱۸۷۶ء کو جہاز نے لنگر اٹھایا اور سویز کی راہ لی۔ بائیسویں تاریخ کی رات کے وقت دفعتاً تند ہوا چلی اور سمندر میں موجیں اٹھیں سمندر کا پانی کھڑکی کے اندر اس قدر آگیا کہ تمام پلنگ اور بچھونے شرابور ہو گئے۔

سویز ۲۲ اپریل ۱۸۷۶ء کو ہم سب مع الخیر سویز پہنچے۔ جہاز نے لنگر کیا ہم نے بڑودہ جہاز کو ڈنڈوت کر کے رخصت کیا اور سویز ہوٹل میں جاکر ٹھہرے نہر سویز اور شہر دیکھنے کا ارادہ کیا وہ مقام جہاں دیکھنے جاتا تھا وہاں سے پانچ میل تھا ہم نے وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر جب لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جس مقام کو لوگ دیکھنے جاتے ہیں وہاں بجز اس کے کہ زمین کھودی جا رہی ہے اور کچھ نہیں ہے تب ہمارا ارادہ شکست ہو گیا پھر شہر کی سیر کو گئے ایک بہت چھوٹا تنگ بازار دیکھا۔ ہر قسم کے لوگ مصری، ترک، جرمنی اور یونانی دوکاندار وہاں تھے سویز سے بذریعہ ریل اسکندریہ پہنچے۔ راستہ میں دریائے نیل کی زیارت ہوئی اس پر آہنی پل باندھا ہوا تھا۔ پل نہایت مستحکم طور پر بنا ہوا ہے لیکن کچھ خوبصورت نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو اسکندریہ دیکھنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملی۔ یہاں ہمارے لیے جہاز تیار تھا۔ ریل سے اترتے ہی سیدھے جہاز پر چلے گئے اور پونا نامی جہاز میں جا بیٹھے۔ اتفاق سے ڈی فیٹر پیٹرک سابق ڈپٹی کمشنر دہلی بھی اسی جہاز میں تھے نہایت مہربانی سے ملے نہایت خوشی اور بہت ہی بہار کی جو اس جہاز میں ہوئی وہ مسٹر ڈی لیسپس صاحب بہادر کی ملاقات ہے۔ یہ صاحب وہ فرانسیسی انجینئر تھے جنھوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز کی۔ جہاز میں میں نے ایک چیز دیکھی جس سے مجھ کو کمال تعجب ہوا۔ مس کارپینٹر اپنی کتاب میں ہر ایک سے کچھ رائیں لکھواتیں ہمارے شفیق میجر جنرل بینگسٹن نے ایک رائے لکھی اس میں انھوں نے ہندوستانیوں کی نسبت یہ کلمے لکھے۔

"احسان فراموش اور بے دل یا بے ہمت" ان لفظوں کے دیکھنے سے مجھے تعجب یہ ہوا کہ باوجودیکہ وہ نہایت بشاشت سے ہندوستانیوں سے ملے مگر اُن کے دل میں ہندوستانیوں کی طرف سے کیا بات سمائی ہوئی ہے۔ وہ کمپنی جس کے دخانی جہازوں میں ہم نے بمبئی سے مارسیلز تک سفر کیا۔ یہ کمپنی
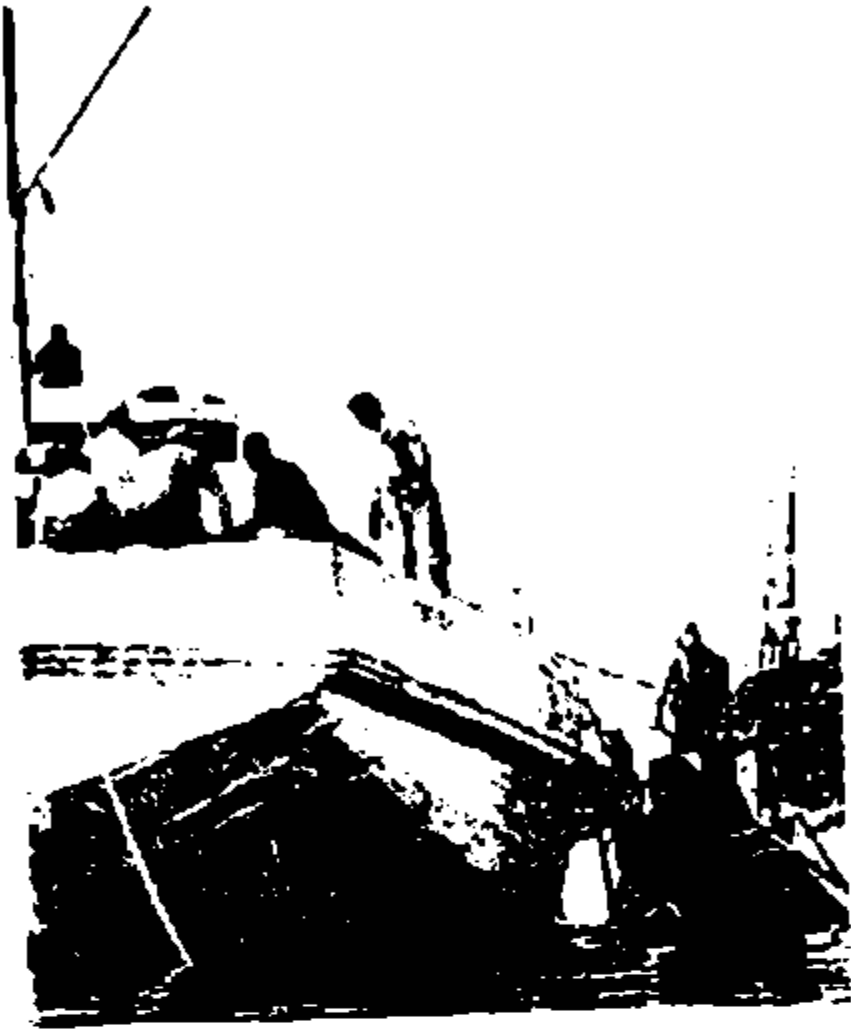
صرف مارسیلز تک مسافروں کے پہنچانے کا انتظام کرتی ہے پہلا یورپ کا شہر جس کو ہم نے دیکھا مارسیلز ہے۔

مارسیلز مارسیلز فرانسیسوں کی عملداری میں ہے۔ کسٹم ہاؤس کے بڑے کمرے میں سامان کی تلاشی ہوئی جب کہ ہم لنگرگاہ مارسیلز میں جہاز سے اُترے تو ہم نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیاں اور اومنی بس کھڑی ہوئی ہیں۔ ہوٹل کا کمشنر ہمارے پاس آیا اور اومنی بس جو اُس ہوٹل کا تھا حاضر کیا اور ہمارے تمام اسباب کی خود سربراہی کر کے لدوایا اور ہوٹل میں جا اُترا جب ہمارا اومنی بس بازار میں پہنچا ہم دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشہ آلات ہم نے کبھی نہ دیکھے تھے۔

پیرس یکم مئی کو ہم مارسیلز سے روانہ ہوئے اور عجائبات قدرت کو دیکھتے ہوئے دوسری مئی کو صبح پیرس میں داخل ہوتے چونکہ ہم نے دو روز تک پیرس میں رہنے کا قصد کیا تھا اس لیے وہاں اترے اور میورس ہوٹل میں ٹھہرے مارسیلز کا ہوٹل اور وہاں کا کھانے کا عمدہ کمرہ اور کھانا کھلانے کا نہایت عمدہ طریقہ اور کھانا کھلانے والوں کی نہایت نفیس وردیاں ہماری آنکھ میں سمائی ہوئی تھیں اس لیے یہ ہوٹل ہماری نگاہ میں کچھ نہیں جچا جب سب جگہ دیکھ چکے تب ہماری خوش نصیبی نے زور کیا اور ہم نے کمشنر سے کہا کہ اور کسی اچھی جگہ لے چلو۔ اس نے کہا کہ دارسیل چلو وہ بہ بہینے پہلے اتوار کو کھلتا ہے بذریعہ ریل وہاں پہنچے۔ جب ہم قلعے میں گھس گئے تو ہم نے جانا کہ ہم دنیا میں نہیں بہشت کے کسی محل میں چلے آتے ہیں ہم سب مکانوں اور کمروں کی سیر کرتے ہوتے اُس کمرے میں جہاں شہنشاہ لوئی چہاردہم دربار کرتا تھا اور تمام رئیس اور امراء وہاں آن کر ملازمت کرتے تھے پہنچے۔ اس تمام محل میں مصوروں کا کام بے نظیر ہے۔ لیبرن، مکنارڈ، گوبل، ریکارڈ، جوئی نت، لیموں جو نہایت نامی مصور تھے ان سب کا اس میں کارنامہ ہے۔ ایک اور بہت بڑا کمرہ ہے جس کا نام کرو سیڈ ہے۔ اس کمرے میں تمام واقعات و محاربات کی تصویریں جو کہ کروسیڈ کی لڑائی میں ہوئی تھیں بنی ہوئی ہیں پیرس سے چوتھی مئی کو روانہ ہونے کے لیے انگلش چینل تک ریل پر

سے ریل سے اتر کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ حسن حسب ... نہیں ہے۔ صرف ڈھائی تین گھنٹہ کا راستہ ہے مگر اس کے پانی کو ایک عجیب قسم کی حرکت ہے کہ جہاں اسٹیمر چلا اور پانی نے اس کو ہلایا اور آدمی کو قے آئی

لندن خدا خدا کر کے وہ رستہ طے کیا کنارہ آیا ڈوور میں اُترے اور ریل پر سوار ہوئے چیرنگ کراس اسٹیشن واقع لندن میں اترے۔ ہمارے شفیق دوست جان ہالمٹ مبین صاحب بہادر سابق کمشنر آگرہ بھی ملنے آئے بر شل میں سرایڈورڈ اسٹریچی بھی آتے۔ میرے پاس نہ اتنا روپیہ تھا مجھ کو ایسا مقدور تھا کہ میں ایک علیحدہ مکان کرائے پر لے کر اس میں رہتا۔ اور تمام اسباب خریدتا۔ اس لیے میں نے لاجنگ کرایہ پر لیا لاجنگ کے یہ معنی ہیں کہ جس مکان میں صاحب مکان رہتا ہے۔ اسی میں سے چند کمرے وہ کرایہ پر دے دیتا ہے۔ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ مسٹر جے لالم کے قبضے میں تھا۔

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ سفر چنداں سخت نہیں نہایت آرام کا سہل ہے۔ اور کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں کہ مسلمان

اُس کو اپنی خاطر خواہ نہ کر سکے یہاں تک ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس

کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کی دُنیا ہے مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی اجازت ہو گئی یہاں ہندوستان کی تمام قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کا اس میں بیان ہے اُس کی بعینہ تصویر بھی ہے کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔

خطاب و تمغہ

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو بخطاب کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا (COMPANION OF THE STAR OF INDIA) سے معزز و ممتاز فرمایا اور یہ تمغہ سٹار آف انڈیا مرحمت کیا۔ احباب کی دُعا سے سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی ہو گیا۔ یہاں کے تمام معزز انگریز دوستوں نے اس قدر مبارکباد اس درجہ کی دی اور ایسا معزز خیال کیا کہ بیان با ہر ہے۔ لارڈ لارنس گورنر جنرل و وائسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لاتے انھوں نے میرے لیے جلسہ منعقد کیا۔ بڑے رؤسا و مدبران کو ملاقات کے لیے بلایا۔ پھر ۱۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو ملکہ معظمہ کی لوی کے محل میں مجھ کو بلایا گیا۔ درباریوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر جا کر سلام کیا لام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک ر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباری اس طرح سلام نہیں ہوتا اس وقت تک ملکہ معظمہ کھڑی رہتی ہیں س کے بعد پرنس آف ویلز کی لوی میں شریک کیا گیا۔

میں انڈیا آفس میں صاحب سکرتر وزیر ہند کے پاس یا۔ انھوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب اسباب غاوت ہند مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کر کے ہندوستان کے ب میں گفتگو کریں گے۔ جس دن کو ڈیوک آرگائل یعنی اہل خانہ وزیر ہند نے دعوت میں مجھے بلایا اس رات وہاں مسٹر بانک سے ملاقات ہوئی۔ خرچ سواری کے ڈر کے مارے امرا اور لارڈ اور سرکی ملاقات کو نہ جا سکا۔

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

ایک انگریز مسٹر جان ڈیون پورٹ نے حمایتِ اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن لکھی۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی۔ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کو چھاپنے کو تیار نہیں ہوا۔ میں نے کل لاگت چھپائی کی دینی قبول کی۔

خطبات احمدیہ

دن رات کی محنت و مشقت سے اور طرح طرح کی تکالیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ خطبات الاحمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔

کیمرج یونیورسٹی

میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا تھا۔ اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ اس غرض سے کیمرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا۔ اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ اور عام تعلیم پر غور کیا کیب مین اور کوچوان اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں۔ جہاں سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری ہو کھڑی کی اور انھوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں دیئے جائیں اور تمام علوم سے واقف ہو جائیں۔

میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلیف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا

کہ کہو لندن بہشت ہے اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بے جا تعصب موجودہ تنزل اور آیندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا۔

جن انگریزوں سے یہاں یعنی انگلستان میں ملاقات ہوئی اُن پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لیئق اور واقف کار ہندوستان کے مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خان ہیں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی ہوتی۔

واپسی میرے ایجنٹ نے وعدہ کر لیا کہ تمام اخراجات جہاز دہ دے کر ہندوستان پہنچا دے گا۔ میں نے حسب ضابطہ انڈیا آفس میں اطلاع کر دی کہ میں ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو لندن سے روانہ ہوں گا۔

لندن میں جو دیکھا اور جو سوچا وہ سوچا مگر اپنی قوم کو دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ایسے پست و تاریک گڑھے میں گرا ہوا پایا۔ جس سے نکلنا محال معلوم ہوتا ہے مگر اپنی ہمت نہ ہاری۔

لندن ہی میں اس مدرسے کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا یہاں تک کہ جس نقشے پر آپ کالج کی عمارتوں کو دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا۔ میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سید محمود کا نہایت شکر گزار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو کچھ حاصل ہوئیں اس میں سید محمود نے میری بہت بڑی مدد کی مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر اُن کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا۔

مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی جس پر اس وقت چل رہا ہے۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا ایک ناانصافی ہوگی، بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا۔ جو انھوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا۔ سید محمود کا خیال تھا کہ کالج ایسا اعلیٰ درجہ کا قائم ہو جس میں تمام یورپین علوم و فنون مع اُن ایشیائی علوم کے جو ہمارے بزرگوں کے لیے سرمایۂ فخر تھے۔ اعلیٰ درجہ پر تعلیم ہو سکے۔ اور وہ کالج محمڈن یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو۔

غرضیکہ ان تجویزوں کو مکمل کر کے میں نے لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا۔ اور لندن ہی میں اس کام کے جو نہایت اہم تھا شروع کرنے کے تین طریقے قرار دیے۔

اوّل ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے۔ جس سے عموماً خیالات تعصب جو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور یورپین سینس و لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ دور ہوں۔

دوم۔ خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یورپین سائنس اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے

سوم۔ کالج کے لیے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت موقع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔

تہذیب الاخلاق ہندوستان میں پہنچ کر تجویز اوّل کے مطابق میں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اس کے سرے پر جو اس کا نام اور اس کے گرد خوبصورت بیل چھپی تھی وہ ٹھپہ لندن ہی میں بنوایا تھا۔ اور اپنے ساتھ لایا تھا۔ گو تہذیب الاخلاق کی بہت مخالفت ہوئی خاص اخبار اور پرچے اس کی مخالفت پر جاری ہوئے لیکن اس کو بڑی کامیابی ہوئی اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ تہذیب نے تمام ہندوستان کو ہلا دیا اور لوگوں کے دلوں کو قومی ہمدردی پر مائل کر دیا تو شاید میری نجات کے لیے کافی ہوگا لیکن بمقتضائے عمر اور بعض عوارض سے میں تہذیب الاخلاق جاری نہ رکھ سکا۔ اس کے بند ہونے کا مجھ کو بھی افسوس ہوا۔

کمیٹی خواستگار ترقی و تعلیم مسلمانان دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم ہوئی اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان اس کا نام رکھا اور بذریعہ جواب مضمون

کے عموماً مسلمانوں سے اس کی نسبت استفسار کیا۔ اس کا اشتہار لندن ہی میں چھپوا لیا تھا۔ اور وہ مضمون جس کا جواب پوچھا گیا تھا سب سید محمود کے لکھے ہوئے اور تجویز کیے ہوئے تھے اس کمیٹی کو نہایت کامیابی ہوئی اور بہت بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا۔ اور کام ختم ہونے پر اس کالج کا قیام ہونا قرار پایا۔

محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی

کالج کا قائم ہونا ہی مقصود تھا جو تجویز سوم میں قرار پایا تھا ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لیے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ جس کا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا۔ اس کا کام چلنا شروع ہوا۔ اس کمیٹی نے ۱۰، جولائی ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں واسطے وصول چندہ کے مقرر کیں۔ منجملہ ان سب کمیٹیوں کے ایک سب کمیٹی علی گڑھ میں مقرر کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور راجہ سید باقر علی خاں صاحب محمد عنایت اللہ خاں مرحوم، کنور محمد لطف علی خاں صاحب منشی محمد مشتاق حسین صاحب کو سب کمیٹی کا ممبر مقرر کیا۔

میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کون ہے جو مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا، وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں یا جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شکل اور افتخار کا باعث سمجھے خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ مگر تعلیل ملی وا لینٹر بنانے چاہیے مگر بہت کم بنے جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ بس میں اسٹیج پر آیا تو قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں میں نے کہا کہ مجھکو اس کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔ ایک دفعہ ایک دوست نے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کو مزدوری ملی ہمارا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدولت مانگتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔

اے میاں۔ اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے۔ پھر کون چندہ مانگے گا۔ ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے۔ اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی "کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے۔؟"

گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ بطور چندہ مرحمت فرمایا اور مسٹر ہرالی نے مجھ کو ایک ہزار روپے دیئے تھے اور یوروپین عہدہ داروں میں سے کسی سے مدد نہیں ملی اسی سال بنارس کی کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے اور بعد تحقیقات اور طلب آرا ۱۸، نومبر ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ بمقام علی گڑھ بنایا جائے

دسویں فروری ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سید محمود نے ایک نہایت کامل تجویز تعلیم علوم کی جو انھوں نے لندن ہی میں بصلاح وہاں کے لائق پروفیسروں اور عالموں کے مرتب کی تھی، پیش کی۔ اگر اس درجہ تعلیم تک مدرسہ پہنچ جاتے تو قوم کے نصیب کھل کھل جائیں گے۔

چودھویں اپریل ۱۸۷۳ء اجلاس میں چھوٹے چھوٹے مدرسوں کے مختلف مقامات پر قائم ہونے پر بحث ہوئی جو آخرکار مدرسۃ العلوم کے ماتحت اور اس کی ایک شاخ قرار پائی۔

علی گڑھ کے مدرسہ کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی سے التماس کیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ کھولنے کی تدبیر کریں چنانچہ انھوں نے کوشش کی جس کے لیے ہم سب کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

دسویں جنوری ۱۸۷۴ء کے اجلاس میں کمیٹی نے متعدد تجویزیں منظور کیں:۔

۱۔ علی گڑھ میں جو زمین پرانی چھاؤنی فوج کی بیکار پڑی ہے تعمیر مدرسہ کے لیے گورنمنٹ سے لے لی جائے۔

۲۰. سیکرٹری کو اجازت دی گئی کہ اگر زمین مل جائے تو اس میں تعمیر مدرسہ کا کام شروع کرے۔ مگر تعمیر میں روپیہ سرمایہ کا خرچ نہ ہو بلکہ اس کی آمدنی یا چندہ خاص تعمیر کا صرف کیا جائے۔

۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء کے اجلاس میں سیکرٹری نے اطلاع دی کہ گورنمنٹ نے اس زمین کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے جہاں مدرسۃ العلوم کا تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے اس زمین کے متصل چار بنگلے لوگوں کی ملکیت تھے۔ جن کا خریدنا لازمی تھا۔ ان میں تین بنگلوں کے خریدنے کا معاملہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے بعوض ... ہزار روپیہ کے قرار دیا۔

۱۵ فروری ۱۸۷۵ء کے اجلاس میں بنارس کی کمیٹی نے علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ کھولنا تجویز کیا ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ تاریخ افتتاح قرار دی۔

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا اس وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائیکورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے اور اکونٹنٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدت ملازمت اور استحقاق پنشن کی تصدیق فرما دیں میں وسط ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ آ گیا۔ میں نے اپنے قدیم نامی اور بڑے شہر (دہلی) کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زیر زمین پڑی ہیں اور جہاں بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں۔ جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی۔ صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال چھوڑا۔ اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راستہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی۔ جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا۔ جب کبھی علمی مجلس دیکھی جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے کبھی عمدہ پھول دیکھے جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے۔ یہاں تک کہ جب بھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے ترقی کی تدبیروں پر غور کیا سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔

ابتدا میں طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا طالب علم جس قدر تھے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیئے جاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہو گئی۔ آٹھویں جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن علی گڑھ تشریف لائے اور ایک نہایت پُر تکلف جلسہ میں رسم فونڈیشن ادا ہوئی۔

اسکول جو ۱۸۷۵ء میں انٹرنس کی پڑھائی تک کے لیے کھولا گیا تھا ۱۸۷۸ء میں ایف اے کی پڑھائی تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کی پڑھائی تک ترقی کر گیا قومی بھلائی کے چاہنے والوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسہ

کیا کہ لاکھوں روپیہ چندہ مجھ کو دے دیا۔ نہ کسی کیفیت کو پوچھا اور نہ یہ جانا کہ روپیہ جو دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے میں اپنی تمام زندگی میں کسی امر پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔

ہمارے یورپین دوست جو دل سے ہمارے کالج کی ترقی و بھلائی کا خیال رکھتے تھے اور خصوصاً مسٹر ڈویٹ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ہم کو دوستانہ نصیحت کرتے تھے اور صلاح دیتے تھے کہ اب کالج کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اس کے لیے باضابطہ ٹرسٹی مقرر کرنے اور تمام کارروائی کے لیے ایک مکمل کوڈ بنانا نہایت ضروری ہے۔ ان تمام حالات کے لحاظ سے میں نے ممبروں کے اجلاس منعقدہ گیارہ مارچ ۱۸۸۹ء میں اس کو پیش کیا ٹرسٹیوں کے انتخاب کا ایسا قاعدہ بنایا گیا کہ جس سے ہر صوبے کے بزرگ ٹرسٹیوں میں شامل ہوں۔ ضلع علی گڑھ اور بلند شہر کے معزز خاندان میں سے بلا لحاظ اس کے کہ وہ مخالف ہیں یا موافق ایک ایک رئیس خاندان کو ٹرسٹیوں میں منتخب کیا۔ میں نے یہ کارروائی نہایت صاف دلی اور نیک نیتی سے کی مگر بدبختی سے میری یہ کارروائی بدنیتی پر محمول ہوئی اور ان لوگوں کو جو ٹرسٹیوں میں نامزد نہیں ہوتے تھے مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی اشتعال دی گئی۔ اس میں ان کو کسی قدر کامیابی بھی ہوئی۔

اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری محنت اور جانفشانی اور تدبیر تھی جو آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالیشان عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں میں نے جاڑے۔ گرمی برسات میں محنت اٹھائی۔ قلی کا کام میں نے کیا۔ اوورسیر کا کام میں نے کیا۔ انجینئر کا کام میں نے کیا۔ اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا اس کا صلہ ہمارے دوستوں نے اس پمفلٹ میں جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کیا، یہ دیا ہے کہ تعمیر کا کام سیکرٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ ان کو بھی نفع کثیر ہوا کرے۔

کوئی کہتا ہے کہ کالج میں یورپین اسٹاف کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے۔ بعض دوست کہتے کہ نہیں یورپین اسٹاف کا ہونا ضروری ہے۔ یورپین اسٹاف جو پورا جنٹلمین ہو اپنی قوم کی بھلائی اور بہتری کر سکتا ہے۔

میرے کل دوستوں نے صلاح دی کہ کالج کی بہتری کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یورپین اسٹاف کو کافی طمانیت سے رکھا جائے اور تم کو بہ نظر بہتری کالج کے ضروری ہے کہ بہت جلد اس بات کا تصفیہ کر دو کہ تمہارے بعد سید محمود کالج کے لائف سیکرٹری ہوں گے۔ لیکن اس سبب سے کہ سید محمود میرے فرزند ہیں۔ اس میں مجھ کو تامل ہو جاتا لیکن سید محمود ابتدا سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے اور مجھ کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ سوائے سید محمود کے اور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا مگر ہاں ایک مدت بعد جب بجز بی مستحکم ہو جائے گا۔ تو ہر کوئی چلا سکے گا۔

خدا اس کا اجر بھی قوم کو دے۔ کالج سے کوئی میری ذاتی غرض بجز اس کے کہ میں نے قومی بھلائی قومی ترقی کے لیے کیا ہے۔ اگر فرض کرو کہ اس میں کامیابی نہ ہو تو کیا؟ ہزاروں انبیاء اور فارمرز زمین کے تلے دبے پڑے ہیں۔ جن کی بے انتہا کوششیں اپنی قوم کے لیے برباد ہو گئی ہیں پھر میری ادنیٰ کوشش، اگر برباد ہو جائے تو کیا حقیقت ہے

کالج کے روپے میں غبن

شاہ ہبادی لال نے جو تعرف کیا وہ اس خیال سے کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں ایک دن میں مر جاؤں گا۔ اور جو کچھ اس نے جعل سازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جاتے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعل سازی اور فریب کھل گیا ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپے میں تصرف کیا ہے پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضے میں تھا حالانکہ یہ امر بالکل

غلط ہے قانون قرستیاں ہیں حکم ہے کہ روپیہ بنک میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کل روپیہ بنک میں جمع تھا۔ اور بنک کے خزانہ سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور چیکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا۔ گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو

سید محمود کی نسبت

جبکہ سید محمود ۱۸۶۹ء میں واسطے تعلیم کے انگلستان گئے تو میری خواہش صرف یہ تھی کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں علوم انگریزی کی عالی مخصوص لٹریچر کی کامل طور پر تحصیل کریں۔ کیوں کہ جو کوئی اس انگریزی کا لٹریچر سے واقف ہے جو انگریزوں نے نسبت اسلام اور بانی اسلام اور نسبت مسلمانوں اور ان کی حکومت کی سلطنت معاشرت کے لکھے ہیں، وہ ضرور اس بات کی خواہش کرے گا کہ کوئی ایسا مسلمان موجود ہونا چاہیے۔ جس کا دماغ قدرتی طور پر اس قابل ہو کہ اُن غلطیوں کی گرفت کر سکے۔ ایسے شخص کا اس تعلیم سے مقصد یہ نہ ہو کہ وہ روٹی کے پیچھے دوڑے، میرے تمام دوستوں کی جو ہندوستان اور انگلستان کی گورنمنٹ میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ یہ خواہش تھی کہ سید محمود سول سروس کے امتحان میں داخل کیے جائیں اور ان کو سید محمود کی کامیابی کا کامل یقین تھا۔ مگر میں نے ہرگز اس کو پسند نہیں کیا۔ بیرسٹری میں داخل ہونے کی میری چنداں خواہش نہ تھی کیوں کہ میں ان کو ایسا شخص بنانا چاہتا تھا۔ جو قومی ضرورت انجام دے۔ مگر چوں کہ بیرسٹری تعلیم میں داخل ہونا میرے مقاصد کا خارج نہ تھا میں نے اس کو گوارا کیا۔

جب وہ انگلستان سے واپس آتے تو انھوں نے بیرسٹری شروع کی۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ چند روز سے اور بہت جلد وہ اس کام پر متوجہ ہوں گے جو میرا مقصد اُن کی تعلیم سے ہے مگر اس بات کے خوش ہوں کہ زمانہ بیرسٹری میں بھی اُنھوں نے چند نہایت مفید آرٹیکل پائنیر اخبار میں لکھے ۱۸۷۸ء میں بعض امور اُن کی طبع کے ناگوار ہوتے اور وہ ہائی کورٹ کی بیرسٹری کے ترک کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ چلے آئے لارڈ نارتھ بروک نے مجبور کیا کہ سید محمود اودھ میں ڈسٹرکٹ جج ہونا منظور کریں۔ اس کے بعد وہ ہائیکورٹ الٰہ آباد کے جج مقرر ہوتے اور اس قابلِ افسوس غلط فہمی کے بعد جو اس میں اور سر ایڈ ایج میں واقع ہو گئی۔ استعفا دے دیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس ۱۸۸۶ء

مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوا کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہو یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام پر جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں۔ اس کا انتظام منظور کریں منعقد ہوا کرے گا۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ مقدس گنگا و جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔

ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں اتفاق نہ رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلم اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا۔

قوم کے نام قوم کوئی چیز نہیں۔ جب تک کہ وہ قوم "قوم" نہ ہو۔ ایک ایک شخص تو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے تب

سرسید احمد خاں کے ۱۵۶ ویں یوم ولادت پر ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۳ کو جاری ہونے والا ڈاک ٹکٹ

تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں۔ تب ہی تک وہ قوم ہے۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔

ہمارے باپ دادا اگر بہت عالی قدر تھے اور ہم نہیں ہیں تو ہم کو اس پر ناز کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ رونا چاہیے کہ ہم اپنے بزرگوں کا بھی نام ڈبونے والے پیدا ہوئے۔ نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا آپ لوگوں نے نام سنا ہوگا۔ ان کے پڑپوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔ تغلق آباد گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد ہیں۔

تمنا میں اپنی قوم کو آسمان کے ستارے کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ اور ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسماں کو عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

انتقال مجھ کو کالج کے اس نقصان کا بے انتہا رنج ہے زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے خصوصاً مجھ سے شخص کی، جو ایک حد تک زندگی پہنچ گئی ہے چند روز چند برس اور باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ نقصان کالج کا کم سے کم اتنا جتنا کہ بنک کا فاضل ہو گیا ہے پورا ہو جائے۔ . اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔

(اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید احمد خاں ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئے)

راقم سید احمد مخاطب بخطاب عارف جنگ۔

ہمارے جدِ بزرگوار سید ظہور الحسن صاحب عرف سید ظہور محمد صاحب نے علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل کے بعد اپنے والد ماجد سید محمد علی عرف سید محمود صاحب سے علم باطن کی تعلیم پائی جب ان کے والد نے رحلت فرمائی تو سندھ سے عزم ہندوستان کیا اور امصار و دیار کی سیر فرماتے ہوئے مقام مونگیر مضافات صوبہ بہار میں قیام کیا اور موضع استھاواں میں ایک سید بزرگ کی دختر سے نکاح ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ نے دو فرزند عطا فرمائے ایک سید احمد حسن عرف سید احمد علی دوسرے سید محمد حسن عرف سید محمد علی۔ سید ظہور الحسن صاحب تا زیست دہیں رہے اور ہزار ہا آدمی آپ کے شرف بیعت اور فیضانِ صحبت سے مشرف ہوئے۔

حضرت جدامجد رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی نے جب سنا کر بڑے بھائی صاحب نے صوبہ بہار کی سکونت اختیار کی ہے تو وہ بھی مع قبائل و عشائر ملک سندھ سے نہضت فرمائے ملک بہار ہوئے اور موضع استھاواں میں پہنچ کر برادر بزرگ کے شامل حال ہو گئے۔ چونکہ ان کی اولاد صلبی نہ تھی۔ اس لئے ہمارے والد بزرگوار سید احمد علی صاحب کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ ان کی گذر اوقات کی عجیب صورت تھی۔ چار ٹکے لے کر حال کھیلا کرتے کوئی ہنسی کرے یا برا کہے اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اکثر بیاہ شادی کی محفلوں میں ان کے حال کا تماشا بھی مروج و معمول ہو گیا تھا۔ حضرت سید ظہور الحسن صاحب کو یہ امر ناپسند ہوا بار بار سمجھاتے کہ بھائی اس نازیبا حرکت سے باز آؤ کیوں بزرگوں کو بدنام کرتے ہو وہ جواب دیتے کہ مجھ کو حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کا

یہی حکم ہے یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتے۔ ایک دن کسی امیر کے لڑکے کی شادی تھی۔ حضرت کو چار ٹکے دے کر بلایا حسب عادت مجلس قوالی میں حال آیا تماشائی تمسخر سے پیش آئے اتفاقاً نوشاہ نے بھی دست گستاخی دراز کیا اور شکم مبارک میں انگلی ماری وہ اور لوگوں سے تو یوں خطاب کرتے تھے "ابے کیوں چھیڑتا ہے، کیا کرتا ہے" لیکن نوشہ کو کہا "ابے کیوں لونڈیوں کے سے کام کرتا ہے" یہ کہنا تھا کہ تمام آثار عورتوں کے نمودار ہو گئے۔ بالآخر لڑکا اپنی ماں کے پاس گیا اور حقیقتِ حال سنائی، وہ بھی حیرت زدہ ہو گئی۔ فوراً اس کے باپ کو خبر کی۔ امیر اور اس کے صلاح کار و مشیر آپ کے بڑے بھائی صاحب کی خدمت میں آئے کیفیت واقعہ عرض کی وہ بھی بہت متعجب ہوئے کہ ہم تو ان کو ایسا نہیں جانتے تھے۔ پھر مع ان سب آدمیوں کے اُن کے پاس گئے دیکھ کر بولے کہ بھائی صاحب خیر ہے یہ مجمع کیسا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ بھائی یہ سب تمہاری ہی تو خوبیاں ہیں۔ آج تم نے کیکھ دیا۔ بولے کہ حضرت اس وقت نہ تو زبان میری ہوتی ہے نہ میرے اختیار میں ہوتی ہے پوچھا کہ اب کیا علاج؟ جواب دیا کہ یہ لوگ پھر مجلس منعقد کرائیں اور یاروں کے چار ٹکے دلوائیں اگر اس وقت حال وارد ہوا اور لڑکا پھر اسی طرح چھیڑے تو دیکھئے زبان سے کیا نکلتا ہے۔ الحاصل پھر وہی سامان کیا گیا حال وارد ہوا اور لڑکے نے چھیڑنا شروع کیا تو آپ کی زبان مبارک سے نکلا کہ "ابے لونڈے کیا کرتا ہے؟" یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس دن سے آپ نے حال ترک فرمایا چونکہ کمال ظاہر ہو گیا تھا۔ سب لوگ تعظیم کرنے لگے تھے یہ بات پسند نہ آئی ناچار وطن چھوڑا اور موضع جھجلی مشہور جھرنا میں جا رہے جو وہاں سے تین کوس پر تھا جب تک جیے محنت خشت سازی اور لائی (مزدوری) سے اوقات بسر کرتے رہے۔ باقی عمر وہیں بسر کی بعد وفات ایک عالی شان گنبد مزار پر بنایا گیا جو اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

جب چھوٹے دادا نے رحلت فرمائی تو ہمارے والد ماجد سید احمد علی اپنی تائی صاحبہ کی خدمت میں ریاض و محنت سے اوقات بسر کرتے رہے۔ جب تائی صاحبہ نے بھی وفات پائی تو اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اگرچہ فیض باطنی تایا صاحب سے بھی حاصل کیا تھا مگر بیعت نہ کی تھی کیونکہ اس خاندان میں اول والد ماجد سے بیعت کرتے ہیں۔ من بعد اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت حضرت والد ماجد کی عمر شریف سولہ برس کی تھی اور اپنے بزرگوار سے شرف بیعت حاصل کیا۔ سترھویں سال آپ کی پہلی شادی ہوئی پھر دوسری اور تیسرے نکاح کی نوبت پہنچی۔ اس کے بعد سواروں میں نوکری کر لی رفتہ رفتہ رسالدار بہادر ہو گئے مدت تک اسی عہدے پر مامور رہے آخر کار پنشن لے کر گھر آن بیٹھے اور گوشۂ عافیت میں یاد الٰہی کرتے رہے۔ قوت جسمانی بھی آپ کی ایسی تھی کہ بڑا اینٹیں ڈھیلوں کی طرح کھینچ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بارہ فرزند عطا فرمائے۔ زوجۂ اولیٰ سے سات، زوجۂ ثانی سے دو ابوالحسن عرف غوث علی اور سید الحسن (ولادت ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء) زوجۂ ثالثہ سے تین صاحبزادے تھے۔

ہمارے برادر عم زاد سید قاسم علی ہمارے والد کے معرفت رسالے میں نوکر ہوئے۔ چند روز کے بعد ایک انگریز کو جو رسالہ کا افسر تھا اردو پڑھانے لگے چونکہ بھائی صاحب آزاد منش اور رنگین طبع آدمی تھے دیوالی، دسہرہ، محرم، شبرات، رمضان سب کا لطف اٹھاتے تھے الا مے خواری و زناکاری سے نہایت محترز و مجتنب رہتے۔ منشی و نقاش و مصور بھی بے بدل تھے لکھنے میں یہ کمال حاصل تھا کہ ہر خط میں خط ملا دیتے تھے۔ اتفاق سے دیوالی آئی۔ خرچ پاس نہ تھا اس انگریز کے نام سے تنخواہ کا بل بنایا اور بعینہ اس کے سے دستخط کر کے خزانے سے پیشگی روپیہ وصول کر لیا اور ایام دیوالی میں خوب کھایا اڑایا۔ جب انگریز نے حسب معمول خزانے پر بل بھیجا تو افسر خزانہ نے وہ پہلا بل دکھلایا اور کہا کہ تم روپیہ وصول کر چکے ہو دیکھا تو بعینہ اس کے دستخط موجود تھے متحیر ہو گیا۔ بعد تحقیق پتا لگا کہ صناعی سید قاسم علی کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ان کو بلا کر حال دریافت

کیا تو آپ نے سارا حال صحیح صحیح بیان کر دیا۔ ضابطہ کے موافق سنگین پہرے میں نظر بند کیے گئے۔ تیسرے دن پہرے والوں سے بولے کہ میاں اب تو جی گھبرا گیا ہم جاتے ہیں یہ کہہ کر آنکھوں آنکھوں میں غائب ہوگئے بیڑی اور ہتھکڑی پڑی رہ گئی پھر جو دیکھا تو کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے بے باکانہ کہتے ہیں کہ صاحب سے ہمارا سلام کہدینا لو بھائی ہم جاتے ہیں اگر کچھ حوصلہ پکڑنے کا رکھتے ہو تو آجاؤ۔ پہرے والوں نے دوڑ کر صاحب کو اطلاع دی اس نے فوراً رسالہ کو تیار کیا اور گرفتاری کا حکم دیا۔ سواروں نے آکر چار طرف سے محاصرہ کر لیا اور چاہا کہ گرفتار کریں دیکھا تو صرف ایک جھنڈ کھڑا ہے۔ وہاں سے غائب ہو کر دور جا کھڑے ہوئے اور بولے کہ صاحبو، سلام اب ہم جاتے ہیں صاحب سے بھی سلام کہنا۔ پھر سوار دوڑے اور ہر طرف سے گھیر لیا دیکھا کہ ایک ببول کا درخت کھڑا ہے اور سید صاحب کا پتہ نہیں۔ ادھر ادھر تلاش کرنے لگے اسی میدان میں ایک ندی بہتی تھی دیکھا کہ ندی کے اس کنارے پر کھڑے ہوئے کہتے ہیں۔ لو یہ آخری سلام ہے۔

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

تعلیم جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ نے بسم اللہ پڑھا کر قرآن شریف شروع کرایا اور پنڈت رام سہی نے جو پدر رضاعی تھے زنکار کا نام لے کر شاستر کا آرنبھ (آغاز) کیا دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف ناظرہ پڑھا۔ کتب فارسیہ بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت سارت سدھ چندر کا تک پنڈت سے حاصل کیا اور عربی کی صرف و نحو نانا محمد حیات صاحب سے جو بڑی والدہ صاحبہ کے والد تھے، پڑھی بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلا لیا۔ یہاں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ محمد اسحاق صاحب اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی باقی کتابیں مولوی فضل امام خیر آبادی سے پڑھیں۔ یہ مبرور و مغفور ہمارے حال پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ان کی اہلیہ کو بھی مثل مادر مشفقہ کے محبت تھی حتیٰ کہ بغیر ہمارے کھانا تناول نہ فرمایا کرتی تھیں ہم ان کے ساتھ چٹیالہ بھی گئے اور ضروری کتب دینیہ و منطق پڑھتے رہے۔ جب وہ عالم قدس کو رحلت فرما ہوئے تو ہم کو نہایت رنج و الم ہوا۔ اس دن سے کتابیں بالائے طاق رکھ دیں کہ نہ اس شفقت سے کوئی پڑھائے گا نہ ہم پڑھیں گے۔

بیعت ہم نے حسب دستور اپنے خاندان کے، اول اپنے والد ماجد سے بیعت کی حضرت والد نے بعد تعلیم و تلقین دیکھا کہ ورد طلب غالب ہے خود اولیاء اللہ کی خدمت بابرکت میں لے جانے لگے اور جہاں جہاں مناسب سمجھا بیعت کرایا۔

زمانۂ طفلی میں ہم کو ایک سنیاسی نے جرجٹ تاڑی کپالی تعلیم کی۔ اس شغل میں حواس ظاہری مفقود ہو جاتے ہیں۔ اور روح دماغ میں آجاتی ہے۔ جس خیال میں انسان بیٹھتا ہے اسی میں رہتا ہے۔ جب ہم کو مشق ہوگئی تو ایک دن خیال آیا کہ دیکھیں تو دوسرے پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم نے اپنے بھائی کو جو والدہ صاحبہ کلاں سے تھے کپالی چڑھائی وہ بالکل بے ہوش ہو کر بشکل مردہ گر پڑے۔ اتارنا ہم کو آتا نہ تھا نہایت حیرانی دامن گیر ہوئی کہ اب کیا علاج کریں والدہ صاحبہ کلاں کو خبر ہوئی مضطرب ہو کر تشریف لائیں اور فرمایا کہ ایک تو گیا ہی دوسرا بھی چلا لوگ گمان کرتے تھے اس نے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ ایک پیالہ دہی کا لاکر اس کے سامنے گرا دیا جو آن کر پوچھتا اس سے فرماتیں کہ نہیں معلوم کیا ہوا دہی کھا کر قے کی ہے۔ میں گھبرا کر اس سنیاسی فقیر کے پاس گیا اور سارا حال بیان کیا اس نے بہت ملامت کی اور کہا کہ تم کو اس واسطے یہ عمل سکھایا تھا کہ لوگوں کا تماشا دیکھو ہم نے تو اس لئے سکھایا تھا کہ یاد الٰہی میں مشغول رہو گے۔ خبردار پھر ایسی حرکت نہ کرنا یہ کہہ کر ہمارے گھر آئے اور بھائی کے سر پر مشکیں چھڑوائیں جب تیسری مشک گری۔ نوبت پہنچی تو اٹھ بیٹھے پھر ہم نے بھائی سے

بے ہوشی کی کیفیت دریافت کی کہا میں تو زندہ تھا اور تم سب کو پکار پکار کے کہتا تھا کہ میں زندہ ہوں تم گھبراؤ مت میں کنویں میں پڑا ہوں مجھ کو نکال لو لیکن تم سنتے نہ تھے اور مجھے کسی طرح کی تکلیف بھی نہ تھی۔ اس دن سے ہم نے توبہ کر لی کہ پھر ایسا کام ہرگز نہ کریں گے۔

ہمارے وطن کے چمار کا لڑکا دریا کے کنارے جا کر کچھ پڑھا کرتا تھا ہم نے دریافت کیا۔ اس نے کہا میاں صاحب میں ایک منتر سِدھ کرتا ہوں ہم نے کہا جس روز تیرا منتر سدھ ہو ہم کو بھی ساتھ لے چلنا۔ وہ ایک رات کو آیا اور ہم کو بھی ساتھ لے گیا دریا کے کنارے پہنچ کر موہن بھوگ اور چاول وغیرہ پکائے بھینٹ دی پوجا کی اور منتر پڑھ کر فارغ ہوا۔ دونوں گھر کو چلے میں نے کہا اب اس کا تماشا تو دکھا۔ اس نے کنکر پڑھ کر ایک درخت پر مارا نیچے سے اوپر تک آگ لگ گئی۔ اور جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ ظرفہ ماجرا دیکھکر ہم نے کہا کہ اب تو ایک کنکر ہمارے اوپر مار۔ اس نے اوّل تو بہت انکار کیا مگر کہنے سننے سے مجبور ہو کر بولا لو ہشیار ہو جاؤ۔ ہم نے "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کہہ کر اپنے گرد حصار کھینچ لیا۔ اس نے کنکر مارا کچھ نہ ہوا دوسرا اور تیسرا مارا کچھ بھی نہ ہوا پھر تو ہم حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے کہ یہ بھروسا اچھا نہیں اس چمار سے کہا کہ بھلا اب تو کنکر پھینک۔ اس نے غصہ میں آکر ایک اور مارا تو وہ کنکر ہمارے سینے پر آن کر ایسا لگا جیسے لڈو لگتا ہے پھر ہمارے سینے سے اچٹ کر اس کی پیشانی پہ جا لگا وہ اوندھے منہ گرا اور تمام سوراخ ہائے جسم سے خون جاری ہو گیا ہم نے دوڑ کر اس کے باپ کو اطلاع دی وہ اپنے لڑکے کو اٹھا کر ہمارے نانا محمد حیات صاحب کی خدمت میں لایا نانا صاحب نے کیفیت دریافت فرمائی ہم نے حال مفصل بیان کر دیا۔ آپ نے دو تین طمانچے لگائے اس وقت ہماری عمر کوئی دس بارہ برس کی تھی پھر فرمانے لگے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کیا تیرے [illegible] ودر بین لگائے بیٹھے ہیں کہ ہر دم تکتے رہیں یا ہر وقت تیرے ساتھ پھریں گے خبردار تم جانتے کہ جو پھر ایسا کیا اگر یہ مر جاتا تو کیا علاج ہوتا غرض ہم کو مارا پیٹا اور بہت سرزنش کی تب حضرت کا غصہ فرو ہوا، پھر سورۂ مزمل دم کر کے اسے پانی پلایا اور نہلایا کئی دن کے بعد وہ اچھا ہوا۔

جب حضرت قبلہ گاہی رحمۃ اللہ علیہ کی تبدیلی دہلی کو ہوئی تو مجھ کو بھی وطن سے طلب فرما لیا اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں سپرد کر دیا اور ایک لڑکا رسالدار بہادر کا ہمارا ہم عمر و ہم سبق تھا اور چونکہ حضرت والد ماجد اور رسالدار میں واسطۂ اتحاد تھا اس لئے ہم دونوں میں بھی انس ہو گیا۔ وہ لڑکا ہمارا بڑا یار نہایت حسین و جمیل آدمی تھا یہاں تک کہ اپنے حسنِ صورت پر آپ فریفتہ ہو گیا ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آئینہ رو برو ہے اور آنکھ آنکھ آنسو رو رہا ہے میں نے پوچھا: کیوں بھائی خیر ہے؟ بولا کیا کہوں مجھ کو اپنی صورت پر آپ پیار آتا ہے اگر دوسرے پر عاشق ہوتا تو بھلا اس کو گلے سے تو لگا سکتا اب تو خود ہی عاشق خود ہی معشوق۔ کروں تو کیا کروں۔ میں نے کہا یہ تو کچھ بڑی بات نہیں تم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھو اور میری چھاتی سے لگ جاؤ۔ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ بھائی تم کو تو ہر وقت دل لگی ہی سوجھتی ہے۔ تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جئے۔ پھر آئینہ پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے والد کے رسالے میں ایک نئے کرنیل صاحب بدل کر آئے ان کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ کرنیل صاحب صرف نوکری کے وقت باہر جاتے ہیں۔ ورنہ رات دن اپنے کمرے میں تنہا اور چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں نصف تنخواہ تعلیم کو دیتے ہیں اور نصف خدا کے نام خیرات کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہمارے والد سے بہت ربط بڑھ گیا ایک دن کہا کہ رسالدار صاحب آپ کی نسبت ذوق و شوق میں بہت بڑھی ہوئی ہے مگر توحید کی بو بھی نہیں۔ یہ بات سن کر والد ہوشیار ہو گئے کمرے سے باہر آن کر کہنے لگے کہ بھلا بچہ تیری توحید دیکھنی ہے چونکہ حضرت کی نسبت قوی اور [illegible] زور کی تھی تین چار دن میں ایسی غالب آئی کہ کرنیل صاحب پر بھی ذوق و شوق [illegible] ہو گیا یہاں تک کہ کمرے میں تنہا بیٹھے رویا کرتے ایک روز والد نے پوچھا کہ صاحب اب وہ توحید کہاں گئی؟ جواب دیا کہ رسالدار صاحب

ہم نہیں جانتے آپ نے کیا کر دیا۔ اب تو ہمارا جی رونے ہی میں لگتا ہے۔ آپ کی نسبت نہایت زبردست ہے۔

شہزادہ روس اجمیر میں

جب والد کا رسالہ نصیر آباد کی چھاؤنی میں تھا تو ہم اور والد ہمیشہ پنجشنبہ کے دن عصر کے وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ولی عہد روس یعنی الگزنڈر اول اس زار کا باپ جو بالفعل تخت نشین ہے وہاں کشمیری فقیر کے بھیس میں موجود تھا بہت لوگ اس کے مرید بھی ہو گئے تھے ہمارے والد بھی کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے مگر پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ یہ شخص نصاریٰ ہے اور فقیری کا صرف بہروپ بھر رکھا ہے۔ چھ مہینے میں ایسی محبت بڑھی کہ اگر والد ہفتے میں ایک بار اس سے نہ ملتے تو آدمی بھیج کر بلاتا اسی عرصے میں ایک اشتہار صدر سے کمشنر اجمیر کے پاس آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ دو سال سے ولی عہد روس گھر چھوڑ کر نکلا ہے کہیں پتہ لگے تو اطلاع دو۔ اس کے ساتھ ہی شہزادے کی تصویر بھی تھی۔ مخبر بھی غضب کے ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح پتہ لگا لیا اور کمشنر کو خبر دی کہ شہزادہ فقیری کے بھیس میں حضرت کی خانقاہ کے اندر موجود ہے۔ کمشنر صاحب اول بطور سیر آئے اور اس کشمیری فقیر کو تصویر سے مطابق کیا تو مو فرق نہ پایا دوسرے دن تمام انگریز مع رسالہ اور پلٹن کے درگاہ شریف میں آئے اور فقیر کے سامنے ٹوپیاں اتار کر کھڑے ہو گئے بولا بابا خیر ہے؟ انگریزوں نے کہا کہ آپ ولی عہد روس ہیں۔ چھاؤنی میں تشریف لے چلئے، پہلے تو انکار کیا لیکن جب تصویر دکھلائی تو مان گیا اور ساتھ ہو لیا۔ لشکر نے سلامی اتاری بڑی تعظیم ہوئی شہر میں روشنی کرائی گئی ملک روس کو خبر کی گئی کہ شہزادہ مل گیا وہاں سے جہاز لینے کو آئے۔ اکیس روز کے بعد اجمیر سے روانہ ہو گیا اس عرصہ میں ایک دن ہمارے والد کو بلا کر دو تین گھنٹے تک باتیں کیں اور بہت کہا کہ ہمارے ساتھ چلئے اپنے باپ سے کہہ کر آپ کو بڑا عہدہ دلاؤں گا والد نے کہا کہ بھلا میں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ گذران کے لئے یہ تنخواہ بھی کافی ہے۔ شہزادے نے کہا اچھا

آپ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے چلئے۔ خرچ ہمارے ذمہ رہا اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو چھ مہینے ہمارے پاس رہا کیجئے اور چھ مہینے اپنے بال بچوں میں اور اس آمد و رفت کا خرچ میں دونگا تنخواہ آپ کی اس کے علاوہ رہی۔ ہر چند شہزادے نے سمجھایا مگر والد راضی نہ ہوئے۔ جب شہزادہ اپنے ملک میں پہنچ گیا تب بھی جرنیل صاحب کو چٹھی لکھی کہ میر احمد علی رسالدار سے ہمارا سلام کہہ دو اگر اب بھی وہ آنا چاہیں تو روانہ کر دو جرنیل صاحب نے بلا کر کہا کہ شہزادہ تم پر بہت مہربان ہے تم چلے کیوں نہیں جاتے ہم تو ذرا سا بھی سہارا پاتے تو فوراً چلے جاتے معلوم نہیں تم سے کیوں اس قدر خوش ہے کہ بار بار طلب کرتا ہے ہمارے نزدیک اگر مستقل طور پر نہیں جاتے تو بطور سیر ہی چلے جاؤ رخصت دلا دینا ہمارا کام ہے مگر

والد نے جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سید اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے ہمراہ راجو پور جانے کا اتفاق ہوا۔ کلو کپتان کے مکان پر ٹھہرے ان کو افیون کی دھت تھی ہر دم پینک میں رہتے اور رات کے بارہ بجے کھانا کھاتے پھر آم چوستے چوستے دو بجے سونا ملتا۔ صبح کی نماز قضا ہو جاتی۔ ہماری طبیعت گھبراتی ناچار ہم نے یہ تدبیر کی کہ جس وقت مؤذن عشار کی اذان دینے کھڑا ہوا تو ہم نے سکھا دیا کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" بھی کہہ دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کپتان صاحب پینک سے چونکے ارے میاں جلد کھانا لاؤ آج تو صبح ہی ہو گئی کھانا آ گیا جب کھا پی چکے تو ٹن ٹن دس بجے کپتان صاحب بولے ہیں یہ کیا؟ نو بجے صبح کی اذان کس نے کہہ دی؟ مؤذن بلایا گیا اس نے کہہ دیا کہ حضور مجھ سے تو مولوی غوث علی نے فرمایا تھا کہ تو "الصلوٰۃ خیر من النوم" اسی وقت پڑھ دے میں نے ان کے کہنے کے موافق عمل کیا ہے۔ کپتان صاحب ہماری طرف مخاطب ہوئے۔ ہم نے کہا کہ صاحب بارہ بجے تک بھوک کے مارے آنتیں قل ھو اللہ پڑھتی ہیں۔ پھر دو بجے سوتے ہیں تو صبح کو آنکھ نہیں کھلتی بجز اس بات کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ کپتان صاحب نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو بلا کر حکم دیا کہ ان کو آٹھ بجے کھانا کھلا دیا کرو۔

ولیم فریزر ہم سونی پت میں میر اعظم علی شاہ کے ہمراہ تعلو کی مسجد میں رہتے تھے ایک دن فریزر صاحب ریزیڈنٹ دہلی تشریف لائے اس وقت میر صاحب مکان کے اندر تھے ہم سے پوچھا کہ "یہ کس کا مکان ہے؟" ہم نے کہا کہ: ایک پیرزادے کا! "صاحب نے کہا کہ: "پیرزادے تو ٹھگ ہوتے ہیں ہم نے کہا کہ" ہاں صاحب ہوتے ہوں گے!" یہی گفتگو تھی کہ میر صاحب تشریف لائے صاحب نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ہم نے کہا صاحب یہ وہی ٹھگ ہیں جن کا مکان ہے بولے نہیں نہیں یہ تو پادری صاحب ہیں اور ہم کو اشارے سے منع کیا کہ وہ بات ان سے نہ کہو پھر میر صاحب کا مزاج پوچھا اور پانچ روپے نذر دیئے دوسرے دن بڑے تکلف سے دعوت کی اور جب تک وہاں قیام رہا ہر روز میر صاحب کے سلام کو آتے رہے پھر دہلی کی جانب کوچ کیا۔ نہایت خلیق و خوش مزاج انسان تھا۔

کلیر شریف جب اوّل مرتبہ ہم پیران کلیر گئے ہیں تو دو وقت کا فاقہ ہوا ہم نے مخدوم صاحبؒ کے مزار پر جا کر کہا کہ حضرت آپ نے تو عمر بھر گولریوں پر گذران کی ہم کو بھوکا ہی مارے گا؟ غور سے جو دیکھا تو قبر کو ایک سیاہ سانپ لپٹا پڑا تھا۔ خیر، ہم اپنا حال کہہ کر چلے آئے تھوڑی دیر میں ایک خادم کھانا لایا اور عذر معذرت کرنے لگا کہ میں بھول گیا تھا آپ معاف کریں۔ غرض وہاں سال بھر رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار تمام خادمان درگاہ، حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں چلے گئے تھے وہاں سوائے ہمارے اور کافر شاہ مجذوب کے کوئی نہ تھا وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا تھے۔ ایک دن ہم سے کہا کہ اب میرا وقت قریب آ گیا ہے میرا بدن اور کپڑے سب ناپاک ہیں کپڑے تو تالاب پر دھو لاؤ اور مجھ کو نہلا دو۔ ہم نے کپڑے دھو دیئے اور ان کو خوب نہلا دیا۔ بعد مغرب چادر تان کر لیٹ گئے اور السلام علیکم کہہ کر جان بحق ہوئے اس زمانے میں مزار کے آس پاس بہت جنگل تھا ہم ان کی لاش کی نگہبانی کرتے رہے جب آدھی رات گذری تو خیال آیا کہ لاش کو تنہا چھوڑتے ہیں تو خوف ہے۔ کہ کوئی جانور نہ کھا جائے اور نہیں جاتے تو نماز قضا ہوئی ہم اسی فکر میں تھے کہ وہ مجذوب الا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور اپنا ڈنڈا سنبھالا کہ شاید کوئی بھوت لاش کے اندر حلول کر گیا مارنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ گھبرا کر بولے میاں غوث علی شاہ خبردار کوئی جن بھوت نہیں میں تو وہی کافر شاہ ہوں تم جو متردد تھے اس لئے میں سرکار سے دو پہر کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ اب تم جاؤ نماز پڑھو میں دو گھڑی دن چڑھے مروں گا۔ خیر ہم نے لٹھ رکھ دیا اور ان سے باتیں شروع کیں۔ اول تو ہم نے پوچھا کہ آپ ہیں کون دوسرے یہ کہ آپ کو فیض کہاں سے ہوا۔ تیسرے یہ کہ مرنے کے بعد کیا گذری؟ جواب دیا کہ میں شہزادہ ہوں تیموریہ خاندان سے اور فیض باطنی مجھ کو حضرت مخدوم

علی احمد صابر کی روح پُر فتوح سے ہوا ہے اور وہاں کا حال مختلف ہے مجھ پر جو گذری زیادہ حال گفتنی نہیں تم جب آؤ گے خود معلوم کر لو گے اب جاؤ نماز پڑھو دیر ہوتی ہے مگر اشراق پڑھ کر جلدی چلے آنا۔ ہم ٹھیک وقت پر آ پہنچے تو بولے کہ لو اب ہم جاتے ہیں تم کفن و دفن کا کچھ فکر نہ کرنا۔ مولوی قلندر صاحب جلال آبادی آتے ہیں۔ دو طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہیں وہ تمہارے شریک حال ہو جائیں گے۔ دو چادر اُن کی اور ایک ہماری ان میں لپیٹ کر دفن کر دینا اور میری قبر مخدوم صاحب کے انداز بنانا۔ پھر بولے کہ اب انگوٹھوں میں سے جان نکل گئی اب ٹخنوں میں آ گئی اب گھٹنوں میں اب کمر میں اب سینے میں اب حلق میں السلام علیکم۔ اتنا کہہ کر رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب بھی تشریف لائے اور حسب وصیت ان کو دفن کر دیا۔ پھر ہم نے تمام حال مولوی صاحب سے بیان کیا بہت دیر تک متحیر رہے اور کہنے لگے کہ حقیقت میں یہ فقیر اپنے فن کا پورا تھا۔

ہم اور کمبل پوش دلی سے پیران کلیر کو چلے اُن دنوں گنگا اشنان کرنے والے بھی ہردوار کو جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک دن میں نے کمبل پوش سے کہا کہ یار بھوک لگی ہے۔ کہیں کھانا کھا دیں۔ اس نے کہا اگر تم میرے چیلے بن جاؤ تو میں ابھی حلوا پوری کھلاتا ہوں۔ میں نے کہا اچھا۔ اس نے ہم کو تو چیلا بنایا اور خود ایک عرقی لنگوٹی باندھ بھبھوت مل سڑک کے کنارے بیٹھ گیا جسیم آدمی، داڑھی صفاچٹ خاصے پرم ہنس معلوم ہونے لگا۔ اتفاقاً ایک بیکانیر کا امیر اس طرف سے گذرا کمبل پوش ہاتھوں سے اشارہ کر کے ایں ایں کرنے لگا۔ ہم سے پوچھا کہ باباجی کیا چاہتے ہو؟ ہم نے کہہ دیا کہ کھانا مانگتے ہیں مگر ان کو حلوا پوری مرغوب ہے لیکن اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے اس نے فوراً تیار کرایا۔ ایک کونڈے میں حلوہ اور بہت سی پوریاں نذر کیں۔ وہ پھر ایں ایں کرنے لگا۔ پوچھا کہ کیا کہتا ہے میں نے کہا کہ کھلانے کو کہتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا جانے کتنی دیر میں کھائے گا ہماری منزل کھوٹی ہوتی ہے مہربانی کر کے تم اس کو کھلا دو۔ اتنا کہہ کر خود تو چل دیا اور ہم دونوں نے کنوئیں کے کنارے بیٹھ کر حلوا پوری کھایا۔ اَلدُّنْیَا زُوْرٌ وَّلَا یَحْصُلُ اِلَّا بِالزُّوْرِ۔ کمبل پوش نے کہا کہ سب چیلا ہو تو ایسا ہو کہ گرو کے اشارے کو انتہا تک پہنچا دے۔

جب ہم دوبارہ کلیر میں گئے تو وہاں ایک بزرگ غلام فرید صاحب جو بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے مع چند مریدوں کے تشریف لائے ہر ایک مرید کو ایک ایک خدمت سپرد تھی اتفاق سے جس مرید کو گھوڑے کی گھاس لانے کا کام تھا اس کو بخار اس شدت سے آیا کہ بے چارہ گھاس نہ لا سکا۔ اس پر پیر جی کا غضب نازل ہوا فرمایا کہ جا ہم نے تجھے مردود کیا اور چودہ خانوادے سے باہر نکال دیا۔ یہ سن کر اس بے چارے کا دم نکل گیا۔ بہت رویا پیٹا توبہ استغفار کی مگر پیر جی نے ایک نہ مانی۔ آخر روتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت آج بڑا غضب ہوا میرا کہیں ٹھکانا نہیں رہا۔ دونوں جہان سے راندہ ہو گیا ہم نے کہا کہ ابھی اس جہان میں تو موجود معلوم ہوتا ہے بات تو کہہ۔ اس نے رو رو کر اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ ہم نے کہا ارے بے وقوف روتا کیوں ہے۔ تیرے پیر جی کو صرف چودہ خاندان یاد تھے ہم کو چھتیس یاد ہیں آ تجھ کو پندرھویں خانوادے میں بھرتی کر لیں۔ تو گھبرا مت۔ لیکن تو جا اور اپنے پیر جی سے پہلے یہ بات دریافت کر کہ حضرت جب آپ نے مجھ کو چودہ خانوادوں میں داخل کیا تھا تو میں کہاں کا بادشاہ یا وزیر یا ولی کامل بن گیا تھا اب جو آپ نے نکال دیا تو میرے پاس سے کیا چھن گیا؟ میں تو جیسا جب تھا ویسا ہی اب ہوں البتہ آپ کے نکالنے سے ایک فائدہ ہوا کہ گھاس کے بوجھ سے سبک دوش ہو گیا اگر تجھ سے پوچھیں کہ یہ بات تجھ کو کہاں سے سوجھی تو کہنا کہ میں پندرھویں خانوادے میں داخل ہو گیا ہوں یہ اس کی بسم اللہ ہے۔ غرض اس نے جا کر اسی طرح سے بیان کیا یہ سن کر ان کے مریدوں کے کان کھڑے ہو گئے اور پیر جی سے کہنے لگے کہ حضرت یہ خاندان تو بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اول تو گھوڑے کی گھاس سے چھوٹا دوسرے ہم سے ایک خاندان آگے بڑھ گیا اگر آپ کو آگے کے خاندان میں دسترس ہوتی تو ہم بھی پندرھویں خاندان میں داخل ہو جاتے۔ پھر تو پیر جی کے چھکے چھوٹے اور گھبرا کر

بولے کہ یہیں میاں غوث علی شاہ کے پاس تو نہیں جا پہنچا۔ یہ سارا فساد انھیں کا معلوم ہوتا ہے ورنہ اور کسی کو یہ باتیں کیا سوجھتیں۔ الحاصل وہ ہمارے پاس دوڑے آئے اور گلا کرنے لگے کہ واہ صاحب تم نے ہمارے سارے مرید فرنٹ کر دیئے میں نے کہا کہ میاں صاحب ذرا غور کرو وہ بیچارے گھر بار جورو بچے چھوڑ کر آپ کے پاس خدا کا نام سیکھنے آئے ہیں یا گھونٹے کی گھاس کھودنے۔ اگر تم کو خدا کا نام آتا ہو تو بتلا کر رخصت کرو ورنہ جواب صاف دے دو۔ وہ بیچارے تو تمہاری خدمت گذاری کریں اور تم کسی طرح ان پر شفقت نہ کرو یہ کیا آدمیت ہے۔ اور جس بات کے لئے وہ مرید ہوئے اس کی تو آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ بقول شخصے ع دیر خود در ماندہ شفاعت کرا کند۔ آپ یہ تو فرمائیں کہ سوائے بزرگوں کی اولاد میں ہونے کے کچھ آپ گرہ کا کمال بھی رکھتے ہیں؟ اور تماشا یہ ہے کہ اس بے ہنری پر اس قدر ناز۔ ذرا شرم کرو اور خدا سے ڈرو۔ میری یہ تقریر سن کر پیرجی بہت گھبرائے اور منت کرنے لگے کہ خدا کے واسطے ایسی تدبیر کرو کہ میرے مرید برگشتہ نہ ہو جائیں ورنہ مجھ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ خیر میں نے پیرجی کے سب مریدوں کو جمع کر کے سمجھا دیا اور ان کے حوالے کیا۔

کلیر میں ایک خان صاحب تشریف لائے۔ کمر باندھے تلوار لگائے۔ نہ سلام نہ دعا۔ اوّل یہی سوال کیا کہ غوث علی شاہ کون ہے؟ میں نے کہا فرمایئے؟ بولے آپ کو کیمیا آتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں آتی ہے! کہا کہ ہم کو بتادو۔ میں نے کہا نہیں بتاتے بولے کیوں؟ میں نے کہا: ہماری خوشی! پھر مجھ کو خیال آیا کہ یہ پٹھان ایک جاہل سپاہی اور ہتھیار بند ہے ایسا نہ ہو کہ جل کر چوٹ کر بیٹھے۔ میں نے کہا کہ خاں صاحب آپ کمر کھولیں آرام فرمائیں بھلا ایسی چیز زبردستی یا راہ چلتے کوئی بتاتا ہے؟ آپ ٹھہریں تو سہی دیکھا جائے گا۔ غرض خان صاحب نے کمر کھول دی اور ہمارے پاس قیام کیا۔ ان دنوں ہماری غذا یہ تھی کہ روکھی سوکھی نان جویں یا پنوار کا ساگ جو اس جنگل میں خودرو ہوتا تھا۔ شام کو یہی کھانا ہم نے ان کے سامنے رکھا خیر خاں صاحب نے مجبوری کھانا شروع کیا مگر لقمہ حلق سے اترنا دشوار تھا ہم نے پوچھا کیوں صاحب خیر ہے؟ اچھی طرح کھایئے۔

بولے کہ صاحب ناگوار غذا تو نگلی نہیں جاتی ہم نے کہا کہ واہ آپ تو کیمیا کے طالب ہیں بس یہی تو کیمیا کے مزے ہیں اگر سیکھ لوگے تو ایسی ہی چھوتیاں تم کو بھی نصیب ہوں گی بہت چپ ہوئے اور دل سرد ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ خاں صاحب خیال تو کرو اگر ہم کو یہ صنعت یاد ہوتی تو کیوں تنگی کی زندگی اور یہ ترکاری بے نمک کھاتے؟ کہا کہ مجھ کو تو میاں امیر الدین شاہ صاحب نے بتادیا تھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے ہم نے کہا کہ میاں اصل بات تو یہ ہے نہ ان کو آتی ہے نہ ہم کو۔ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے انھوں نے یہ حیلہ کیا اور تم کو ٹال دیا اور جس طرح تم طلب کرتے ہو اس طریقے سے تو کوئی جاننے والا کبھی نہیں بتانے کا بڑی خدمت و اطاعت سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ سری نگر کے پہاڑ پر ایک ہندو بابا جی رہتے ہیں۔ ان کے پاس چلے جاؤ۔ اور کچھ مدت ان کی خدمت میں رہو شاید تمہارے حال پر رحم کھا کر کچھ بتادیں۔ خدا خدا کر کے اس پٹھان کو ہم نے ٹالا۔ اگلے روز میاں امیر الدین شاہ صاحب بھی تشریف لائے میں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بلا میرے پیچھے لگادی تھی بولے کہ میاں وہ تو ایسا ہمارے سر ہوا کہ کسی طور سے مانتا ہی نہ تھا مجبوری تمہارے پاس بھیج دیا تھا کہ تم کسی نہ کسی ڈھنگ سے اس کو سمجھا دو گے اور ہم تم دونوں اس بلائے ناگہانی سے چھوٹ جائیں گے۔

دہرہ دون

جب ہم دہرہ دون کو گئے وہاں ایک ہندو فقیر کی خبر سن کر پہاڑ پر پہنچے ان کی ملاقات سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ چار پانچ روز رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز تنہائی میں ہم گئے اس وقت بابا جی رام گیتا لکھ رہے تھے ہم نے کہا "نمو نارائن" بولے اجی "نمو نارائن" پرلا حول بھیجو السلام علیکم کہو۔ یہ کلام سن کر ہم چونکے فرمانے لگے میں سید ہوں اور میرا نام محمد حسین ہے پہلے تو شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کی پھر وید اور شاستر کا شوق دامنگیر ہوا۔ بنارس جا کر یہ بھی پڑھا۔ خاندان قادریہ میں مرید ہوں۔ اب جوگ لے کر یہاں آرہا ہوں چیلے کام کرتے ہیں میں یاد خدا میں مصروف ہوں۔ ہم نے دریافت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فقیری میں آپ نے کیا فرق دیکھا کہا کہ فقیری کی بات

تو دونوں طرف یکساں ہے صرف الفاظ و اصطلاحات جدا ہیں۔

سری نگر

ہم دہرہ دون کے پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے سری نگر میں پہنچے ایک پہاڑ پر باباجی رہتے تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئی۔ بڑی خلق و مدارات سے پیش آئے دیکھتے ہی بولے کہ ایسی صورت تو بعد مدت دیکھنے میں آئی ہے۔ ہم کو ایک جُدا مکان دیا چارپائی منگائی ہر چند ہم نے انکار کیا کہ آپ زمین پہ سوتے ہیں ہم بھی اسی طور سے بسرام کریں گے ہرگز نہ مانا اور اصرار کیا کہ نہیں تم کو چارپائی ضرور چاہئے چند روز میں بے تکلفی ہو گئی ایک دن ان کے کسی چیلے کو پدم ناگ نے جو ہاتھ بھر کا اور نہایت زہریلا ہوتا ہے کاٹ لیا دوسرے چیلے نے سانپ کو پتھر کے کونٹے سے ڈھاک دیا اور خود آ کر گروجی کو خبر کی فرمایا کہ جلدی بھبھوت (یعنی اکسیر اعظم) لا۔ اتنے میں ایسا زہر چڑھا کہ چیلے کا منہ بند ہو گیا اور گردن کا منکا ڈھل گیا۔ کہا کہ جس طرح ہو سکے اس کے حلق سے بھبھوت اتار دو۔ خیر بڑی مشکل سے ایک خشخاش کے برابر راکھ سینک سے اس کو کھلا دی اس کا اترنا تھا کہ چیلا پھر جھری لے کر سیدھا ہو گیا۔ اور چیلوں کو حکم دیا کہ اب اس کو بٹھاؤ تھوڑی دیر میں اس نے بھوک کی فریاد کی تو دو سیر گھی اس کو پلایا اور پھر ٹہلانا شروع کر دیا۔ اور جب خواہش ہوئی گھی پلا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کو خون کا دست آیا پھر گھی پلا کر کچے لہو کا دست آیا۔ اس کے بعد غذائی آیا اور بھلا چنگا ہو گیا۔ اب گروجی نے کہا کہ اس سانپ کو لاؤ چیلے پکڑ لائے۔ ایک سینک سے اس کے منہ میں وہی بھبھوت ڈال دی۔ اسی دم اینٹھ کر رہ گیا اور ذرا دیر میں پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ اور وہ خاک پانی پر تیرنے لگی باباجی نے کہا کہ اس کا زہر تو اس کے لئے اکسیر ہے مگر انسان کے لئے قاتل ہے اور انسان کی اکسیر اس کے لئے زہر ہلاہل ہے۔

اس کے بعد باباجی نے کہا کہ آؤ تم کو ایک اور تماشا دکھائیں ایک کڑھائی دودھ کی بھری ہوئی منگائی اور اس میں سرکہ اور نمک ڈال کر دودھ کو پھاڑ دیا۔ مجھ سے بولے کہ بھلا اب کوئی شے اس کو درست کر سکتی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں پھر وہی خاک چاول بھر اس میں ڈال کر لکڑی سے ہلانا شروع کیا۔ فوراً دودھ اصلی حالت پر آ گیا پھر کتنا ہی سرکہ

اور نمک اس پر ڈالا کچھ اثر نہ ہوا۔ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ بابا جی نے چیلوں کو حکم دیا کہ گڑھا کھود کر اس دودھ کو دبا دو۔ ہم نے کہا کہ صاحب ان چیلوں کو آپ کیوں نہیں پلا دیتے۔ فرمایا یہ پئیں گے تو کامی (شہوت پرست) ہو جائیں گے۔ پھر ہم سے براہِ عنایت فرمایا کہ تم کھاؤ تو ہم کھلا دیں سات پشت تک اس کی تاثیر رہے گی۔ میں نے کہا بہت اچھا مگر اس کا آتا بھی بتا دیجئے۔ ورنہ پانچ سیر مرغن کھانا ہر روز کہاں سے لائیں گے۔ فرمانے لگے میاں خدا مالک۔ میں نے کہا سبحان اللہ دوا کھلانے کے تو آپ مالک ہیں اور کھانا کھلانے کے لئے خدا مالک۔ میں ایسی دوا سے باز آیا۔ ان بابا جی کی عمر چار سو برس کی تھی ستر برس میں کایا پلٹ کرتے تھے۔ اسی طرح کہ چھ مہینے ایک کوٹھری میں بیٹھ کر جہاں ہوا کا گذر نہ ہو ایک دوا کھاتے تھے۔ پہلا جسم پھٹ کر اس کے اندر سے بارہ برس کی عمر کا ایک جسم نکل آتا تھا۔ جن دنوں میں ہم گئے تھے وہ دوا تیار ہو رہی تھی۔

ایک زمانہ میں حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ متبرک کی زیارت کو ہم گئے۔ پیرانِ کلیر میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جب عرس شروع ہوا تو اطراف و جوانب سے صوفیا کا ورود ہونے لگا۔ خوش اعتقادوں کے ہجوم اور آہنگ و سرود کی دھوم ارباب شوق کی مستی و اصحاب ذوق کی بادہ دستی سے ہنگامہ بزم گرم ہوا۔ میں بھی عین وجد و حالت کی گرما گرمی میں اس مجلس کے اندر پہنچا۔ دیکھا کہ تین شخص رنگین لباس، بادۂ شوق سے سرمست ہیں اور اصاغر و اکابر خاموش۔ مطربان خوش آہنگ کسی سوختہ دل کا یہ شعر گاتے ہیں۔

یہ شکایت ہے ہمیں اس ساقی گلفام سے
دور ساغر میں ہیں محروم رکھتا جام سے

اُن میں سے ایک فرید خاں کا ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ نے اس شعر سے کیا کیفیت اخذ کی اور تحقیق معانی سے کیا اثر آپ کے دل پر مترتب ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم جو گوہرِ اشک پروتے ہیں سو اللہ کو روتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کیا آپ کے دلِ مردہ کی طرح حی القیوم لاتاخذہٗ سنۃٌ ولا نوم بھی دامِ اجل میں گرفتار ہو گیا ہے جس کے ماتم میں آپ نوحہ گری کرتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو مقامِ تہنیت ہے نہ جائے تعزیت۔ کیونکہ اس نے تمہارے بزرگوں کو مارا اور تمہاری فکر میں ہے۔ یہ بات سُن کر چپ چاپ ایک گوشہ مجلس میں جا بیٹھے معلوم نہیں کبیدہ خاطری سے گردن جھکائی یا خدا سے جی لگا بیٹھے۔ پھر میں نے دوسرے نالہ کش سے وہی سوال کیا جو پہلے سے کیا تھا وہ بولے کہ حضرت کیسی غزل اور کہاں کا شعر۔ نہ ہم سمجھتے ہیں اور نہ اس کو سنتے ہیں یہاں تو الاپ اور سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سر دھنتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت درست:

کسا نیکہ ایزد پرستی کنند
بر آواز دولاب مستی کنند

پھر تیسرے صاحبِ ذوق سے بھی یہی سوال کیا انھوں نے فرمایا کہ حضرت شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والثنا شبِ معراج کو مدارج و مقامات طے کرتے ہوئے پردۂ وحدت تک پہنچے تو آواز آئی کہ السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ پس اس ساغر کو حضرت رسالت پناہ نے نوش فرمایا ایک حصہ تو خود نوش کیا اور دوسرا حصہ بندگانِ صالح کو عنایت کیا یعنی فرمایا کہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین جس کا حشر تو یہ ہے کہ بندگانِ صالح کو تو ان کی صالحیت کا ل تھی وہاں ہم جیسے تشنہ لبان بادۂ معصیت کو یاد کیوں نہیں فرمایا۔

ع۔ کہ مستحق کرامت گناہگارانند

میں نے عرض کیا کہ حضرت خیر الوریٰ نے تو گناہگاروں کو صالحین سے بھی پہلے دور ساغر میں کمال شفقت کے ساتھ شریک فرمایا ہے۔ چنانچہ علینا میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے۔ صالحین کو بعد عطف جدا یاد کیا اور عاصیوں کو اپنے ساتھ رکھا بھلا اس سے زیادہ اور کیا عنایت ہو سکتی ہے یہ بات سن کر ان کا جوش و خروش دھیما ہو گیا اور خاموش ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔

شاہ ابو سعید نقشبندی

جب ہم میرٹھ میں تھے تو کپڑے بالکل پھٹ گئے گرہ میں کوڑی نہ تھی مجبور لڑکے پڑھانے شروع کئے۔ جب کپڑوں کے لائق دام آگئے تو پڑھانا ترک کر دیا اسی زمانے میں مولوی حبیب اللہ

شاہ کی خدمت میں رہے فی الواقع حضرت کی اصلاحی توجہ نہایت عمدہ تھی ہماری طبیعت کو بہت درستی اور اصلاح حاصل ہوئی اور یہ تمام سلوک نقشبندیہ شاہ صاحب قبلہ سے طے کیا جب سیر لطائف و دوائر و انوار کی ہو چکی تو حضرت نے فرمایا کہ لو سید صاحب تعلیم ختم ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی توجہ سے لطائف و دوائر کا خوب تماشہ دیکھا مگر گستاخی معاف ہو خدا کا پتہ تو کسی دائرے میں نہ لگا نہ کسی لطیفے میں یہ سب بھان متی کا سوانگ معلوم ہوتا ہے اس وقت تو یہ بات ان کو ناپسند ہوئی مگر رات کو خود غور و فکر کیا تو بات سمجھ میں آگئی چونکہ نہایت منصف اور دانا آدمی تھے صبح کو فرمانے لگے۔: سید تم سچ کہتے ہو ہم نے جو غور و انصاف کیا تو در حقیقت خدا لئے بے چون و بیچگون کسی دائرے اور لطیفے میں مقید نہیں آفریں صد آفریں تم نے یہ بات سمجھائی صدہا طالب ہمارے پاس آئے مگر کسی نے اس سوجھ بوجھ کی گفتگو نہیں کی۔ آؤ دہلی چل کر شاہ ابوسعید صاحب سے یہ بات عرض کریں چنانچہ شاہ صاحب مجھ کو دہلی لے گئے۔ اول تو شاہ ابوسعید صاحب نے بڑے زور شور کی توجہ دی۔ لوگوں کو خیال تھا کہ دیکھئے کیا حالت ہوتی ہے۔ مگر ہم تو جیسے تھے ویسے ہی اٹھ کھڑے ہوئے بعد اس کے مولانا حبیب اللہ شاہ صاحب نے وہ تقریر عرض کی شاہ ابوسعید صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال تمہارا تو نہیں معلوم ہوتا۔ میاں صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اس وقت جناب شاہ صاحب نے نہایت ہی انصاف کی بات فرمائی اور بہت ہی معقول جواب دیا کہ سنو صاحبزادے جو کچھ ہم کو بزرگوں سے پہنچا تھا وہ تم کو پہنچا دیا۔ اب اگر تمہارا حوصلہ فراخ اور طلب غالب ہے تو اور جگہ تلاش کرو۔

میرٹھ

میرٹھ میں حافظ جلال الدین صاحب گیارھویں کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم پانچ آدمیوں کی دعوت کی جب فاتحہ شروع کی تو گھنٹہ بھر تک بزرگوں کے نام پڑھتے رہے بروح پاک فلاں فلاں۔ آخر ہم نے تھک کر ان سے عرض کیا کہ حضرت سب کے شمار تو ہو گئے ان پانچ صورتوں کے نام بھی پکار دیجئے جو اصل کھانے والے ہیں بزرگوں کو ثواب جب پہنچے گا جب ان پانچوں کا شکم سیر ہوگا۔ اس بات پر بعض لوگ تو ہنس پڑے اور بعض ناراض ہوئے لیکن عبارت فاتحہ ختم ہو گئی۔

کرت پور

جب ہم کرت پور میں گئے تو دیکھا کہ صبح دم آن کر سجادہ نشین صاحب نے حضرت احمد شاہ کے مزار کا طواف و سجدہ کیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب طواف و سجدہ تو یہاں ہوا اگر حضرت غوث الاعظم کے مزار پر آپ ہوں تو وہاں کیا کیجئے گا۔؟ اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے کیا باقی رکھا؟ اور خدا سے تو کچھ مطلب نہیں جس کے لئے کچھ ادب و تعظیم درکار ہو۔ وہ خفا ہو گئے اور بولے کہ میاں طالب علم حجتی ہوتے ہیں اسی واسطے ان کو فیض نہیں ہوتا ہم نے کہا کہ صاحب ایسے فیض کو ہمارا سلام ہے کہ جس کے لئے خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سر جھکائیں۔ اور توحید سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوں۔

شاہ نیاز احمد بریلویؒ

ایک بار شہر بریلی میں گذر ہوا۔ وہاں شاہ نیاز احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ نہایت اخلاق سے پیش آئے ہمہ صفت موصوف تھے۔ ہم چند روز وہاں ٹھہرے ایک دن میاں صاحب فرمانے لگے تم ہمہ اوست کیوں نہیں کہتے ہم نے عرض کیا کہ حضرت جو کہتے ہیں وہ قالی اور خالی ہیں اور جو حالی ہیں وہ کہتے نہیں۔

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند
کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دوسرے یہ کہ ہم ٹھہرے طالب۔ اگر ہمہ اوست کہیں تو طلب کس کی کریں؟ مولانا صاحب تو چپ ہو رہے مگر ان کے خلیفہ صاحب بولے کہ ہمارے حجرے میں آؤ تم کو توجہ دیں گے۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔ وہ حجرے میں جا کر توجہ دینے بیٹھے ہم نے کہا کہ صاحب اس وقت تو آپ بالکل مولانا نیاز احمد معلوم ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے کہا" اجی استغفراللہ۔ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک" ہم نے کہا۔ سبحان اللہ خدا بننے کو تو آپ تیار ہیں مگر نیاز احمد نہیں بن سکتے۔ بس

رکھیے اپنی توجہ۔ ایسی توجہ لس کام کی جو کبھی تو خدا بن بیٹھے اور کبھی بندے کا بھی بندہ۔

لکھنؤ میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب موحّد سے ملاقات ہوئی ان کی عادت تھی کہ جب کوئی آتا تو فرماتے آؤ معبود اور جاتا تو کہتے جاؤ معبود۔ ہم سے بھی حسب عادت یہی کلام کیا۔ ہم نے کہا کہ حضرت معبود معبود تو ہماری سمجھ میں آگیا۔ لیکن آؤ جاؤ کے معنی کچھ نہ کھلے۔ مولوی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن سر اٹھا کر بہت دیر تک ہماری طرف کو دیکھتے رہے۔ خیر تھوڑی دیر بعد ہم چلے آئے پھر نہ گئے۔

کوٹ پتلی

جب ہم کوٹ پتلی سے چلے تو راستے میں ایک مندر ملا وہاں ایک سادھو نہایت دلآویز الحان سے بھجن گا رہا تھا ہم بھی اس کے پاس جا بیٹھے بھجن سنتے رہے پھر ان سے باتیں ہونے لگیں یہاں تک کہ نماز کا وقت آیا۔ ہم نے مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھ لی۔ بعد نماز وہ سادھو جی مخاطب ہوئے کہ میاں صاحب آپ کی طبیعت میں تو بڑی آزادی معلوم ہوتی ہے پھر یہ علت کیوں لگا رکھی ہے ہم نے کہا کہ باباجی علت سے تو نہ تم خالی نہ ہم خالی۔ تم کو اس مورتی کے پوجنے کی علت لگی ہوئی ہے۔ ہم کو نماز کی تم گھنٹا بجاتے ہو ہم تسبیح ہلاتے ہیں۔ بس بے قید تو خدا کی ذات ہے ورنہ سب اپنی اپنی قید میں مبتلا ہیں۔

حج اول کے سفر میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا وہاں سنا کہ ایک سیدالعالم صاحب بڑے کامل فقیر ہیں ان سے بھی ملے انھوں نے تعلیم کا دعویٰ کیا مگر کچھ اس کا ظہور نہ دیکھا گیا چند روز تال بھوپال کے کنارے ایک پہاڑی پر رہے ایک دن سکندر بیگم والیہ بھوپال یہ سن کر کہ کوئی فقیر نو وارد شہر میں آیا ہے۔ ملاقات کو آئیں چند خواص وارالین بھی ہمرکاب تھے خود گھوڑے پر سوار۔ ہمارے قریب آن کر یہ شعر پڑھا:

کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا
جس کو تو ڈھونڈتا ہے تیری بغل میں بیٹھا

اور فرمایا کہ شاید آپ کا ارادہ بیت اللہ کا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں ہے تو سہی۔ اتنے میں دوسری بیگم صاحبہ جو ان کی وزیر تھیں یوں گویا ہوئیں ؎

عابد و معبود دونوں پاس ہیں غافل ترے
کیوں کرے پھر تو ارادہ طوف بیت اللہ کا

ہم نے دیکھا کہ یہ تو سر پر چڑھی جاتی ہیں اب سکوت مصلحت نہیں ناچار تیغ زبان کو خاموشی کی نیام سے کھینچ کر ایک ضرب اس شعر کی لگائی ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

یہ سن کر بیگم صاحبہ بولیں کہ یہ تو شہری معلوم ہوتے ہیں مگر چھوٹ گئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ ـــ بیگم صاحبہ لوٹ گئیں اور گھوڑے سے اتر پڑیں اور کہا کہ ہمارا قصور معاف ہو معلوم ہوا کہ آپ سب طرح درست اور پورے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ آزمائش اور پیمائش کر لیں اگر کمی و بیشی ہو تو قصور از من است۔ پھر تو پھڑک گئیں اور کہنے لگیں میاں صاحب کیا یہاں بولنا بھی خطا ہے؟ ہم نے کہا اس میں شک کیا ہے آپ نے نہیں سنا: مَن سَکَتَ سَلِمَ وَمَن سَلِمَ نَجَا۔ یہاں سب طرح کا سامان موجود ہے دیکھ لو۔ دکھا لو، پرکھ لو، پرکھا لو، سودا نقد ہے اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ بیگم صاحبہ بولیں، بے شک میاں صاحب ہمارا بولنا غضب ہوا اب تمہاری ہماری صلح ہے۔ ہم نے کہا بہت اچھا غرض عذر تقصیر کے بعد نذر پیش کی اور کہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں تو ہم کو ہر وقت آپ کی زیارت نصیب ہو۔ اور آپ کو ہر طرح کا آرام ملے۔ ہم نے کہا کہ بیگم صاحبہ ہم کو تو یہی بڑا آرام ہے کہ آپ اپنا رام نہ بنائیں اور بے کل آرام کرنے دیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئیں اور رخصت ہو گئیں۔

بابا سیتل داس

بھوپال میں ایک ہندو فقیر تھے۔ بابا سیتل داس۔ ہم نے سنا کہ وہ توجہ دیا کرتے ہیں ہم بھی ان کے پاس گئے اور درخواست کی کہا کہ تین دن تک فاقہ کرو نہ ان کھاؤ نہ پانی پیو ہم نے ایسا ہی کیا تیسرے دن باباجی نے توجہ کی تو تمام جسم مثل آئینہ ہو گیا اندر سے لعل و بیر و فی رنگ و ریشہ سب عیاں تھے اور ایک شعلۂ نورانی زمین سے آسمان تک منور معلوم ہوتا تھا ہم نے عرض کیا کہ باباجی ہم کو مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ کے معنی سمجھاؤ

اس توجہ سے کوئی بات حاصل ہوئی نہیں۔ ہم تو دیدِ جاں چاہتے ہیں نہ دیدِ جسم و جہان۔ غیر کو دیکھا تو کیا دیکھا اصل دیکھنا تو اپنا ہی دیکھنا ہے۔ کہا کہ یہ مشکل ہے ہم نے کہا کہ اگر یہ مشکل ہے تو ہمارا ابھی سلام ہے۔

جب ہم نے بھوپال سے آگے کا عزم کیا تو میاں وزیر علی سے پوچھا کہ کچھ خرچ بھی ہے؟ بولے گیارہ ٹکے موجود ہیں ہم نے کہا خرچ تو بہت ہے اب کیا دیر ہے چلو۔ آدھی رات کے وقت ہم دونوں چل نکلے جب اندور میں پہنچے تو کچھ پاس نہ تھا۔ بمجبوری رسالہ کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں کا ملّاں نہایت نیک بخت آدمی تھا۔ اس نے دس بارہ روز ٹھہرایا بوقتِ روانگی پانچ روپے پیش کئے۔ ہم نے سید وزیر علی صاحب کی طرف اشارہ کیا اس نے انکار کیا۔ ہم نے سمجھایا کہ میاں صاحب دعوتِ خدا کو کیوں رد کرتے ہو۔ آپ بھیک نہیں مانگتے۔ مزدوری اور تجارت نہیں کرتے۔ اس فقیری جامے میں تو اسی طور ملے گا بارے مان گئے۔ اور روپے لے کر وہاں سے روانہ ہو کر چاندور پہنچے اکیس دن رہنے کا اتفاق ہوا سید وزیر علی صاحب نے کہ ہمت باندھی اور کتابت و طباعت کے ذریعے سے نو روپے جمع کئے تب وہاں سے آگے کو چلے ایک منزل میں سخت بارش ہوئی ہم دونوں کمبل تان کر بیٹھ گئے تاہم کپڑے بہت بھیگ گئے۔ سردی نے غلبہ کیا سامنے ایک مُردہ ہندو کا جل رہا تھا وہاں خوب آگ تاپی اور کپڑے سکھائے لیکن کپڑوں میں اس کی بدبو بس گئی۔ دماغ پریشان ہونے لگا جب ذرا ابر کھلا تو ہم نے غسل کیا اور کپڑے دھوئے تب ذرا طبیعت صاف ہوئی۔ غرض چلتے چلتے بمبئی میں پہنچے۔ جب بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اس کے معلم سے پوچھا کہ میاں تم کو کبھی کوئی مردِ خدا بھی ملا ہے اس نے کہا کہ ہاں دو مرد ملے ہیں ایک تو اس زمانے میں تشریف لائے تھے جب میں خورد سال تھا اور میرا باپ معلم تھا اور دوسرے اب ملے ہیں ہم نے کہا دوسرا کہاں ہے بولا کہ میرے پاس بیٹھا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم نے کیوں کر جانا کہا کہ مجھ کو ہزار ہا آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقرا کی زیارت کی مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا اور مردِ خدا کا حال نہ پوچھا کیونکہ مرد کو مرد پوچھتا ہے۔

بیت اللہ شریف

بیت اللہ شریف میں حسن علی زمزمی کے حجرے میں ٹھہرے بعد چندے مولوی محمد یعقوب اور مولانا شاہ اسحاق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے مولوی محمد یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہاں آپ نے کوئی فقیر بھی دیکھا کہا کہ ہاں ایک نووارد شہر کے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں وہ بڑے کامل ہیں۔ کل ان کے پاس چلیں گے۔ دوسرے دن گئے تو بہت آدمیت سے پیش آئے۔ مولوی صاحب نے ان سے توجہ کی درخواست کی بولے کہ ابھی تم اس قابل نہیں اگرچہ مہینے تک آتے رہو تو شاید توجہ کے قابل ہو جاؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ صاحب آپ کی توجہ میں ایسی کیا بات ہے۔ کہا کہ مولوی صاحب کی تو کیا ہستی ہے؟ پتھر بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ توجہ تو بہت قسموں کی دیکھی لیکن پتھر توڑ کبھی نہیں دیکھی ہم تین چار آدمی پہاڑ پر گئے اور ایک بھاری پتھر لڑھکا کر لائے اور ان بزرگ کے سامنے رکھ دیا ایک نگاہ ڈالی تو پتھر فوراً ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ہم متحیر ہو گئے کہ

اللہ اکبر بڑے زور کی نگاہ ہے۔ ان کا طریقہ پوچھا تو کہا شیطانیہ۔ ہم سمجھے کہ مقرر، یہ ملامتیہ ہیں۔ اس دن سے ہم روز جانے لگے۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی ہو گئی۔ ایک دن ان کا نام پوچھا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ محمد۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ آپ کا نام تو ابلیس ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ لوگ مجھ کو بہت تنگ کرتے ہیں اس لئے یہ بہروپ بھرا ہے اس میں بہت امن ہے میرا نام محمد ہے اور خاندان قادریہ ہے۔ اس وقت جو صاحب بغداد میں سجادہ نشین ہیں سید محمود رزاقی انھیں سے مجھکو بیعت ہے۔ میرا وطن بھی بغداد ہے اور پیشہ تجارت۔ ملک ملک کی سیر کی ہندوستان کے بڑے بڑے شہر دیکھ آیا ہوں۔ اب کی بار حج کے لئے یہاں چلا آیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب یہ سب کچھ ہی لیکن یہ تو فرمایئے کہ آپ کو تطہیر القلب عن ما سوی اللہ بھی حاصل ہوئی یا نہیں۔ آدمی سچے تھے کہنے لگے کہ میاں اس کی تو ہوا بھی نہیں لگی ہم نے کہا بس صاحب تو جہ پتھر توڑ ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا ؎

قوی شدیم چہ شد ناتواں شدیم چہ شد

چنیں شدیم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد

بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست

تو گر بہار شدی ما خزاں شدیم چہ شد

بیت اللہ شریف میں ہمارے والد ماجد کا ایک مرید شب برات کے دن تھوڑا سا حلوا پکا کر لایا اور کہا کہ بزرگوں کی فاتحہ دے دیجیے ہم نے کہا کہ بھلے مانس دیکھ تو کیسی مصیبت اٹھا کر ہم یہاں پہنچے ہیں بھلا اس ذرا سے حلوے کے لئے کیوں بزرگوں کو تکلیف دیتا ہے اتنی دور دراز مسافت بیچ میں سمندر حائل۔ اور بالفرض وہ آبھی گئے تو اتنے سے حلوے میں کیا بھلا ہوگا۔ کیا تم ان کو آپس میں لڑانا چاہتے ہو۔ ہنس کر کہنے لگا میاں صاحب آپ کو تو ہمیشہ ہنسی کی بات سوجھتی ہے۔ اپنے بزرگوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ خیر ہم نے فاتحہ پڑھ کر حلوا تقسیم کر دیا۔ ایک دن بام کعبہ کی مرمت ہو رہی تھی ہم بھی مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ اور چونے کی ٹوکری سر پہ رکھ کر اوپر پہنچے اور دوگانہ ادا کیا۔ دوسرے دن یہ حال مولوی محمد یعقوب صاحب سے بیان کیا وہ بولے اے میاں کعبے کی چھت پر تو شیطان نماز پڑھا کرتا ہے ہم نے کہا الحمد للہ یہ منزل بھی طے ہوئی اور ایک عقدہ حل ہوا کہ شیطان بھی نماز پڑھتا ہے۔

(بیت اللہ شریف سے واپسی میں) ایک دن حضرت معروف کرخیؒ کی زیارت کو گئے۔ گور غریباں میں آسودہ ہیں مزار خام مگر مرجع انام ہے۔ سنی شیعہ سب ان کی زیارت کو آتے تھے بقول سعدی شیرازی ؎

شنیدم کردر کرخ تربت لبے است

بجز گور معروف معروف نیست

چند روز کے بعد ہمارے ہم نام جن سے بنارس میں ملاقات ہوئی تھی مل گئے۔ ایک روز سنا کہ ہندوستان کے کچھ لوگ سجادہ نشین صاحب کو ایک ایک ریال دے کر حسینی بن گئے اور نسب نامہ بھی حاصل کر لیا۔ حسب اتفاق ایک روز ہم اور ہم نام اور میاں سید علی شاہ صاحب سجادہ نشین ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے اس وقت میاں غوث علی شاہ کو جو کہ سید حسینی تھے ہم نے چھیڑا کہ میر صاحب آپ بھی ایک ریال حضرت کو نذر کر کے اولاد میں شامل ہو جائیے پھر خوب بن آئے گی اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں کچھ کسر ہے یا تم سے کچھ کم ہیں۔ یہ بات سن کر سجادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ تم کو کیوں رشک آیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب رشک تو نہیں مگر شک ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں ہمارے بزرگ بھی کچھ اور نہ رہے ہوں۔ یہاں نام لکھوا کر سید بن گئے ہوں۔ ہم کو تو آج سے اپنی سیادت میں کلام ہوگیا

بصرہ بعد چندے ہم بصرے کو روانہ ہوئے سجادہ نشین صاحب نے ہم کو ایک ناخدا کے نام خط دیا۔ اور کہا کہ وہ تم کو جہاز پر سوار کرا کے بمبئی پہنچا دے گا۔ ہم نے بصرے میں پہنچ کر اس ناخدا کو خط دیا اول اس نے سر پر رکھ کر رقص کیا اور کہا زہے قسمت۔ پھر ہم کو بہت عمدہ مکان میں ٹھہرایا اور کہا کہ ابھی جہاز کی روانگی میں پندرہ دن کا عرصہ ہے۔ آپ گھبرایئے نہیں، شہر کی خوب سیر کیجئے۔ ہم نے کہا کہ اتنا خرچ نہیں کہ سیر کریں۔ کہا کہ خرچ کا فکر نہ کیجیے جو درکار ہو یہاں موجود ہے۔ پھر ہم نے شہر کی خوب سیر کی نہایت ویران مدر

کنگال شہر ہے۔ حضرت حسن بصری اور حضرت زبیر و طلحہ رضی اللہ عنہم کے مزارات متبرکہ کی زیارت کی۔ جو پرانے بصرے میں ہیں اور وہ دوکان بھی دیکھی جہاں حضرت حبیب عجمی کپڑے رنگا کرتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری آن کر بیچتے تھے لیکن رابعہ بصری کے مزار کا پتہ نہ لگا۔ چندہ روز کے بعد جہاز بغلہ پر سوار ہوکر شہر سورت میں پہنچے وہاں سے منزل بہ منزل سیر کرتے ہوئے دہلی میں آ پہنچے اور چھ مہینے تک زینت المساجد میں رہے۔

مرزا غالب سے ملاقات

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آکر لے گئے۔ اور ہمارا احوال دریافت کیا ہم نے کہا مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں مے خوار رو سیہ گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کی کیسی ہے ؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا

اور کہا کہ ظالم پہلے سے کیوں نہ کہا دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں ہم ان کے ہمراہ ہو گئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا۔ اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت کیا بیان کروں نہایت فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیوں کر نہ ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا اس وقت بھی ان کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ۔

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں۔ اور ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

جب ہم زینت المساجد میں ٹھہرے ہوئے تھے ہمارے دوست کمل پوش نے جو بلّی بالشٹر صاحب میں رہتے تھے ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا۔ اور آپ چنپت ہو گئے پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ بچھایا ہوگا مگر پھر معلوم ہوا کہ یوں ہی بٹھا کر چل دیا ہے۔ ہم بہت گھبرائے کہ بھلا ایسی جگہ تم بخت کیوں لایا اور گھڑی کے بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب میں آپ کی پھڑک مٹانے کو یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہٗ اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور کھانا کھلایا۔

دوسرا حج

جب ہم کو زینت المساجد میں چھ مہینے گذر گئے تو ایک دن حسب اتفاق شہزادہ مرزا مشکو آئے اور کہنے لگے کہ حضرت حج کو چلئے گا۔ ہم نے کہا کہ میاں ایک بار تو دھرم دھکے کھا آئے۔ اب اگر کوئی اسی مقام سے سوار کر کے لے چلے اور وہیں لا کر اتارے تو خیر مضائقہ نہیں۔ دوسرے دن انھوں نے سچ مچ گاڑی لا کر کھڑی کر دی۔ اور کہا کہ سوار ہو جائیے۔ پہلے تو ہم حیران رہ گئے کہ کل کی بات ہم تو ہنسی سمجھے تھے۔ خیر اسی دم سوار ہوئے اور منزل بمنزل لدھیانہ پہنچے وہاں سنا کہ حکم الدین شاہ بڑے کامل فقیر ہیں۔ ان کے مکان پر گئے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ہم نے پوچھا حضرت آپ کا اسم شریف بولے: خدا۔ ہم نے کہا سبحان اللہ ہم تو آپ کو آسمان پر تلاش کرتے تھے آپ زمین ہی پر نکلے۔ پھر ہمارا نام پوچھا ہم نے کہا صاحب آپ خدا کیسے ہیں کہ مخلوق کا نام بھی نہیں جانتے۔ ذرا تامل کیا اور سوچ کر بولے کہ تم غوث علی ہو۔ اور تمہارے والد کا نام احمد حسن اور دادا کا نام ظہور الحسن ہم نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا آپ بدتمالی خدا ہیں۔ جب تک ماجرہ ہمیں کھینچتے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ غرض تین دن تک ٹھہرے اور لاہور و ملتان ہوتے ہوئے کراچی بندرگاہ پہنچے وہاں سے جہاز پر چڑھے اور بغداد جا اترے پھر کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت کر کے مکہ معظمہ میں پہنچے اور بعد حج روضۂ منورہ کی زیارت کو گئے۔ پھر مکے میں واپس آئے مولوی محمد یعقوب صاحب سے ملاقات ہوئی فرمانے لگے میاں تم تو ابھی گئے تھے۔ پھر چلے آئے ہم نے کہا کہ صاحب گناہِ عظیم ہوا۔ معاف فرمائیے۔ انشاء اللہ پھر ایسا قصور سرزد نہ ہوگا۔ ہنس پڑے کہ میاں تم تو ہر بات میں قائل کر دیتے ہو۔

مکّے سے روانہ ہو کر بمبئی اور بمبئی سے چل کر دلی آ پہنچے اور جس جگہ سے سوار ہوئے تھے وہیں پھر اترے ہمارا حج بھی ایسے تھے جیسے بچوں کی نماز۔ یعنی نہ ان پر نماز فرض نہ ہم پر حج فرض۔ پھر ہم لکھنؤ گئے۔

گھر کو مراجعت

لکھنؤ سے ہم اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ جب ننھیال کے گاؤں نور پور میں پہنچے تو مسجد میں جا اترے۔ عصر کے وقت ہمارے ماموں صاحب چری کا بار سر پر رکھے مسجد کے سامنے سے گذرے۔ ایک صاحب نے مسجد میں سے پکار کر کہا کہ ہمارے میر صاحب بڑے بھاگوان ہیں جب باہر سے تشریف لاتے ہیں تو بھرے بھتوے آتے ہیں۔ آپ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ پھر نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے میاں جی نے کہہ دیا کہ میر صاحب آج ایک مسافر بھی آگیا ہے۔ بعد نماز مغرب ہم کو اپنے گھر لے جا کر بٹھایا اور خود کسی کام کے لئے باہر گئے۔ گھر میں صرف نانی صاحبہ بخار کی شدت میں پڑی کراہتی تھیں۔ وقت فرصت کو غنیمت سمجھ کر ہم ان کے پاؤں دبانے لگے فرمایا کون؟ عرض کیا مسافر ہوں۔ اور سید آپ کا نواسہ۔ خفا ہو کر بولیں کہ تو میرا نواسہ کیوں ہوتا۔ خدا جانے کون ہے کون نہیں میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگا۔ اتنے میں ماموں صاحب آگئے پوچھا کیا ہے نانی صاحبہ نے فرمایا کہ یہ نامحرم مسافر کہتا ہے کہ میں تمہارا

نواسہ ہوں۔ اور پاؤں دبانے کو آ بیٹھا۔ ماموں صاحب نے کہا خیر نواسہ نہ سہی نواسوں کے برابر تو ضرور ہے۔ اگر پاؤں دباتا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن انھوں نے نہ مانا۔ کھانا کھا کر ہم مسجد میں آ گئے۔ سویرے اٹھ کر گھر کو روانہ ہوئے۔ جب سنفیاں کے گاؤں سے چل کر دہلی میں پہنچے تو محلے کی مسجد میں جا ٹھہرے۔ مسجد کے ملاجی نے ہمارے گھر خبر کی کہ آج ایک مسافر نووارد مسجد میں آگیا ہے شام کے وقت ہمارا چھوٹا بھائی حیدر حسن جس کی عمر بارہ برس کی تھی۔ ہمارے سامنے کھانا لایا ہم نے اس کا اور باپ دادا کا نام اور قوم پوچھی۔ سب باتوں کا جواب ٹھیک دیا۔ پھر تو واپس لے کر گھر گیا اور والدہ صاحبہ سے ساری باتیں بیان کیں وہ سن کر چپ ہو رہیں۔ ایک روز ہم نے حجام کو بلایا اور حجامت بنوائی۔ ہمارے سر میں ایک نشان تھا بشکل چلیپا وہ دیکھ کر بولا کہ اگر قصور معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔ ہم نے کہا کہ اچھا کہو بولا کہ یہ نشان جو آپ کے سر پر ہے میرے ہاتھ کا ہے اب یہ نہیں معلوم کہ آپ وہی ہیں یا کوئی اور۔ ہم نے حال پوچھا تو اس نے ہمارا قصہ ہوبہو سنایا کہ سید احمد علی صاحب کا ایک لڑکا تھا غوث نام اس کے سر میں میں نے ایسا ہی شگاف دیا تھا مدت ہوئی وہ گم ہو گیا۔ آج تک پتہ نہیں ہم نے اس کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔ بھائی حیدر حسن ہمارے واسطے روز کھانا لاتا اور ہم اس سے کچھ نہ کچھ ہنسی کی بات کہہ دیتے۔ ایک دن ہم نے کہا کہ آؤ بھائی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس نے برا مانا اور والدہ سے جا کر کہا کہ یہ مسافر مجھ کو روز چھیڑتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے آج سے روٹی دینے نہیں جاؤں گا۔ اتفاق سے اس روز ملاجی کی کہیں دعوت تھی۔ مغرب کی اذان ہم کو دینی پڑی والدہ صاحبہ نے آواز پہچان لی شام کو جب حیدر حسن کھانا لایا تو یہ پیام دیا کہ کل صبح کو آپ کی دعوت ہے مکان پر چل کر کھانا۔ ہم نے دل میں کہا کہ خدا خیر کرے کہیں بڑی بی نے پہچان تو نہیں لیا صبح کو ہم بلائے گئے پردہ ہوا صحن میں بیٹھے۔ والدہ نے پہلے تو پس پردہ ہم کو خوب دیکھا بھالا پھر باہر نکل ہمارے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور فرمایا کہ مارے تھپڑ — میں بولا مائی صاحبہ میرا کیا گناہ ہے۔ گھر میں بلا کر غریب مسافر کو مارتی ہو۔ فرمایا خوب ابھی انکار کیے جاتا ہے۔ ہم نے تجھ کو کھلایا پلایا پالا پرورش کیا۔ ہماری گود میں ہوش سنبھالا چھوٹے سے بڑا ہوا۔ ہم تجھ کو نہ پہچانیں گے۔ اب چوبیس برس بعد آیا تو چوروں کی طرح مسافر بن کر مسجد میں ٹھہرا۔ اس وقت ہم سے کیا بھول ہوئی کہ بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ میں غوث نہیں ہوں یہ بات منہ سے نکلی تھی کہ انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ ہاں تو غوث نہیں تو اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہم نے قدم بوسی کی انھوں نے ہم کو چھاتی سے لگایا اور زار زار رونے لگیں اتنے میں دوسری والدہ صاحبہ بھی خفا ہوتی آئیں کہ اسے بے مروت بے وفا تو ہم سب کو بھول گیا چوبیس برس میں ایک دفعہ بھی اپنی خبر نہ بھیجی۔ بڑی والدہ نے فرمایا کہ کیا اس نے کہیں شادی کر لی تھی یا کہیں کا بادشاہ بن گیا تھا۔ جو بھول گیا۔ بے چارہ قسمت کا مارا نصیبوں کی گردش سے ادھر ادھر پھرتا رہا یہی غنیمت سمجھو کہ آ نکلا اور ہم کو اپنی صورت دکھا دی اگر نہ آتا تو ہم اس کا کیا کر لیتے۔ المختصر ہم نے منت سماجت کر کے سب کو راضی کیا اور چوبیس روپے جو ہمارے پاس تھے سب کے سامنے رکھ دیئے۔ حیدر حسن سے ہم نے کہا کہ لو اب تو ہم تمہارے بھائی ہیں آؤ مل لو۔ وہ رونے لگا ہم نے پیار کیا۔ اس کا عجیب حال تھا جہاں ہم کو دیکھتا رو دیتا۔ ہم نے بہت پوچھا کہا میں نہیں جانتا کیا بات ہے۔ آپ کو دیکھ کر بے اختیار میرا جی بھر آتا ہے۔ ہمارے آنے کی خبر سن کر نانی صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ میں نے کہا اس وقت آپ نے پاؤں نہیں دبوائے۔ اب میں بھی آپ سے نہیں ملتا۔ فرمایا کہ تو بڑا دغا باز اور فریبی ہے کیوں نہیں کہا تھا کہ میں غوث ہوں پھر میں نے قدم بوسی کی۔ انھوں نے بہت پیار کیا۔

چند روز کے بعد سب گھر والے ہمارے سر ہوئے کہ تمہاری منسوبہ اب تک بیٹھی ہوئی ہے اور کسی سے نکاح نہیں کرتی بہتر ہے کہ اب تم شادی کر لو۔ یہ مضمون سن کر ہم بہت گھبرا گئے۔ آخر بڑی مشکل سے اس نیک بخت کی شادی بھائی سید الحسن کے ساتھ کرا دی۔ کیونکہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ تیرے حصے کی جائیداد موجود ہے۔ مناسب ہے کہ سید الحسن اپنے حقیقی بھائی

کے نام لکھ دے۔ میں نے عرض کیا کہ ان سے کیا خصوصیت ہے مجھ کو تو سب بھائی برابر ہیں۔ چنانچہ سب کو برابر تقسیم کر دی۔

مولانا فضلِ حق خیر آبادی

جب ہم دوبارہ رامپور میں گئے تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضلِ حق صاحب سے ملاقات ہوئی نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ ان کے خرچ کا حساب ہمارے ذمہ ہے اگر پانچ روپے روز بھی اٹھیں تو کچھ مضائقہ نہیں ہم دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ میاں صاحب بلا اجازت ہمارے کہیں چلے نہ جائیں۔ ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آ گیا۔ اپنے والدِ بزرگوار کو یاد کر کے روتے رہے ہم نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی تھی۔ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے وہ عجب زمانہ تھا اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولوی فضل امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضلِ حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی بدصورت عمر زیادہ علم کم، ذہن کند۔ یہ نازک طبع نازپروردہ جمال صورت دامنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال نئی فضیلت ذہن میں جودت بھلا میل ملے تو کیسے ملے اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے جھٹ اس کی کتاب پھینک دی۔ اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا سارا حال بیان کیا۔ فرمایا کہ بلاؤ اس خبیث کو۔ مولوی فضلِ حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا ایسے زور سے کہ ان کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا ناز و نعمت میں پرورش پایا جس کے سامنے کتاب کھلی۔ اس نے خاطر داری سے پڑھایا طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے؟ اگر مسافرت کرتا بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ارے طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔ خبردار تم جانو گے اگر ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا۔

مفتی صدر الدین آزردہ

غرض ہم رامپور میں مہینہ بھر تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ رامپور میں میاں سبحان شاہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے نہایت خاطر مدارات سے اپنے مکان پر ٹھہرایا ہم نے ان کو نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا مگر ہر وقت تسبیح ہاتھ میں اور باوضو درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ ان کی نسبت ایسی تھی کہ جب کوئی مشائخ اُن کے کوچے میں جا نکلتا تو اس کی کیفیت سرد ہو جاتی چنانچہ مشائخوں کا قول تھا کہ اس بدعتی فقیر کے کوچے میں جانے سے قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک نابینا ان کی خدمت میں آیا اور ارادت ظاہر کی۔ شاہ صاحب نے کہا بھلا حافظ جی تم کیسے نابینا ہوئے ہو کہا کہ نو برس کی عمر میں چیچک نکلی تھی جب سے آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ پھر پوچھا بھلا آنکھیں کس نے کھوئی ہیں حافظ جی نے کہا کہ اللہ نے۔ شاہ صاحب نے کہا ارے عقل کے دشمن جس نے تیری آنکھیں کھوئیں تیرے ماں باپ کو مارا اور تیری فکر میں ہے۔ ایسے دشمن کو کیوں تلاش کرتا ہے خبردار اس خبط میں مت پڑ۔ یہ باتیں سُن کر وہ گالیاں دیتا چلا گیا۔ ایک روز مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور سبحان شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے مفتی صاحب کی عادت تھی کہ ہر وقت تسبیح پر نفی اثبات کا ورد رکھتے تھے۔ حسبِ عادت یہاں بھی تسبیح پڑھتے رہے شاہ صاحب نے کہا مفتی صاحب کیا اب تک آپ کا شک رفع نہیں ہوا؟ مفتی صاحب نے سکوت کیا کئی بار پوچھا کچھ جواب نہ دیا جب مفتی صاحب تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ میاں صاحب آپ نے کیا لچر سوال کیا تھا وہ عالم متبحر تھے اگر چاہتے تو ہزار طرح سے جواب دیتے مگر وہ اپنی کسرِ شان سمجھے ورنہ میدانِ سخن تنگ نہ تھا۔ ان کی بخیلی تو دیکھو آپ نے بہت ہی سر مارا لیکن انھوں نے اپنی عادت کو ترک نہ کیا۔ اب میں ان کی طرف سے جواب دیتا ہوں۔ یہ تو فرمایئے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز میں اھدنا الصراط المستقیم

کیوں پڑھتے تھے اور ہر نماز کے بعد تین بار استغفار کس واسطے کہا کرتے تھے۔ کیا حضرت کو کچھ شک تھا۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ حضرت کو شک نہ تھا بلکہ مراتب اعلیٰ کی ترقی کے لئے طلب ہدایت تھی۔ اور مراتب حاصل شدہ کی نسبت استغفار۔ ہم نے کہا کہ بس یہی مقصد ہمارا بھی ہے اگر ہم نے رسولِ خدا کی متابعت کی تو کیا قباحت لازم آئی خدا کی کوئی حد نہ اس کی طلب کی کچھ انتہا۔

غدر ۱۸۵۷ء

ہم رام پور سے چل کر میرٹھ آئے اور چند روز ٹھہرے یہاں ایک مجذوب شتر خانے کے قریب رہتے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن گوروں کا رسالہ ادھر سے گذرا ایک افسران میں سے جُدا ہو کر میاں صاحب کے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا۔ پھر چند چار باتیں کر کے چل دیا۔ ہم نے پوچھا کہ میاں صاحب یہ کیوں روتا تھا۔ اور آپ سے کیا کہتا تھا۔ فرمایا کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک بھید ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو ہم خود بھی جانتے ہیں کہ بھید ہے لیکن آپ بتلائیے کہ وہ بھید کیا ہے۔ کہنے لگا کہ یہ افسر کہتا تھا کہ ان بھائیے کے قتل کا حکم ہوا ہے۔ ہم میں سے بہت لوگ مارے جائیں گے اور بہت کشت و خون ہوگا۔ آپ دعا کریں۔ میں نے کہا قطعی حکم ہو چکا ہے۔ اب دم مارنے کی جگہ نہیں راضی برضا رہو۔ اس وقت تک بالکل امن و امان تھا۔ چند روز بعد ہم وہاں سے بابری چلے گئے اس سے ایک مہینے بعد یکایک غدر شروع ہو گیا۔

جب کسی قدر غدر رفع ہوا تو مجرموں کو انگریزوں نے پھانسی دینی شروع کی۔ ہم کو بھی ایک انگریز نے جو تحقیقات کرتا تھا بمقام شاملی طلب کیا اور پوچھا کہ جب یہاں لڑائی ہوئی اور تحصیل دھقانہ پر لوگوں نے یورش کی تو تم کہاں تھے؟ ہم نے کہا کہ صاحب ہم تو بابری میں تھے۔ اوران دنوں میں ہم کو بخار آتا تھا۔ بولا کہ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو ہم نے کہا کہ صاحب گھبرانے کی بات یہ ہے کہ آپ حاکم ہیں۔ آپ نے بلایا ہم فوراً دوڑے چلے آئے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ دوسرے یہ اندیشہ ہے کہ دیکھئے

آپ کیا حکم کریں۔ بولا کہ سنو صاحب ہم ظلم نہیں کرتا۔ اور خواہ مخواہ کسی کو نہیں ستاتا جس کی نسبت تمہارے بھائی بند قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں۔ کہ یہ مجرم ہے اسی کو ہم سزا دیتا ہے اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں اگر جھوٹ بولا تو یہ عذاب ان کے سر پر ہوگا۔ پھر اپنے خانساماں کو بلا کر کہا کہ ان کو کھانا کھلا دو وہ ہم کو اپنے پاس لے گیا۔ اتفاق سے اس دن صاحب کا بچہ نہایت بے چین ہو رہا تھا برابر روتا تھا زبان تالو سے نہیں لگتی تھی کسی شخص نے صاحب سے کہہ دیا کہ جس کو آپ نے بابری سے بلایا ہے وہ بہت بزرگ آدمی ہے۔ اس بچے پر دعا پڑھ دے گا تو یقین ہے کہ اس کو جلد آرام ہو جائے گا۔ اس نے آیا کے ہاتھ بچے کو ہمارے پاس بھیجا۔ ہم نے کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ خدا کی قدرت بچہ اسی دم چپ ہو گیا۔ صاحب اور میم دونوں اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر ہم کو بلا کر کہا۔ آپ کو اختیار ہے جہاں چاہو چلے جاؤ کوئی مزاحم نہیں ہم وہاں سے

رخصت ہو کر پابری آئے اور بعد چندے سونی پت چلے گئے۔ میر اعظم علی شاہ صاحب قبلہ کے مزار پر چھ مہینے تک قیام کیا۔ وہاں مولوی محب اللہ صاحب پانی پتی سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے کہا کہ مولوی صاحب کسی کامل فقیر کی خبر دو۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں سید احمد شاہ صاحب نہایت کامل آزاد منش درویش ہیں میرا بھی جانے کا ارادہ ہے اگر آپ کا عزم ہو تو باتفاق چلے چلیں۔ ہم نے کہا کہ پہلے اپنے حال کا ایک عریضہ لکھ کر ہم آپ کو دیتے ہیں جو کچھ اس کا جواب آئے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب عریضہ لے گئے۔ جس کا جواب شاہ صاحب نے یوں تحریر فرمایا کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں اگر آپ تشریف لائیں تو شاید آپ کی ذات سے مجھ کو کچھ فائدہ ہو جاوے۔ اس کے بعد ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کچھ روپے جمع ہو جاویں تو چلیں مگر یہ کیوں کر ہوتا ؎

قرار در کف آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

ایک مدت کے بعد کچھ روپیہ جمع ہوا تو قصد کشمیر کیا سونی پت سے چل کر بستم شعبان ۱۲۹۳ھ کو پانی پت پہنچے۔ تو دس دن ماہِ صیام میں باقی تھے۔ دل میں آیا کہ یہ ایام یہیں بسر کریں۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ تھی کہ مولوی محب اللہ صاحب اور منشی مفضل رسول صاحب کا خط آیا کہ سید احمد شاہ صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر سن کر ہم نے ارادہ ملتوی کیا اور قلندر صاحب کے حجرے میں رہنے لگے مشیت ایزدی یہی تھی کہ پانی پت میں قیام ہو۔ (دیمیں ۷ مارچ ۱۸۸۰ء کو مردِ میدانِ تجرید شہنشاہ ممالک توحید سلطان جہاں تفرید نے نہایت الوصال کا پردہ درمیان سے اٹھا لیا)

٭٭

مئی ۱۱ کی تاریخ کی صبح ہمیں غسل و عبادت میں خاصی دیر ہو گئی ورنہ ہم ہمیشہ جمنا پر صبح صادق کو طلوع ہوتا دیکھتے تھے۔ آج ہم نے قدرے ہلکی سحری تناول کی تھی۔ اس میں تیتر اور پلاؤ کے ساتھ دو عدد ثمرِ بہشت (آم) بھی شامل تھے جس کی فصل ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ ہم نے ایک کٹورہ دودھ جس میں زعفران چھڑکی گئی تھی اور جو بہ غایب تھا نوش کیا۔ معمول کے مطابق پان اور حقے کا شغل بھی رہا۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم دیوان خاص میں لوٹ آئے جہاں شاہی طبیب حکیم احسان اللہ خاں پہلے ہی سے شرف باریابی کے خواستگار تھے۔ حکیم صاحب نے ہماری نبض دیکھی اور اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں پوری طرح صحت مند پایا۔ بعد ازاں خواجہ سرا نسبت علی خاں اور وکیل غلام عباس جو ہمارے غلام ہیں شاہی اخراجات کا حساب لگا کر حاضر ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح ہمارے مصارف آمدنی سے کہیں زیادہ تھے۔ ہم نے اسے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اور انہیں اشارے سے چلے جانے کو کہا۔ اسی اثناء میں درخواست گزاروں کا اژدہام اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم ان کی سمت اپنی پشت کر کے جمنا کے خوبصورت منظر میں کھو گئے۔

سورج چڑھ آیا تھا۔ دھوپ پتھروں کی سلوں پر

کپڑوں کو کوٹ رہے تھے اور عورتیں کنارے کی ریت پر دھلے ہوئے کپڑوں کو پھیلا رہی تھیں۔ یکایک ایک کھلبلی سی پیدا ہوئی۔ ہم نے دیکھا کچھ سوار ہوا میں طمنچے دلغتے ہوئے سرپٹ دریا کے پل کے اس پار جا رہے ہیں۔ پل پر تعینات محافظ دستے کے سپاہی انہیں روکنے میں ناکام رہے۔ گھوڑ سوار دریا کی ریت پر سے ہو کر ہماری سمت مڑ گئے اور چشم زدن میں محل کی دیوار کے پاس پہنچ کر اپنی باگیں کھینچ لیں اور پھر ایک ساتھ "دہائی ہے! دہائی ہے۔ ہماری فریاد سنو! ہماری فریاد سنو!" کی رٹ لگانے لگے۔ کچھ نے "بادشاہ سلامت زندہ باد" کے نعرے بھی لگائے۔ ہم نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا۔ گھوڑ سوار ایسٹ انڈیا کمپنی کی وردی میں تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر ہم پر پڑی سب نے مؤدبانہ ہمیں سلام کیا اور بلند آواز "شہنشاہ ہندوستان زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ ان میں سے ایک نہایت اونچی آواز میں چیخا۔

"ہم نے میرٹھ میں فرنگیوں کو قتل کر دیا ہے۔ نصاریٰ ہمارے ایمان اور مذہب کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کو ان ناپاک کافروں کے وجود سے پاک کر دیں گے۔ جہاں پناہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنائیں گے۔ اس کے بعد وہ سب ایک ساتھ چیخنے لگے "خاندان مغلیہ زندہ باد، خاندانِ مغلیہ زندہ باد"

اسی عرصہ میں میرٹھ کے سپاہی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے ہمارے حرم کے محلات کے قریب آ پہنچے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے۔ "ملکۂ ہندوستان زندہ باد" دریا کے پل سے آنے والوں کی تعداد اب خاصی ہو گئی تھی۔ کپتان ڈگلس جو محل کے محافظ دستے کا سردار تھا ہمارے حضور باریاب ہوا اور نیچے جا کر ان سواروں سے گفت و شنید کی اجازت چاہی لیکن ہم نے اسے اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے باز رکھا۔

"آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے سواروں سے دریافت کیا۔ بادشاہ سلامت کو اس طرح پریشان کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا؟ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم سب اسی وقت اپنی اپنی رجمنٹوں کو لوٹ جاؤ۔ ورنہ تمہیں اس کی سخت سزا دی جائے گی۔"

کپتان ڈگلس ہم سے اجازت لے کر ان باغیوں کی سرزنش کے لئے رخصت ہو گیا۔

ہم انتظار کرنے لگے۔ معاً ہم نے سپاہیوں کو کمپنی کی وردیاں پہنے پل پر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ مسٹر سائمن فریزیر نے جو قلعہ ہی میں رہتا تھا ہماری خدمت میں ایک قاصد بھیجا اور ہم سے درخواست کی کہ اسے ایک ساتھ قلعہ کی دیواروں پر توپیں نصب کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے حرم کی فینسیں مستعار دے دی جائیں تاکہ انگریز خواتین کو ہمارے حرم میں تحفظ کے ساتھ منتقل کیا جا سکے۔

ہم نے اس کی درخواست پر فوری عمل درآمد کا حکم دیا لیکن شومئ قسمت سے جس کو ان احکامات کی تعمیل کرنا تھی وہ خواجہ سرا نسبت علی خاں تھا۔

قاصد نے خبر دی کہ شہر کے مختلف علاقوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ اس وقت جبکہ تصادم کی آگ زیادہ نہیں بھڑک پائی تھی، اگر ہم چاہتے تو مکر و فریب کے پانی سے ٹھنڈا کر سکتے تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ باغیوں کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ہم نے صاحب لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ شہر سے باہر جا کر ان لوگوں سے کسی قسم کی گفت و شنید نہ کریں لیکن کسی نے نہ سمجھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم نے سنا کہ باغی شہر میں داخل ہو چکے ہیں اور انہوں نے دریا گنج کے کچھ یورپیوں کو قتل بھی کر دیا ہے۔

ہمیں قلعہ کے یورپیوں کے تحفظ کی فکر لاحق ہو گئی۔ ہم نے دریافت کیا کہ کیا انگریز خواتین ہمارے حرم میں پہنچائی جا چکی ہیں؟ اسی اثنا میں ہمیں اطلاع ملی کہ کپتان ڈگلس، مسٹر فریزیر اور ان کی مستورات کو بھی ان کے کمروں میں قتل کر دیا گیا ہے۔

ہم نے محسوس کیا کہ ہم سپاہیوں کے جم غفیر میں گھرے ہوئے ہیں جن میں ہمارے محافظ دستے کے بیشتر سپاہی بھی شامل تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنا جائز حکمران اور شہنشاہ

کشمیری گیٹ پر فرنگیوں اور مغل فوج کا ٹکراؤ

ہندوستان تسلیم کر لیا اور "شہنشاہِ ہندوستان زندہ باد" کے نعرے بھی لگائے ۔ ہم نے احتجاج کیا ۔ ہم ایک فقیر ہیں جو اس بدبخت زمین پہ اپنی زندگی کے ایام یونہی گزار رہے ہیں ۔ ہمارے بازوؤں میں طاقت نہیں رہی ۔ ہماری کمزور آواز اس قلعہ کی دیواروں کے باہر نہیں سنی جاتی تھی" لیکن ان لوگوں نے ہماری ایک نہ سنی ۔ ہماری حیثیت اس کاغذ کی ناؤ کی سی تھی جسے ایک پہاڑی چشمے کے تیز دھارے پہ چھوڑ دیا گیا ہو ۔

اس دن صبح سے شام تک ہمارے محل میں سپاہیوں کا تانتا بندھا رہا ۔ جو بغیر کسی اطلاع اور ہماری اجازت کے بے روک ٹوک گھستے چلے آ رہے تھے ۔ انہوں نے شاہی آداب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا اور ہمارے خادموں کو دھکیلتے ہوئے دیوانِ خاص میں جو کہ اہم ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھا در آئے تھے ۔ کچھ نے چاندی کے سکے نذر کے طور پہ پیش کئے اور بعض نے صرف ہاتھوں کو بوسہ دینے پہ ہی اکتفا کی ۔ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں پھر ایک دھماکے کے ساتھ ہماری آنکھیں کھل گئیں ہم بیدار ہو گئے ۔ ہم نے محسوس کیا جیسے بادل گرج رہے ہیں اور ہمارے محل کی دیواریں کسی زلزلے کے جھٹکوں سے دہل رہی ہیں ۔ معاً ہمیں خبر ملی کہ انگریز سپاہیوں نے کشمیری دروازے کے بارود کے ذخیرے کو آگ لگا دی ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں ہندوستانی لقمۂ اجل بن گئے ہیں ۔ اب پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ چکا تھا ۔

دوپہر کے بعد تقریباً چالیس یورپین جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور جن کی مشکیں کسی ہوئی تھیں ہمارے سامنے پیش کئے گئے ۔ ان کے پیچھے زبردست بھیڑ تھی جو کہہ رہی تھی ۔ "ان لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے ۔ ہم انصاف چاہتے ہیں ۔ ان غیر ملکیوں کو پھانسی دی جائے یا پھر انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے ۔"

یہ لوگ بارود کے ذخیروں کی آگ سے مرنے والوں

کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس سفید قوم نے ہمارے اجداد کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو انتقامی کارروائی کر سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ دیر تک بھیڑ میں کھلبلی مچی رہی لیکن سمجھدار لوگوں کے سمجھانے پر وہ اپنے بادشاہ کی مرضی کے سامنے جھک گئے۔ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم جہاں پناہ کا"۔ نعرے لگاتے ہوئے یہ لوگ رخصت ہو گئے۔

ہم نے مغرب کی نماز موتی مسجد میں ادا کی۔ جب ہم مسجد سے باہر آئے تو لوگوں نے فرنگی کے خون کا مطالبہ کیا اور نعرے لگائے چند گستاخوں نے انگریز قیدیوں کو ان کے حوالے کرنے کی مانگ بھی کی۔ ہم نے شہیدوں کے اعزا سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور مشیت ایزدی پر شاکر رہنے کی تلقین کی۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ گھر جا کر مقتولین کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں۔

مغرب کے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ جامع مسجد میں ہمارے نام کا خطبہ بھی پڑھا گیا۔ اس طرح تقدیر نے ہماری زندگی کی پتنگ کو جس کی ڈوری ہمارے ہاتھوں میں نہیں تھی، بکھرے ہوئے بادلوں میں چھوڑ دیا ہم اپنے اجداد کے تخت پر بیٹھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ ہماری رعایا نے عقیدت اور احترام کی بارش شروع کر دی۔ یہ سلسلہ شاید ابھی اور کچھ دیر چلتا رہتا لیکن غروب آفتاب کے ساتھ قومیں سرکی جانے لگی تھیں۔

ہم نے تخلیہ کی خواہش کی تاکہ ہم غور و فکر کر سکیں۔ ہم کافی دیر تک دیوان خاص میں اپنی نشست سے ٹیکے رہے۔ ہماری آنکھیں اس کی چھت پر مرکوز تھیں ہمیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب یہ سونے اور چاندی کے پتروں سے مزین تھی لیکن اب جگہ جگہ اس کا رنگ چونا تک نکل گیا تھا۔ سنگ مرمر کے ستون تو وہی تھے جن میں کبھی لعل شب چراغ، یاقوت اعلیٰ اور نیلم اور پکھراج جڑے ہوئے تھے لیکن اب ان میں سوائے سوراخوں کے کچھ اور باقی نہ رہا تھا۔ ہماری نگاہ ان مٹے ہوئے حروف پر پڑی جو ہمارے مورث اعلیٰ شاہجہاں کی عظمت اور جاہ و جلال کے عہد پرشکوہ کے نقیب تھے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است!
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است!

ہمارے سینے سے ایک آہ اٹھی اور ہماری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

ہماری محبوب ملکہ زینت محل ہمارے ساتھ روزہ افطار کا شرف حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ہم بیگم زینت محل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دسترخوان پر کھانا پہلے ہی چنا جا چکا تھا۔۔ فانوسوں پر یاسمین اور مولسری کے ہار آویزاں تھے۔ گلدانوں میں کیوڑہ سجایا گیا تھا جونہی ہم اندر داخل ہوئے خادمائیں جھک کر آداب بجا لائیں اور باہر نکل گئیں۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے اور تھکی ہوئی کمر گاؤ تکیے سے لگا دی۔

آج بیگم زینت محل سرتاپا دلہن بنی ہوئی تھیں اسی طرح جیسے آج سے سترہ سال قبل جب میں نے انہیں اپنی دلہن بنا کر حرم میں داخل کیا تھا جسم پر اطلس و کمخواب کا سنہرا جھلملاتا ہوا لباس سر پر مکڑی کے جال کا دوپٹہ جس کے نیچے نرم و سیاہ زلفیں ناگوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ اس پر زمرد اور ہیروں کے وہ زیورات بھی تھے جو ہم نے انہیں تحفتاً پیش کئے تھے۔ ان کی غزالی آنکھوں میں تمناؤں کے چراغ جگمگا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ باوقار انداز سے خرام ناز کرتی ہوئی ہماری سمت بڑھ رہی تھیں۔ اگرچہ ان کے پیروں میں گھنگھریاں نہیں بندھی تھیں لیکن ہمارے کانوں میں ان کی نغمگی گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے شمعوں کی لویں بڑھا دی ہیں۔ اور سارا ماحول جگمگا اٹھا ہے۔ فصاحت کی زبان ان کے حسن کے اظہار سے قاصر ہے۔ ہماری زبان سے بے اختیار۔۔۔ "سبحان اللہ" نکل گیا جب ہم نے ان سے شادی کی تھی تو ان کی عمر ۱۹ سال تھی اور ہم زندگی کے ۶۵ سال گزار چکے تھے۔ گزشتہ سترہ سالوں نے ان کے حسن کو نکھار دیا تھا اور ہمارے دل میں ان کے لئے بے پناہ طلب و تڑپ پیدا کر دی تھی۔ کاش اس وقت ہم ان کی آغوش میں اپنا سر رکھ سکتے۔ اور اپنے سفید بالوں میں ان کی مخروطی انگلیوں کے لمس کو محسوس

کر ملتے۔ ہمارے لیے خصوصی طور پر تیار کئے گئے لذیذ کھانوں کے بجائے ان کے حسن سحر انگیز نے ہمیں مبہوت کر دیا شاید انہوں نے ہمارے چہرے کو پڑھ لیا اور بات کا رخ پھیرنے کے لئے بولیں۔

"عالم پناہ کو اہتمام میں کوئی کمی تو محسوس نہیں ہوئی"

ہم نے موقع کی مناسبت سے سعدی کا ایک شعر پڑھا اور ہم نے دیکھا کہ ان کے رخسار گلنار ہو گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ زینت نے آج ہمارے لئے پسندیدہ کھانے تیار کئے تھے ان میں ہرن کے گوشت کے کباب، نورتن چٹنی۔ بھنا ہوا تیتر اور مور کے بازو۔ قلفی جس پر سونے کے ورق جمے ہوئے تھے اور جام کی چھوٹی چھوٹی قاشوں سے سنوارا گیا تھا بیگم نے ہمارے ہاتھ دھلائے اور اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر ہمارے منہ میں رکھ دیا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ بیگم نے اس خلوص و دل نوازی کا مظاہرہ آخری بار کب کیا تھا کھانے کے بعد بیگم نے پان کا بیڑہ بنایا اور اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

ہم یہاں چبا رہے تھے کہ بیگم نے قدرے جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات ہمارے ساتھ گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمیں قدرے تعجب ہوا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ عمر کے بوجھ نے ہماری خواہش کو سرد کر دیا تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی ہم نے ایک بیل کو جو ہاتھی پر دوڑا کر اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دیا تھا۔ خدا نے ہمیں بھرپور جسمانی طاقت سے نوازا تھا۔ یہ عمر کا سبب نہیں بلکہ مقدس مہینے کے احکامات تھے جس کے باعث دل اور دماغ میں ایک قسم کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ بیگم نے ہماری آنکھوں میں اس کشمکش کو پڑھ لیا اور بولیں "شریعت نے مخصوص حالات میں کچھ رعایتیں دی ہیں اور چونکہ ہم ایک مقدس جنگ سے دوچار ہیں اس لئے خدا ہماری معمولی غلطی کو معاف فرمائے گا۔"

ان کے بدن سے اٹھتی ہوئی مہک اتنی مسحور کن اور نرم گداز جسم کے پیغام کی تپش اتنی جھلسا دینے والی تھی کہ باوجود عمر کے بیاسی سالوں اور طویل دن کی تھکن کے ہم نے اپنے اعضا سے تکلیف کو جھٹک دیا اور ایک مچھہ شربت نوش کیا جو حکیم

احسان اللہ خاں نے ایسے ہی موقع کے لئے تیار کیا تھا۔ کچھ وقفہ کے بعد ہم نے بیگم کو اپنی آغوش میں اسی شدت جذبات سے جکڑ لیا جس طرح پہلی بار ہم نشۂ وصل سے سرشار ہوئے تھے۔ ہماری زبان پر حافظ کے اشعار تھے کہ امڈے چلے آتے تھے۔

ہم دونوں جوان عاشقوں کی طرح باہوں میں باہیں ڈالے کافی دیر تک لیٹے رہے۔ جب توپیں داغی جلنے لگیں تو ہماری آنکھیں کھلیں۔ زینت محل کی غلافی آنکھوں میں شرم و حجاب کی صہبا موجزن تھی۔ انہوں نے فوراً اپنا لباس درست کیا اور ہم سے دریافت کیا۔ رات کی ان گھڑیوں میں کون توپیں سر کر رہا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے گننا شروع کیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ اکیس۔ شہنشاہ ہندوستان کو ہ۔ ی کا آداب۔ اس لونڈی کو اجازت دیجئے کہ وہ عالم پناہ کو سب سے پہلے ہدیہ تہنیت پیش کرنے کا شرف حاصل کرے۔ تین مرتبہ فرشی سلام کرنے کے بعد وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس سے قبل کہ ہمارے خادموں میں سے کوئی بیدار ہو

ہم جاگ اٹھے اور برج کی طرف چلے آئے تاکہ تنہائی میں چند ساعتیں ہم صرف اپنی ذات کے ساتھ گزار سکیں۔ گزشتہ روز پیش آنے والے واقعات ایک ایک کرکے ہمارے ذہن کی سطح پر ابھرنے لگے اور ہم سوچنے لگے کہ کیا ہم نے واقعی کوئی صحیح... اقدام کیا تھا۔ کیا درحقیقت ہم... اپنی تقدیر کے مالک ہیں۔؟ یا مداری کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی؟ ہمارے ذہن کا آئینہ دھندلا گیا۔ ہم صرف نام کے بادشاہ تھے۔ ہم اس محل میں رہتے تھے جو ایک زمانے میں دنیا کا سب سے خوبصورت محل کہلاتا تھا۔ لیکن اب جو صرف کہنے کو محل رہ گیا تھا اور جو ہمارے بعد ہمارے ورثار کو نہیں ملنے والا تھا۔ ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہماری موت کے بعد (خدا کرے کہ وہ جلد آئے) ہمارے خاندان کے افراد سے لال قلعہ خالی کروالیا جائے گا۔ فرنگی نے ہمارے اجداد کے چھوڑے ہوئے ورثہ کے سمندر سے ہمیں صرف ایک قطرہ عنایت کیا تھا۔ ہم نے اس قطرہ کو قبول کرلیا تھا اور اسے "خراج" کہتے تھے۔

ایک شہنشاہ کو پیش کی جانے والی نذر کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن فرنگی اسے پنشن کہتا تھا۔ ایک شہنشاہ اور اپنی رعایا کا پنشن خوار!!

ایک پریشان کن مسئلہ ہماری جانشینی کا تھا۔ بیگم زینت محل چاہتی تھیں کہ مرزا جواں بخت کو دیگر بڑے بیٹوں کے مقابلہ میں ولی عہد نامزد کر دیا جائے۔ ہم نے زینت محل کی بات مان لی اور مرزا جواں بخت کے نام کی گورنر سے سفارش کر دی۔ ایک بار پھر گورنر جنرل نے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور ہمارے بیٹوں میں سے جس کا نام مرزا فخرو تھا ہمارا جانشین تسلیم کرلیا۔ اس نے فخرو کو رشوت دے کر ایک دستاویز پر دستخط کروالئے جس کی رو سے (جانشین بننے کے بعد) فخرو کو لال قلعہ سے دست بردار ہونا تھا اور اس کے بدلے ایک حقیر پنشن ملنی تھی۔ فرنگی زمین پر ہمارے قیام کو مختصر ترین کرنے کے لئے اس قدر مضطرب تھا کہ ایک بار جب ہم بیمار پڑے تو اس نے محل کے دروازوں پر اپنے سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا۔ مجبور ہوکر ہمیں ریزیڈنٹ کو ایک رقعہ لکھنا پڑا کہ "جناب والا کیا ہم کو اطمینان سے مرنے کی عزت بھی نصیب نہیں ہوگی؟ کیا آپ کو یہ شک ہے کہ ہماری لاش آپ کے خلاف ہتھیار اٹھالے گی؟"

ہم نے شہزادوں، امراء اور سپاہیوں کے نمائندوں کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ انتظامیہ کو نئے سرے سے چاق و چوبند کیا جائے اور غیر ملکیوں کو ہمارے ملک سے نکالنے کے منصوبے تیار رکھے جائیں۔ جلسہ نے ہمارے بڑے بیٹے مرزا افضل کو سپہ سالار اعظم منتخب کیا۔ مرزا ابوبکر کو جو فرنگی سے نبرد آزمائی کے لئے بہت بے چین تھا کرنل کا عہدہ تفویض ہوا۔ جلسہ کے اختتام پر ہم نے حسن عسکری کو بلوا بھیجا۔ حسن عسکری ایک خدا رسیدہ درویش تھے۔ سخت عبادت و ریاضت کے سبب خدا نے انہیں روشن ضمیر کر دیا تھا۔ ان کی آنکھیں مستقبل کو دیکھ سکتی تھیں۔ وہ ہماری مرحوم بیٹی نواب بیگم کے مکان واقع دریا گنج میں رہتے تھے۔ جب تک حسن عسکری ہم تک پہنچیں ہم نے آج کے اخباروں کو پڑھ کر سنائے جانے کا حکم دیا۔ یہ اخبار "دہلی اردو اخبار"، "سراج الاخبار" اور "صادق الاخبار" وغیرہ تھے۔ ان میں بارود کے ذخیروں کی آگ کا آنکھوں دیکھا حال درج تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سیکڑوں شہیدوں کے نام بھی تھے جو اس ذخیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ہم نے دریافت کیا کہ انگریزی اخبار "دہلی گزٹ" نے اس موضوع پر کیا لکھا ہے؟ ہمیں بتایا گیا کہ دہلی گزٹ شائع نہیں ہو سکا کیونکہ اس کے عملہ کے تمام انگریز کارکن قتل کر دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک شخص جو امریکی تھا اور جس نے اسلام قبول کرلیا تھا بمشکل بچ سکا تھا۔ ہم نے بغیر کسی تبصرے کے ان خبروں کو سنا اور اخبار والوں کو چلے جانے کو کہا۔ اتنے میں حسن عسکری داخل ہوئے۔ وہ خدا رسیدہ انسان تھے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی تھی کہ ان کی زندگی کے بیس سال ہماری عمر میں جوڑ دیئے جائیں۔ ہم نے انہیں اپنے پہلو میں بٹھالیا اور شہر میں اٹھتے ہوئے طوفان کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ درویش نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تسبیح کے دانے گھمانے شروع کر دیئے۔ کچھ وقفہ کے بعد انہوں نے اپنا چہرہ چھت کی طرف اٹھایا۔ دونوں ہاتھ

سے اپنی داڑھی کو سہلاتا اور کہنا شروع کر دیا۔
"عالم پناہ کو میرا وہ سیلاب والا خواب تو یاد ہوگا۔
جس میں سوائے تخت کے اور ہر چیز غرق ہوگئی تھی۔ عالم پناہ!
یہ سیلاب آپ کے خاندان کے دشمنوں کو غرق کر دے گا۔
صرف تختِ طاؤس ہی اس سیلاب میں باقی رہ جائے گا۔"
"امین ثم آمین۔ اللہ اپنے محبوب بندوں کی دعا ضرور
قبول کرتا ہے۔" ہم نے تائیداً کہا۔ اگرچہ سو سال قبل نادر
شاہ تخت طاؤس کو ہندوستان سے لے گیا تھا لیکن ہماری
رعایا آج بھی اس تخت کو جس پر ہم بیٹھے ہیں، تختِ طاؤس
ہی کے نام سے پکارتی ہے۔"

ہم نے حسن عسکری کا شکریہ ادا کیا اور درخواست
کی کہ وہ ہمارے لئے دعا کرتے رہیں۔ ہم نے ان کی ہتھیلی
پر سونے کی ایک مہر رکھ دی اور اس سے قبل کہ وہ اس
پر کچھ اعتراض و احتجاج کرتے ہم اپنے حرم میں چلے آئے۔
ہم بیگم زینت محل کو ان تمام واقعات سے خبردار کرنے کے
لئے بہت بے چین تھے۔

زینت نے ہماری آنکھوں کے استعجاب کو پڑھ لیا۔
"عالم پناہ" "قسمت کے نوشتے کو پڑھنے کا میرا اپنا خود
کا ایک طریقہ کار ہے۔ اس کی بشارت تو مجھے حافظ نے دی۔"
یہ کہہ کر انہوں نے دیوانِ حافظ کی ورق گردانی شروع کر دی۔
اب ہمارا استعجاب قدرے دور ہو چکا تھا۔ بیگم نے دیوانِ
حافظ سے فال نکالی تھی۔ جو درویش کی پیش گوئی سے بالکل
مشابہ تھی۔ فرطِ محبت سے ہم نے بیگم کے رخساروں کو چوم
لیا۔ وہ شرم سے گلنار ہوگئیں۔ اس شورش کے پہلے دو دنوں
میں ہم نے محسوس کیا کہ واقعی ہم ہندوستان کے شہنشاہ تھے
اور فرنگی ہماری سلطنت سے اپنے خیمے اکھاڑ چکا تھا۔ لیکن
تیسرے دن ہماری آنکھوں سے پردہ ہٹا۔ ہمارے فرزند
مرزا مغل نے ایک حکمراں کے تمام اختیارات غصب کر لئے
تھے۔ عوام اس سے احکامات حاصل کرنے لگے تھے یہاں
تک کہ ہمارے بھی ملازم خواجہ نسبت علی خاں وغیرہ اس
کے درباریوں میں شامل ہوگئے تھے۔

شہزادہ مرزا مغل عوام کے غم و غصہ کو ان لوگوں
کے خلاف مبذول کر رہا تھا۔ جو ہمارے تحفظ میں تھے۔۔
ہم نے انہیں سمجھایا اور ہوشیار کیا کہ وہ نسبت علی خاں جیسے
لوگوں کی باتوں میں نہ آئے لیکن بے سود نکلا۔ تین روز
بعد شاید اس روز ۱۶ کی تاریخ تھی۔ ان لوگوں نے قیدیوں
کو ان کی کمین گاہوں سے باہر کھینچ نکالا۔ اور ۴۹ لوگوں
کے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے نہایت بے رحمی
سے گلے کاٹ ڈالے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بے زبان
قربانی کے بکرے ذبح کئے جا رہے تھے۔ ہمارے محل کے مقابل
شاہی فوارہ ان بے گناہوں کے خون اور لاشوں سے بھرا تھا۔
کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ عوام نے اشتعالاً حکیم احسان اللہ خاں کے
مکان کو آگ لگا دی۔ ہم نے اپنے محافظوں کو روانہ کیا تاکہ وہ
حکیم صاحب کے متعلقین کو بچا سکیں۔ اس کے بعد غم و غصہ
میں بجھے ہوئے یہ لوگ دیوانِ خاص میں گھس آئے اور ہم
پر غداری کے بے ہودہ الزام عائد کرنے لگے لیکن ہمارے
استقلال نے حالات کو مزید ابتر ہونے سے بچا لیا۔ ہم نے
قسم کھائی کہ اگر کسی شخص کے قبضہ سے حکیم صاحب کی املاک
برآمد ہوئی تو ہم اس کا پیٹ چیر ڈالیں گے۔

دہلی میں شک و شبہ کی فضا قائم تھی۔ ہم اس نتیجے
پر پہنچے کہ تقدیر نے ہمارے خلاف پانسا پھینکا ہے۔ اور ہم
جیت نہیں سکتے۔ دہلی پر آفت نازل ہو چکی تھی۔ دانش مندی
کا تقاضا تھا کہ ایسی صورت حال میں ہم جو بھی کر سکتے تھے ضرور
کرتے۔ ہم نے دشمن کی سپاہ کے کمانڈر ولسن صاحب کے
پاس رازدارانہ طور پر ایک قاصد روانہ کیا اور کہلوا دیا کہ اگر
ہمارے بچوں اور زینت محل کی ضمانت دی جائے اور ہماری
پنشن بحال کر دی جائے تو ہم کوشش کریں گے کہ شہر کے دروازے
آپ کے سپاہیوں کے لئے کھول دیتے جائیں۔

ہم انتظار کرنے لگے تاآنکہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ۱۴ ستمبر
کو فرنگی اور اس کے حلیفوں نے جن میں پٹھان، پنجابی مسلمان
سکھ اور گورکھے وغیرہ شامل تھے۔ دہلی پر حملہ کر دیا۔ شہر پناہ
کی دیوار کا شمالی حصہ جو دریا تک چلا گیا تھا مسلسل گولہ بارود
کی زد میں رہا۔ توپ کے کچھ گولے لال قلعہ میں بھی گرے۔ کچھ
لوگوں کے مکانات کو بھی نقصان پہنچا۔ جنرل بخت خاں نے

انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا وہ ہر محاذ پر نظر آتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہمارے حضور میں حاضر ہوا اور تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ دشمن شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہر گلی کوچہ میں لوگوں نے اس کا دلیری سے مقابلہ کیا عورتوں اور بچوں نے بھی حملہ آوروں پر پتھروں کی بارش کی۔ لیکن خدا کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

۱۴ ستمبر کو بخت خاں نے ہمیں یہ دل سوز خبر سنائی کہ دہلی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ اس نے ہمیں اپنے ساتھ اودھ چلنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں سے جنگ کو جاری رکھا جا سکے۔ ہم نے مجبوری ظاہر کی۔ عمر کے بیاسی سالوں کا بوجھ ہمارے کمزور جسم سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہم نے بھی دہلی کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے ہم نے سوچا کہ مہرولی چلے جائیں جہاں ہم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے روضۂ مبارک سے قریب رہ سکیں گے۔ لیکن مرزا الٰہی بخش نے جو مرحوم مرزا فخرو کے خسر تھے ہمیں اپنے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینے کا مشورہ دیا۔ ان کے خیال میں مہرولی کا دفاع ناممکن تھا۔ اس کے برعکس یہ مقبرہ چھوٹے سے قلعہ کی طرح تھا جہاں سے ہم صاحب لوگوں سے مراسلت کر سکتے تھے۔

ہم نے اس مشورہ کو قبول کر لیا۔ آخر کار وہ گھڑی آ پہنچی جب تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے جدائی کے نقارہ پر چوب ماری۔ ہم نے رختِ سفر باندھا اور آگرے شاہراہ پر چل پڑے۔

ہمارے ساتھ ہمارے حرم کے افراد، امراء اور خادموں کی ایک لمبی قطار تھی۔ جو ہمارے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ راستہ میں ہم نے سیکڑوں لوگوں کو بیل گاڑیوں، اکوں اور خچروں پر سوار دیکھا اور سیکڑوں لوگ ایسے تھے جو پیدل چل رہے تھے۔ جب عرب کی سرائے کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ مقبرہ کے گرد و نواح کے تمام باغات لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹے، پوتے، بھتیجے، بھتیجیاں نیز دیگر اعزا اور ان کے خاندان کے افراد پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

ہم نے اپنا بوجھل سر اپنے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ ہمایوں کے قدموں میں رکھ دیا اور قبر کے پتھر سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔

دوسرے دن علی الصبح جبکہ لوگ اپنی اپنی چادریں اوڑھے مردوں کی طرح لیٹے ہوئے تھے ہم نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کی راہ لی۔ آج کسی نقیب نے بادشاہ غازی ظل اللہ اور شہنشاہ ہندوستان کی آمد کا اعلان نہیں کیا۔

ہم دو دن تک انتظار کرتے رہے۔ تیسرے دن ایک گورا پچاس سکھ گھوڑ سواروں کے ساتھ دروازہ پر آیا۔ ان کا قاصد ایک چاپلوس اور مکار رجب علی تھا۔ اس خوشامدی نے بارہا ہمارے حضور سرِ نیاز خم کیا تھا اور زمین پر دونوں زانوں ہو کر ہمارے پیروں کو چومنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ مرزا الٰہی بخش نے ولسن صاحب

اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسی اثنا میں ایک اجنبی دہلی میں نمودار ہوا جس کا نام بخت خاں تھا ہم نے اس کو ایک خلعت عطا کی اور اسے جنرل بخت کے نام سے پکارا۔

"بخت خاں! ہم تمہیں اپنا جرنیل اور اپنی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کرتے ہیں۔ خدا تمہاری تلوار کو فتح و نصرت سے ہم کنار کرے۔" ہم نے اس سے کہا۔

بخت خاں کی آمد کے ساتھ بارش بھی آئی۔ ہمارے خزاں رسیدہ باغ میں کچھ دیر کے لئے بہار آ گئی۔ کچھ عرصے کے لئے ہم نے بخت خاں کو جنگ کے معاملات کا مختار بنا دیا ہم اپنے دن "ساون، بھادوں" میں گزارنے لگے۔ جنہیں ہم نے موتی مسجد کے عقب میں باغ حیات بخش میں تعمیر کروایا تھا۔ ہماری رعایا اسے ہمارے نام کی رعایت سے "ظفر محل" کے نام سے پکارتی تھی۔ یہاں ہم مشاعرے منعقد کراتے اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتے۔ اس سال ہم نے تاج محل بیگم کے اعزاز میں جو بیگم زینت محل کی چھوٹی بہن تھیں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا تھا۔

کئی دنوں سے ہم نے توپوں کی آواز نہیں سنی۔ سوائے بادلوں کی گرج۔ بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ۔ رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ کے کوئی اور آواز ہمارے کانوں میں نہیں آئی۔ اس کے بعد پھول والوں کی سیر کا موسم آیا۔ ہم نے زینت محل اور مرزا جواں بخت کو

اپنے ساتھ لیا اور مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کی زیارت اور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

جیسے ہی ہم مہرولی پہنچے بارش شروع ہو گئی۔ شہریوں نے جو کئی گھنٹوں سے ہمارے منتظر تھے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ان لوگوں نے ایک جلوس کی شکل اختیار کر لی جن کے آگے آگے موسیقار اور رقاص تھے۔ ہم مہرولی کی تنگ گلیوں میں آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ لوگ ہم پر پھولوں کی بارش کر رہے تھے اور آسمان ہم پر پانی کے موتی برسا رہا تھا۔ جب ہم جہاز محل پہنچے تو آتش بازی چھوڑی جانے لگی۔ شمسی تالاب کا پانی چٹانوں کی رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ سبحان اللہ یہ عالم کتنا دل فریب تھا۔

دوسرے دن صبح دھلی ہوئی تھی اور آسمان نکھرا ہوا تھا۔ ہم نے اولیا مسجد میں فجر کی نماز ادا کی۔ اس چھوٹی سی مسجد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ حضرت فرید الدین گنج شکر پاک پٹن اور لاتعداد صوفیائے کرام نے چلہ کشی کی تھی۔ اور سجدے دیئے۔ وہ جگہ نور چھایا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد ہم حضرت قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ کے مقبرہ پر حاضر ہوئے اور فاتحہ پڑھی۔

ہم نے شام جہاز محل میں بسر کی اور اس کے بعد یہاں تین دن گزارے۔ ان دنوں میں ہم تمام تفکرات سے آزاد تھے۔ ہم نے پہاڑوں کی سیر کی۔ موسیقی سے دل بہلایا۔ رقص کرنے والوں کے فن سے لطف اندوز ہوئے اور جب ہم دہلی واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے کمک حاصل کر لی تھی جب کہ ہماری فوج کو ہر طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ ہر چیز کی قلت تھی۔ خاص طور پر ہتھیار اور خوراک وغیرہ کی شدید کمی تھی۔ ادھر مرزا مغل اور بخت خاں میں بھی نوک جھونک شروع ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر لعن طعن کے تیر برساتے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ عام شہریوں اور سپاہیوں کے درمیان بھی تشدد کے کئی واقعات ہو چکے تھے۔ شہری سپاہیوں کی بدزبانی پر فقرے

چست کرنے اور سپاہی تاجروں کو دشمن سے تجارت کرنے کا طعنہ دیتے اور مذاق اڑاتے۔ ہمارے سپاہیوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جبکہ تاجروں میں بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی۔ بقرعید قریب آرہی تھی ہم نے گائے کی قربانی پر پابندی عائد کر دی اور خود اونٹ کی قربانی کرکے ایک مثال قائم کی۔ خدا خدا کرکے بقرعید امن و امان کے ساتھ گزر گئی۔

عید کے تہوار کے دو دن بعد شیطان کے ہاتھوں نے بارود کو چھوا۔ نتیجتہً بندوق کی بارود کی ایک بھاری مقدار ضائع ہوگئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور بڑی مقدار میں گولہ بارود ضائع ہوا۔ اور اکثر کے مکانات زمین بوس ہوگئے۔ فرنگی نے خطوط لکھ کر عوام میں غلط فہمیاں پھیلانا شروع کر دیں اور ہمارے معتمد خان حکیم احسان اللہ خاں اور ملکہ معظمہ زینت محل کو بارود کے ذخیروں میں دھماکہ جب ہم نے مرزا مغل اور اس بے شرم نسبت علی خاں کی سرزنش کرنی چاہی تو دونوں نے کمال جسارت سے پوچھا کہ آیا ہم مجاہدوں کے ساتھ ہیں یا کافروں کے انہوں نے الزام لگایا کہ بیگم زینت محل کے والد اور ہمارے طبیب احسان اللہ خاں فرنگی کے تنخواہ دار تھے۔ ہم ایک بہرے کی طرح ان الزاموں کو سنتے رہے لیکن کچھ دیر بعد ہم میں تذبذب کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایک طرف ہماری خواہش تھی کہ ہمارے سپاہیوں کو فتح و نصرت نصیب ہو اور ہماری حکومت ہمیں پھر سے بازیاب ہو جائے۔ دوسری طرف ہم چاہتے تھے کہ کاش لوگ ہم سے صلح کرلیں۔

۲۴ رمئی اتوار کی شام کو عید کا چاند نظر آیا۔ ہوا میں گرد و غبار کی وجہ سے ہماری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر رہیں لیکن بیگم زینت محل نے ڈوبتے ہوئے سورج کی وجہ سے سرخ ہوتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "ماہِ نو ایک نقرئی خنجر کی مانند نظر آرہا ہے"۔ دوسرے روز ہم نے عصر کی نماز شاہی مسجد میں اپنی رعایا کے ساتھ ادا کی۔ واپس ہوتے وقت ہم نے فقراء پر اشرفیاں برسائیں۔ ڈیوڑھی دروازہ تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہوگیا۔ ہمارے محل کی دیواروں پر چراغ روشن کئے جا چکے تھے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر شہر پر ایک نظر ڈالی جو روشنی سے جگمگا رہا تھا فضا میں آتش بازی چھوڑی جا رہی تھی۔ جس سے آسمان میں رنگ برنگے ستارے بکھرتے نظر آرہے تھے۔ ہمارے اعزاز میں اکیس توپوں کی سلامی دی جا رہی تھی۔

عید الفطر خوشی کا دن ہے۔ لیکن ہمارے بیٹے یہ نہیں جانتے تھے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچائے بغیر کس طرح حظ سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ نصف شب کے قریب ہمیں داروغہ نے بیدار کر دیا اور ہم سے درخواست کہ اپنے فرزند کو جو کہ دریبے کے مالدار ہندو تاجر کے گھر میں گھس گیا تھا کسی طرح اس حرکت سے باز رکھیں۔ ایک دوسرے صاحبزادے لال کنوئیں کے ایک مکان سے برہنہ اور نشہ میں دھت پائے گئے۔ تیسرے صاحبزادے دریا گنج کے ایک چکلے میں پائے گئے جہاں انہیں کافی پریشان کیا گیا اور دست درازی تک کی نوبت پہنچی تھی۔

تیمور اور بابر کا خاندان اس حد تک گر چکا تھا۔ دوسرے روز ہم نے ان کی خون کی طرح سرخ آنکھوں اور ساتر سے ہوئے چہروں کو دیکھ کر ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگایا۔ ان کے چہروں پر ندامت و تاسف نہ تھے۔

جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام اقتدار تھی وہ اُن لوگوں سے لڑنے کے لئے بھیجے گئے تھے جو اعلیٰ تربیت یافتہ تھے اور جو بندوقوں سے لیس تھے۔ ایک طرف جدید آلات حرب کی بہترین تربیت یافتہ فوج اور دوسری طرف غیر منظم لوگوں کی بھیڑ جس کے پاس روایتی قسم کے ہتھیار بھی نہیں تھے! عید الفطر کے پانچ دن کے بعد دریا کے کنارے غازی آباد میں ایک جھڑپ ہوگئی۔ ہمارے غازیوں کو شہادت اور فرنگیوں کو نصرت نصیب ہوئی۔ کچھ دن بعد ایسا ہی ایک واقعہ گراقد شریف روڈ پر واقع بدلی کی سرائے میں ہوا۔ یہاں بھی پرانی کہانی دہرائی گئی یعنی فرنگی فاتح اور مجاہد مفتوح ہو درویش عسکری نے ہمیں بتایا کہ یہ ناکامیاں دراصل خدا کی طرف سے پوری طرح تیار ہونے کی تنبیہ ہیں۔ ہمارے نجومیوں نے بھی یہی پیش گوئی کی کہ فرنگیوں کا

راج ۲۳ جون کو ختم ہو جائے گا جو دراصل جنگ پلاسی کی سوویں سالگرہ کا دن ہے۔ ہمارے غازی ہزاروں کی تعداد میں دشمن پر ٹوٹ پڑے جس نے سبزی منڈی میں شہر پناہ کی دیوار کے پاس اپنی فوجوں کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ اس بار بھی خدا نے ہمارے مجاہدوں کو حور و جنت سے سرفراز کیا اور فرنگی اور اس کے سکھ اور گورکھا زر خرید حواریوں کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا۔

سبزی منڈی کی ناکامی کے سبب سارا شہر غم میں ڈوب گیا۔ کمانڈروں پر سے عوام کا اعتماد جاتا رہا۔ ہر فرد ایک دوسرے پر دغابازی اور فرنگی کا تنخواہ دار ہونے کا الزام لگانے لگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ریگستان کی گرم ہواؤں نے لوگوں کے دامن ضبط و برداشت کو تار تار کر دیا۔ یکایک تاجروں نے اپنے سامان کو چھپانا شروع کر دیا۔ بازار میں نہ تو غلہ دستیاب تھا اور نہ ہی جانوروں کا چارا۔ غریب لوگوں کی حالت ابتر ہو گئی۔ بنیوں نے چور ی چکاری شروع کر دی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ

سے جو انگریز فوج کا کمانڈر تھا یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیں گرفتار کروا دیں گے۔ میجر ہڈسن کو اس حکم کی تعمیل پر مامور کیا گیا ہے۔

ہمارے کانوں کو یقین نہیں آیا جب ہم نے سنا کہ حکیم احسان اللہ خاں بھی دشمن سے جا ملے اور اب ہماری املاک و جائداد کی فہرست تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

اس مکروہ، بدذات کانے رجب علی نے ہمیں یقین دلایا کہ اگر ہم اس کے ساتھ چلے جائیں تو ہماری زندگیاں بچ جائیں گی۔ بیاسی سال کی عمر میں ہماری زندگی کی قیمت کیا تھی۔ لیکن ہمیں بیگم زینت محل اور جواں بخت کی فکر تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے فرزند اکبر مرزا مغل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں ان کی بھی تشویش تھی۔ مرزا مغل نے ہم سے کہا کہ ہم رجب علی کے چہرہ پر تھوک دیں۔

"ہم اس گورے اور اس کے گھوڑ سوار سکھوں کا کباب بنا ڈالیں گے" اس نے جوش میں کہا۔

ہمارے پاس کہنے کے لئے کیا رہ گیا تھا۔ ہم ایک گھنٹے تک اس مباحثہ کو سنتے رہے۔ ہم نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا بلکہ زینت محل اور مرزا جواں بخت کو بلا بھیجا۔ ہم نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور مقبرہ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ مرزا مغل اور اس کے سپاہی برابر چیخ پکار مچا رہے تھے۔ ہم جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ ہماری ڈولیاں مقبرہ کے دروازے سے اس طرف لے جائی جانے لگیں جہاں ہمارے صیاد منتظر تھے۔ ڈولی سے قدم باہر نکالنے سے قبل ہم نے دس بار سورہ پڑھی۔ ہم نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کہا۔ "اے خدا ہم تیرے حقیر بندے بہادر شاہ ظفر کو تیرے حوالے کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت تو ہماری حفاظت کر۔"

ہم سکھ گھوڑ سواروں کے افسر کے پاس آئے اور پوچھا۔

"کیا ہڈسن صاحب آپ ہی ہیں؟"

اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ہم نے مشہور زمانہ تلوار جس کا نام "ذوالفقار" تھا اور جسے ایرانی فاتح نادر شاہ نے ہمارے اجداد کو تحفہ میں دی تھی، صاحب بہادر کو پیش کر دی۔ ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم اپنی اپنی ڈولیوں میں سوار ہو جائیں اور ہم فرنگی کے قیدی تھے۔

دلی پہنچتے پہنچتے دن تمام ہو گیا۔ ہم بہت کی چیخ و پکار سنتے رہے۔ کئی جگہ ہماری ڈولیوں کو رکھا گیا۔ دوپہر تک تمام ہلچل فرو ہو گئی اور آخر کار جب ہم دلی دروازے پر پہنچے تو شہر میں مکمل سکوت طاری تھا۔ دلی شہر خاموشاں بنا ہوا تھا ہماری ڈولیوں کو مینا بازار سے گزارا گیا۔ ہم کو ان تہہ خانوں میں ٹھہرایا گیا جہاں چند ماہ قبل ہم یورپینوں کو پناہ دی تھی۔ جس کے بعد لوگوں نے انہیں قتل کر دیا تھا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور ایک مسلح دستہ پہرہ پر تعینات کر دیا گیا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ بالکل منقطع کر دیا گیا۔ البتہ بری خبریں ہمیں برابر موصول ہوتی رہیں۔

دوسرے دن شام کو ایک پیامبر ہمارے زنداں میں آیا۔ وہ ہمارے قدموں میں گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے کہا کہ ہمارے پیارے بیٹے مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور ہمارے پوتے مرزا ابوبکر کو ہڈسن نے گولی مار دی ہے اور ان کے سر بہت جلد ہمارے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ ہمارے حرم کی مستورات نے آہ و زاری

شروع کردی۔ ہم قبلہ رخ ہو کر بارگاہ ایزدی میں مصروف دعا ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور پیغام رساں تہہ خانہ میں داخل ہوا اور اس نے یہ دل دوز خبر سنائی کہ ہمارے خاندان کے تمام افراد اور دیگر ہمدردوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ ایک درخواست پہنچائی کہ جو کچھ ہماری جائداد کی فروخت سے حاصل ہوا ہے اسے مقتولین کی مناسب تجہیز و تکفین پر خرچ کیا جائے۔ مرزا مغل ابوبکر اور سلطان خضر کی نعشیں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ میں پھنسی ہوئی تھیں۔ جھجر اور فرخ نگر کے نوابوں کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ ان کی لاشوں کو قطب الدین کے مقبرہ سے ملحق ان کے خاندان کے قبرستانوں میں دفنا دیا گیا تھا۔ بلبھ گڑھ کے راجہ بہادر کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی نعش کو نگم بودھ گھاٹ پر جو جمنا پر واقع ہے۔ سپرد آتش کر دیا گیا۔

ہمارے گلستان میں جو کبھی ہماری مملکت تھا خزاں کا دور دورہ تھا ہر طرف دھول اور خاک اڑ رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب یہی عالم آب و گل ایک چمن زار معلوم ہوتا تھا۔ جس میں ڈھلتے سورج کی حیات افروز کرنیں کلیوں کے سینے میں پوشیدہ نکہت و رنگ کے خزانوں کے منکوں دیتی تھیں، وہی عالم اب سیکڑوں ہزاروں سڑتی ہوئی لاشوں کی بدبو سے متعفن زار بنا ہوا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جسے آفتاب و مہتاب غسل نور کراتے تھے۔ یہ وہی دیار تھا جس کی دوشیزائیں اپنے حسن و جمال سے حوروں کو بھی شرم سار کر دیا کرتی تھیں آج وہی شہر وہی دیار لاشوں کا شہر اور کفن کا بازار بنا ہوا تھا۔ اس شہر کو کس نے تاراج کر دیا؟ اسے کون لوٹ کر لے گیا۔

یہ دہلی تھی۔ دنیا کے تمام شہروں کی ملکہ جو اب ایک ویرانہ بن چکی تھی۔ ہم سے جس طرح کا سلوک کیا گیا اگر ہم اسے لکھنے بیٹھیں تو آنسوؤں کی روشنائی کبھی نہ ختم ہو۔

ہم نے اپنے سفید آقاؤں سے کاغذ اور قلم کی درخواست کی جسے نامنظور کر دیا گیا۔ ہم اپنے حجرے میں استعمال ہونے والے کوئلے کے کچھ ٹکڑے بچا لیتے اور اس زنداں کی دیواروں کو سلیٹ سمجھ کر ان پر لکھتے۔ ہمارا وقت عبادت یا فکر و شعر و سخن میں گزر رہا۔

بہت جلد فرنگی کے وعدہ و قرار کی حقیقت ہم پر کھل گئی۔ وہ ہمیں جنگلی، وحشی اور غیر مہذب بکتا تھا۔ کیونکہ ہمارے سپاہیوں نے سفید عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا لیکن جو لوگ اصل حال سے واقف تھے وہ برو ئے حلف کہہ سکتے تھے کہ ہم نے انہیں بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ ہم نے بہت چاہا کہ قتل و غارت گری رک جائے لیکن ہماری خواہش شر کو نہ روک سکی۔ انگریزوں کو ہماری باتوں پر یقین نہ آیا۔ اپنے تئیں دو درجن کا بدلہ ان لوگوں نے کئی ہزار گنا لوگوں کی جانوں سے لیا۔

کانے رجب علی کی پختہ یقین دہانیوں کے بعد بھی ہم پر مقدمہ چلایا گیا۔ انہوں نے ہمارے نمک خواروں کو ہمارے سامنے کھڑا کیا اور طوطے کی طرح ان کی زبان سے وہ سب کچھ کہلوا دیا جو انہیں پہلے سے یاد کروا دیا گیا تھا۔ ہمارے ان شکر گزاروں میں حکیم احسان اللہ خاں، درویش حسن عسکری رجب علی، غلام عباس اور مکند لال وغیرہ شامل تھے۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے شدید صدمہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے خلاف زبان کھولی تھی۔ ان میں فاطمہ الذیل بھی شامل تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس کی تین لڑکیوں کی زندگیاں بچانے کے لئے ہم نے خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

اس پورے معرکہ دار و گیر میں سوائے خدا کے ہمارا اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ وہی ہمارا واحد گواہ تھا۔ ہمیں جلا وطنی کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ اس سرزمین سے جسے ہمارے اجداد نے فتح کیا تھا اور جس پر انہوں نے تین سو سال تک حکومت کی تھی ہمیں جلا وطن کیا جانا تھا۔ کاش وہ ہمیں سزائے موت دے سکتے اور ہماری ہڈیوں کو دہلی کی مقدس خاک میں مل جانے دیتے۔ کاش!

ہماری چودہ بیگمات میں سے صرف ہماری محبوب بیگم زینت محل ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہیں۔ ہمارے امتحان کی سخت ترین گھڑیوں میں بھی وہ ہمارے دوش بدوش رہیں۔ ہمیں اپنے پیغمبر کے وہ الفاظ یاد آئے جو انہوں نے ام المسلمین حضرت خدیجہ کے بارے میں کہے تھے۔

"میں غریب تھا اس نے مجھے مالدار بنا دیا جب ساری دنیا نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اس نے مجھے سہارا دیا اور جب مجھے افترا پرداز (کاذب) کہا گیا، اس نے مجھے صادق القول سمجھا،

میں دسمبر کی ستائیسویں تاریخ ۱۷۹۷ء یعنی آٹھویں رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو آگرہ میں پیدا ہوا۔ پانچ سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گیا۔ چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے دست شفقت بڑھایا لیکن وائے قسمت کہ تین سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک لڑائی میں وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب نانا جان مرزا غلام حسین کے دامن عاطفت میں پناہ ملی۔

تیرہ سال کی صغر سنی میں نواب الٰہی بخش معروف کی دختر نیک اختر امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔ بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔

میں نے ریختہ کے استاد، میر تقی میر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ انہوں نے میری شعر گوئی کی نسبت فرمایا تھا۔ "اگر کوئی کامل استاد اسے مل گیا تو یہ لڑکا بڑا شاعر بنے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" تا خدائے سخن کے الفاظ تاحیات نہیں بھول سکا مگر استاد نہ کوئی ملنا تھا نہ ملا۔ مشکل پسندی فطرت میں تھی سو میرا کلام بھی اس کا مظہر رہا۔

فارسی اور ریختہ میں طبع آزمائی کی۔ دلی پہنچ کر اپنے خاندان والوں سے الگ بلی ماروں کی ایک حویلی میں بود و باش اختیار کی۔ دلی ان دنوں علوم و فنون کا مرکز تھی۔ سو بہت

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

اسد اللہ خاں غالب

بلکہ یہاں عزت و توقیر پائی مگر یہاں کے ادبی حلقے میں میری مشکل پسندی کسی کو پسند نہ آئی۔ اور سہل و آسان کی فرمائش ہونے لگی۔

ہاں بھئی! میں کلکتہ بھی گیا تھا۔ ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

میرے چچا مرحوم کی خدمات کے عوض کچھ پنشن مجھے ملا کرتی تھی۔

جب پنشن موقوف ہو گئی تو ناچار کلکتے جا کر عذر داری کرنے کا خیال آیا کیونکہ گورنر جنرل صاحب کا دربار وہیں تھا۔ رخت سفر باندھا اور عازم سفر ہوا۔ کانپور ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا میاں کیا بتاؤں، لکھنؤ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اہل لکھنؤ زبان وکلام میں یکتائے روزگار تھے۔

بارے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ گیا۔ اہل فرنگ نے اس شہر کو رشک فردوس بنا رکھا تھا سو مجھے بہت پسند آیا۔

سرزمین بنگال بھی اہل علم سے خالی نہیں تھی۔ نواب اکبر علی طباطبائی سے یہیں رسم و راہ ہوئی۔ یہ ہوگلی کے امام باڑے کے متولی تھے۔

ایک بار کا ذکر سنو۔ یہ نہ سمجھنا کہ اپنی مدح آپ کر رہا ہوں۔ بس ایک واقعہ ہے جو مجھے یاد آیا۔ مجھے دلی کالج میں فارسی کا استاد بنانے کے لیے مسٹر طامس نے نامزد کیا۔ وہ تعلیم کے محکمہ میں سکریٹری ہوا کرتے تھے۔ میں سواری میں مدرسے پہنچا۔ مجھے دروازے پر وہ کہیں نظر نہ آئے کہ میرا استقبال کرتے۔ ناچار ہوا اور وہیں رکوائی۔ صاحب خانہ کو خبر ہوئی نوکر سے بلوایا۔ میں نے کہا، وہ استقبال کو آئیں تو ٹھیک ورنہ ہم چلے۔ اندر سے جواب آیا اس وقت آپ رئیس شہر نہیں ملازمت کے لیے آئے ہیں سو اصول یہ ہے کہ ملازم کا استقبال نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا اگر یہ اصول ہے تو بخشو بلی غالب بے ملازمت ہی بھلا۔

اب کیا پوچھتے ہو وہ دلی کے شب و روز۔ شعر و سخن کی محفلیں جمتی تھیں۔ مباحث ہوتے تھے کبھی کبھی ادب میں بے ادبی بھی ہوتی تھی۔ بڑا لطف آتا تھا۔ میں رند خانہ خراب بنا ہوا تھا بلا ناغہ پیتا تھا مئے سے غرض نشاط نہ تھی بلکہ یک گونہ بے خودی دن رات چاہیئے تھی۔ تھا ہے گا ہے مجلس رنداں میں چلا جاتا تھا۔ میاں ایک بار تو پھنس ہی گئے۔ چوسر کی پھڑ جمی تھی، ناگاہ سرکاری پیادے آدھمکے اور ہم رنگے ہاتھوں دھر لیے گئے کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی آدھی مدت قید میں گزری بارے حکام کو رحم آیا اور گلو خلاصی ہوئی۔ میاں کیا برا وقت تھا۔ اپنے بیگانے ہو گئے تھے صرف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اعانت کی اللہ انہیں اس غالب نوازی کا اجر دے گا۔

میاں کالے خان کو بھی اللہ اجر دے گا جن کا احاطہ بلی ماروں سے قریب ہی تھا۔ مجھے بکمال محبت قلعے میں لے گئے۔ ظل سبحانی بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ اچھا ذوق شعری پایا تھا۔ اعلیحضرت نے قدر افزائی کی تاریخ خاندان تیموریہ کی تالیف کی خدمت عطا کی اور بکمال غالب نوازی، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔

اور میاں اب اس داستان کا آخری حصہ بھی سن لو۔ ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ ہوا جس کا فرنگیوں نے غدر نام رکھا تھا دلی پر قیامت آئی۔ آن کی آن میں شہر اجڑ گیا۔ قلعہ لٹ گیا۔ دلی گوروں کے تصرف میں آئی۔

غدر آیا میری زندگی میں بھی انقلاب عظیم آیا، پنشن بند ہوئی، قلعہ معلیٰ کی عنایات موقوف ہوئیں اور اس پر بڑھاپا سب طرف سے مصیبتوں نے بلا بول دیا۔ نواب یوسف علی خاں والئ رامپور میرے آشنائے قدیم تھے۔ وہ میرے شاگرد بھی تھے ناظم تخلص کرتے تھے گاہے گاہے وہاں سے کچھ روپیہ آجاتا تھا۔ ناظم میاں چاہتے تھے کہ میں دلی چھوڑ رامپور جا بسوں دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کیا۔ میں وہاں چلا گیا۔ دل نہیں لگا۔ واپس چلا آیا۔ اور دلی ہی میں تاحیات رہنے کا عہد کیا۔

(ترتیب فاروق ارگلی) ★★

غدر سے

غدر کا وقت آیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی نوکری اور کیسا پڑھنا، جینے کے لالے پڑ گئے۔ غدر کے دنوں میں جب باغیوں نے دہلی کے سرکاری میگزین کو لوٹا اور لٹوایا تو ازاری لوگوں میں کمتر کوئی بچا ہوگا۔ جو کوئی نہ کوئی ہتھیار جزائل بندوق طپنچہ اڑا کر نہ لے گیا ہو۔ ہمارے محلے میں پنجابی کٹرے کی مشہور مسجد تھی۔ اس میں بہت سے مجاہدین ابھرے تھے۔ ان میں اکثر باہر کے گنوار تھے۔ اس خدائی لشکر کے ریکروٹ سپاہیوں کا حال یہ تھا کہ نشانہ لگانا اور بندوق چلانا کیسا بچاروں کو بھرنے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ ان لوگوں کی بڑی بڑی جماعتیں دھاوا کرنے کو جاتیں۔ شام کو فتح پاکر واپس آتے اور یہی واپسی ان کی فتح ہوتی تھی، دو چار دس پانچ آدمی زخمی بھی ہوتے لوگ جانتے کہ لڑائی میں زخمی ہوئے ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی مگر وہ لڑائی کے زخمی نہیں ہوتے تھے وہ زخمی ہوتے تھے۔ اس طرح پر کہ بندوق بھرنی چاہی مثلاً ایک انچ ڈیڑھ انچ انہوں نے ناواقفیت کی وجہ سے بھر دی ایک بالشت سوا بالشت اُدھر چارج کرنے سے بندوق پھٹی ادھر پھٹی ہی تھی۔ اپنی طرف کے دو چار دس پندرہ جس کا وقت آ لگا لوٹ گئے اور بندوق اپنے فرض سے ادا ہوئی یہ مجاہد انگریزوں لگا لیاں دیتے کہ ان ایسے تمیوں نے اسی دن کے لئے یہ دھوکہ کی بندوقیں بنا بنا کر رکھی تھیں۔

اُن دنوں فصیل قلعہ پر توپیں چڑھائی گئیں تو شاہزادے جمع ہو کر حضور میں گئے اور عرض کیا کہ اگر توپیں چھوڑی جائیں گی تو خانہ زاد دہل کر مر جائیں گے چنانچہ حضور نے ممانعت کر دی یہ ان لوگوں کی بہادری تھی جنہوں نے انگریزوں کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ میں اس زمانے کے بہادروں میں نہیں تو بزدلوں میں بھی نہیں، بہادری کا سٹنڈرڈ ہی

غدر کا زمانہ

(ڈپٹی نذیر احمد)

گھٹ گیا ہو تو اس کا میں کیا کروں۔
بچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کسی اور پر بھی اگر یہ مصیبت
نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ
میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی
آئے تھے۔ ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انہوں
نے دہلی کو کنگال کر دیا۔ ایک روز میں دریبے میں سے جا رہا تھا۔
کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج تلنگوں کی آ رہی ہے۔ میں بھی دیکھ کر
گلاب گندی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے چھیلے
تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا
کی پناہ پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت
تھی گھوڑے کیا تھے۔ دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے بیچ
میں سوار تھے۔ مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا سا
ہی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں؟ دہلی کی لوٹ
جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لئے۔
جس روپیہ پیسے والوں کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر ڈھی دیدی
اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعے کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔
جب تک کچھ نہ کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا اگر دہلی کے
چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ
کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے غرض خدائی فوجداروں کا
یہ لشکر غل مچاتا، "دین دین" کے نعرے مارتا میرے سامنے
سے گذرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے یہ کون تھے۔
عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے
سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے
ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف
گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کونسا زنانہ
سلفہ بجائے طرے کے سراسری لٹکائی تھی۔ جیسے خود زیور
سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور سے لدا ہوا تھا
ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ
باللہ خدائی اب ان کے ہاتھ آگئی ہے گلاب گندی نے جو ان
لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور اندر دبکا
سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا
ٹھیک اس کی دوکان کے سامنے آکر رکا بہادر خاں نے ادھر
ادھر گردن پھیری پوچھا یہ کس کی دوکان ہے ان کے ایک
تلنگ نے عرض کی کہ گلاب گندی کی۔ فرمایا اس بدمعاش
کو خبر نہیں تھی کہ ہم بدولت ادھر سے گزر رہے ہیں۔ دوکان بند
کرنے کے کیا معنی ابھی کھلواؤ خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بچارے
لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار
کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو اور جس طرح تم تم کھل
جائے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا
دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم محکم سے گلاب گندی کی دوکان
کھل گئی بجنسہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازے
کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا
چاہتے تھے۔ مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اس وقت بہادر خاں
کچھ خوش تھے۔ کسی موٹی آسامی کو مار کر آئے ہوں گے
کہنے لگے تمہاری ہی دکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے۔ لالہ جی
نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔
حکم ہوا کچھ عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ ڈر کر لپکتے ہوئے
اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے۔ معلوم نہیں
بیس روپیہ تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے تولہ کا۔ بہادر خاں نے
دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی
گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ
گئیں۔ عطر سونگھا کچھ پسند آیا۔ ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ
دیا اور دوسرا ادھر پر کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا۔ "فارورڈ" اس
طرح بچارے گلاب گندی کا سیکڑوں روپیہ کا نقصان کر کے یہ
ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے۔ ادھر اس خدائی
فوجدار کا جانا ادھر ہم دشمنوں کا تالیاں بجانا۔ بچارے لالہ جی نے
کھسیانے ہو کر دکان بند کر دی۔

غدر کے طوفان بدتمیزی میں نقصان تو جو ہونا تھا وہ ہوا
مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے
ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے
تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج
کی نذر کی ہے۔ اس کے سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا
تھا۔ اسی انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر
پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ یہ دوربین

کالج کا سرمایۂ ناز تھی۔

بارے تقدیر میں تو انگریزی عمل داری کی برکات سے متمتع ہونا لکھا تھا۔ ہم مولویوں کے خاندان سے ایک بڑے دھڑے کی خیر خواہی بن پڑی یعنی باغیوں نے انگریز یوروپین عیسائی تعداد کو جمع کر کے میگزین کے میدان میں باڑ ماری ان میں (مسز لیسن) بھی تھیں وہ بھی زخمی ہوئیں مگر مری نہیں۔ ان کو مولویوں نے اپنے یہاں رکھ کر ان کی مرہم پٹی کی۔ توانا۔ تندرست ہوئیں۔ میں بھی اس کی جان بچانے میں شریک و معین رہا۔ دہلی کی فتح سے پہلے ان کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ یہ خیر خواہی قطع نظر اس سے کہ ایسے نازک اور خطرناک وقت میں۔ ع

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

مولویوں کے خاندان سے ہوئی اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ ایک طرف مسجد میں جہادی نعرے پڑے تھے اور دوسری طرف ان کے پڑوس میں تھے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے

ایک لیڈی کئی مہینے ٹھہری رہی اور اس کی ہوا تک نہ ہوئی یہ خیر خواہی فی نفسہ اس رتبے کی تھی کہ گورنمنٹ اس کے صلے میں جو کچھ کرتی کم تھا مگر مولویوں کے باہمی اختلاف نے جوان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اتنی بڑی خیر خواہی کو خاک میں ملا دیا یعنی کم سے کم اس خیر خواہی کی رازداری میں تو مولویوں کے خاندان کا بچہ بچہ شریک تھا۔ مگر اس وقت رئیس خاندان دو تھے مولوی نذیر حسین صاحب جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور میرے خسر مولوی عبد القادر صاحب مرحوم۔ اور خیر خواہی میں بھی ان ہی دو کا نام تھا۔ باوجودیکہ دونوں میں سانے بہنوئی کا رشتہ بھی تھا اس پر بھی دونوں میں اختلاف ہوا اور خیر خواہی کا انعام یہ ملا کہ جنرل بخت خاں باغی نے مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مہریں کرائی تھیں اگر یہ خیر خواہی نہ ہوتی تو ان کو پھانسی ملتی انہوں نے میم کی جان بچائی سرکار نے ان کی جان بخشی فرمائی۔ پھر دونوں نے اس اختلاف کا خمیازہ بھی بھگتا۔ میں نے جو یہ پھوٹ دیکھی بھاگا کا حکمہ الہ آباد میں جا کر دم لیا۔ جان بچی لاکھوں پائے غدر کی وجہ سے گورنمنٹ کی مشینری کے سارے کیل پرزے ڈھیلے
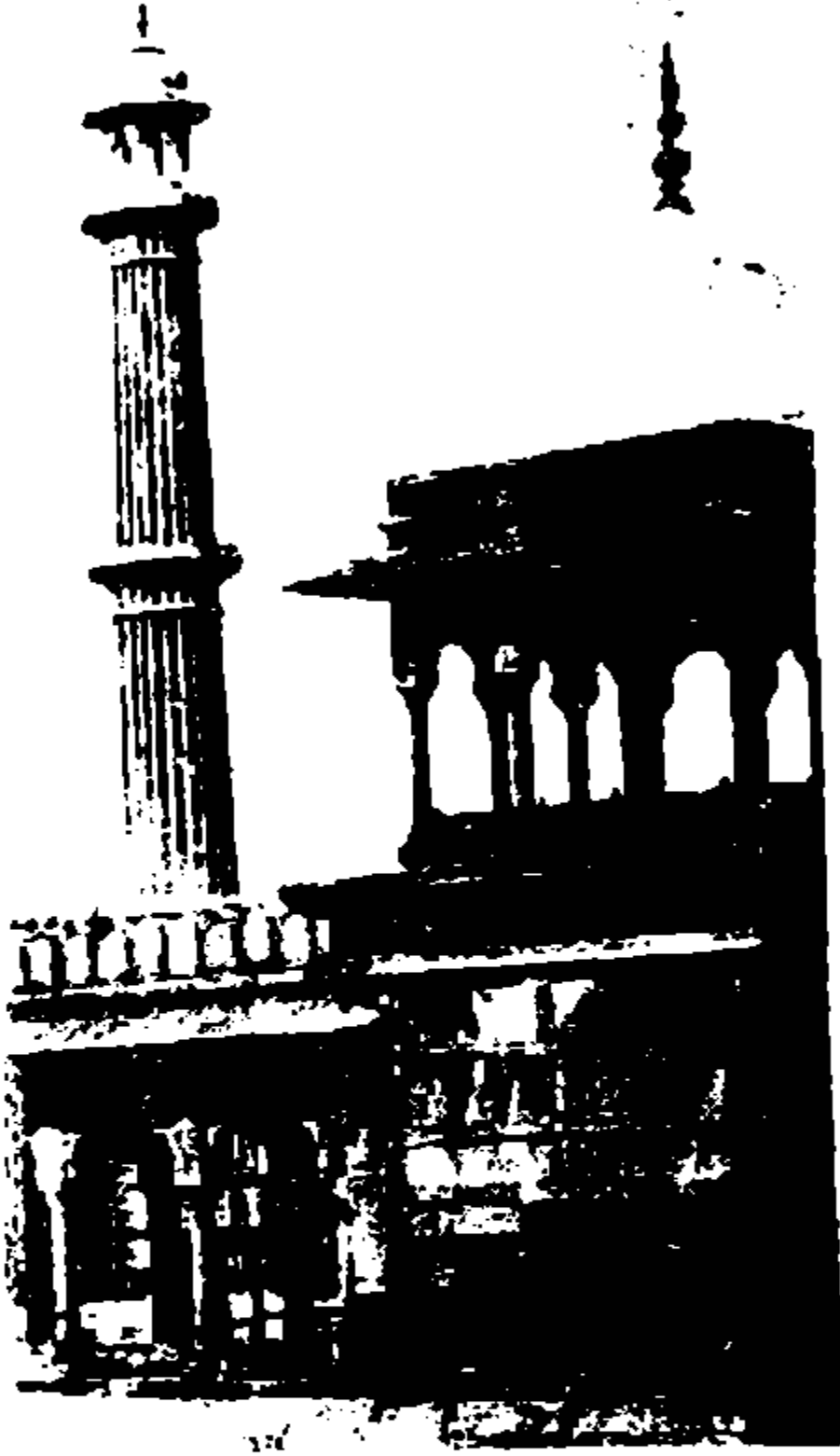
پڑ گئے تھے۔ خاص کر سر رشتہ تعلیم تو ایسا چپیٹ میں آیا کہ اس کو سنبھلتے سنبھلتے کئی برس لگے۔ میں نے غدر کی یہ حکایت اس لئے بیان کی کہ مجھ کو جتنا کچھ بھی اس خیر خواہی میں دخل رہا اس سے تعلق تھا وہ کالج کی صحبت کا اثر تھا۔ غدر کے دو تین برس بعد سر رشتہ تعلیم تو بن گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ پہلا اس کا نام کو رنگ نہ تھا دری ناپ تول وہی بھوکوں۔ بارے مساعدت توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایک

ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لئے بس کرتا ہے اور اب علم کی طرف سے میری خاطر جمع ہے جیسے ایک پیاسا چشمۂ آبِ حیات پر جا بیٹھا ہے اور اس کا دل سیر ہے اب جا کے کہاں جائے گا۔ تصریح اس اجمال کی یہ ہے۔

انگریزی تعلیم میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا۔ بیٹھک میری ان کی مشترک تھی ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اردو کی شُد بُد کے علاوہ مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ یہ معلوم کر کے میں تو کسی قدر رکھتا مگر دیکھا تو ان کو پکا مسلمان پایا۔ غلو کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند باوجودیکہ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے مگر وضع ظاہر طرز ماندو بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ عبداللہ خاں کی وہ ادا جس کو میں نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے جو آگ ملک میں لگائی تھی۔ وہ ابھی تک پڑی سلگ رہی تھی۔ یعنی دارو گیر جاری تھی تو جو لوگ ناکردہ گناہ دشمنوں کی مخبری پر یا محض اشتباہ پر ماخوذ تھے ان کے عزیز و قریب ان کی رہائی کے لئے یہاں صدر الہ آباد میں آ کر پڑے ہوئے تھے۔ اور ان کو انگریزی استغاثے اور اپیلیں لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی اور وکیلوں اور بیرسٹروں کی یہ کیفیت کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی آگ تاپے میں عبداللہ خاں کو دیکھتا تھا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مسلمانوں کی اپیلیں مفت لکھتے اور کوئی کچھ دیتا تو بھی تو بڑے مضائقے کے ساتھ لیتے اس وقت مسلمانوں کی امداد اور خیر خواہی کا اس سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں تھا سب سے پہلے شخص جنھوں نے انگریزی اور انگریزی دانوں کی طرف سے میرے سوءِ ظن کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ عبداللہ خاں کو دیکھ کر ذرا کر میں نے اول بار سمجھا کہ انگریزی اور اسلامی عقائد منافی اجتماع نہیں۔ عبداللہ خاں مذہبی آدمی تو تھے ہی۔ اکثر مجھ سے قرآن کی آیتوں اور دعاؤں کے معنی پوچھتے رہتے تھے۔ تو میں متعلق الفاظ ایسی طرح سمجھاتا کہ وہ جلدی سے سمجھ لیتے اور عبارت سے استنباطِ مطلب پر قادر ہو جاتے۔ یوں تو عبداللہ خاں مجھ سے انگریزی پڑھنے کے لئے کہتے رہتے تھے۔ اب انہوں نے میری ذرا سی امداد کے صلے میں زیادہ اصرار کرنا شروع کیا اور کہا کہ میں تم کو چھٹی بجائے تمہیں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرضیکہ میں نے انگریزی پڑھنی شروع کی مگر مشکل یہ تھی کہ میری نوکری تھی دورے کی تو میں کیا کرتا کہ (سمال ٹاپ عربین نائٹس) کے دس دس پندرہ پندرہ صفحے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دورے میں ان کو رٹا کرتا۔ شروع شروع میں تو انگریزی کے ہجوں سے ایک طرح کی وحشت ہوئی مگر جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں (انگلش انٹو اردو ڈکشنری) کی مدد سے آسان آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا۔ اور یہ صرف چھ مہینے میں اس طرح پر انگریزی کے سیکھنے میں مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کوئی سی زبان بھی باقاعدہ سیکھے تو اس کی مدد سے دوسری زبان سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ میں نے انگریزی سبقاً سبقاً ترتیب سے نہیں پڑھی اور انگریزی کی گرامر مجھے اب تک نہیں آتی۔ مگر چونکہ عربی ٹھوک بجا کر پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا۔ کہ جو مدرسے کے لڑکے برسوں میں کرتے ہیں، نے مہینوں میں کر لیا۔

میں جن دنوں مدارس الہ آباد کا ڈپٹی انسپکٹر تھا اور مجھ کو دورے کی ضرورت سے اکثر ریل پر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا چونکہ ریل نئی چیز تھی انتظام میں بہت سے نقص تھے۔

ایک مرتبہ سفر میں مجھ سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انگریزوں کی صنعت و ایجاد کا مذکور تھا ریل کا نام آیا تو ایک صاحب بولے کہ خدا جانے کن مدتوں سے قسطنطنیہ میں حضرت سلطان روم کے اصطبل کی لید وغیرہ اٹھانے کے لئے ریل کام میں لائی جاتی ہے۔ کسی انگریز کی نظر پڑ گئی اور وہ نمونہ اڑا لایا۔ بات تو کچھ نہیں مگر ایسی ہی ایسی باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ انگریزوں کی نسبت کیسے خیالات تھے۔ ●●●

قصہ ایک جن کا

از نواب سرور الملک آغا مرزا دہلوی

کون سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

صبح کا وقت روز سہ شنبہ ماہ ذالحجہ [illegible] مطابق [illegible]ء میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ میرے والدین مرحوم میری پھوپی کے ساتھ فراشخانہ (دہلی) کے محلہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے میرا نام آغا مرزا رکھا۔ یہ مکان جس میں میں پیدا ہوا دو منزلہ تھا۔ نیچے دالان در دالان کے دائیں بائیں کوٹھا۔ صحن جانب مقابل باورچی خانہ وغیرہ۔ بائیں طرف ڈیوڑھی اور سامنے اس کے مختصر کھتیاں تھیں۔ اوپر کی منزل پر مختصر صحن ایک دالان اجانبین کوٹھریاں تھیں۔ اس مکان کی تفصیل اس واسطے لکھتا ہوں کہ میری ولادت سے متعلق ایک عجیب حکایت میں نے والدہ مرحومہ سے سنی ہے۔

والدہ مغفورہ میری نہایت عابدہ زاہدہ اور ضروری مسائل دین سے واقف تھیں اور قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر شاہ عبدالقادرؒ پڑھی ہوئی تھیں۔ استادان کے سید حسن بہنوئی سر سید احمد خاں مرحوم کے تھے۔ ان صاحب نے اپنے رشتے کی کل مستورات کو قرآن مجید اور مسائل دین پڑھائے تھے۔ جناب شاہ صاحب کے اصل مسودہ ترجمۂ قرآن مجید کی نقل والدہ مرحومہ کے پاس تھی اور اسی مسودہ میں والدہ ماجدہ نے مجھ کو بھی قرآن مجید پڑھایا تھا۔

الغرض والدۂ ماجدہ نے جو حکایت بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ اس مکان کی اوپر کی منزل پر ایک کوٹھری میں کوئی جنّی بزرگ باخدا عبادت گزار رہتے تھے۔ میری پھوپی صاحب ان کو بھائی پکارا کرتی تھیں۔ گو مجھے یہ ہر شخص کو نہ جانے

دیتی تھیں اور نہایت پاک وصاف رہتی تھیں۔ وہ بزرگ بھی اکثر بوقت ضرورت ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ والدہ صاحبہ نے ایک نقل بیان فرمائی کہ ایک شب کو پھوپی نماز عشا کے واسطے کھڑی ہوئیں۔ اتنے میں گنڈیریوں والے نے آواز دی۔ پھوپی صاحبہ نے کہا کہ افسوس ہے اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں ورنہ میں گنڈیریاں لیتی۔ اسی وقت ان کے پاؤں کے پاس کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ چراغ منگا کر جو دیکھا تو ایک روپیہ کلمہ کا پڑا ہوا تھا۔ وہ انہوں نے اٹھا لیا اور کہا کہ بھائی یہ روپیہ کلمہ کا میں تبرکاً رکھوں گی۔ والد ماجد میرے نہایت ذی علم تھے۔ فارسی، عربی کے علاوہ رڑکی سے علوم ریاضیات میں سند بھی حاصل کی تھی۔ وہ ان بزرگ کے وجود سے منکر تھے لیکن آخر کار انہیں بھی قائل ہونا پڑا۔

القصہ جب میری ولادت قریب پہنچی۔ پھوپی صاحبہ نے مولانا شاہ رفیع الدینؒ کو بلا بھیجا اور کہا کہ آپ کوٹھے پر جائیے فلاں کوٹھری میں ایک بزرگ رہتے ہیں مجھ کو بہن کہتے ہیں۔ میرا سلام ان سے کہئے اور کہئے کہ میرے ہاں زچگی خانہ ہونے والا ہے ممکن نہیں کہ کسی قسم کی طہارت کا انتظام ہو سکے۔ پس اگر آپ کو ناگوار خاطر ہو تو میں دوسرے مکان میں اٹھ جاؤں ورنہ اس مکان میں سامان زچگی کا کروں۔ چنانچہ شاہ صاحب کوٹھے پر گئے اور پیام پھوپی صاحبہ کا پہنچایا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ ہرگز دوسرے مکان میں نہ جائیں۔ میں خود اس مولود کی حفاظت کروں گا۔ صرف اس قدر احتیاط کریں کہ کوئی عورت مرد یا بچہ کوٹھے پر نہ آنے پائے۔ الغرض والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ جب میں پیدا ہوا تو جب کبھی میں رات کو پاؤں مار کر کپڑا اتار ڈالا کرتا تھا تو وہ بزرگ فوراً اڑھا دیا کرتے تھے یا کبھی انا خواب غفلت میں مبتلا ہوتی اور میں دودھ کے واسطے روتا تو وہ انا کو جگا دیتے۔ جب چھٹے کا دن قریب آیا تو پھر پھوپی صاحبہ نے شاہ رفیع الدین صاحب کو طلب کر کے پیام بھیجا کہ اب میرے یہاں مہمانداری ہے اور کل مستورات، ان کے بچے اور ماما انا وغیرہ ملازمین جمع ہوں گے۔ اس وقت کوئی انتظام احتیاط کا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ لہذا میں دوسرے مکان میں مہمانداری کے واسطے اٹھی جاتی ہوں۔ وہ بزرگ راضی نہ ہوئے اور کہا کہ ہم بھی اس خوشی میں شریک ہوا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ دن تقریب کا آیا اور مہمان جمع ہوگئے۔ پھوپی صاحبہ خود کوٹھے پر گئیں اور پکار کر کہا بھائی صاحب میرے یہ مہمان آپ کے وجود سے ناواقف ہیں مبادا آپ کی کسی حرکت سے ڈر جائیں تو میری مہمانداری ستیاناس ہو جائے گی۔ اس حجرے میں سے جواب آیا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ تمہارے مہمان ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی خاطرداری میرے ذمہ ہے۔ دوسرے روز جب سب مہمان جمع ہوئے تو ان بزرگ نے نئی طرح سے اس خوشی میں شرکت کی یعنی بیبیوں کے زیور و لباس وغیرہ چرانے شروع کر دیئے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کوئی بی بی کہتی تھی کہ میرا ہار کوئی چرا لے گیا۔ کسی کا صندوقچہ غائب ہو گیا۔ کوئی اپنا دوشالہ ڈھونڈتی پھرتی تھی ایک بی بی دوسری بی بی کے ملازمین پر چوری لگاتی تھی۔ پھوپی صاحبہ نہایت غضب اور غصے میں اوپر گئیں اور ان بزرگ کو خوب برا بھلا کہا اور کہا وہ سب چیزیں فوراً واپس کیجئے ورنہ میری خوشی مبدل بہ رنج اور میری مہمانداری برباد ہوئی جاتی ہے۔ آواز آئی کہ آپ نیچے جائیے وہ سب چیزیں پہنچ جاتی ہیں۔ پھوپی صاحبہ نیچے اتر آئیں۔ اس وقت دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کل مہمان کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک چھت کی طرف سے چرچر کی آواز آئی۔ سبھوں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کسی کا دوشالہ لٹکا ہوا چلا آتا ہے۔ کسی کی پازیب لٹکتی آرہی ہے۔ یہ تماشا دیکھ کر سب بیبیاں چیخیں مار مار کر ادھر ادھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کسی کو بخار ہو گیا۔ کوئی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ افتاں وخیزاں کل مہمان بھاگ نکلے۔ جلسہ اور دعوت سب درہم برہم ہو گئی۔ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ ہم لوگ اس مکان سے اٹھ کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ پھر صرف ایک دفعہ ان بزرگ سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ قلعہ میں کوئی شہزادی بیمار ہو گئی اور حالت جنون کی پہنچی۔ والدہ صاحبہ بھی مزاج پرسی کو وہاں گئیں تو اس شہزادی نے والدہ ماجدہ کو دیکھ کر کہا کہ

"السلام علیکم تم مجھ کو پہچانتی ہو؟" والدہ ماجدہ ڈر گئیں۔ انھوں (شہزادی) نے کہا: "ڈرو نہیں میں وہی ہوں کہ تمہارے بچے کی نگرانی کرتا تھا اور میرے مکان میں وہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ میں اس کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔" والدہ ماجدہ خوف زدہ اسی وقت وہاں سے واپس چلی آئیں۔

غدر ۱۸۵۷ء ۱۸۵۷ء تک میں اسی مکان میں رہا۔ غدر کے زمانے میں مجھ کو ہوش اچھی طرح ہو گئے تھے۔ بہت سی باتیں اب تک یاد ہیں۔ اس زمانہ میں اگر کسی یورپین سپاہی کی صورت نظر آتی تھی تو بچے تالیاں بجاتے لولو کہہ کر کنکر مارتے تھے۔ جب باغی لوگ شہر میں آتے تو ہمارے مکانوں میں خوب پہرا چوکی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جس روز کالے شہر میں گھسے میں اس دن رحیم بخش خدمتگار کے ساتھ بلاقی بیگم کے کوچہ میں اپنی خالہ صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔ جب دریبہ میں پہنچا تو دیکھا کہ خلقت پریشان حال ہر طرف بھاگتی پھرتی ہے۔ رحیم بخش کہ قوی آدمی تھے۔ مجھ کو جلدی سے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر بھاگا جس وقت خالہ مرحومہ کے مکان پر پہنچے دروازہ پھاٹک کا بند ہو رہا تھا۔ رحیم بخش دھکا دے کر اس زور سے گھسا کہ ہم دونوں دروازے کے اندر گر پڑے اور خوب چوٹ آئی۔ ایک دو روز کے بعد یہ خوف دلوں سے جاتا رہا اور پھر اپنے مکان پر بااطمینان واپس آ گئے۔

شہر میں باغی اور پہاڑی پر انگریز تخمیناً چھ ماہ تک لڑتے رہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم ہر شب توپ کے گولوں کو چمکتے ہوئے دیکھتے تھے اور آتش بازی سمجھتے تھے۔ ایک دن ایک گولہ کوٹھے پر چھت پھاڑ کر ڈالان میں اس وقت گرا جب ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ بڑے ابا نے دوڑ کر بہت سا پانی اس پر انڈیل دیا۔ میں ایک ولایتی مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ ولایتی ان لوگوں کو کہتے تھے جو سرحد افغانستان سے بشکل طالب علم یا میوہ فروش آیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب قوی ہیکل، ریش دراز، سر کے بال تا بہ شانہ، بڑے وظیفی اور عبادت گزار تھے۔ ایک روز والد مرحوم کے پاس آئے اور کہا کہ ایک نعمت عظمیٰ ہم کو خداوند تعالیٰ نے اس زمانہ میں عطا فرمائی ہے۔ حیف ہے کہ ہم اس رحمت سے محروم رہیں۔ والد نے پوچھا کہ وہ کیا نعمت ہے۔ جواب دیا کہ جہاد اور شہادت۔ والد مرحوم نے بہت کچھ ان کو سمجھایا مگر ان کے سر پر شوقِ شہادت سوار ہو چکا تھا۔ پگڑی سر پر اور تلوار کمر میں باندھ کر بندوق ہاتھ میں لے کر تیار ہو گئے اور والد مرحوم سے کہا جو کچھ رقم میری تنخواہ کی آپ کی طرف ہو وہ امانتاً اپنے پاس رہنے دیجئے۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے۔ عرصۂ دراز تک غائب رہے۔ والد مرحوم یہ سمجھے کہ مولوی کو نعمتِ شہادت نصیب ہو گئی۔ ان کی رقم سے پلاؤ وغیرہ پکوایا۔ جب سہ پہر کو والد صاحب فاتحہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب بھی آ پہنچے اور اپنی فاتحہ کا پلاؤ خوب کھایا اور پھر اسی وقت جانے کو مستعد ہو گئے۔ والد نے ان سے کہا کہ یہ فاتحہ حسبۃً للہ ہے۔ آپ اپنی تنخواہ لیتے جائیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اوّل تو میں اس رقم کا مستحق نہیں ہوں اور اگر آپ دیتے ہیں تو اپنے پاس رہنے دیجئے۔ شاید میری فاتحہ کے کام آ جائے۔ والد نے کہا کہ آپ زندہ ہو کر اپنی فاتحہ آپ کھایا کرتے ہیں۔ یہ دل لگی اچھی نہیں ہے۔ یہ رقم آپ لیتے جائیے مگر مولوی صاحب نے رقم نہ لی اور چلے گئے اور پھر واپس نہ آئے۔ والد نے چند روز بعد ان کی فاتحہ کر دی۔

اس جنگ شش ماہہ میں کالے خاں گولنداز نے بڑا نام پیدا کیا اور خوب تاک تاک کر پہاڑی پر گولے برسائے۔ پوربیوں کا یہ حال تھا کہ ہر نفر اپنے تئیں خود مختار بلکہ بادشاہ سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ ابوظفر محمد بہادر شاہ سے بھی گستاخیاں کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ بادسا بادسا کہوں کا جس کے مونڈ پر ہم منڈا رکھ دیں توں ہو بادسا ہو گئے (یعنی بادشاہ کاہے کا جس کے سر پر ہم جو تاج رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے)

مرزا عاشور بیگ کی معرکہ آرائی

مجھ کو خوب یاد ہے کہ بڑے ابا مرحوم ایک روز دستار و کمر بستہ بادشاہ کے پاس گئے اور ان سے کچھ فوج طلب کی تاکہ انگریزوں سے حریف

بادشاہ نے جواب دیا کہ "آ ما میرے پاس فوج کہاں ہے جو میں کسی کو دوں۔ اسی برس کی میری عمر ہو گئی۔ اعضا رسب بیکار ہو گئے۔ یہ جنگ میری لڑائی نہیں میری خود سر فوج لڑ رہی ہے۔ اگر تم کو شوقِ جنگ ہے تو اس فوج کے افسروں سے معاملہ کر لو۔" چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دو پلٹنیں سے کر وہ شہر کے باہر نکلے۔ بانک پت پر گوروں سے مقابلہ ہوا اور کچھ چھکڑے غنیمت کے لوٹ کر حضرت مرحوم گھر واپس آئے اور باہر کے جلو خانہ کے حجروں میں وہ سب غنیمت مقفل کر دی۔ دوسرے روز افسرانِ فوج ان کے پاس آئے اور کہا کہ میرزا صاحب یہ غنیمت تقسیم کر دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اس کے مستحق نہیں ہو۔ "چے لام زبر چل، دال واو پیش دو چل دو۔" ہر چند ان سب نے اور والد مرحوم نے ان کو سمجھایا کہ یہ تکرار مناسب نہیں تمام فوج بگڑ جائے گی مگر بڑے ابا نے کسی کی نہ سنی۔ اور لوگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ کل سمجھ لیں گے۔ دوسرے دن یہ خبر ملی کہ وہ لوگ مع ایک جمعیت مسلح مستعد بفساد آ رہے ہیں۔ یہاں بھی لڑائی کی تیاری کر لی گئی۔ نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین کے اپنے بہنوئی کی مدد کو آ گئے۔ پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ملازمین جستہ جستہ مقاماتِ مناسبہ پر بندوق تلوار دے کر کھڑے کر دئے گئے۔ بڑے ابا اور ان کے فرزند اکبر ادھر ادھر استحکام میں مصروف تھے۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ نے فرصت پا کر یہ مشورہ کیا کہ جس طرح ہو سکے صلح کر لی جائے۔ باہم مشورہ کر کے دونوں نے بڑے ابا سے کہا کہ آپ مع چند ملازمین کے دیوان خانہ کی چھت پر جائیں تاکہ آپ کو ٹھیک طرح موقع بندوق چلانے کا ملے اور ہم یہاں پھاٹک پر ان کو روک سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تو کوٹھے پر گئے اور نواب ضیاء الدولہ نے زینہ کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا اور خود پھاٹک پر مع والد مرحوم ان کے پاس گئے اور گفتگو صلح کی شروع کر دی۔ افسروں نے کہا کہ میرزا صاحب ناحق ضد کرتے ہیں۔ اگر ہم خاموش رہ جائیں تو یہ جمعیت کس طرح خاموش رہ سکتی ہے۔ خلاصہ ایں کہ قرار پایا کہ جمعیت دور کھڑی رہے۔ افسرانِ فوج ہمراہ آ کر مالِ غنیمت کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد تقسیم کر لی جائے۔ چنانچہ حجروں سے قفل کھولے گئے۔ افسروں نے دیکھا کہ حجروں میں پرانی کرتیاں، جوتے اور ٹوپیاں بھری ہوئی ہیں۔ افسروں نے تعجب کیا کہ اس ہی مال پر میرزا صاحب ہم سے لڑتے تھے۔ الغرض افسروں نے سپاہیوں کو بلا کر وہ مال دکھا دیا۔ سبھوں نے یہ کہا کہ یہ مال مرزا صاحب کو مبارک رہے اور باجا بجاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ادھر بڑے ابا اور ان کے فرزند اکبر مع ملازمین کے گولے بارود سے طیار منتظر تھے کہ جمعیت زد پر آئے تو حملہ کر دیا جائے۔ نواب ضیاء الدولہ نے حجرہ اسی طرح مقفل کر دیا اور زینہ کا دروازہ کھول کر اپنے بہنوئی کو طلب کیا اور اطلاع کر دی کہ مخالفین کی فہمایش کر دی گئی۔ اب کوئی خدشہ نہیں رہا۔

جس دن انگریز شہر پر حملہ آور ہوئے اور کشمیری دروازہ پر قابض ہوئے۔ اہلِ شہر متوحش اور سراسیمہ شہر سے نکل کر بھاگنے لگے۔ اس وقت نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین اور جوان فرزندوں کے خانچن کے کوچہ میں چلے آئے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور تقدیرِ الٰہی کے منتظر رہیں۔ والد مرحوم اور نواب ضیاء الدولہ بہادر نے ہر چند چاہا کہ سب مستورات، بیگمات، ملازمین، مذکور و اناث اس وقت فرصت میں کہ ہنوز انگریز شہر میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ مثل دیگر خلائق کے کسی طرف نکل جائیں۔ مگر بڑے ابا راضی نہ ہوئے وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت کو علم نجوم و رمل میں بڑا دخل تھا اور یہ حکم لگا رکھا تھا کہ انگریزوں کو شکست ہو گی۔ میرزا احمد بیگ نے بھی کہ ان فنون میں شاگردِ رشید والد کے تھے۔ باجازت اپنے والد کے قرعہ ڈالا تھا اور یہ حکم لگایا تھا کہ فلاں روز انگریز شہر میں داخل ہوں گے۔ اس حکم پر بڑے ابا نہایت برافروختہ ہوئے اور بیٹے سے کہا کہ افسوس ہے تو ان فنون میں اب تک نالائق رہا۔ القصہ والد مرحوم افسوس کناں دہلی دروازہ واپس آئے تاکہ سب گھر والوں کو اور کچھ ضروری سامان لے کے خانچن کے کوچہ سے واپس جائیں اور شرکت کریں مگر اس میں ناکام رہے یعنی شہر میں یکایک قیامت برپا ہو گئی۔

اپنی گرمی میں جا ملا۔ تب سب کی جان میں جان آئی۔ خود ہمارے دونوں خدمتگار روزانہ ادھر اُدھر دور تک نکل جاتے اور لٹیروں کے ساتھ مل کر جنس وغیرہ کھانے کی چیزیں لوٹ لاتے اور ایک گھڑا پانی سے بھرا پتھروں کے چولہے پر دھرا رہتا تھا۔ اس میں ڈالتے جاتے۔ دال، چاول گوشت، گڑ، گیہوں، آٹا سب اس میں مل کر پکتا تھا۔ جس کو بھوک لگتی دبے دبے پاؤں گھڑے کے پاس جاتا اور اپنا پیٹ بھر کر پھر کسی دیوار، منڈیر کی آڑ میں چھپ رہتا۔ انہی نوکروں نے خبر دی کہ خالہ صاحبہ اور ان کے ساتھ دو سو رشتہ دار مرد اور عورت برف خانہ میں مقیم ہیں۔ ہم سب گرتے پڑتے برف خانہ پہنچے تو وہاں دیکھا۔ ہر طرف پہرا چوکی ہے اور سب لوگ اطمینان سے بے خوف اور بافراغت گزر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خالو ابا نے الور سے جمعیت اور سواریاں اونٹ، چھکڑے، رتھیں، بہلیاں، پالکیاں اور انگریزی پروانے راہداری اور نقد کثیر رقم بھیجی ہے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی انو جان ریاست الور کے وزیر اعظم تھے اور

شہر پر انگریزوں کا قبضہ اور کشت و خون

ہر گلی کوچے میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ راستے سب بند ہو گئے۔ گورے، خاکی اور افغانی ہر قسم کے ہتھیار باندھے فتح کے نشہ میں سرشار لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ زن، بچہ، ضعیف، جوان میں فرق نہ کرتے تھے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ زنانوں میں گھس گھس کر غارت گری شروع کر دی۔ وہ بیبیاں کہ بقول فردوسی؛

برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

کی مصداق تھیں گھر چھوڑ کر اپنے مردوں سے حالات سے بے خبر جدھر کو منہ اٹھا بھاگ رہی تھیں۔ ہمارے مکان سے شہر کا دروازہ قریب تھا۔ والد مرحوم اور ماموں محمد ابراہیم خاں مع سب اہل و عیال و ملازمین کے افتاں و خیزاں شہر کے باہر نکل گئے اور حضرت سید حسن رسول نما کی درگاہ میں پہنچ کر وہاں کے کھنڈروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں رحیم بخش اور غلام رسول دو قدیم ملازمین بھی ہتھیار بند پہنچ گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عین دار و گیر کے دن بڑے ابا اور نواب ضیاء الدولہ مع اعزا و ملازمین مسلح گھر سے نکلے۔ ان کا چوک میں کالے منشاف سے مقابلہ ہو گیا۔ وہیں سب مرد شہید ہو گئے۔ عورتوں بچوں کا حال معلوم نہیں کہ کدھر گئے۔ جو صدمہ سامعین کے دلوں پر گزرا، وہ قابل بیان نہیں مگر خود اپنی مصیبت بھی کم نہ تھی۔ دونوں فریقوں سے خوف جان و مال تھا۔ باغی ایک طرف اور خاکی وغیرہ انگریزی فوج دوسری طرف۔ گویا شرط باندھے ہوئے تھے کہ کون خون خرابہ لوٹ مار زیادہ کرے۔ ایک دن کا واقعہ مجھ کو یاد ہے کہ میں اور دوسرے ہم سن بچے درگاہ شریف کے باہر املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے اور ایک لڑکا املی پر چڑھ کر کتارے پھینک رہا تھا کہ دور سے خاکی دکھائی دیئے بلکہ ایک خاکی تیغ بکف ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ہم سب بچے کھنڈروں کی طرف "خاکی آ گئے" کہتے ہوئے بھاگے۔ عورت مرد سب یہ آواز سن کر کھنڈروں سے نکل کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ بارے وہ خاکی چند قدم چل کر پھر

میری حقیقی خالہ کے شوہر تھے۔ یہاں دوسرے رشتے دار بھی رفتہ رفتہ جمع ہونے لگے مثلاً بڑے خوجم صاحب (مترجم بوستانِ خیال) کہ میرے رشتے کے چچا تھے اور بڑے ابا کا منجھلا فرزند مرزا محمود بیگ اور عورت مرد دیگر اعزا بھی آملے۔ اب ہم امیرانہ ٹھاٹ سے الور روانہ ہوئے۔ راستہ میں چند منزل بعد نواب محمد غلام فخرالدین خاں مع اہل و عیال ایک چھکڑے میں لدے ہوئے ملے۔ غلام فخرالدین خاں میری پھوپی مرحومہ موصوفہ امانی خانم کے اکلوتے بیٹے اور نواب دبیرالملک اسداللہ خاں غالب کے نہایت پیارے بھتیجے داماد تھے جن کی تعلیم کے واسطے غالب نے "ماہ نیم ماہ" و "پنج آہنگ" وغیرہ کتابیں تصنیف کی تھیں یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ چند روز یہاں آرام سے گزرے تھے کہ پھر فلکِ شعبدہ باز نیا رنگ لایا۔ ٹھاکر لکھدیر سنگھ حقیقی چچا مہاراج کا باافر رئیس تھا یکایک اس نے بغاوت کر دی اور راتوں رات ہمارے گھروں پر جمعیت کثیر ٹھاکروں اور مینوں کی لے کر حملہ آور ہوا کچھ کشت و خون کے بعد مینے مکان میں گھس آئے۔ ان مینوں نے پیٹ بھر کر ہم سب کو خوب لوٹا۔ الغرض ہم مینوں کے دست برد کے مظلوم ایک تباہی کی حالت میں وہاں سے نکالے گئے۔

راستہ میں ایک ندی پڑتی ہے جس کا نام سابی ہے۔ ہمیشہ خشک رہتی ہے۔ شاید برشگال میں بھری رہتی ہوگی لیکن کبھی کبھی غیر موسم میں بھی کسی وجہ سے اس میں یکایک پانی آجاتا ہے اور اس زور سے آتا ہے کہ ہاتھی بھی اگر سامنے ہو تو بہہ جائے اور جب پانی سب بہہ جاتا ہے تو پھر خشک ہو جاتی ہے۔ ہمارا جو حال ہوا ناقابل بیان نہیں پانی کے دھکے کا صدمہ، ڈوب جانے کا خوف سر سے پاؤں تک پانی میں ڈوبے ہوئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہ بھی میدان اور جنگل کی۔ غرض کہ جانیں بچ گئیں۔ اسی کو غنیمت سمجھئے۔ کھانا وغیرہ اور کچھ جنس جو ساتھ تھی وہ سب ستیاناس ہوگئی۔ رائے یہ قرار پائی کہ اسی حالت میں جس طرح ہو سکے منزل ختم کرنی چاہیے مگر مینوں کی سے کچھ کید ارجھگڑا لاکے کہ مال اسباب دکھاؤ۔ یہاں تک کہ مار کٹائی پر فریقین تیار ہو گئے والد نے کچھ زر نقد ان کے حوالے کیا۔ تب ہم سب عجیب حالت بیچارگی میں آگے روانہ ہوئے اور منزل بمنزل شیدی پور ایک قصبہ شہر دہلی کے باہر پہاڑی پر تھا وہاں پہنچے۔

شیدی پور میں قیام

یہاں ہمارے جد چچا مرزا جیون بیگ خاں کے پوتے مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولہا بیگ مع اہل و عیال و اطفال مقیم تھے۔ ہم سب ان کے پاس اترے۔ یہاں بڑی اماں مع اپنے دونوں لڑکوں خداداد بیگ و رفیع الدین بیگ اور دختر آبادی بیگم بھی آگئیں اور مفصل حال شہیدوں کا سنایا۔ یعنی یہ کہ بڑے ابا مرزا عاشور بیگ مع اپنے فرزند اکبر مرزا احمد بیگ و دیگر عیال و ملازمین اور نواب ضیاء الدولہ مع اہل و عیال و ملازمین سب ہتھیار بند و کمر بستہ چاندنی چوک میں آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے گوروں کی جمعیت نظر آئی۔ آگے آگے ان کے سر تھیافلس مٹکاف چلا آتا تھا۔ اس کو اہلِ شہر "کانڑا مٹکاف" اس واسطے کہتے تھے کہ وہ ایک آنکھ پر شیشہ لگاتا تھا اور بادشاہ کے دربار میں رزیڈنٹ یا ایجنٹ تھا۔ اس ظالم نے فوراً سب کو گھیر لیا۔ مرزا احمد بیگ نے تلوار میان سے نکالی مگر ان کے والد نے ان کو روک دیا اور کہا کہ بس اب شہادت کے لیے تیار ہو جاؤ اور کلمہ توحید کا ورد کرو۔ سر تھیافلس نے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو الگ کھڑا کر دیا اور مردوں کی رسن بستہ قطار کھڑی کر دی اور حکم فائر کا دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی وقت ایک انگریز نے ضیاء الدولہ کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ یہ یکم تحیم آدمی زمین پر گر پڑے۔ ادھر رسن بستہ قطار مثل مرغان مذبوح لوٹنے لگے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نواب ضیاء الدولہ عورتوں اور بچوں کو لے کر سپنت گئے اور وہاں سے شیدی پور آگئے۔

الغرض شیدی پوری میں ہم لوگ چند روز مقیم رہے۔ شہر کے دروازہ پر گوروں کا پہرہ تھا۔ بلا ٹکٹ آمد و رفت مسدود تھی۔ بھائی علی مرزا بیگ جن کا انتقال

میر محبوب علی خاں آصف

حال میں ہوا ہے۔ ان کو ضرورت شہر میں جانے کی تھی۔ میں بھی ساتھ ہو اوہ کپتان کے بنگلہ پر ٹکٹ کے واسطے گئے۔ کپتان اتفاقاً باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار انگریز کی صورت دیکھی۔ وہ نہایت گورا چٹا اور فربہ تھا۔ میرے سر پر اس نے ہاتھ پھیرا اور ٹکٹ دے دیا۔ شیدی پوری میں چچا مرزا عباس بیگ کا خط والد کے نام آیا کہ تم عاشور بیگ شہید کے اہل و عیال سمیت فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

مرزا عباس بیگ سیتا پور ملک اودھ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے ان کو جاگیر علاقہ بڑا گاؤں عطا کی تھی اور علاوہ اس کے چھ سو روپیہ ماہوار بھی کر دیئے تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کو بہت کم ملتے تھے۔ علاوہ خط کے چچا صاحب نے خرچ راہ اور پروانہ راہداری بھی بھجوا دیا تھا۔ چچا مرزا دولہا نے اپنے منجھلے فرزند علی مرزا بیگ کا نکاح بڑے ابا شہید کی منجھلی لڑکی آبادی بیگم سے بمشورہ والد ماجد کر دیا اور ہم سب لوگ سیتا پور روانہ ہو گئے۔ شیدی پوری کے قیام میں کوئی بات قابل تحریر نہیں بجز اس کے کہ ہر جمعہ کی سہ پہر کو شیدی گوہر کے باغ میں عبداللہ خاں داستان گو امیر حمزہ کی داستان کہا کرتے تھے۔

والد مرحوم کو مرض مراق تھا اور شدت مرض میں یہاں کی نوبت جنون کی پہنچی تھی کہ از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی۔ دادا صاحب مرحوم (مرزا اکبر بیگ) سیلانی آدمی تھے۔ عربی فارسی میں فرد فرید تھے اور علوم ریاضیات ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے علاوہ فن نجوم و رمل میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ممالک میں سیر و سفر کیا۔ حتیٰ کہ اس زمانہ میں حج بیت اللہ کی نعمت حاصل کرتے ہوئے براہِ مصر ملک اطالیہ پہنچے اور وہاں عملی ریاضیات حاصل کی۔ وہاں سے مغرب اقصیٰ کی سیر کرتے ہوئے حیدر آباد دکن واپس آئے اور مہاراج چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ اسی زمانہ میں میرزا یوسف برادر حقیقی کلاں مرزا اسد اللہ خاں غالب الخواج قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت معتمد عہدہ پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلا دی کہ وہ مجنون محض ہو گئے اور تا وقت انتقال مجنون رہے۔ الغرض دادا صاحب (مرزا اکبر بیگ) مہاراج سے رخصت ہو کر دہلی واپس آئے اور اپنے مکان شیش محل میں گھنٹہ گھر یعنی کلاک ٹاور کھڑا کیا جو تمام ہندوستان میں اس وقت تک کہیں نہیں بنا تھا مگر چند روز بعد پھر سفر کو نکلے اور لکھنؤ آئے۔ اس بار والد مرحوم کو بھی ہمراہ لائے۔

لکھنؤ میں افیون کھانے کا رواج ادنیٰ و اعلیٰ میں بہت تھا۔ والد مرحوم کو بھی افیون کی بکثرت عادت پڑ گئی۔ جب دہلی واپس آئے تو بعض احباب نے چھیڑنا شروع کیا۔ اور پھوپی صاحبہ نے جب ان کی نسبت تلاش کی تو کوئی اپنی لڑکی دینے پر راضی نہ ہوا اور مرحوم کو اس قدر غیرت دامن گیر ہوئی کہ ایک مرتبہ قسم کھا بیٹھے کہ آج سے افیون نہ کھاؤں گا۔ ایک دم ترک کرنے کے باعث سخت بیمار پڑ گئے۔ اس زمانے میں حکیم محمود خاں کی شہرت شروع ہوئی تھی اور والد مرحوم میں اور حکیم صاحب مغفور میں کمال محبت تھی۔ انہوں نے خاص توجہ سے ایسا نادر علاج کیا کہ گویا مردے کو زندہ کر دیا۔ بایں ہمہ دماغ پر اس عادت بد کا کچھ اثر باقی رہ گیا تھا۔ جس سے کبھی کبھی مراق کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ ●●

فسانۂ عجائب

(رجب علی بیگ سرور)

پہلے وہاں کے ہمدان محرر داستان مقلد گذشتگان سراپا قصور رجب علی بیگ تخلص سرور متوطن حال خطۂ بے نظیر دلپذیر رشک گلشن جناں مسکن حور و غلماں جائے مردم خیز، باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز اگر دیدۂ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھیے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرلے

شعر؎
نثار رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ و بحمدہ۔ عجب شہر گلزار ہے ہر گلی و کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطعدار ہے دورویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دکان میں سرمایۂ ناز و نیاز کا ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ شیرمال کباب نان نہاری جہاں کی نعمت اس آبداری کی جس کی بوباس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گزرے تو سونگھے کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ رغبت ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے وہ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سرخی جھنکار شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ ہر کنجڑن کی وہ سج دھج چتون آدمی رشک شمشاد دوکانوں میں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے رو در رو محاورے ان کے دیکھے نہ سنے کبھی کوئی پکار اٹھی میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی ہے مرواگھور کا ہے۔ کنجڑوں میں کسی طرف یہ صدا آتی ہے۔ گنڈیریاں پونڈے کی۔ ایک طرف تمبولی سرخروئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتی مکھن کا منھ کالا مہوبا گردکر ڈالا۔ بمبئی نہ کلال ہے۔ کتھے چونے سے ادھی میں کھڑا لال ہے۔ مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خداداد ہے جاہل ہر فنکار استاد ہے۔ سینکڑوں کھامڑ بدشکل کندۂ ناتراش اطراف و جوانب سے آ کے تھوڑے عرصے میں چھیل چھبیلا وضعدار ہو گئے صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی صبح بھول جاتی ہے۔ شہر نفیس مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔

بندہ کمترین تلامذہ اور خوشہ چیں خرمن سخن جناب قبلہ استاد شاگرد نواز معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال نیک سیرت فرخندہ خصائل خرد آگاہ دانش آموز و یادگار جناب میر سوز عرفی عمر سعدی زمان رشک انوری و خاقانی نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خاقانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقت حال یہ مقام ہے کہ طرز ریختہ اور روزمرہ اردو کا ان پر اختتام ہے۔

حسب الاتفاق ایک روز مع چند دوست صادق محبان صفا کیش و موافق باہم بیٹھا تھا۔ مگر نیرنگی زمانہ ناہنجار و کجروی فلک سفلہ پرور دوں نواز جفا شعار سے ہادل حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور حرمان و افکار سے ہر دم یہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے۔ انہوں نے کہا ہے

تو ہم تم پاس بیٹھے ہیں سنو ہر دم غنیمت ہے
یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرت غم و شدت اندوہ و الم دو شخص کو باہم نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت کوئی قصہ کہانی بشیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو اور غنچۂ سربستہ دل با اہتزاز نسیم تکلم کھل جائے فرمانبرداں نے بجز اقرار انکار مناسب وقت نہ جانا۔ چند کلمے گوش گزار کیے اگرچہ گریہ کردن را ہم دلخوش می باید۔ مگر یہ فسانہ انہیں بہت پسند آیا۔ کہا اگر یہ دلجمعی تمام تو اس قصۂ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظور نظر اہل بصیرت ہے۔ بندے نے کہا۔ یہ تو مقدمۂ تحریر ہے اگر سرکار کے کام آجا تقصیر نہیں تحریر اس کی ایفائے تقریر ہے۔ قصۂ دلچسپ بے نظیر ہے۔ نیاز مند کو تحریر سے نمود نظم و نثر و جودت طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔ فسانۂ عجائب اس کا نام رکھا۔

★★

شہزادہ معظم جاہ ولی عہد شہزادہ اعظم جاہ کے بعد اعلیٰ حضرت نظام دکن کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ شجاعت علی خاں اسم گرامی اور شجیع تخلص تھا صاحب دیوان شاعر تھے۔ عجیب بات کہ آزادی سے قبل ہم نے "دیوان شجیع" گورنمنٹ ہائی سکول ٹوہانہ ضلع حصار کی لائبریری میں دیکھا، جہاں اس کی موجودگی کا بظاہر کوئی امکان نظر نہ آتا تھا اور بعد ازاں کہیں نہ دیکھا۔ شہزادہ معظم جاہ کو جونیئر پرنس کہا جاتا تھا۔ ان کا خاص دربار ہر شب کو ان کے محل میں لگتا تھا جس میں صاحب ذوق امرائے حیدر آباد کے علاوہ اس دور کے مشاہیر شعرا مثلاً فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، صدق جائسی اور نجم آفندی شریک ہوتے تھے۔ پرنس معظم جاہ کی ان درباری محفلوں کا حال صدق جائسی نے اپنی بلیغ و بہار کتاب "دربار دُربار" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس دربار کے دو ایک واقعات کا ذکر کر کے ہم اس داستانِ طویل کو ختم کرتے ہیں۔ صدق جائسی، فانی بدایونی کے حوالے سے لکھتے ہیں،

"برسات کا موسم اور ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر

سلطنت آصفیہ کے دلچسپ واقعات

(عبدالمجید قریشی)

ابر دُھواں دھار چھایا ہوا تھا اور بجلی زور و شور سے چمک رہی تھی۔ کھانے کا وقت آیا تو پرنس نے اسٹاف افسر کو حکم دیا کہ کھانے کی میز اس وقت لان پر لگوائی جائے۔ پھر پیا کی طرف دیکھ کر فرمایا: "موسم خوش گوار ہے۔ باغ میں کھانے کا لطف آئے گا۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بہت صحیح ارشاد ہوا۔" پھر کہنے لگے: "صاحب ماشاءاللہ آپ نے دادا کا مزاج پایا ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم بھی برسات میں اکثر لان ہی میں خاصہ تناول فرماتے تھے۔" پھر دست بستہ ہو کر شعر پڑھا کہ

کیا موسمِ گل ہے روح فزا چھتی ہے عجب پر کیف ہوا
وہ شخص چمن میں خار بنا جو چاک گریباں ہو نہ سکا

پرنس نے کہا: "پیا سچ کہتے ہو موسم ایسا ہی فرحت بخش اور فرح ناک ہے۔" دو منٹ کے بعد پرنس اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیچھے پیچھے چالیس پینتالیس مصاحب ہوں گے۔ میں نے باہر نکل کر آسمان کا رنگ دیکھا تو کانپ گیا۔ ایسی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی گویا آج ساری دنیا کو ڈبونے کا تہیہ کر کے اٹھی ہے۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ صرف پرنس کا راستہ برقی قمقموں کی قطار سے دن کی طرح روشن تھا۔ بجلی کا انجینئر جس کی ڈیوٹی تھی حکم کے ساتھ ہی باغ میں پہنچ چکا تھا۔ باغ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر درخت میں سرخ سبز زرد گلابی سفید اور اودے اور ہر رنگ کے ہزاروں بلب روشن تھے۔

پرنس خراماں خراماں لان پر پہنچے۔ خاصے کی میزیں اس عالمِ نور میں آئینے کی طرح چمک رہی تھیں۔ پرنس کے بیٹھتے ہی مصاحب بھی سلیقے سے اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خدام کی خوبصورت اور نظر فریب ٹکڑی سفید وردیوں میں پانی پلانے کے لیے سامنے کھڑی تھی۔ ایک طرف باورچی خانے کا عملہ تھا۔ اسٹاف افسر حکم کا منتظر بت بنا ہوا کچھ فاصلے پر حاضر تھا۔ سروس شروع ہوئی، بارش جیسے سروس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ پرنس نے پستئی رنگ کے سوپ سے اور پانی نے پھوار سے ابتدا کی۔ دو چار منٹ میں ہماری رکابیوں میں تین حصے سوپ اور ایک حصہ پانی بھر گیا۔ پرنس نے سوپ کی بدمزگی محسوس کر کے چمچہ ہاتھ سے رکھ دیا اور پیا سے مخاطب ہوئے: "پیا سوپ اس وقت فرادے رہا ہے۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ اس وقت یخنی غلام کو بھی روز سے زیادہ لذیذ معلوم ہو رہی ہے۔"

یخنی کی پلیٹوں کا اٹھانا تھا کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ حسنِ اتفاق سے اس روز پرنسس بھی شریکِ طعام تھیں، ان سے تو پرنس نے اتنا ضرور کہا: "آپ اپنے کمرے ہی میں خاصہ منگوا لیجیے۔" وہ اٹھ کر فوراً محل میں چلی گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب خود بدولت بھی اٹھ کھڑے ہوں گے، مگر توبہ کیجیے جو اس اللہ کے بندے پر جوں بھی رینگی ہو۔ بارش ہر لمحے تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی، مگر سروس اسی ادب اور قاعدے سے جاری تھی۔ دو ہی پلیٹوں کے آنے اور اٹھنے میں پرنس اور درباری شرابور ہو چکے تھے۔ بریانی میرے سامنے آئی تو دو سیکنڈ میں ہی میری پلیٹ کا ایک ایک چاول مائل بہ فرار ہو گیا۔ لاحول پڑھ کر اس سے بھی دست کش ہو گیا۔ سالن آنے شروع ہوئے تو جو سالن لیتا ہوں پلیٹ تک آتے آتے بوٹیاں اس طرح دھل جاتی تھیں گویا آج انھوں نے مسالے کا منہ ہی نہیں دیکھا۔ البتہ پہلی بوٹی میں جسے میں فوراً ہی منہ میں رکھ لیتا تھا کسی قدر نمک اور مرچ کی آمیزش باقی رہ جاتی تھی۔ بقیہ دھل دھلا کر کھانے کے قابل نہ رہتی تھیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ سالن آٹھ دس قسم کے تھے۔ میں نے ہر سالن کی ایک بوٹی سے پیٹ کے دوزخ کو بھر لیا۔

پرنس ایسی ادائے بے نیازی سے صدر میں رونق افروز تھے گویا سینما ہال میں کوئی فلم ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اُدھر پانی کے آثار اسے زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ آج ساتوں سمندروں کا پانی اُبل کر تم سب پر نہ پھینک دیا تو ہمیں ساون کی گھٹا نہ کہنا۔ پانی کا زور دم بہ دم بڑھتا ہی جاتا تھا اور طوفانِ نوح کا سماں پیشِ نظر تھا۔ ہمارے سروں پر اتنا پانی پڑ چکا تھا کہ ڈنر کے اختتام پر پانی کی ایک موٹی دھار شیروانی، قمیص اور بنیان کو توڑ کر میری پیٹھ پر مسلسل بہہ رہی تھی، جس سے سارا پاجامہ بھی بھیگ

گیا تھا۔ ڈنر کے خاتمے پر، پرنس نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے، طمانیت کے ساتھ گلوری کھائی، پھر بڑی دلجمعی سے خلال کرنے لگے۔ خدمت گاروں نے اب مصاحبوں کے ہاتھ دھلوانے شروع کر دیے، حالانکہ ہمارے ہاتھ پہلے ہی دھلے دھلائے تھے۔

پندرہ منٹ کے بعد پرنس کرسی سے اٹھے، ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آگے آگے پرنس اور پیچھے پیچھے مصاحبوں کا تر بتر انبوہ۔ سرکار اس وقت بھی اس اطمینان سے چل رہے تھے گویا اچھے بھلے دنوں میں گل گشتِ چمن میں مصروف ہیں۔ چلتے چلتے یکایک ٹھہرے اور ہنسا سے فرمایا "حضرت رابعہ بصریؒ اپنے وقت کی قطب تھیں۔" ہنسا نے دست بستہ عرض کی "آپ بہت صحیح ارشاد ہوا صاحب! خانہ زاد نے سنا ہے کہ ان کی خدمت میں بڑے بڑے اولیا اللہ حاضر ہوا کرتے تھے۔" غرض اسی طرح ٹھہرتے اور چلتے خدا خدا کر کے ہل فورٹ کی گیلری میں داخل ہوئے۔ وہاں چھت کا سایہ ہمارے سروں اور کسی قدر گرمی ہمارے جسموں کو نصیب ہوئی۔

نازک مزاجِ شاہاں | ایک روز خاصہ تناول فرماتے ہوئے پرنس نے پانی مانگا۔ آب دار خانے کے ایک خوبصورت خادم نے فوراً نہایت ادب کے ساتھ ایک شفاف گلاس میں آبِ مصفا پیش کیا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہی پرنس کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ دریافت فرمایا: "یہ گلاس کس خدمت گار نے صاف کیا ہے؟" ملازم فرطِ خوف سے کانپنے لگا۔

پرنس نے غصیلی آواز میں، "اس گلاس سے بو آتی ہے، فانی! ذرا تم گلاس ہاتھ میں لے کر دیکھو۔"

فانی نے ادب سے کھڑے ہو کر گلاس کو ہاتھ میں لیا اور ناک کے قریب لے گئے، پھر عرض کیا: "بے شک بو آتی ہے۔" حالانکہ وہ بلوریں گلاس ایسا صاف و شفاف تھا جس سے زیادہ صفائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد ہوا "ہنسا تم بھی دیکھو۔" "بہت خوب" کہہ کر ہنسا نے کھڑے ہو کر فانی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور گلاس کو ہاتھ لگاتے ہی کہنے لگے: "بہت صحیح ارشاد ہوا، بے شک بو آتی ہے اور یہ آب دار خانے کے چھوکروں کی سراسر لاپروائی ہے۔"

میں دل ہی دل میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ شہزادے کے آب دار خانے کا گلاس وہ بھی خاصے کا، چاندی سے زیادہ صاف، آئینے سے بڑھ کر شفاف، یہ کم بخت بو اس میں کہاں سے آ گھسی کہ جو ہاتھ میں لیتا ہے اسی کا دماغ پریشان ہو جاتا ہے؟ پھر خیال آیا تائید کرنے والے تمام مصاحب ہیں، ہاں میں ہاں ملانا ہی ان کا کام ہے، اگر تمہیں سے ارشاد فرماتے کہ صدق تم دیکھو تو تم بھی کہتے جو ہنسا اور فانی نے کہا، اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو تمہیں یہی کہنا چاہیے "بجا ارشاد ہوا، وہ سامنے چاند نور افشانی کر رہا ہے اور وہ اس کے پاس ہی ستارے چمک رہے ہیں۔" یہ دروغِ مصلحت آمیز صدقِ فتنہ انگیز سے کہیں بہتر ہے۔

شبِ عیش: اختری بائی فیض آبادی جو دو ہفتوں سے ایک ہزار روپیہ روزانہ پر آئی ہوئی تھی اور پرنس کی مہمان تھی، آج اس کے قیام کا آخری دن تھا اور آج کی رات اس کا آخری مجرا تھا۔ دو بجے رات کو پرنس نے اس سے ٹھمری کی فرمائش کی۔ سوز وہ ساز سے اپنی آواز ملا رہی تھی جو اتنی سریلی تھی کہ سارنگی کی صدا اور اس کی آواز میں سننے والا مشکل سے تمیز کر سکتا تھا۔ میرے دل میں جذبۂ توصیف نے انگڑائی لی۔ میں نے خیال کیا "سبحان اللہ کیا دل کش آواز ہے، جس میں اور سارنگی کی آواز میں مطلق فرق نہیں ہے۔" اتنے میں پرنس نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:

پرنس: "صدق، دیکھ رہے ہو، کیا سریلی آواز ہے کہ سارنگی کی آواز اور ان کی آواز میں تمیز نہیں ہوتی؟"

میں: "سرکار فدوی خود اس مشابہت آواز کے مزے لے رہا تھا اور یہی بات خود کہنا چاہتا تھا کہ سرکار نے سبقت فرمائی اور میرے منہ کی بات چھین لی۔"

حسبِ معمول تین بجے شب محفل برخاست ہوئی اور پرنس نے ہم سب کو رخصت کی اجازت دی۔ فانی اور میں باہر نکل کر موٹر پر بیٹھے ہی تھے کہ یکایک ایک پیش خدمت دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ سرکار آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے لیے ہوئے بل فورٹ کی ایک کشادہ چھت پر پہنچا جہاں شطرنجی کا فرش تھا اور ایک کرسی پر پرنس رونق افروز تھے۔ میں آداب بجالایا۔ پرنس نے فرمایا "صدق! رات اتنی تھوڑی باقی رہ گئی ہے کہ اس میں آرام کا خیال کرنا آرام و استراحت کی توہین کرنا ہے۔ اس خیال سے میں نے تم کو واپس بلا لیا کہ اب تم میرے ساتھ صبح کا ناشتہ کر کے گھر جاؤ۔" پھر ایک پیش خدمت کو حکم دیا "فوراً موٹر لے کر بنجارہ ہل جاؤ اور اختری کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ سو گئی ہو تو جگا لینا۔ کہنا میرا حکم ہے ایک سیکنڈ کی تاخیر نہ ہو۔" دوسرے خدمت گار کو حکم دیا "دیکھو اختری کو ہماری طرف سے رخصتانے میں جو تحائف دیے جائیں گے وہ حاضر کرو۔" پانچ منٹ کے اندر اختری نے حاضر ہو کر سلام کیا ارشاد ہوا "صبح قریب ہے میرے خیال میں اس وقت سونے کے ارادے سے لیٹنا بہ ہیں معترض سخن ہو کر "دیدہ و دانستہ شب بیداری کا ثواب کھونا ہے۔" پرنس ہنسنے لگے اور اختری کو بھی بے اختیار ہنسی آ گئی۔

رخصتی تحائف! اتنے میں خوش سلیقہ خدام نے تحائف سامنے رکھنے شروع کیے۔ بارہ نقرئی کشتیوں میں ایک درجن جدا جدا ساڑھیاں تھیں۔ ہر ساڑھی کے ساتھ بلاؤز کا بیش قیمت کپڑا تھا۔ ہر ساڑھی قیمت میں ایک ایک ہزار کی تھی۔ نوار کا ایک پلنگ تھا جس کے پائے ٹھوس چاندی کے تھے۔ چاندی ہی کا ایک جال دار خوش نما صراحی اسٹینڈ تھا۔ بہت خوبصورت ایک نقرئی گلاس تھا۔ چاندی ہی کا ایک پاندان، ناگردان اور ایک اگالدان تھا۔ ایک بہت قیمتی رسٹ واچ تھی۔ خدام نے میرے سامنے اس اہتمام اور سلیقے سے ان تحائف کو سجایا جس طرح کسی امیر کی لڑکی کی رخصتی میں جہیز لڑکے والوں کے سامنے سجاتے ہیں۔

پرنس: "صدق! میری طرف سے یہ حقیر تحائف مہمانِ عزیز کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔" اختری اٹھ کر آداب بجا لائی۔

میں: "بجا ارشاد ہوا لیکن ایسے خوش قسمت کی قسم کھانی چاہیے جس پر سرکار کی ایسی نظرِ عنایت ہو۔"

پرنس: "تحائف کا پیش کر دینا میرے لیے بہت آسان تھا لیکن ساڑھی اور بلاؤز کے کپڑوں کی میچنگ کی داد صدق سے حاصل کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔"

میں: (دست بستہ ہو کر) "سرکار کا ہر انتخاب اپنی جگہ لاجواب ہے۔ ہر بلاؤز ہر ساڑھی پر ایسا موزوں ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ ہوتا ہے۔"

پرنس اپنے تحائف کی اس تعریف پر مسرور نظر آتے تھے اور غالباً اسی لیے انھوں نے مجھے روک بھی

لیا تھا۔ کہنے لگے: "چلو میرا اطمینان ہو گیا میں تمہاری باریک بینی کا قائل ہوں۔" میں اٹھ کر آداب بجا لایا۔

پرنس اب اختری کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: "میں اسوقت تم کو کچھ کھلانا چاہتا ہوں، تم اسوقت شوق سے کیا چیز کھانا پسند کرو گی؟"

اختری ہاتھ جوڑ کر "سرکار میں ڈنر میں بہت کچھ کھا چکی ہوں۔"

پرنس: "نہیں کھانا تو تم کو ضرور پڑے گا، کیونکہ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تمہیں کچھ کھلاؤں۔ لیکن چیز پسند کرنے کا حق میں تم کو دیتا ہوں، جو چیز کہو گی وہی کھلاؤں گا۔"

اختری اس سے بھی کچھ زیادہ سیانی تھی جتنا اس پیشے کی عورتیں عموماً ہوتی ہیں۔ سوچ کر کہنے لگی "اگر سرکار اسی پر بضد ہیں کہ میں کچھ ضرور کھاؤں تو اناناس کا مربہ کھا لوں گی۔"

میرا دل دھڑکنے لگا کہ خدا ہی پرنس کی آبرو رکھے، بھلا چار بجے رات کو اناناس کا مربہ کہاں سے آئے گا۔

میں نے دل میں اللہ سے پناہ مانگی کہ خدا اپنے بندوں کو اس قماش کی عورتوں سے بچائے۔

پرنس ایک پیش خدمت کی طرف مخاطب ہوئے فرمایا: "ہمارے یہاں اناناس کا کچھ مربہ ہو گا؟" خوبصورت خادم نے پہلے ادب سے سر جھکایا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا: "تھوڑا سا ہو گا۔" پرنس نے فرمایا: "لاؤ۔" چند منٹ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ خادم آگے آگے ہے اور پانچ مضبوط آدمی پانچ بڑے بڑے چینی مرتبان لیے ہوئے پیچھے پیچھے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے اتنے بڑے مرتبان نہ دیکھے تھے۔ ہر مرتبان منہ تک اناناس کے تازہ مربے سے بھرا ہوا تھا اور ہر ظرف میں کم از کم بارہ سیر مربہ تو ضرور تھا۔ میرے ہوش اڑ گئے اور میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص بے شک شاہزادہ ہے، لیکن یہ ایسا کڑا اور نازک امتحان تھا جس میں اودھ کے راجوں مہاراجوں کا کیا ذکر ہے ہندوستان بھر کے والیانِ ریاست ناکام ہو جاتے۔

★★

پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کے رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی سے سرفراز کر کر مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرما دیا۔ چنانچہ یہ لقب شاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس کے گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آپہنچا۔ چندے بے کاری گذری اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی جی کے واسطے سے حضور تک جان گلکریسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے رسائی ہوئی۔ بارے

اردو زبان کی کہانی بزرگوں کی زبانی

از میر امن دھلوی

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانی لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے

طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہے کہ کچھ دن بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدرداں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا نام چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پسماندوں کی گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم۔ قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک

کی گویائی اور بولی جدی کی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے لیکن ایک اردو زبان کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہاں صاحب قرآن نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کرایا اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا۔ اور دَل بادل سا خیمہ چوبوں پر استادہ کر طنابوں سے کھچوایا۔ اور نواب علی مردان خان نہر کو لے آیا۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا۔ تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا اگرچہ دلی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔ اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدردان منصف چاہیئے جو تجویز کرے۔ جواب خدا نے بعد مدت کے جان گلکرسٹ صاحب سا دانا نکتہ رس پیدا کیا کہ جنہوں نے اپنے گیان اور لگت سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا۔ اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی برا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے۔ کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے۔ بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے۔ وہاں کے آدمیوں کی سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے۔ وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا۔ اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے۔ عرس چھڑیاں۔ سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی۔ اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا۔ اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے

سن و تاریخ ولادت

۱۲۹۶ھ

شوال ۱۲۹۶ھ کی ۱۹ویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے شنبہ کا دن گذر جانے کے بعد شب سہ شنبہ میں بمقام بانگر مئو (اناؤ) میں پیدا ہوا۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے۔ تاریخ و سن عیسوی نہیں لکھا ہے۔ حساب سے ۱۸۷۹ء ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگر مئو میں اردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور کئی سال سے مستقلین وہاں مقیم رہے۔

سلسلہ نسب

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی، بن سید جہانگیر علی بخش، بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن، بن شاہ محمد ماہ شاہی، بن شاہ خیر اللہ، بن شاہ صفۃ اللہ، بن شاہ محب اللہ، بن شاہ محمود، بن شاہ لدھن، بن شاہ قلندر بن شاہ منور، بن شاہ راجو، بن شاہ عبد الواحد بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ۔

شاہ نور الحقؒ وہ مورث اعلیٰ ہیں جو اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ، (ضلع فیض آباد) میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں قوم رجبھر کا قبضہ ٹانڈہ کے تمام گرد و نواح اور دیہات پر تھا۔ اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ شاہ نور الحقؒ نے پہنچ کر دعوت اسلام دی مگر راجہ اور عوام مقابلہ پر آئے۔ آپ نے بزور کرامت ان کو روک دیا۔ ان کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ

از: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام اللہ داد پور رکھا جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے باقیماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں۔ اسی قلعہ میں آپ کے اور آپ کی تمام اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آتے ہیں۔

ہجرت مدینہ

(وفاتِ مرشد (مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی) سے بڑے غمگین رہا کرتے تھے) بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب کو لکھ دیا کہ یہاں اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں اب تو مدینہ منورہ چل بسیے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے۔ یہ کلمات ایسے موثر ہوئے جیسے اسپرٹ میں دیا سلائی۔ اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشقِ محمدی کی آگ بھڑک اٹھی ہر دم یہی دھن تھی کہ تمام گھرانے کو لے کر وہیں چلنا چاہیے۔ تدبیریں سوچنے لگے، بارہ نفوس پر مشتمل خاندان کا سفر معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جا کے اور حج و زیارت کر آئیے۔ مگر نہ مانے۔ بیٹوں کے سسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کی طلاق لے لو، میں تو اپنے لڑکے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔

بہوؤں سے کہا جسے چلنا نہ ہو وہ طلاق لے لے۔ میری کتابیں ادب و ہیئت کی کچھ باقی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں میں ایک دو سال بعد آ جاؤں گا۔ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں پوری کر لینا۔ میرے حقیقی خسر تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے۔ میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت مرحوم قتال پوری نے پالا تھا اور وہی شادی کے کفیل ہوتے تھے۔ ریاست بلرام پور میں ملازم تھے۔ ان دنوں ریاست کے معتمد ہو کر وہیں مقیم تھے انہوں نے مجھ کو روکنا چاہا اور والد سے کہا کہ میں خود لکھنؤ میں موجود ہوں حسین احمد کو اپنے پاس رکھ کر حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کے ہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں اس کو یہاں چھوڑ دیجئے۔ والد نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا۔ اس کو علوم دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے اس سے بڑھ کر کونسی تعلیم ہے۔ بالغرض دوستوں، رشتہ داروں، احباب سبھوں نے سمجھایا مگر بقول شاعر

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ سفر حجاز میں جب گورنمنٹ کی طرف سے بہت سختیاں کی جاتی تھیں۔ بالآخر قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجیے۔ تو فرمانے لگے کہ اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر گولہ چلائیں گے اور تو مدینہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

گھر میں سوائے بڑے بھائی سید احمد کے پورا ہم خیال والد مرحوم کا کوئی نہ تھا۔ بڑے بھائی نے جب والد کا یہ عزم مصمم دیکھ کر حضرت گنگوہی سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں چلے جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ کر چلے آنا۔

والد صاحب کا شوق و اضطراب بڑھتا رہا۔ فکر تھی کہ کسی طرح جائداد فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں اس جدوجہد میں عرصہ لگ گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد ٹانڈہ کے ایک رئیس راجہ علی حسین تیار ہو گئے اور غالباً ۳ ہزار روپیہ پر قلعہ اداپور اور جیلون پور کا زرعی حصہ فروخت کر دیا۔ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانگی ہوئی۔

میری تعلیم و تربیت

(میرے کھیل کود کو دیکھ کر) بالآخر والد صاحب نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہیے اور دیوبند ہی بھیج دیا جائے چنانچہ بھائی صاحب کی روانگی کے بعد ۳ ماہ بعد منشی فیروزالدین صاحب بٹالوی کے ساتھ دیوبند بھیج دیا۔ منشی صاحب مرحوم بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کے باشندہ اور والد مرحوم کے بہت دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پیر بھائی ہونے کی وجہ سے آپس میں خلوص اور ربط تھا وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ جا رہے تھے۔ والد مرحوم نے ان کو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جائیے اور دیوبند پہنچا دیجیے چونکہ سہارنپور ہو کر ان کا راستہ تھا اسلئے ان کو کوئی دقت نہ تھی چنانچہ اوائل صفر ۱۳۱۶ھ ہی میں ان کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ انہی کے کمرے میں حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کے قریب رہنے لگا یہ کمرہ حضرتؒ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں

واقع تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گلستان اور میزان شروع کی بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہندؒ سے درخواست کی آپ تبرکاً اس کو دونوں کتابیں شروع کرادیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ حضرتؒ نے مولانا خلیل احمدؒ سے فرمایا کہ آپ شروع کرادیں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کتابیں شروع کرادیں۔

اور پھر بھائی صاحب نے میزان منشعب پڑھائی اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہوچکا تھا۔ مگر جسم اس قدر دُبلا اور پستہ تھا کہ سب ۱۱ سال کا سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہاں مجھ پر شفقت زیادہ کی گئی وہاں اس قدر دور کے نوعمر اور چھوٹے طالب علم نہیں جاتے تھے اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا اور خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے سارے خانگی خطوط اور حسابات کی خدمت انجام دیتا تھا بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہ بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں مستوراتی منشی مشہور ہوگیا تھا۔ دیوبند پہنچنے کے بعد کھیل کود کی رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی بڑے سخت تھے۔ اس وجہ سے علمی شغف زیادہ ہوگیا۔

دارالعلوم کی تعلیمات

بھائی مرحوم نے تو گلستان کے شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے تھے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی جب دونوں خوب یاد ہوگئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے بعد دیگرے پڑھیں۔ یہ اسباق خارج میں ہوتے۔ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا۔

مدینہ منورہ میں درس

درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو رخصت کرنے والوں میں خود حضرت شیخ الہند ساتھ ساتھ دیوبند اسٹیشن تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے تمہارا ایک ہی طالب علم ہو۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد بعض ہندوستانی اور عرب طلبہ پڑھنے کے خواستگار ہوئے اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی۔ اس لیے مشکل کا سامنا ہوا مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہند اوقات کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں شروع کردیا۔ اس زمانہ میں بہت سے علما اعزازی طور پر حرم نبوی میں پڑھایا کرتے تھے اس سے تو مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف و نحو فقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں اور زبان صاف ہوگئی۔

اہلِ علم میں عموماً اور علمائے حجاز میں حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقید ہوتی ہے علمائے ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے بسا اوقات شکست کھا جاتے ہیں۔ بہرحال ہم جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ان عرب علما پر دھاک بٹھانا نہایت مشکل تھا اس لیے ہمارا گوشۂ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا بہت مفید ہوا۔

عام طلبا اور علما میں ہماری دھاک بیٹھ گئی۔ اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنونِ درسیہ میں نہ صرف مہارت ہے، بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اس بنا پر میرے پاس سمجھدار اور محنتی طلبا کا اجتماع بہت زیادہ ہوگیا۔ جس سے حرم کے متعدد مدرسین کو حسد اور رقابت پیدا ہوگئی۔ ناظم مدرسہ شمسیہ باغ کا اصرار تھا کہ جو طلبہ مجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبویؐ میں نہیں بلکہ مدرسہ میں آکر پڑھا کریں۔ مگر سب طلبا اس پر راضی نہ ہوتے۔ طلبا میں صرف اہلِ مدینہ ہی نہ تھے ترک، بخاری، قازانی، قزق، ترکستانی، مصری اور کابلی وغیرہ بھی تھے۔ ناظم مدرسہ کا یہ اصرار بھی تھا کہ مدرسہ کے خارج اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جن کی وجہ سے مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ اور یہ ارادہ کرلیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو کفیل حقیقی کے سپرد کردیا جائے۔ استعفا دینا پڑا۔ کتب درسیہ کا میدان وسیع کردیا گیا حضرت گنگوہیؒ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست

اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کی کہ جو تعلیم شغل طریقت کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کے لیے بیٹھتا ہوں تو غنودگی غالب ہو جاتی ہے، نیز وسوسے سخت پریشان کرتے ہیں طلبا کے اصرار پر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں لگا رکھا ہے۔ جواب میں حضرت نے ارشاد فرمایا (پڑھاؤ خوب پڑھاؤ) اس سے ہمت اور بندھ گئی۔ روزانہ ۱۴ اسباق پڑھاتا تھا صبح کو تین یا چار ظہر بعد دو عصر بعد دو مغرب بعد دو ایک عشاء کے بعد۔

بشارات و رویائے صالحہ

اب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، اولیائے عظام، ائمہ کبار اور جناب باری عزاسمہ، کو بار بار دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

۱۔ ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدارؐ مسجد شریف کے شمالی دروازے باب مجیدی کے باہر شمال کی طرف منہ کیے ہوئے مسجد سے نکل کر کھڑے ہیں اور آپ کے لب میں میٹھے کدو کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا جب قریب پہنچا تو آپ کے لب کو بیچ سے کھول دیا۔ کچھ بیج نیچے کو گرے تو میں نے دامن میں لے لیے ان کا عدد تقریباً ۳۰ تھا۔

۲۔ دیکھا کہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے مکبر والے کے نیچے لیٹا ہوا ہوں مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے تیرے قدم تو حضورؐ کے قدم جیسے ہیں۔ اس کی تعبیر حضرت گنگوہیؒ نے اتباع سنت سے دی تھی۔

۳۔ دیکھا کہ ایک جگہ پر حضرت رسول اللہؐ کی قبر کھلی ہوئی ہے نعش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس ہے کفن کھلا ہوا ہے چہرۂ مبارک نہایت تر و تازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تر و تازہ ہے اور آنحضرتؐ چت سو رہے ہیں مگر آپ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے قینچی سے لبیں اور ناخن کتر دیے۔

۴۔ باب السلام سے مسجد میں داخل ہوا اور حجرۂ مطہرہ کی جانب جاتا ہوں حضرت رسول اللہؐ ایک کرسی پر رونق افروز ہیں قبلہ کی طرف آپ کا چہرۂ مبارک ہے۔ میں داہنی جانب سے حاضر ہوا جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ نے مجھ کو چار چیزیں عطا فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیا معلوم نہیں کیا تھیں۔

۵۔ ایک روز اشعار کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا ایک مصرع تھا کہ ہاں اے حبیب رُخ سے ہٹا دو نقاب کو! یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہ شریف میں بعد آداب و تحیات کے ان ہی الفاظ کو پڑھنا اور شوقِ دیدار میں رونا شروع کیا دیر تک یہی حالت رہی جس سے محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور حضرت رسول اللہؐ میں دیواروں اور جالیوں کا کوئی حجاب نہیں آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا چہرۂ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔

۶۔ جب میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصبہ سے سفر کر رہا تھا۔ گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ حضرت رسول اللہؐ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لاتے ہیں اور ہاتھ اس طرح ڈالے ہیں کہ انگلیاں بھی ایک ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

۷۔ ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ فگن ہیں درخت کی اوپر کی سطح پر جناب باری عزاسمہ، جلوہ فرما ہیں۔ ہیبت و جلال بے حد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ ادھر سے ارشاد ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل یاد نہیں۔

مدینہ منورہ محرم ۱۳۳۳ھ میں پہنچا اسی زمانہ میں ترکی کا اعلان جنگ بھی ہو گیا اور فوج کشی کے ساتھ ساتھ جنگی تحفظات کا اثر حجاز اور بالخصوص حرمین میں شروع ہو گیا اہل متعلقین کے ساتھ مدینہ پہنچ کر حسبِ سابق مشاغل علمیہ میں مشغول ہو گیا اسی اثنا میں جب ترکی فوجیں حدودِ مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین (والنٹیروں) کی بھرتی کی جا رہی تھی تو ترغیب جہاد کے لیے مناخہ (مدینہ) میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اور میری اردو تقریر ہوئی۔ میرے برادران بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کی تقریریں بھی ہوئیں اور ہندوستانی مجاہدوں کا ایک گروہ والنٹیروں میں داخل ہو گیا۔ جس میں مولانا محمد جان قازانی اور مولوی ناصر محمد قازانی بھی تھے۔ یہ دونوں اسی مدینہ اور دیوبند سے تعلیم پا کر اسی سال پہنچے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان کنال سوئز اور بیر سبع

کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔

سیاست سے میرا تعلق

پہلی

تک ذاتی اور عائلی حالات تھے۔ اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی "سیاست سے میرا تعلق" اور مغربی سامراج کے مقابلہ میں عزم انقلاب۔ جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض حضرت شیخ الہندؒ تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصۂ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُر نور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔

سیاست میں داخلہ

میں اس

وقت تک کوشش آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہندؒ کے خیالات اور واقعات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتدا کا کہا جا سکتا ہے۔

مسجد نبوی میں جلسہ!

مفتی مامون

بصری صدر علمائے مدینہ نے پاس انور پاشا کا حکم بھیجا کر میں علمائے مدینہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں۔ اجتماع ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عربی تقریر کی عدم مہارت کی وجہ سے معذرت کر دی۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا، میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط تقریر کی۔ جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا کہ نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے جہاد ضروری ہے، تقریر آدھ گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی۔ حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔

گرفتاری

محرم ۱۳۳۵ھ میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے منجملہ علمائے مکہ عصر بعد آیا اور کہا کہ ترکوں کے خلاف اس فتوی پر دستخط کر دیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے انکار کر دیا۔ اور چار دن کے بعد شریف حسین کو دھوکہ دیا گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا مولوی سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طرفوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ ۲۹ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے۔ پھر ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے زیر حراست مصر بھیجے گئے۔ ۲۲ کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں (جو پندرہ یا سولہ تھے اور بندوقوں سنگینوں سے مسلح تھے) ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر بعد ہم کو جیزہ کے سیاسی جیل میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور رسائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیانات اور رپورٹیں تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو افغانستان، کابل، فرانس اور ہندوستان وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں۔ ان میں کی مخبری اپنے پرایوں دونوں نے کی ہے۔ بہت سی باتیں ایسی پوچھی گئیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو معلوم نہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ جیزہ کے جیل میں ایک ماہ رکھے اور بیانات لینے کے بعد پانچ

مرتب کیا گیا اور ۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ۔ ۱۷ فروری ۱۹۱۷ء کو ہمیں مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کر رہی تھی۔ اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار کیے گئے۔ اور ۲۹ ربیع الثانی کو مالٹا پہنچ گئے۔

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس دو مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت رخصت کے وقت تمام ترکی افسر (جو اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدرِ اعظم ترکی سے لے کر نیچے کے عہدہ داروں تک سب کے سب خود بخود جمع ہو گئے تھے اور بہت زیادہ مہر و محبت کا ثبوت دیتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی شروع کی اور تمام افسروں نے ان کی موافقت۔ آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔

۵ ۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء اگبرٹ اسکندریہ پہنچا۔ اور ۶ ۲ جمادی الثانی سیدی بشر میں جو مصری قیدیوں کی جگہ تھی داخل کر دیے گئے۔ ۱۸ روز کے قیام کے بعد ۲۰ رجب ۱۳۳۸ھ ۱۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز کو روانہ کیے گئے۔ سویز میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں داخل کیے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ ۲۳ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن۔ اگبرٹ پہنچا یا گیا ۱۷ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور ۳ تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں، دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں، تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسبِ ذیل تھے: "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے یہ مختصر ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس ۷ ماہ کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

سفرِ کلکتہ

مولانا آزاد کی پُر زور تقریروں کی وجہ سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبا علیحدہ ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور مستقل مدرسہ عالیہ قائم کیا جائے خلافت کمیٹی کے ارکان اس کی سرپرستی کریں۔ اس کے لیے ایک جید عالم کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے مولانا آزاد نے مولوی عبداللہ مصری کو بھیجا تھا اور حضرت انور شاہؒ کو طلب کیا تھا۔ مگر شیخ الہندؒ نے فرمایا۔ شاہ صاحب تو دارالعلوم چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو تمام حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور تجربہ کار و مشہور بھی ہو۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے عذر کیا۔ بالآخر مجھے حکم ہوا۔ میں مجبوراً کلکتہ روانہ ہوا۔ اور وہاں اسباقِ حدیث سنبھال لیے مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اطرافِ کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا اس زمانے میں اندرونِ بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا جن میں سے مولوی بازار کے مشہور کانگریس اور خلافت کے جلسوں میں بھی جانا پڑا۔ اجلاس کانگریس کے صدر آنجہانی سی آر داس تھے اور جلسہ خلافت و جمعیۃ علما کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ دوسرا جلسہ رنگ پور میں بڑے پیمانہ پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ یوپی بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ بجنور کا تھا۔ اجلاس جمعیۃ کی صدارت مولانا حبیب الرحمان صاحب نے فرمائی تھی اور جلسہ خلافت کی خدمتِ صدارت مجھے انجام دینا پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا اس کے صدر دیرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا تھا۔ اسی طرح خطبہ علوم سہارنپور کے جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا۔ جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور دو سال قیدِ بامشقت کی عزت مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس وجہ سے ختم ہو گئی۔

کانگریس سے تعلق

میں اگرچہ پہلے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے مصائب بھی اہلِ ملک کے ساتھ جھیلتا رہا۔ الحمدللہ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ساالحمدللہ اولاً و آخراً۔

تلخیص شمس تبریز خاں

میرے آباو اجداد شہنشاہ بابر کے زمانے میں ہرات سے ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان کے مشہور شہر اکبر آباد (آگرہ) آکر سکونت پذیر ہوئے۔ بعد میں انہوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ میرے والد مولانا منیر الدین کے نانا مولانا منور الدین دورِ مغلیہ میں رکن المدرسین کے عہدہ پر فائز تھے یہ عہدہ آج کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے۔ غدر کے دوران نواب سکندر بیگم والیہ ریاست بھوپال نے انہیں اپنی ریاست ہی میں رکھا۔

میرے والد ماجد مولانا منیر الدین پچیس برس کی عمر میں مکہ تشریف لے آئے اور انہوں نے مدینے کے ایک مشہور عالم فاضل شیخ محمد ظاہر وتری کی صاحبزادی سے شادی کی۔ یہی میری والدہ تھیں جن کے بطن سے ۱۸۸۸ء میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد نے یہیں عربی میں ایک کتاب لکھی جو مصر سے دس جلدوں میں شائع ہوئی۔

میں بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل علم ہو چکا تھا۔ فارسی اور اردو زبانوں پر مجھے عبور حاصل ہو چکا تھا۔ جہاں تک عربی کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ یہ میری مادری زبان تھی۔ میں نے زبان اور ادب کے علاوہ تاریخ اسلام کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ دین اسلام کی تعلیمات سے بھرپور واقفیت حاصل کی اور مقدور بھر فلسفہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔

پندرہ برس کی عمر میں مجھے لسان الصدق کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں اس رسالے کے علاوہ میں

جیسے لوگ مجھے دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد خود نہیں آسکے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ لیکن جب میں نے پلیٹ فارم پر آکر موضوع مذکورہ پر تقریر کی تو یہ لوگ حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے۔

میری زندگی کے ذوق و سلیقہ سنوارنے میں حضرت مولانا شبلی نعمانی کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل ہے۔ میں ۱۹۰۵ء میں اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر چکا تھا۔ وہ سر سید احمد خاں کے ساتھیوں میں سے تھے۔ سیاست کے میدان میں مجھے اُن کی تعلیمات سے بڑی تقویت ملی ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک میں نے بیرونی دنیا کا سفر کیا۔ مصر، شام، دیبا، ترکی اور عراق وغیرہ جا کر میں نے وہاں کے سماجی دینی اور سیاسی حالات کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا اور حضرت سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے انقلابی تصورات سے بڑی حد تک مسحور رہا۔ یہ لوگ شہنشاہیت کے بدترین مخالف تھے۔ اور تمام غلام ممالک کی آزادی کے حامی ہی نہیں تھے بلکہ اس ذیل میں انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

مشرقِ وسطیٰ کے ان ممالک کے دورے کے دوران ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اسی میں فائدہ ہے کہ وہ اپنے دیگر ہم وطنوں کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لیکر برطانوی سامراج کی زنجیروں سے نجات حاصل کریں۔ بغیر ہندو مسلم اتحاد کے یہ آزادی ناممکن تھی۔ اور آزادیٔ ہندوستان کا صریحاً یہ فائدہ تھا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو آزاد ہندوستان سے بڑی تقویت حاصل ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے برطانوی استعمار پرستوں سے تعاون اور اشتراک کو ناپسندیدہ قرار دیکر سیاسی زندگی کے میدان میں پہلا قدم رکھ دیا جو سراسر انگریزوں کی حکومت اور اُن کے حواریوں کے خلاف تھا۔ میری تمام آرزوؤں امنگوں اور خواہشوں کا محور یہی تھا کہ میرے ملک

نے امرتسر سے نکلنے والے وکیل میں بھی مضامین بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میرے ان مضامین سے لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بہت ہی معمر انسان ہو سکتا ہوں۔ اسی دوران لاہور میں انجمن اسلامیہ کے سالانہ اجلاس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا اور مجھ سے خواہش ظاہر کی گئی کہ میں "اسلام میں اصالتِ عقل" جیسے ادق موضوع پر تقریر کروں۔

انجمن اسلامیہ لاہور کے اس اجلاس میں مولانا الطاف حسین حالی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سر عبدالقادر

غیر ملکی بندشوں اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے۔

سیاسی زندگی میں اگرچہ میں سر سید احمد خاں مرحوم کے موقف کے خلاف تھا لیکن میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے مضامین نے میرے دل میں بھی اور عرائی اُمنگوں کو موجزن کر دیا۔ ان کا یہ خیال سو فیصدی صحیح تھا کہ قوموں کو ترقی کرنے کے لئے عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنا لازم و ملزوم ہے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار کا اجرا کلکتہ سے کیا۔ اس اخبار نے مسلم حلقوں میں سند قبولیت حاصل کی اور ابتدا سے ہی مخالف برطانوی پالیسی کی وجہ سے یہ ہفت روزہ حکومت کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ اسی کو بند کرنے کے لئے غور و خوض کی محفل آرائیاں ہوئیں اور حکومت بنگال نے پریس ایکٹ کے تحت اس سے دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کر لی جو ضبط کر لی گئی — دوسری بار ایک ہزار روپیہ کی ضمانت کا بھی یہی حشر ہوا۔

۱۹۱۵ء میں جنگ عالمگیر اول کے دوران "الہلال" کے دفتر پر تالے ڈال دیئے گئے۔

جس "الہلال" کے ذریعہ میں نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں جوش وطن اور حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جس نے آزادی وطن کے نعرے لگائے۔ اپنا حق طلب کیا اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر سختی سے زور دیا وہ مولنا محمد علی جوہر کے "کامریڈ" سے زیادہ خطرناک قرار دیا گیا تھا اور برطانوی حکومت اُسے نظر انداز نہیں کر سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ الہلال ہندوستان سے باہر بھی بھیجا جاتا تھا۔ صوبہ سرحد میں اس کی مقبولیت نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار بھی اس میں اپنے مضامین شائع ہونے کے لئے روانہ کیا کرتے تھے۔ "الہلال" نے سرحد کے غیور پٹھانوں کے دلوں میں وطن پرستی کا لاوا بھر دیا۔ بھلا یہ بات برطانوی حکومت کو کیسے گوارہ ہو سکتی تھی؟

مولانا شوکت علی

۱۹۱۶ء میں وطن کے لئے تمام قیود و حدود سے آزادی کا اعلان کرنے کے لئے، میں نے اپنے نام کے ساتھ آزاد لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا صرف یہی مطلب تھا کہ میں آزادی کے حصول کی خاطر تمام پابندیوں سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی خود کو آزاد کر چکا تھا۔ اسی سال میں نے "البلاغ" کے نام سے ایک پریس بھی قائم کیا اور اس نام سے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ حکومت بنگال کو اس پرچے سے بھی عداوت ہو گئی اور اس نے بغض و عناد کے مظاہرے شروع کرا دیئے۔ یہ پرچہ حکومت کے لئے دردِ سر بن چکا تھا چنانچہ مجھے صوبہ بنگال کی سرحدوں سے قانوناً باہر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ تحفظ ہند کے اس ایکٹ کے تحت حکومت ہائے صوبہ پنجاب، بمبئی، یوپی اور دہلی میں بھی میرے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ مجبوراً میں رانچی کے لئے روانہ ہوا جہاں مجھے نظر بند کر دیا گیا۔ بالآخر ۱۹۲۰ء کے نئے سال کے دن مجھے اس قید و بند سے نجات دیدی گئی۔

الہلال کے ذریعہ میں مسلمانوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر انہیں ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کرنا چاہیئے اور اسی وجہ سے مہاتما گاندھی نے مجھے اپنے قریبی حلقے میں گردانا شروع کر دیا۔ برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی گاندھیائی پالیسی مجھے پہلے سے ہی عزیز تھی اور میں ان سے قبل کئی آرٹیکل "الہلال" میں اس موضوع پر تحریر کر چکا تھا۔

بہت سے نامور مسلم رہنما مثلاً حکیم اجمل خاں، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر اور فرنگی محل لکھنؤ کے مولانا عبدالباری آخر کار میری اس پالیسی کے حامی بن گئے۔ بزرگوں کے دلوں میں اس اصول کے گھر کر جانے پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور آزادی کے چراغ میرے قلب و ذہن میں ایسے جل اٹھے کہ مرتے دم تک اپنی روشنی سے میرے دل و دماغ کو منور کرتے رہیں گے۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ناگپور اجلاس میں میری تحریک پر کانگریس نے اپنے پروگرام میں ترکی خلافت کے احیا، سیلف گورنمنٹ اور پنجاب میں ہونے والی ناانصافیوں کو دور کرنے کی تجاویز کو اپنایا۔

دہلی میں ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت میں نے کی۔ کانگریس کی اس پہلی صدارت کے وقت میری عمر پینتیس سال کی تھی اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس عمر میں کوئی بھی کانگریس جیسی عظیم جماعت کا صدر نہیں ہوا۔ شاید آنے والے دنوں میں کبھی ہو سکے۔ اس اجلاس میں دو ایسے مخالف گروپ سمجھوتے کے لئے جمع ہوئے تھے جو آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے حق میں تھے یا مخالف۔

۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک شباب پر تھی۔ خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ اتحاد و اتفاق کیا لیکن ۱۹۲۸ء میں جب "نہرو رپورٹ" شائع ہوئی اور اس پر قوم اور ملک میں اختلاف

کی لہریں چلیں تو میں نے مذکورہ دونوں جماعتوں سے علیحدگی اختیار کرکے صرف کانگریس ہی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک فرد کانگریس اور مسلم لیگ کا بیک وقت ممبر بنارہ سکتا تھا اور دونوں جماعتیں بسا اوقات ایک ہی پلیٹ فارم سے اپنی تحریکیں چلانے کو بے اصولی پر محمول نہیں کرتی تھیں۔

میں نے ۱۹۲۹ء میں کچھ دوسرے قوم پرست مسلمان رہنماؤں کی معیت میں ایک کانفرنس بلائی۔ جس میں مسلم لیگ، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، جمعیۃ العلماء ہند وغیرہ کے علاوہ خان عبدالغفار خان کے خدائی خدمتگار بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کو اس لیے طلب کیا گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند نیشنلزم کے میدان میں علیحدہ پسندی سے اجتناب کرکے ملک کی بقیہ اقوام کے ساتھ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کردیں اگرچہ یہ کانفرنس اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکی لیکن اس سے بہت سے فائدے رونما ہوئے اور ایسی ماحول میں یگانگت کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے۔

آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو نے اس زمانے میں مجھے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے شانہ بشانہ اور دوش بدوش آزادی حاصل کرنے کے لیے ترغیب دینے کے لیے کہا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے صدق دل سے کوشاں تھے اور مذہب کو سیاست میں داخل کرنے کے مخالف تھے۔ ۱۹۲۲ء سے ہی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جو علی برادران کے نام سے افقِ سیاست پر نمودار ہوکر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دلوں میں گھر کرچکے تھے۔ آل انڈیا کانگریس سے دور ہونے چلے جارہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں علی برادران کانگریس کے لاہور سیشن میں شریک تو ہوئے لیکن انہوں نے مہاتما گاندھی پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں کانگریس کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اس وقت میرے ساتھ سرحدی گاندھی

ہند کے محکمہ ڈاک و تار نے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو مجاہد آزادی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی مولانا محمد علی جوہرؔ کی یاد میں ان کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ڈاک کا یہ ٹکٹ جاری کیا ہے

خان عبدالغفار خان بھی اس امر پر متفق تھے کہ مسلمانوں کو اس موقع پر کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے چنانچہ ہم دونوں نے اس ذیل میں مقدور بھر جدوجہد کی۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں اسی لیے ایک بار انڈین نیشنل کانگریس کا دامن پکڑ لینے کے بعد میں نے تادمِ تحریر اُسے مضبوطی سے تھامے رکھا اور میں اپنا آخری لمحہ بھی اسی وابستگی کے ساتھ گزارنے کا تہیہ کرچکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندو مسلمان دونوں ہی ایک ہزار سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد، ہمدرد و معاون رہے ہیں۔ ہماری تہذیبوں میں اس عرصہ دراز کے میل جول سے گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کے جلوے نمودار ہوئے ہیں۔ ہماری مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت، شاعری، ادب، رہن سہن کے اطوار لباس

آدابِ زندگی اور رسم و رواج ہیں اس بات کی تنبیہ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا یہ اشتراک، یہ اتحاد، میل جول اور اتفاق تاعمر برقرار رہے کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کبھی علیحدہ نہیں ہوسکتے اور اگر ہوتے تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

دوسری بار مجھے ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا صدر چنا گیا۔ یہ فیصلہ رام گڑھ کانگریس سیشن میں ہوا تھا اور اسی حیثیت سے میں نے کرپس مشن سے ۱۹۴۲ء میں مذاکرات کئے۔ اس مشن کے صدر مشہور برطانوی سیاس سر اسٹیفورڈ کرپس تھے۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینی مشن ہندوستان آیا تاکہ ہندوستان کو آزادی دینے کے سلسلے میں ابتدائی مراحل طے کئے جائیں۔ اس وقت بھی میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اس مشن سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس مشن کے لیڈر سر پیتھک لارنس تھے جو اس وقت سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جیسے اہم عہدے پر فائز تھے۔

ان دونوں برطانوی مشن کے دوران ہم لوگ احمد آباد جیل میں اسیر تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی وہ انقلابی تجویز پاس کی تھی جس نے سارے ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ ہر ہندوستانی جوش، ولولے، امنگ اور جذبے کے ساتھ برطانوی حکومت نے خوف اور ڈر کے مارے ہم لوگوں کو احمد آباد جیل میں نظر بند کر دیا۔ قلعہ احمد نگر میں اس وقت میرے ساتھ سردار پٹیل، آصف علی، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیّہ، اچاریہ جگل کشور کرپلانی وغیرہ نظر بند تھے۔ برطانوی شہنشاہیت نے کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیدیا۔ جگہ جگہ کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جانے لگیں۔ لیکن یہ ایک ایسا سیلاب تھا جسے روکنے کی طاقت سلطنتِ برطانیہ کھو چکی تھی۔ اسی لئے ۱۹۴۶ء میں وائسرائے لارڈ ویول

نے ہمیں رہا کر دیا تھا تاکہ ہم شملہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں۔ کانگریس پر عائد شدہ پابندی بھی اٹھالی گئی۔

میرے بعد اپریل ۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ مجھے جواہر لال سے بے پناہ محبت تھی۔ اور وہ بھی میرا قلب کی گہرائیوں سے احترام کرتے تھے۔ ہم دونوں کی رفاقت اس لئے بھی بڑھی کہ بہت سے متنازعہ امور پر ہم دونوں ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نہرو اعلیٰ قدروں کو

ماننے والے انسان ہیں۔ اُن کا سیاسی نظریہ ترقی پسندانہ ہے اور وہ مذہبی تعصبات کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہیں۔ اُن سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن کوئی انسان خطاؤں سے مبرا نہیں ہوسکتا۔

میں نے سنہ ۱۹۱۵ء میں ہی طے کرلیا تھا کہ قرآن پاک کا ایسا ترجمہ کروں جو قارئین کے دلوں میں اُتر جائے لیکن اکثر وبیشتر ترجمے کے مسودے میری گرفتاری کے دوران بااوقات ضبط کرلئے گئے۔ پھر بھی میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیشہ مضطرب رہا۔ آخرکار ترجمان القرآن کی پہلی جلد سنہ ۱۹۳۰ء میں مکمل ہوکر منصۂ شہود پر آگئی۔ اس وقت میں میرٹھ جیل میں تھا۔ ترجمان القرآن کے علاوہ میں نے جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں غبارِ خاطر اور تذکرہ مجھے دل سے عزیز ہیں چونکہ ان کے ذریعے میں نے اپنی قوم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

میری ساری زندگی جدوجہد میں گزری ہے۔ مجھے کام سے عشق، خدمت سے محبت، مصروفیت اور انہماک عمل سے دلی وابستگی ہے شاید اسی لئے میرے لئے بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے کہا تھا کہ جس وقت پیدا ہوا اس وقت میری عمر پچاس سال کی شمار کرنا چاہیئے چونکہ جتنا میں نے کام کیا ہے لوگ دو جنموں میں بھی نہیں کرسکتے۔

ہندوستان آخرکار آزاد ہوا۔ مجھے وزارت تعلیم کا سربراہ بنادیا گیا۔ جواہر لال نے مجھ سے باربار ہندوستان کے نائب صدر ہوجانے کے لئے اصرار کیا لیکن ایسا کرنے سے میرے اعصاب ناستراحت کی وجہ سے مشل ہوجاتے۔ چنانچہ میں نے کبھی بھی اس عہدے کو قبول کرنے پر غور ہی نہیں کیا۔ میں تا دمِ آخر ہندوستان کی فلاح وبہبود کی خاطر کام کرنے کا عہد کرچکا ہوں۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ میں تقسیم ہند کا مخالف تھا۔ میں ہندوستان کو متحد رکھنے کا آرزومند تھا۔ اتحاد کے شیرازے کو منتشر دیکھنے کی مجھ میں تاب وطاقت نہیں تھی۔ لیکن جب میرے خوابوں کی مجھے تعبیر نہیں ملی اور پاکستان وجود میں آگیا تو اس دن کے بعد سے کبھی بھی میرے قلب وذہن میں اس کے خلاف کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا بلکہ میں صدقِ دل سے اس کی خوشحالی اور ترقی کی خواہش کرتا رہا ہوں۔

پاکستان بننے کے ذیل میں میرے محبوب ساتھی اور ہندوستان کے ہردلعزیز رہنما جواہر لال سے جو خود متحدہ ہندوستان کے حامی اور طلب گار تھے۔ چند لغزشیں ہوئیں جن کا تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں جواہر لال ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن چکے تھے پھر بھی میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ کبھی کبھی وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں ——— بسا اوقات وہ معاملوں کے خالص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوجاتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کرپاتے۔

دستور ساز اسمبلی کے بارے میں جو بیان اُنہوں نے سنہ ۱۹۴۶ء میں دیا اُس کا ذمہ دار بھی مجرد علمی بحث کا شوق تھا اور اسی نظری رجحان کی وجہ سے اُنہوں نے اس قسم کی غلطی سنہ ۱۹۳۷ء میں کی تھی۔ اِن انتخابات میں بمبئی اور یوپی کے علاوہ سارے ملک میں مسلم لیگ بری طرح ناکام رہی۔ بمبئی میں مسلم لیگ کی کامیابی کا سبب جمعیۃ العلماء ہند کا اشتراک تھا جو اس اُمید کے ساتھ کیا گیا تھا کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی۔

چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں اس وقت یوپی مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ وزارت میں شریک کرلئے گئے تو نہ صرف کانگریس سے تعاون کریں گے بلکہ اس کے مجوزہ پروگراموں کی مکمل حمایت بھی کریں گے۔ میں نے جواہر لال سے کہا تھا کہ وہ دونوں کو وزارت میں شامل کرلیں۔ مقامی حالات ایسے تھے کہ یہ دونوں ایکدوسرے

www.taemeernews.com

۱۹۴۷ء کی ایک خون آلود تصویر

کو چھوڑ کر وزارت میں نہیں آسکتے تھے یا دونوں کو لیا جاتا یا دونوں ہی کو چھوڑ دیا جاتا۔ کچھ دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ جواہر لال نے دونوں کو لکھ دیا کہ ان میں سے کوئی ایک ہی وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ دونوں نے ہی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ واقعہ بہت افسوسناک تھا۔ چنانچہ میں نے جواہر لال کو آگاہ کیا کہ ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے اور اس فروگذاشت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلم لیگ بجائے کمزور ہونے کے طاقت پکڑتی چلی گئی۔

۱۹۳۷ء میں کی گئی یہ غلطی کافی اہم تھی لیکن ۱۹۴۶ء میں اُن کی جانب سے جو لغزش مذکورہ اُس سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس لغزش سے ہی ہماری سیاست اور زندگی کے رُخ نے پلٹا کھایا۔

بات یہ ہوئی کہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں اُنہوں نے پریس کانفرنس بلائی اور اس میں ایسا بیان دیا جس سے منافرت کی فضا میں انتہائی افسوسناک نتائج کا ایک سلسلۂ لامتناہی شروع ہو گیا۔ ایک سوال کے جواب میں اُنہوں نے بیان دیا تھا کہ "کانگریس دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرتے ہوئے اپنے آپ کو معاہدہ کا پابند نہ سمجھے گی اور جس قسم کے حالات پیدا ہوں گے اُس کے مطابق آزادی کے ساتھ فیصلے نافذ کرے گی۔"

مسٹر جناح کے لئے یہ ایک ہتھیار جیسا ہو گیا اور پھر جلد ہی اِن حالات میں مسٹر جناح نے ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا جس نے منافرت کی ایسی فضا پھیلا دی

کہ پاکستان کے مطالبے کو اس سے اصل تقویت پہنچی۔ میں یہ بات ضبط تحریر میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تقسیم ہند کے معاملے میں ماؤنٹ بیٹن نے جو دام بچھایا تھا اُس میں سب سے پہلے سردار پٹیل گرفتار ہوئے۔ تقسیم آخر تک مسٹر جناح کے سودا کرنے کے لئے ایک چال تھا لیکن پاکستان کا مطالبہ کرکے وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے خود سردار پٹیل کے ایما اور منشا پر لیاقت علی خاں کو محکمہ مال سپرد کر دیا گیا تھا جو بعد میں اُن کے لئے دردِ سر ثابت ہوا۔ لیاقت علی خاں کے سامنے روپیہ پیسہ کی منظوری کے معاملے میں اُنہیں اپنی مجبوری کا تلخ احساس ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُنہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ وہ مسلم لیگ کو ہندوستان کا ایک حصہ دے کر اس سے نجات حاصل کرنے پر تیار ہیں۔

ابتداً جواہر لال نہرو تقسیم کی بات بھی سننا نہیں چاہتے تھے لیکن کچھ لوگوں کے مشورے پر اس جانب مائل ہو گئے۔ اس مسئلے میں مشورہ دینے والوں میں کرشنا مینن بھی تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ مینن کے مشوروں پر چلتے تھے۔ مجھے یہ بات اس لئے ناپسند تھی کہ مینن انہیں اکثر و بیشتر غلط مشورے دیتے رہتے تھے۔ سردار پٹیل اور مجھ میں ہمیشہ اتفاق رائے نہ ہوتا لیکن اس ایک بات پر ہم دونوں ایک رائے تھے کہ جواہر لال نہرو اکثر کرشنا مینن کے غلط مشوروں پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بہرحال پاکستان بن گیا اور دونوں ریاستوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ دونوں دوستانہ تعلقات اور اشتراک عمل سے کام لیں۔ البتہ ایک بات میں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں گے اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بنے رہیں گے۔

میں بلندی سے گرتے گرتے بچا

پنڈت جواہر لال نہرو کی دلچسپ آپ بیتی

میرے آباواجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مغل شہنشاہ فرخ سیر کے دورِ حکومت میں میرے خاندان کے جن بزرگ نے کشمیر کی سرسبز وادیوں کو چھوڑ کر دلی کا رخ کیا ان کا نام راج کول تھا۔ وہ فارسی اور سنسکرت کے نامور عالم تھے۔ شہنشاہ فرخ سیر سے جب ان کی ملاقات کشمیر میں ہوئی تو وہ ان کی علمی صلاحیتوں سے بیحد متاثر ہوا یہاں تک کہ ایک بھاری جاگیر دے کر انہیں دلی بلوا لیا۔ یہ جاگیر ایک نہر کے کنارے دی گئی تھی اسی لئے ہم لوگ نہرو مشہور ہوگئے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے خاندان کے حالات بھی پلٹا کھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب ناکامی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان والے مال ومتاع، گھر بار حتیٰ کہ اور دوسری معمولی چیزوں سے بھی محروم ہوگئے۔ دلی سے نکل کر ۱۸۶۱ء میں آگرے میں میرے دادا نے سکونت اختیار کرلی اور اسی سال مئی کی چھ تاریخ کو میرے والد پنڈت موتی لال نہرو پیدا ہوئے۔ والد کی پیدائش سے تین ماہ پیشتر میرے دادا پنڈت گنگادھر کول کا انتقال ہو چکا تھا۔

میرے والد فارسی، اردو، عربی اور انگریزی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے قانون کا امتحان دے کر کانپور ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور پھر وہاں تین سال گزرنے کے بعد الٰہ آباد چلے آئے۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو شایانِ شان معاوضہ ملا اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت الٰہ آباد اور یوپی سے نکل کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ اور جس رفتار سے گھر میں دولت آ رہی تھی اسی رفتار سے والد خرچ کرنے لگے۔ ان کا طرزِ حیات مغربی انداز کا تھا۔ دوستوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ روزانہ ہی محفلیں جمتیں۔ بوتلوں کے کاگ اڑتے اور کھانے پینے میں روزانہ ہی زرِ خطیر صرف ہو جاتا تھا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں میری پیدائش ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔ چونکہ میں اس وقت ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس لئے میری پیدائش کی خوشی میں بھی روپے کو پانی کی طرح بہا دیا گیا۔ میری ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ایک انگریز معلمہ میری تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کر دی گئی۔ ان دنوں انگریزوں کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ ہر جگہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا تھا۔ ریلوں میں سفر کرنے کے لئے ان کے علیحدہ کمپارٹمنٹ تھے۔ ان کے ہوٹل الگ تھے۔ ان کے رہنے کے مکانات عام ہندوستانیوں سے دور تھے۔ بعض حالات میں وہ قتل کرنے کے باوجود پھانسی پر چڑھنے کی بجائے آزاد گھومتے پھرتے تھے۔ ان کے پارک علیحدہ تھے کلب مخصوص تھے غرض یہ کہ وہ ہندوستان میں اس طرح رہتے تھے کہ مغل شہزادے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں ایک انگریز خاتون کا ہمارے یہاں نوکری کرنا ہی والد کی جاہ و ثروت کا ثبوت تھا۔

آٹھ برس کی عمر میں مجھے شہ سواری سکھائی گئی۔ ایک روز جب میں گھوڑے سے گر گیا اور وہ بغیر میرے گھر پہنچا تو کھلبلی مچ گئی۔ میری تلاش میں چاروں طرف آدمی دوڑا دیئے گئے اور جب میرے والد نے راستے میں مجھے پایا تو انہوں نے اور ان کے ساتھ آنے والے لوگوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گویا میں نے کوئی بہت ہی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔

دسویں سال گرہ کے بعد والد نے پرانا مکان چھوڑ دیا کیونکہ آنند بھون کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ یہ مکان انہوں نے زرِ کثیر خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اس میں ایک سر سبز و شاداب باغ کے علاوہ تیرنے کے لئے تالاب بھی تھا۔ یہاں منتقل ہونے کے بعد ہی میری بہن وجے لکشمی پیدا ہوئیں۔ ان کی پیدائش سے میں بے حد خوش ہوا کیونکہ اس وقت میں والدین کی اکلوتی اولاد ہی تھا مجھے ساتھ کھیلنے کودنے کے لئے ایک سہارا ملا۔

گیارہ سال کی عمر میں میری تعلیم کے لئے ایک اور ٹیوٹر ایف۔ ٹی۔ بروک نام کا متعین کیا گیا۔ یہ تھیوسوفی کے ماننے والے تھے ان کی وجہ سے ہی میں تھیوسوفیکل سوسائٹی (مجلس معارفان) کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ ۱۹۰۴ء میں مسٹر بروک نے ملازمت ترک کر دی۔ ان کی جدائی کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ ہمارے گھر میں مذہب کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے محض عورتوں کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے تمام مذاہب میرے لئے ایک ہی جیسے رہے۔

۱۹۰۵ء میں جب میری عمر پندرہ سال سے متجاوز ہوئی تو مجھے حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ مجھے انگلستان چھوڑنے میرے والدین اور چھوٹی بہن بھی آئی یہ لوگ کچھ دن قیام کرنے اور مجھے ہیرو اسکول میں داخلہ دلانے کے بعد واپس ہو گئے۔

تعلیم کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میرے انگریز ہم جماعت تعلیم سے زیادہ کھیل کود میں دلچسپی لیتے تھے۔ میں نے ان میں سے بہت سے طلباء کو غبی پایا۔ اسی سال جب برطانوی پارلیمان کے عام انتخاب کے نتائج شائع ہوئے اور جب ان کے بارے میں میرے انگریز معلم نے سب سے دریافت کیا تو سوائے میرے کوئی اور طالب علم ان کو تشفی بخش جواب نہیں دے سکا۔ میں نے اپنے ٹیچر کو نئی کابینہ کے تمام ممبران کے نام تک گنوا دیئے۔ یہاں مجھے ہوا بازی سے بھی شغف

پیدا ہوا۔ ہوائی جہاز ان دنوں اتنے مقبول نہیں ہوئے تھے جتنے بعد میں ہوئے۔ پھر بھی میری یہی تمنا تھی کہ ایک ہفتے کے لئے ہوائی جہاز کے ذریعہ الہ آباد ہو آؤں۔

اسکول میں نمایاں کامیابی کے انعام میں مجھے گیری بالڈی کی کتابیں ملیں۔ میں نے ان سب کو غور سے پڑھا اور گیری بالڈی کے کارناموں نے میرے ذہن کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اب یہ اسکول میری ذہنی وسعتوں کے لئے تنگ نظر آنے لگا تو میں نے ۱۹۰۷ء میں کیمرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔

کیمرج میں اور بہت سے ہندوستانی طلبا بھی تعلیم پا رہے تھے۔ ان میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی کے علاوہ ایس۔ ایم سلیمان بھی تھے جو بعد میں ہائی کورٹ الہ آباد کے مشہور و معروف چیف جسٹس ہوئے۔

ہندوستانی طلبا نے کیمرج میں ایک انجمن قائم کی ہوئی تھی جسے "مجلس" کے نام سے پکارا جاتا تھا لیکن میں اس میں تقریر کرنے سے شرمایا کرتا تھا۔ کئی بار اس کی پاداش میں مجھے جرمانے ادا کرنے پڑے۔ اس سلسلے میں مجھے اس بات پر بڑا ہی تعجب اور دکھ ہوا کہ تقریر کرنے والے بعض ہندوستانی طلبا انتہا پسندی کا دعویٰ کرتے تھے۔ اپنے وطن کی عظمت اور شوکت کے لئے سنہری الفاظ کے ذخیرے ختم کر دیتے تھے۔ ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے لئے بڑی لفاظی سے کام لیتے لیکن تعلیم کے بعد یہی لوگ آئی۔ سی۔ ایس بن کر انگریزوں کے حامی اور مددگار بن جاتے تھے۔

۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں بیرسٹری کا امتحان دے کر میں ہندوستان واپس چلا آیا۔ راستے میں تھوڑا بہت یورپ کا سفر بھی کیا۔ یہیں ایک جگہ میں ایک یخ آلود ندی میں نہاتا ہوئے ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ میری بعد کی زندگی میں ایسے کئی حادثات رونما ہوئے جہاں میری زندگی اور موت کے درمیان شاید بال برابر فاصلہ رہ گیا ہوگا۔ ناروے کی ایک ندی میں نہاتے ہوئے مذکورہ بالا حادثہ عمر میں پہلی بار پیش آیا تھا۔

انگلستان کے قیام کے دوران میں سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کا عادی بن چکا تھا۔ چنانچہ اپنے وطن لوٹنے کے بعد میں نے یہاں کی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالت انگلستان کے مقابلہ میں اتنی افسوسناک تھی کہ اکثر و بیشتر میرا خون اسی بات کو سوچ کر کھول اٹھتا تھا۔ ہندوستان واپسی کے بعد بانکی پور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں ایک مندوب کی حیثیت سے میں نے بھی شرکت کی۔ ان دنوں انڈین نیشنل کانگریس میں موجودہ وحدت اور سرگرمی نہیں تھی بلکہ اس کے اجلاس ایک طرح سے قومی میلے کی شکل میں ہوا کرتے تھے۔ اس اجلاس میں گوپال کرشن گوکھلے بھی شریک تھے۔ وہ جنوبی افریقہ کے سفر سے آئے تھے۔ میرے دل میں ان کی عظمت نے ایسا گھر کیا کہ میں ان کی قائم کردہ سوسائٹی "انجمن خدام ہند" کو تعریف آلود نظروں سے

دیکھنے لگا۔ مگر مجھے ان کی سیاست کے میدان میں اعتدال پسندی ضرور کھٹکتی رہی۔

اس اجلاس کے بعد میں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اور بھی آگے بڑھایا اور میں بیک وقت تلک اور اینی بیسنٹ کی قائم کردہ ہوم رول جماعتوں کا ممبر بن گیا۔ اسی دوران اولین جنگ عالمگیر زور پکڑ گئی اور میرے علاوہ نجانے کتنے قوم پرستوں نے حکومت برطانیہ کی امداد کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ ہمیں اس جنگ کے خاتمہ کے بعد آزادیٔ ملک کی پوری توقع تھی۔

۱۹۱۵ء میں جب حکومت نے اخبارات پر پابندیاں لگائیں تو میں نے پہلی بار عوام کے سامنے تقریر کی۔ لیکن یہ تقریر مختصر تھی انگریزی میں تھی......

سر تیج بہادر سپرو بھی جلسے میں شریک تھے۔ انہوں نے میری تقریر سن کر مجھے اسٹیج پر ہی گلے لگا کر میری شعلہ بیانی کی تعریف و توصیف کی۔

لکھنؤ کانگریس سیشن میں جو ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا تھا میری ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ میں ان کی جنوبی افریقہ کی سیاسی اور سماجی تحریکوں سے بخوبی واقف تھا۔ اب جو انہیں دیکھا تو میرا دل ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا۔

۱۹۱۶ء میرے لئے اس لئے بھی اہم تھا کہ میری شادی اسی سال کملا سے ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ہی ہم دونوں کشمیر چلے گئے جہاں ایک روز برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا میں سولہ ہزار فیٹ کی بلندی سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ یہ میری زندگی میں موت سے ہمکنار ہوتے ہوتے بچ جانے کا دوسرا واقعہ تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد برطانوی سامراج کی دغابازی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ آزادی کے روپہلے خواب چکنا چور ہو گئے۔ عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی جسے تشدد کے ساتھ برطانوی حکمرانوں نے کچل دیا۔ ان اصلاحات کے اجرا پہ ہندوستانی سیاسی حلقے دو گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک اعتدال پسند اور دوسرا گروپ انتہا پسندوں کا شد و مد کے ساتھ سامنے آگیا۔ اگرچہ یہ دونوں گروپ پہلے سے موجود تھے لیکن ان میں وہ کشمکش اور تناؤ ہرگز نہ تھا جو اب پیدا ہو چکا تھا۔ کانگریس سے ماڈریٹ اجتماعی طور پر باہر نکل آئے۔ انتہا پسند گروپ نئی اصلاحات کے استرداد کے لئے جد و جہد کرنے لگا تو حکومت نے اس کی مخالفت کا زور ختم کرنے کے لئے حکومت نے رولٹ ایکٹ جاری کر دیا۔ جگہ جگہ مظاہروں کو درہم برہم کر دیا گیا۔ لوگوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا اور انگریزی حکومت بھی سختی پر اتر آئی تھی۔ نتیجے میں جلیانوالہ قتل عام ظہور پذیر ہوا۔ پنجاب مارشل لا کی زد میں آگیا۔ ان دنوں غم اور غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔

کانگریس نے پنجاب میں رونما ہوئے خونیں واقعات کی تحقیقات اور مصیبت زدگان کی امداد کے لئے جو کمیٹی مقرر کی اس میں مجھے بھی نامزد کیا گیا کہ میں شری سی آر داس کی ماتحتی میں خدمات انجام دوں۔ یہیں میں نے شری سی آر۔ داس کو قریب سے دیکھا اور ان کی بے لوث خدمت اور بے غرض ایثار نے میرے دل میں ان کے لئے عقیدت کے گہرے جذبات پیدا کر دیئے۔

پنجاب کے سنگین حالات دیکھ کر میرے والد انتہا پسندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ کل تک وہ انتہائی ماڈریٹ تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے انڈیپنڈنٹ کے نام سے ایک روزنامہ نکالا جس کا ایک ڈائرکٹر انہوں نے مجھے بھی مقرر کیا۔ اسی سال انہوں نے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت امرتسر میں کی اور اسی اجلاس سے گاندھی جی کا دور رہبری شروع ہو گیا۔ ملک کے گوشے گوشے اور کونے کونے میں "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ میں ان کی عظمت و شہرت کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ دراصل مہاتما گاندھی نے میرے قلب و ذہن پر اپنی محبت کا سکہ ایک دن ہی میں نہیں جمایا تھا بلکہ عقیدت اور محبت اور احترام کے جذبات گزشتہ دس سال سے ان کی زندگی کے کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے رفتہ رفتہ میرے دل میں گھر کرتے چلے جا رہے تھے جوان

کی موت کے بعد بھی موجود ہیں ۔ باپو واقعی باپو تھے ۔ ان کی تعریف کرنا تنہا میرے بس کی بات بھی نہیں ہے ۔

۱۹۲۰ء میں مئی کا مہینہ تھا ۔ میری والدہ اور کملا علیل تھیں ۔ اس لئے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر میں انہیں لے کر مسوری گیا جہاں ایک افغانی وفد برطانوی حکومت سے مذاکرات کے لئے ٹھہرا ہوا تھا ۔ حکومت کو تشویش لاحق ہوئی اور مجھ سے کہا گیا کہ میں ایک تحریری وعدے کے ذریعے برطانوی حکومت کو یقین دلاؤں کہ میں ان افغانیوں سے کسی طرح کا رابطہ قائم نہیں کروں گا ۔ میں نے تحریری وعدہ کرنے سے انکار کر دیا تو مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مسوری چھوڑ دینے کا حکم سنا دیا گیا ۔ کچھ دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ دونوں کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے بگڑ رہی ہے تو میں اپنے والد کے ساتھ پھر مسوری چلا گیا ۔ دریں اثنا حکومت میرے خلاف جاری کئے گئے فرمان کو واپس لے چکی تھی ۔

مسوری جا کر میں نے دیکھا کہ ایک افغانی اندرا کو کھلا رہا ہے ۔ اس سے ہماری خاندانی رسم و راہ پیدا ہو گئی اور پھر افغانی وفد کے تمام اراکین سے ہم دونوں باپ بیٹے ملے ۔ وہ ہم سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ہمیں ۔ ۔ ۔ افغانستان آنے کی دعوت دی ۔

مسوری سے واپسی کے بعد اسی سال میں نے کسانوں کی زبوں حالی اور افلاس کی وجہ سے کسان تحریک میں حصہ لیا ۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستان کبھی بھی ترقی کی راہوں پر بغیر کسانوں کی حالت سدھارے ہوئے گامزن نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ میں نے گاؤں گاؤں جا کر تقریریں شروع کر دیں ۔ میری نگرانی کے لئے خفیہ پولس کے علاوہ ڈپٹی کلکٹر کو بھی تعینات کر دیا گیا تھا لیکن میں اپنے ارادے سے باز نہیں آیا ۔

۱۹۲۰ء میں تمام یو پی کا دورہ کرنے کے بعد میں کانگریس کے ناگپور سیشن میں شرکت کے لئے آیا تو مجھے رائے بریلی سے بذریعہ تار بلاوا آیا ۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ تمام کسانوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور حکومت تشدد پر آمادہ ہے ۔ ایک مجمع پر پولس نے گولیوں کی بوچھار کر دی ۔ کسان اس قدر مغلوب الغضب ہو چکے تھے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی جے جے کار کے ساتھ فیض آباد کے ایک تعلقہ دار کے مکان پر دھاوا بول دیا ۔ مجھے ان کی یہ حرکت پسند نہیں آئی ۔ اسی دوران تحریک عدم تعاون زور پکڑ گئی اور میں اس میں ایسا مصروف ہوا کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی بھول گیا ۔

میں پہلی بار ۱۹۲۱ء میں جیل گیا ۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ولی عہد سلطنت برطانیہ کی ہندوستان آمد پر کانگریس نے اس سلسلے میں کی جانے والی تمام رسوم اور تقریبات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ۔ اس بائیکاٹ نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ تشدد پر اتر آئے ۔ بنگال اور یوپی میں دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور مجھے اور میرے والد کو بھی آنند بھون سے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ۔ لیکن یہ تحریک فروری کے مہینے میں مہاتما گاندھی نے واپس لے لی اور تمام قیدی رہا کر دیئے گئے ۔ مجھے اس رہائی اور تحریک کی واپسی سے بڑا صدمہ ہوا ۔

ابھی میری رہائی کو چھ ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے بدیشی کپڑوں کے تاجروں کے خلاف کئے گئے ایجی ٹیشن کے دوران گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا جہاں مجھ پر مقدمہ چلا کر ایک سال نو ماہ کی سزا کا حکم سنا دیا گیا ۔ میرے اوپر تین الزامات عاید کئے گئے تھے ۔ بغاوت ۔ دوسروں کو خوفزدہ

کرنا - اور تحویل بالجبر - اور یہ تینوں ہی عدالت میں حکومت نے ثابت کر دیئے - چونکہ میں نے مقدمے کی پیروی ہی نہیں کی تھی - قید کے علاوہ مجھ پر جرمانہ بھی کیا گیا جس کی وصولی کے لئے پولیس اکثر و بیشتر سامان قرق کرنے کے لئے آنند بھون جاتی رہی - نئی اندرا ہر ایسے وقت زبردست احتجاج کرتی تھی -

۱۹۲۲ء جنوری کے مہینے میں تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے تو میں بھی آزاد ہو گیا جیل سے باہر آکر میں نے محسوس کیا کہ کانگریس دو حصوں میں بٹ چکی ہے ایک گروپ سوراجسٹ تھا جو مجلس آئین ساز پر قبضہ کرنے کے حق میں تھا اور دوسرا گروپ گاندھی وادیوں کا تھا جو کانگریس کی پالیسی اور اس کے پروگرام میں کسی تبدیلی کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے ان اختلافات سے سخت وحشت ہوئی - لیکن میں اس دکھ کا کوئی علاج نہ کر سکا - کچھ عرصے بعد مجھے الہ آباد میونسپل کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا لیکن کچھ بعد ۱۹۲۵ء کے دوران میں نے اس اعزاز سے استعفیٰ دیدیا چونکہ میرے اختیارات نوکر شاہی کے مقابلہ میں محدود تھے -

۱۹۲۳ء میں ہی مجھے یوپی کی صوبائی پولیٹیکل کانفرنس کا صدر بنایا گیا لیکن میں علالت کے سبب شرکت کی بجائے اپنا ایڈریس بھیجنے پر مجبور ہو گیا - اس سال آل انڈیا کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر ہوئے اور انہوں نے مجھے کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا - اس دوران میں نے ایک مہم چلائی کہ ناموں کے ساتھ خطابات از قسم مولینا، مہاتما وغیرہ کو اڑا دیا جائے - مولانا محمد علی جوہر نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے مجھے ایک تار بھیجا جس کا متن درج ذیل ہے -

میں پرانے طرز تخاطب کے طریقے کو بدل دینے کی اجازت نہیں دے سکتا - خصوصاً گاندھی جی کو مہاتما ہر قیمت پر لکھا جائے - محمد علی

۱۹۲۴ء میں جب باپو کو صدر کانگریس بنایا گیا تو انہوں نے مجھے پھر سکریٹری کا عہدہ دیا - ۱۹۲۵ء میں سی آر داس کی موت نے ہم باپ بیٹے دونوں کو بڑا صدمہ پہنچایا اسی سال میں نے الہ آباد میونسپلٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیا اور چونکہ کملا سخت بیمار ہو گئی تھیں اس لئے انہیں علاج کی خاطر یورپ گیا اور وہاں علاج کے دوران بہت سے ممالک کا دورہ کیا -

۱۹۲۷ء میں پسماندہ اقوام کی کانگریس منعقدہ برسلز میں مجھے حصہ لینے کے لئے بھیجا گیا اور اسی سال میں اپنے خاندان کے ساتھ ماسکو گیا جہاں روسی انقلاب کی دسویں سالگرہ کے جشن منائے جا رہے تھے - ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کی سیاسی بیداری نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی - اس سال کے دو اہم واقعات سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس تھے - میں نے دونوں ہی میں حصہ لیا - لکھنؤ میں سائمن کمیشن ہی تو میں نے اس کے خلاف مظاہرے کئے - دو بار پولیس کی لاٹھیاں کھائیں اور ایک بار پھر موت کے منہ میں جانے سے بچا - اگر میرے ساتھی مجھے لاٹھی چارج کے دوران زبردستی اٹھا کر نہ لے جاتے تو میں آخری سانس تک وہاں سے ہلنے والا نہیں تھا - موت کی میں نے کبھی پروا نہیں کی اور شاید اسی لئے وہ مجھ سے دور دور رہی -

۱۹۲۹ء میں جب مہاتما گاندھی نے کانگریس کی صدارت کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا تو یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی - اس وقت میری عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی - انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے علاوہ مجھے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا بھی صدر چن لیا گیا - میں نے دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے نزدیک تر لانے کی تلقین کی - میں چاہتا تھا کہ کانگریس کا رجحان سوشلزم کی جانب ہو جائے -

اسی زمانے میں کانگریس کے فیصلے کے مطابق ۲۲ جنوری کو ملک بھر میں یوم آزادی منایا گیا اور انجام کار حکومت نے عوام کے جوش و خروش کو کچلنے کے لئے لاٹھیاں برسائیں گولیاں چلائیں اور اندھا دھند گرفتاریاں عمل میں لائیں -

۱۴ اپریل کو جب میں سی پی (سنٹرل پراونس) میں منعقد ہونیوالی ایک کانفرنس کی صدارت کے لئے جا رہا تھا مجھے گرفتار کر کے سالٹ (نمک) ایکٹ کے تحت چھ ماہ کی سزا دیدی گئی - اسی واقعہ سے متاثر ہو کر میری بیوی، ساس والد اور والدہ بھی جیل جانے سے باز نہ رہ سکیں بہنیں میری بیوی

سردار پٹیل، گاندھی جی اور پنڈت نہرو، یادگار لمحے

نے ڈاکٹر سید محمود کی بیگم سے مراسلت کرنے کے لئے باقاعدہ رد و بدل کی چونکہ بیگم محمود ہندی سے واقف نہیں تھیں۔

اس سزا سے رہائی کے آٹھ دن بعد پھر مجھے گرفتار کرکے دو سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ اب کی بار مجھ پر ٹیکس نہ ادا کرنے کا الزام تھا۔ ساتھ ساتھ سو روپیہ جرمانہ بھی عاید کیا گیا۔ لیکن چند ماہ بعد مجھے والد کی سخت ترین علالت کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ اور وہ ۶ فروری ۱۹۳۱ء کو انتقال فرما کر نہ صرف نہرو خاندان بلکہ ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کو مغموم اور افسردہ کر گئے۔

کچھ دن بعد گاندھی جی اور حکومت میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں سمجھوتہ ہو گیا اور جب مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس سے واپس لوٹے تو میں ان سے ملنے جا رہا تھا کہ پھر مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے ساتھ اس وقت تصدق احمد خاں شروانی بھی تھے۔ انہیں بھی ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ مجھے دو سال کی قید اور پانچسو روپیہ جرمانے کی سزا ملی۔ ۳۰ اگست ۱۹۳۳ء کو میری رہائی عمل میں آئی

لیکن چند ماہ بعد پھر مجھے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ انہی دنوں کملا کی طبیعت اور خراب ہوئی اور مجھے جرمنی جا کر اپنی بیوی کی دیکھ ریکھ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کملا کو اپنی بیماری سے ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رستگاری مل گئی اور میں ان کی موت کے بعد ہندوستان چلا آیا یہاں مجھے فیض آباد سیشن میں کانگریس نے سہ بارہ اپنا صدر منتخب کر لیا۔ ابھی تک اتنی بار ایک ہی شخص کا صدر بننا صرف مجھے ہی نصیب ہوا تھا۔

۱۹۳۹ء میں کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس ہوئے۔ ان کے مقابلہ پر میرا نام بھی پیش کیا گیا تھا جسے میں نے واپس لے لیا۔ سبھاش چندر بوس نے لاکھ کوشش کی کہ صدارت اور کانگریس ہائی کمانڈ کے درمیان اختلاف رائے نہ ہو لیکن بوڑھے رہنماؤں (اولڈ گارڈس) نے ان کے ترقی پسندانہ اور مجاہدانہ خیالات سے ہم آہنگی کی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ تری پورہ اجلاس میں گاندھی وادیوں نے ایک تجویز کے ذریعہ صدارت پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں جنہیں سبھاش

بابو نے صدر کے عہدے کی شان کے منافی سمجھتے ہوئے صدارت کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ اب ڈاکٹر راجندر پرشاد نے صدارت سنبھال لی تھی۔

جولائی ۱۹۳۹ء میں مجھے سری لنکا کے دورے پر بھیجا گیا۔ یہاں آنے کا مقصد ہندوستانیوں اور حکومت سری لنکا میں خوشگوار تعلقات کا رشتہ پائدار قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس مشن میں سری لنکا میں بسے ہوئے ہندوستانیوں نے میرا ساتھ دیا اور میں بڑی حد تک کامیابی اور کامرانی کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔

اگست ۱۹۳۹ء میں مجھے چین جانا پڑا۔ یہ مشن ان جاپانیو کے خلاف تھا جنھوں نے چین پر حملہ کر دیا تھا۔ اپنے ہمسایہ ملک کو تکلیف اور عذاب میں مبتلا دیکھ کر ہندوستان بے چین ہو اٹھا۔ میں نے چین میں ایک طبی وفد بھی روانہ کیا تھا تاکہ وہ زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس طبی وفد کے کارناموں کو آج بھی چین کے عوام سراہتے رہتے ہیں۔ اسی سفر کے دوران میری ملاقات چیانگ کائی شیک سے ہوئی اور اسی سال ستمبر کے مہینے میں اس جنگ کا آغاز ہو گیا جو دوسری عالمگیر جنگ بن گئی۔ جنگ میں ہندوستان کو بغیر اس کے عوام کی مرضی حاصل کئے شامل کر دیا گیا تو کانگریس نے احتجاج کے طور پر تمام صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد میں یہی احتجاج انفرادی ستیہ گرہ کی شکل میں بدل گیا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۴۰ء کو یہ تحریک آزادی تحریر و تقریر کے مطالبے کو ساتھ لے کر شروع ہوئی تھی۔ اس کے اجراء کے دو ہفتے بعد میں باپو سے ملنے کے لئے واردھا گیا۔ ان سے طویل ملاقات کے بعد جب الہ آباد واپس آرہا تھا تو مجھے راستے ہی میں سیو کی ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت عمل میں لائی گئی۔ گرفتاری کے بعد مجھے گورکھپور لے جایا گیا وہاں مجھ پر عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہوئے حکومت نے الزام لگایا کہ میں نے باغیانہ تقریریں کرنا اپنا مستقل پیشہ بنا لیا ہے۔ عدالت کے سامنے میں نے اس الزام کو قبول کیا اور مجھے چار سال کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجدیا گیا۔ یہ سزائے قید با مشقت تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب گاندھی جی نے تحریک واپس لی تو عام ستیہ گرہی قیدیوں کے ساتھ میں بھی جیل سے چھوڑ دیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلی جس کی پاداش میں تمام کانگریسی نیتا بشمول باپو گرفتار کر لئے گئے اور ہمیں احمد نگر قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس قید کو میں یوں بھی اپنی خوش بختی پر محمول کرتا ہوں کہ یہاں مجھے اور دوسرے ساتھیوں کے علاوہ مولینا ابوالکلام آزاد کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ مولینا کی علمی شخصیت کا جواب میں نے ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا۔ وہ عجیب و غریب انسان نظر آئے۔ وہ جو دشمنوں تک کی ہرزہ سرائی سے احتیاط برتتے تھے۔ ان کی غبار خاطر میں نے پڑھی اور میں اسے ایک عظیم کتاب قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ انہوں نے ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کے حصول کی خاطر گزار دی۔ انہیں مسلم لیگ کے مطالبۂ تقسیم ہند سے بڑا رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ جیل کے دوران وہی کانگریس کے صدر تھے اور جب ۱۹۴۵ء میں وائسرائے ہندوستان لارڈ ویول نے کانگریسی نیتاؤں کو رہا کر کے ہندوستان کو آزادی دینے کے بارے میں مذاکرات شروع کئے تو یہی مولانا صاحب کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے۔

۱۹۴۶ء میں مولینا کے بعد پھر مجھے کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔ اور جب ہندوستان آزاد ہوا تو میں نے چاروں طرف دیکھا کہ صدق دلی کے ساتھ میری کون مدد کر سکتا ہے تو ان چند لوگوں میں مولانا صاحب بھی تھے جنھیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ ایسی پاک اور بلند شخصیتیں دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔

تقسیم ہند کا میں بھی مخالف تھا لیکن یہ ہمارا مقدر بن چکی تھی۔ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ اگر ہندوستان تقسیم نہیں ہوتا تو محض دس برس کے اندر اندر برصغیر دنیا کی عظیم طاقتوں میں سے ایک ہوتا جہاں کے عوام کو اقتصادی مشکلات جیسی کوئی پریشانیاں لاحق نہیں ہوتیں۔

سب سے پہلے یہ سن لیجئے کہ میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو بھی یہ یاد نہیں رہتا۔ اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعہ میں کمی بیشی یا تقدم و تاخر نظر آئے تو آپ اُسے معاف کر دیں۔

میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی بلکہ شاعری نے خود میرا تعاقب کیا اور نو برس کی عمر میں ہی مجھ کو پکڑ لیا۔ شاعری میری حاکم ہے، میں محکوم۔ وہ جابر ہے، میں مجبور، وہ قاہر، میں مقہور، وہ آمر ہے، اور میں مامور۔

میری دادی جان نے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔

میرا وطن آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا، بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا، کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی ہو، پی ہو سے چہکتا ہوا ملیح آباد، ہندوستان کی تہذیبی جنت، یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے جس کے ایک گوشے میں، ہم لوگ یعنی درۂ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں، قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں۔

میں نے کبھی بھی کوئی ایک کھیل جم کر نہیں کھیلا۔ یوں تو پتنگ بازی بھی کی بعضے طور سے گوٹیاں بھی کھیلیں، آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا۔ فٹ بال اور ٹینس بھی برابر کھیلا اور ست گھرے کے خانوں میں بھی اچھلا کودا مگر دو دو چار چار بار کھیل کر ہر کھیل ترک کر دیا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق اپنے ہم عمروں کو پڑھانا، داغ و میر کے دیوان پڑھنا اور اپنے کمرے کو سجانا۔ یہ تھے میرے محبوب کھیل۔

میرے خاندان کی خواتین پر خوفناک تصورات منڈلایا کرتے تھے، یوں تو ہر محل میں ارواح خبیثہ کی عملداری تھی لیکن وہ محل جس میں دادا میاں رہتے اور جس کا نام تھا بڑا محل وہ تو خصوصیت کے ساتھ دنیا بھر کے شہید مردوں، ہنگامہ شدہ کے تمام مقتول گوروں، بھوتوں، پریتوں، پلیدوں، دیوؤں، چڑیلوں، بھتنیوں، پچھل پائیوں، سر بریدوں، خبیثوں اور جنوں کی راجدھانی سمجھا جاتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد اکثر بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے اور خواتین کے ساتھ ساتھ تمام لونڈیاں باندیاں اور مامائیں اصیلیں بھی اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن بہت تڑکے جبکہ دادی جان اپنے گدے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھوکری بانپتی کانپتی ان کے پاس آئی اور سہمی آواز میں کہنے لگی،

"بڑی بی بی آدھی رات کو جب گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا ٹن ٹن ٹن کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدے اور بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلوٹی، بگٹن لوٹی چڑیل میرے پلنگ کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہو کر رہ گئی۔ جی میں آیا چیخ مار کر گھر بھر کو جگا دوں مگر ڈر کے مارے دانت بھنچ گئے، گھگھی بندھ گئی اور میرا دم نکل جانے میں ذرا سی کسر باقی تھی کہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ سہ دری کے جو سبز عمامے اور لال جریب والے شہید مرد ہیں وہ سہ دری سے نکل کر آ گئے اور آتے ہی انہوں نے اس مردار کی کھوپڑی پر ایسی کس کے جریب ماری کہ وہ بھتنی بلبلا اٹھی اور اچھا آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی" کہتی ہوئی بھاگی اور دھواں بن کر پائے خانہ کی نالی کے اندر غائب ہو گئی۔

ایک رات کو جب کہ محرم کی نویں تاریخ کو ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر چیخیں مار مار کر کہنا شروع کیا۔

"اری تو کون ہے، اری تو کون ہے، اری تو کون ہے؟؟؟"

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی، تمام عورتیں آنگن میں جمع ہو گئیں اور پوچھنے لگیں "اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی ہے؟"

اس نے کہا "بیوی میں نے دیکھا ایک بڑے بڑے دانتوں کی بھتنی اوپر کی منڈیر سے جھک جھک کر تعزیہ دیکھ رہی ہے اور جب میں نے اس سے پوچھا اری تو کون ہے؟ تو اس نے منمنا کر کہا ہم زیارت کرنے آئے ہیں اور غائب ہو گئی۔"

دادی جان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ وہ ہر رات کو سوتے وقت بلا ناغہ کچھ پڑھ کر اور دور دور تک حصار کھینچ کر تین بار تالی بجایا کرتی تھیں اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی، میرا دل دھڑکنے لگتا اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور آج بھی جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ارواح خبیثہ کو وہم کی خلاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا، پھر بھی میرا یہ عالم ہے کہ ابھی سال گزشتہ جب ملیح آباد میں دادا میاں کا محل دیکھنے کو گیا تھا تو ہر چند کہ دن کا وقت تھا لیکن دو چار آدمیوں کو ساتھ لئے بغیر میں اندر قدم ہی نہ رکھ سکا۔ اللہ اکبر کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں بچپن کے اثرات۔

میرا پورا خاندان سنی ہے۔ ہر چند کہ میرے پردادا کے زمانے ہی سے ہم لوگوں میں شدید قسم کی تفضیلیت راہ پا چکی ہے۔ لیکن میری دادی کے آنے سے پیشتر ہمارے گھر میں عزاداری کا مطلق رواج نہیں تھا اور یہ میری شیعہ دادی تھیں جنہوں نے امام باڑہ تعمیر کرا کے ہمارے گھر میں عزاداری کی طرح ڈالی تھی اور ہر چند کہ وہ اپنے بچوں کو شیعہ

نہیں بنا سکیں پھر بھی انہوں نے ان کو اور ان کے ساتھ گھر کی تمام عورتوں کو حسین کا سوگوار ضرور بنا دیا۔ یہاں تک کہ خود دادامیاں بھی امام باڑے میں آنے اور نوحے سن کر آنسو بہانے لگے۔

میرا نکاح ایسا ویسا نہیں تھا۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجئے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے مختلف البطن بھائی تھے نواب محمد نسیم خاں۔ ان دونوں بھائیوں کے مابین حسب دستور خاندان، بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مانند بڑی ان بن اور ٹھن رہا کرتی تھی۔ میرے خسر نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے تھے اور اسی بنا پر میرے نکاح کے موقع پر، میرے نکاح کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ الحمدللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑکا بڑے دھوم سے مجرے ہوئے۔ دعوتیں ہوئیں۔

یہ غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت، حضرت مولانا رضا فرنگی محلی کے مشاعرے میں سب سے پہلے شریک ہوا۔

آیئے میں آپ کو مشاعرے میں لے چلوں، تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے چاندنی پر قالین ہیں گاؤ تکئے دیواروں سے لگے ہوئے ہیں۔ ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان، بانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور الائچی دانے تمباکو اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں شعراء زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔ سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں۔ گلوریاں کھائی اور حقے پئے جا رہے ہیں اور جو شاعر مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے وہ حاضرین کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے۔ حاضرین اس کے حسب مراتب نیم قد و سروقد جوابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ لیجئے اب میر مشاعرہ کے سامنے شمع آگئی ہے اور مولانا رضا کی غزل سے حسب دستور مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ داد سے چھت گونجنے لگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے حقہ پی لے پان کھالے، آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

لیجئے نومشقوں میں اب میری باری آگئی۔ بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں۔ مطلع پر داد مل رہی ہے اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں۔ ؎

اے نسیم صبح کے جھونکو، یہ تم نے کیا کیا!
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پا رہا ہوں اور ولولے کے ساتھ دوسرا شعر سنا رہا ہوں۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا گھر آیا۔ خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور سو گیا تو خواب میں رات بھر یہ دیکھتا رہا کہ پریاں کھینچ کھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

کچھ دن بعد جب میری شیعیت یا یوں کہئے کہ میری رافضیت، کا غلغلہ بلند ہو گیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے، جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے خسر کو طلب فرما کر کہا۔

"غلام شبیر پکا رافضی بن چکا ہے۔ تم نکاح کی تنسیخ کا دعویٰ کر دو، میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا۔"

میرے خسر بھولے بھالے پٹھان تھے آگئے بھڑکی میں اور دائر کر دیا مقدمہ۔ اس مقدمہ دائر ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی اور اس کے چرچوں سے ملیح آباد سے لے کر لکھنؤ تک گونجنے لگا۔ میرے باپ نے اپنی سنت جاریہ پر عمل کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجۂ اول کے وکلاء یعنی شیخ علی عباس، ظہور احمد، مرزا سمیع اللہ بیگ، سرو زیر حسن، اور الہ آباد کے تیج بہادر سپرو اور سر جان جیکسن کو پہلے ہی سے اپنا لیا، تاکہ فریق ثانی کو درجۂ اول کا کوئی وکیل میسر نہ آسکے۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک زور و شور کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے خسر کی جانب سے علمائے اہل سنت کے فتوے پیش کئے گئے تھے کہ رافضی کافر ہوتا ہے اس لئے کسی مسلمان

ڈگی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلاف شریعت۔

حیرت کی بات ہے کہ تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے بھی ان فتوؤں پر تصدیق فرمادی۔

مجھے پتہ نہیں کہ میرے خسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپے صرف ہو گئے تھے۔

میرے باپ کی موت کے غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا اور میرے نکاح کو جائز قرار دے دیا گیا۔

یوپی کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے۔ انہوں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو تار بھیج کر مجھکو نینی تال بلا بھیجا اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا، "میں آپ کو بی، اے، سے مستثنیٰ کرکے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا اسپیشل منیجر کورٹ آف وارڈز؟"

میں نے کہا، جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں میں آپ کی پیش کش سر آنکھوں پر قبول کرتا مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے اس لئے میں آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت سے ایسی تھیں کہ لڑکپن سے ہی مجھے ان سے شدید نفرت تھی۔ ایک تو ان میں تھی بادہ خواری اور دوسری تھی دروغ گفتاری۔ دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا ہوں۔

مہاتما گاندھی سے میری پہلی ملاقات مولانا آزاد کے ساتھ ہوئی۔ ان کی صورت نے میرے ذوق جمالیات کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مار دیا۔ اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور گاندھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟

لیکن جب مختلف مسائل پر انہوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلایا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔ اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔

گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحبزادی وجے لکشمی سرجھکائے بیٹھی تھیں۔ اس وقت تک میں نے حسن معصوم نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل کانپ اٹھا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آجاتی۔ ہم سب چھٹ بھیئے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہم کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے رہیں گے۔ اتنے میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت نہرو آگئے۔ نہرو نے مجھے گلے لگا لیا اور مجھکو وہ زمانہ یاد آگیا جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا تھا اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔

ایک بار جب دہلی پہونچا تو مسز سروجنی نائیڈو برس پڑیں۔ کہنے لگیں، ذرا اس کا نام تو بتایے جس نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مرچکی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھے زندہ سمجھتے تو سیدھے میرے پاس آکر اپنی پتا کہتے۔ اور میرا جواب سنے بغیر انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر گھوش مجھکو نہ لکھتے تو مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ دھولپور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے کہا۔ میں آپ کے ٹمپرامنٹ سے واقف ہوں، کچھ نہ کہئے، میری خواب گاہ میں جائیے۔ میرے تکئے کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے اسے کھولے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیجئے، ذرا سنبھال کر رکھئے گا تاکہ گر نہ جائے۔ اب آپ کا یہ کام ہوگا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہنامہ نکالیں گے۔ اور کسی ریاست کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔ میں نے اس رسالے کا نام "کلیم" رکھا۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے۔ آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے

جوش ملیح آبادی اور نریش کمار شاد

نکالا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گمنام خط آیا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی۔

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ادارہ "کلیم" کو کامیابی سے چلا کر اور ایک ایسے روحانی عذاب میں گرفتار ہو کر جس نے میرے حواس چھین لئے تھے، میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آباد چلا گیا۔

ابتداً میں اپنے اور ساغر نظامی کو ساتھ لے کر جب میں ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا تو اس کے دوسرے ہی دن شام کے وقت شالیمار پکچرز پونا کے مالک احمد بھیا بنے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم لوگوں کا کلام سننے کے بعد وہ بنے میاں کو ایک دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب رخصت ہو گئے تو بنے میاں نے مجھ سے کہا کہ احمد صاحب آپ کو اور ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا آپ کا معاوضہ گیارہ سو تک اور ساغر صاحب کا معاوضہ ساڑھے پانچ سو تک حاضر کیا جائے گا۔

میں نے بنے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر معاوضہ دیا جائے اگر احمد صاحب اسے قبول نہیں کریں گے تو میں ان کی پیش کش نامنظور کر دوں گا۔

احمد صاحب نے با دلِ ناخواستہ یہ شرط قبول کر لی اور تھوڑے دن کے بعد ہم لوگ پونے آ گئے اور شنکر سیٹھ روڈ کے "طاہر پیلس" میں رہنے لگے۔ پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دلفریب صبحیں، شامیں وہاں کی پابندِ اوقات برسات اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک بھلا نہیں سکا ہوں۔

وہیں ساغر نظامی کا مراد آباد کی ایک صاحبزادی سے قلبی معاشقہ بھی چل رہا تھا اور کچھ روز کے بعد وہ صاحبزادی طاہر پیلس میں دلہن بن کر آ گئیں تھیں۔

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات شب برات تھی۔ اور ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جا کر کسی کے آستانِ جمال پر سجدہ ریزی بھی کر آتا تھا۔ لیکن احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر وہ سارا طلسم توڑ دیا۔ وہ چپ چاپ پاکستان کی طرف پرواز کر گئے اور ہم

سب لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ پونے کو خیرباد کہہ کر بمبئی آ گیا اور رہنے کے خالی گھر میں رہنے لگا جو کہیں بہت دور رکھے ہوئے تھے اور زندگی فاقہ و فقر کے سائے میں گزرنے لگی ۔

ایک دن جب بیدار ہوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آ رہا ہے ۔ اس نے اخبار دے کر کہا ملوں سرکار ہند کو اپنے رسالے " آج کل " کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے ماموں آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے آپ فوراً درخواست روانہ کر دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس اپنی درخواست کی نقل بھیج دیں اور درخواست دہلی بھیج دی گئی ۔

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن حسن اتفاق سے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد دونوں بمبئی آ گئے ۔ میں نے ان کی آمد کو تائید غیبی تصور کیا اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گیا ۔ مولانا نے فقط ہاتھ ملایا اور پنڈت جی لپک کر میرے گلے لگ گئے اور چھوٹتے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں ۔ میں نے کہا پنڈت جی " آج کل " کے واسطے درخواست دے کر اس کا انتظار کر رہا ہوں ۔ پنڈت جی نے کہا یہ " آج کل " کا الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آیا ۔ مولانا آزاد نے کہا معلوم ہوتا ہے جوش صاحب نے ہمارے سرکاری رسالے " آج کل " کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہے ۔ پنڈت جی نے کہا تو پھر دہلی آ جایئے میں بندوبست کر دوں گا ۔ "

مولانا آزاد نے کہا پنڈت جی ۔ آپ کو معلوم نہیں ، یہ محکمہ سردار پٹیل کا ہے آپ سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں ۔ پنڈت جی نے کہا جوش صاحب ہمارے شانہ بشانہ برٹش امپائر سے لڑ چکے ہیں پٹیل کو بھی یہ بات معلوم ہو گی اور نہیں تو میں ان کو بتا دوں گا ۔ آپ بڑے اطمینان کے ساتھ دہلی آ جائیں ۔

وہ غالباً ۱۹۴۸ء کا دور تھا کہ میں دہلی پہنچا ۔ اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کر کے میری ملازمت کی بات پکی کر لی اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشن بھی مقرر کرا دیں گے ۔ اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت اطلاعات عامہ کے سکریٹری تھے ۔ اور جب میں انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار پانچ آدمی ایسے بھی وہاں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا ۔ اس کمرے میں پہنچ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے ۔ مجھ سے انگریزی میں کہا کہ یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں ۔ میں پان کھانے سے باز نہیں آ سکتا ۔ پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا ۔ آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں ۔ میں ڈبیا اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے یہ کہہ کر مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں ۔ اس کے بعد اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں ۔ بس وہ نظم سنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی ۔

" آج کل " کی ادارت سنبھالنے کے بعد جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا ۔ تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر سردار پٹیل سے ملنے گئے یا نہیں ؟

میں نے کہا نہیں اور نہ ملنے کا ارادہ ہے پنڈت نے پوچھا کیوں ؟

انگریزی میں جواب دیا کہ اس لئے کہ ان کا چہرہ مجرموں کا سا ہے ۔

یہ سن کر پنڈت جی نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے کہا نہیں نہیں آپ کو ان سے ضرور مل لینا چاہئے ۔ میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں ۔ انہوں نے فون کیا جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے ۔ میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ دھوتی باندھے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے ۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہی ان سے کہا سردار

صاحب مجھے آپ سے ملنے کا ایک خاص وجہ سے بڑا اشتیاق تھا۔ وہ بڑے گھاگ آدمی تھے۔ خاص وجہ سن کر بھانپ گئے اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا۔ میں نے کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سن چکا ہوں۔

یہ سن کر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں کہا کہ آپ نے سنا ہوگا میں مسلمانوں کا دشمن ہوں آپ جس قدر خوفناک برہنہ گفتار آدمی ہیں اسی قدر میں بھی ہوں ۔اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ آپ کے سے ان تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں جن کے خاندان باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں لیکن میں ان تمام مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق.. ہندو قوم کے شودروں اور نیچی ذاتوں سے تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آکر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ دراصل نہایت متعصب ،شریر اور فسادی ہیں اور اقلیت میں موجود ہونے کے باوجود ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے میں ابھی نکلا ہی تھا کہ مولانا آزاد سے مڈبھیڑ ہو گئی انہوں نے اپنی موٹر روک کر مجھے آواز دی اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر ان کی موٹر میں بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھے بڑے دردانگیز تیوروں سے دیکھ کر کہا جوش صاحب آپ اور سردار پٹیل ! میں نے سر جھکا لیا اور انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن !!
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مولانا آزاد تو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے لیکن دل کا عجیب عالم ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہم نے اپنے ملک کو اتنی قربانیاں دے کر کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اردو کا بیڑہ غرق ہو جائے اور مسلمانوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

۱۹۵۵ء میں جب بسلسلۂ شرکت مشاعرہ تیسری بار پاکستان آیا تو ہر چند اس سے بیشتر بھی میرے دیرینہ دوست سید ابوطالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) جو مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے لیکن اس مرتبہ تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

میں نے کہا نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھکو آپ سے کس قدر محبت ہے اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کر دوں، لیکن جب تک پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں، میں پاکستان کیوں کر آسکتا ہوں۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہوگا یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی میں ہی سدھار گئے تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا ۔آپ کی یہ نوکری ،آپ کی یہ فراغت وعزت کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی اور تھوڑی دیر کے واسطے یہ بھی فرض کیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا۔ لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ خدانخواستہ آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ دیکھئے جوش صاحب آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے دردر مارے پھریں گے اور ایک متنفس بھی ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھیگا

ان کی اس طویل جذباتی ومنطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا اور میری آنکھیں کھول دیں۔ نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد ناصر احمد خاں میرے قریب آکر بیٹھ گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ انگشت شہادت بلند کر کے کہنے لگے خان صاحب ہم کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھراتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے۔ کل اسی دو کوڑی رعایا کے بچے آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے ۔اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیشتر ہم مر جائیں۔

صبح اٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا۔ نہا دھو کر نقوی صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر تیار ہو گیا ہوں۔ یہ سنتے ہی نقوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور اسی وقت ڈپٹی کمشنر صاحب کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہانگیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہے اس کو جوش صاحب

کے نام الاٹ کر دیجئے اس پر ان کا سینما حال اور مکان تعمیر کیا جائے گا اور رفاہِ عام مقام پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجئے وہاں ان کا باغ نصب کیا جائیگا۔

جب ان کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو دونوں زمینوں پر مجھکو قبضہ دے دیا گیا اور میرے چوکیدار جھونپڑیاں ڈال کر وہاں رہنے لگے۔

دہلی پہنچا تو معلوم ہوا پنڈت جی باہر گئے ہوئے ہیں دو تین دن میں آئیں گے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر میں پالم ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور پھر ان کے ساتھ ان کے گھر آ کر میں نے اپنا ماجرا بیان کیا تو ان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ "یہ معاملہ بہت نازک ہے اور مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے"۔

دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اٹھاتے ہی میں نے ان کے دل موہ لینے والے چہرے پر اس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھانے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو پاکستانی بنا دیں لیکن آپ یہیں رہیں اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے اردو کی خدمت کرایا کریں سرکار آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اچھل پڑا اور میں نے کہا کہ یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے۔ میری منظوری سے بیحد بشاش ہو کر وہ میرے گلے لگ گئے۔

جب پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا تو نقوی صاحب نے میری خوشی پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے کہا یہ صورت حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی۔ پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستانی آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائیں گے کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے۔ جوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریا عبور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا لیکن چونکہ بات تھی باوزن تو سے پاؤ رتی کی اس لئے ان کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا۔

میرے پاکستانی بنتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر پولا اٹھا گویا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے ملکر خم ٹھونک ٹھونک کر تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کرنے لگے۔ یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے، یہ تمام دھماکے اور یہ ملکی دہائیاں جب حکومت کے کانوں میں پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ اور جس وقت میں نے دیکھا کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

میں نے سوچا کر ہندوستان پلٹ جاؤں۔ غیرت نے اجازت نہیں دی۔ اب میری مسلسل ناکامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ جہانگیر روڈ کا سینما اور باغ لگانے کی زمین خود میں نے واپس کر دی۔

۲۔ ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ نیلام میں میرے نام چھوٹا قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

۳۔ کاشتکاری کے لئے ہاشمی صاحب ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی۔ الطاف گوہر صاحب نے اسے ضبط کر لیا

۴۔ سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔ نرخ گر گئے پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

۵۔ کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی۔ روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

۶۔ واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیں دینے پر آمادہ ہو گئے۔ روپیہ لگانے والوں کو روک دیا گیا۔

۷۔ بیڑی کے پتوں کا لائسنس مل رہا تھا۔ لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا۔ اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا

۸۔ سینما کے ساز و سامان کا پرمٹ مل رہا تھا کہ وزیر معطل کر دیا گیا۔

۹۔ پریس قائم کرنے کی اجازت نامہ تیار ہو گیا۔ لیکن

دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

۱۰۔ مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا۔ لیکن سکریٹری کو برطرف کر دیا گیا۔

۱۱۔ پٹرول پمپ کی سعی کی۔ ناکام ہو گئی۔

۱۲۔ ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ آج تک قبضہ نہ مل سکا۔

۱۳۔ دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی۔ منظور نہیں ہوئی۔

۱۴۔ اپنی کتابوں کی اشاعت و طباعت چاہی کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔

۱۵۔ فریر ہال کے ایک گوشے میں ریستوران کھلوانے کا وعدہ محکم ہو گیا۔ افسر محکمہ متعلقہ کا تبادلہ ہو گیا

۱۶۔ سندھ ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا اجرت نہیں ملی۔

۱۷۔ محکمۂ آبادکاری کے انسپکٹر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے میرے الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے پھینک دیا

۱۸۔ پنجاب کے چیف کمشنر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا۔ الغرض

ع جس جگہ ہم نے بنایا گھر سڑک میں آ گیا

ان مسلسل ناکامیوں نے مجھے چکرا دیا۔ شدت یاس اور ہجوم افلاس نے میرا احاطہ کر لیا۔ نقوی صاحب جو ایک ہزار روپیہ قرض دینے تھے وہ اس قدر کم تھا کہ صرف گھر چلا سکتا تھا۔ اس لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ کر کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔ بیوی نے کہا کر ساری بدیاں آدھی کر دو۔ اس کی لپیٹ میں آکر شراب ترک کر دی۔ ترک شراب کے بعد میرا اس بچے کا سا عالم ہو گیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ شراب کی پھٹکن سے نجات پانے کے واسطے شام ہی سے کھانا کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن بے چینی میں کمی نہیں آئی۔ جی بہلانے کو

کتاب اٹھا لیتا تھا کہ شراب کی للک بہل جائے تو کتاب کی سطریں ناگنوں کی طرح رینگنے لگتی تھیں اور حروف کے دائروں میں بچھو ڈنک اٹھائے نظر آتے تھے۔

غالباً اگست ۱۹۶۰ء میں رخصت لے کر اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفئے کی خاطر ہندوستان گیا۔ اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے وہاں چار مہینے رہنا پڑا۔ چند مشاعروں کے سلسلے میں بمبئی پہنچا۔ ظ۔ انصاری صاحب کسی اخبار کے نمائندے کو لے کر انٹرویو کے لئے آئے اور میرا انٹرویو کسی اخبار میں شائع ہو گیا۔ رخصت کے اختتام پر جب میں لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے معانی پہنا کر یہاں کے اخباروں نے خوب اچھالا اور مجھ کو پاکستان دشمن ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا۔

میری زندگی کا بحمد اللہ کہ یہ پانچواں معاشی بحران ہے جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں۔ ہر چند میری ملازمت

تو ختم کر دیا گیا ہے۔ میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے میری سیمنٹ کی ایجنسی مجھ سے چھین لی گئی ہے اور میرے باغوں کا جو روپیہ ہندوستان کے ریزرو بنک میں جمع ہے وہ بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کے فضل و کرم سے میرا کوئی بینک بیلنس بھی نہیں ہے لیکن میں بدحواس نہیں ہوں۔ مجھ کو اس بحران کی بھی کبھی پروا نہیں ہوئی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ حسب سابق اس بحران کا سورج بھی میرے قدموں میں جھک کر رہے گا۔

ع۔ ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

میرا خاندان

میرے پردادا

تہور جنگ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خان بہادر گویا۔ ان کے دادا یار بیگ خان درۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔ یار بیگ خان کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام محمد دار خان اور چھوٹے کا محمد بلند خان۔ نام دلو خان درۂ خیبر میں ہی رہے اور محمد بلند خان آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خان اور فقیر محمد خان کو ساتھ لے کر ۱۲۳۴ء میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

میرے دادا

نواب محمد احمد خان بہادر احمدؔ صاحب "مخزن آلام" اور تعلقہ دار کسمنڈی جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو اپنے جانے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا۔ ان کی آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے تھے۔

میرے باپ

میرے باپ کا نام تھا نواب بشیر احمد خاں اور تخلص تھا بشیر۔ مردانہ حسن میں ان کا جواب نہیں تھا اور تاریخ اسلام جب بیان فرماتے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے۔

میری ماں

نواب خواجہ محمد خان، جاگیردار دھولپور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں۔ میری ماں کو اس ناز سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں۔ ان کو پوری سو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں۔ میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور میر انیسؔ سے بڑی محبت تھی۔

میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خان بہادر تعلقہ دار کے فرزند محمد مقیم خان کی بیٹی اور سائرہ بیگم کی نواسی ہیں۔ وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ماہر نفسیات یا ماہر نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو اس امر کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ کب اور کس بات پر ہنسیں اور کس بات پہ جامے سے باہر ہو جائینگی اب ان کے مزاج کی چند خصوصیات بھی سن لیجئے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وہم ہر قیاس، ہر ظن اور ہر واہمے کو ایک حقیقت کبریٰ اور وحی و الہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے اور اگر بول دیتا ہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتیں، کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

جہاں تک کہ تدبیر منزل کا تعلق ہے ان کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے میں ایک لکھ لٹ انسان ہوں اگر میری شادی ان سے نہ ہوئی ہوتی تو میں فاقے کر کے مرجاتا۔

میرے احباب

میرے دیگر احباب میں ابرار حسن خان اثرؔ، مختار احمد خاں، قاضی خورشید احمد، حکیم صاحب عالم، رفیع احمد خاں، پرنس مرزا عالمگیر قدر، ڈاکٹر ایس۔ کے سکسینہ، مانی جائسی، شررؔ لکھنوی

ایک یادگار شاعری کی تصویر شاعر بسمل سعیدی سائل نظامی کے ساتھ جوش صاحب ہیں۔

شاہ دین نیر الہ آبادی، نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، خلیفہ ”انصاری، فانی بدایونی، آغا شاعر قزلباش، سردار روپ سنگھ ڈاکٹر کرنل اشرف الحق، کنور بندر سنگھ بیدی، میاں محمد صادق، علامہ حیرت، سردار دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبد السلام، مولانا عبداللہ عمادی، فراق گورکھپوری، وحید الدین سلیم، سید جالب، روشن علی بھیم جی، آغا حسن عابدی مصطفےٰ زیدی اور مجاز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میرے بے شمار احباب میں سے سہا مجددی بھی تھے جو کبھی تاجدار خیرپور کے پرائیویٹ سکریٹری محض شاعری کے بل بوتے پر ہوئے تھے۔ سہا انتہائی پست قامت تھے۔ اور میری ان کی جوڑی ہاتھی اور بکری جیسی تھی۔ انہیں شراب و شباب سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ ایک بار جب وہ جنگ عظیم ثانی کے دوران مجھے بمبئی میں ملے تو انہوں نے بتایا کہ ان کی شاناسے گذر بسر ہو رہی ہے۔ اندور کے ایک جوان انعام اللہ خاں نے ان کے ساتھ لوہے کا ایک بڑا فوجی ٹھیکہ لیا تھا جس نے ان کے بھوجن کا بھی انتظام کر دیا اور……

کا تھی۔ سہا نے بتایا کہ انہوں نے جس پینا ترک کر دیا ہے اور اب دن بھر میں صرف دو بوتل وائن اور چار چھ بیر پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ ان کا آخری دور اپنے وطن میں کٹا اور انتہائی کس مپرسی کے عالم میں انتقال کیا۔ میں نے نواب بھوپال سے کہا تو انہوں نے سہا کی مدد کے لئے ہر قسم کے انتظامات کا حکم دیا مگر فردوسی کی طرح جب ایک دروازے سے ان کی لاش نکلی تو دوسرے دروازے پر نوابی امداد پہنچی۔

میرے معاشقے

میرے باپ نے مجھ کو اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی اور اس بنا پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی۔ میرے انتہائی شرمیلے پن کے سیکڑوں واقعات میں سے فقط ایک واقعہ سن لیجئے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں ”نامحمدا“ کس حد تک شرمیلا تھا۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک بچہ خاصی کم سن اور بطور انعام طوائف مجرے کے لئے آئی ۔ ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈرا کورا ہے ۔ معاذ اللہ ۔ جب اس کی نشیلی انکھڑیوں میں کھلا بزت کا باب، میرے تارِ وجود پر مچلنے لگی مضطرب اور جب ناچتے ناچتے وہ بالکل میرے قریب آئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی ۔ تو اس کی شربتی پشواز کا ملائم سرا میرے ہاتھ کی پشت سے مس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ۔ کھٹنے لگی ایک بھاپ سی میرے مسامات سے ہوا سنکنے اور پوسی پھٹنے لگی میرے جسم کے اندر

ایک دامنِ حریر کے لمسِ خفیف سے
نودے اٹھا ہے خونِ رگِ جاں کبھی کبھی

یہ تھا میرا پہلا آپریشن جو برگِ یاسمن کی دھار سے کیا گیا تھا ۔ اب سنئے دوسرا واقعہ :-

ایک دن، جب گلابی جاڑے کی نویلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر حسب دستور محو خواب اور میں حسب عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کی ہری بھری نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب کی کوٹھری میں رہنے والی جوشی لونڈی ظہورن میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے گھورنے لگی اور جب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم رنگین سی ملگجاہٹ ہے ۔ اس کے ہونٹوں کے ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضہ ہے اور اس کی ٹھوڑی تک ابھرا سینہ گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے ۔ تو میں نے پوچھا "ظہورن کیا بات ہے؟" اس نے کہا "منجھلے بھیا میری کوٹھری میں ذری چلے چلو تو بات بتاؤں ۔ میری کوٹھری بڑی گرم گرم ہے" مروت کے مارے انکار نہیں کر سکا ۔ وہ آگے آگے چلی اور میں اس کی گرم گرم سانسوں میں لپٹا ہوا کوٹھری میں داخل ہو گیا ۔

ظہورن نے بڑے چاؤ اور بلا کے بھاؤ کے ساتھ کہا "منجھلے بھیا ذری لیٹ جاؤ میں تمہارے پاؤں داب دوں" میں بڑی معصومیت کے ساتھ لیٹ گیا ۔ اس نے مجھ پر رضائی ڈال دی ۔ اور رضائی کے اندر ہاتھ ڈال کر بڑے بچے تلے انداز سے میرے پاؤں دابنے لگی ۔ تھوڑی دیر پاؤں دابتی رہی ۔ اور اس کے بعد .....

بندہ پرور ایک بار نہیں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں

ایک وسیع اور دو منزلہ مکان کے ایک حصے میں اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز ربعلی روزبالڈ کے ساتھ رہتی تھی ۔ زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا ۔ اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے ۔ ہماری خوابگاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا ۔ اور جب ہم اپنے بستروں پر لیٹتے تھے تو فریقین دیر تک ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنا کرتے تھے ۔
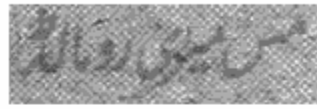
ایک روز سرِ شام ہم دونوں زینے پر چڑھ رہے تھے ۔ وہ آگے تھی میں پیچھے کہ یکایک اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور "اوگاڈ" (ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی اور بڑے کرب کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑ لیا ۔ میں نے انگریزی میں پوچھا آپ کو کیا تکلیف ہے ۔ اس نے کہا "میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے ۔ آپ مجھ کو سہارا دے کر میری خوابگاہ تک پہونچا دیں ۔ او مائی گاڈ"

میں نے لپک کر اس کی چھلا سی کمر میں ہاتھ ڈال دیا ۔ اور سہارا دے کر اسے اس کی خوابگاہ میں پہونچا دیا ۔ وہ بستر پر لیٹ کر تڑپنے لگی ۔ میں نے کہا میں "ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں" اس نے کہا "نہیں پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر کو بلا لائیں"

میں بڑے انہماک کے ساتھ اس کا پیٹ سہلانے لگا ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے ۔

میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا ۔ اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر پر جو اس کے سرہانے آویزاں تھی چادر ڈال دی ۔

اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ۔

ایڈیٹر "ریاست" کا وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) ہے۔ یہ وہاں کے ایک کھنہ کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہوا۔ خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں۔ بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" کے والد اپنے زمانے میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ جو بنوں، میانوالی اور جہلم وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔

ایڈیٹر "ریاست" کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی جب والد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے کیونکہ والد نے اپنی کامیاب زندگی میں کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکانات پر قبضہ کر لیا اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریاتِ زندگی اور بڑے بھائی اور بہنوں کی چار شادیوں پر روپیہ صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیٹر "ریاست" کی عمر جب بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ایڈیٹر "ریاست" پانچ روپے ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دوکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑوں کے تھان لا کر خریداروں کو دکھائیں۔

بعض لیڈر اور اخبار نویس زندگی بھر روتے رہے اور پبلک کی قدر ناشناسی کا الزام لگا کر ہمیشہ ہی چلاتے رہے کہ بغیر روپیہ کے کام کیوں کر کریں اور اگر کوئی لیڈر یا اخبار نویس خود غرض ہو تو وہ روپیہ کے لیے لوگوں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے مگر اس کو روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیے کیا مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح، ماسٹر تارا سنگھ یا دوسرے مخلص کام کرنے والوں کو پبلک کام کے لیے کبھی بھی کمی ہوئی اور اگر کبھی انہوں نے ہاتھ پھیلایا تو کیا لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ان کے پاس نہیں پہنچ گیا؟

کئی برس کی بات ہے۔ "ریاست" کو جاری ہوئے شاید چار ماہ ہوئے ہوں گے۔ دفتر "ریاست" جامع مسجد کے بالکل سامنے مچھلی والان بازار کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا ایک بارعب جسیم مسلمان نوجوان

پہنچے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دو ملازم بھی تھے۔ ایڈیٹر ریاست نے سمجھا شاید کوئی پولیس افسر ہیں اور وارنٹ لے کر آئے ہیں۔ آپ نے آتے ہی پوچھا کہ سردار دیوان سنگھ کہاں ہیں؟" راقم الحروف نے جواب دیا۔ "فرمائیے میں ہی دیوان سنگھ ہوں" میرے پاس کاتب اور دفتر کے اسٹاف کے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا "علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ دفتر کا ایک ہی بڑا کمرہ تھا میں ان کو برآمدہ میں لے گیا۔ وہاں ہم کھڑے تھے کہ آپ نے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

"میں آپ کے اخبار کا مداح ہوں۔ یہ لفافہ آپ کے اخبار کی امداد کے لیے ہے۔"

میں نے پوچھا: آپ کون صاحب ہیں اور دہلی کیسے تشریف لائے ہیں؟"

آپ نے بتانے سے انکار کر دیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد معلوم ہوا کہ آپ یوپی کے ایک خان بہادر اور ڈپٹی کلکٹر پنشنر تھے۔ میرے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ پبلک کام کرنے والے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کام کرنے کے لیے روپیہ نہیں ملتا وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور ان میں اخلاص اور دیانداری کی کمی ہے۔

"ریاست" جب جاری ہوا تو اس کے دفتر میں نہ کوئی سب ایڈیٹر تھا، نہ مترجم اور نہ کوئی مینیجر۔ صرف ایک کلرک تھا اور ایک چپڑاسی۔ کلرک کی تنخواہ تیس روپے تھی اور چپڑاسی کی پندرہ روپے۔ "ریاست" کا دفتر دہلی دروازے کے قریب، تھانے کے بالکل سامنے ایک گلی کے اندر تھا۔ اس مکان کا کرایہ اٹھائیس روپیہ ماہوار تھا۔ اس میں سے بھی کچھ حصہ بارہ روپیہ ماہوار پر ایک ریلوے گارڈ کو دیا گیا تھا گویا کہ ریاست کے دفتر اور ایڈیٹر "ریاست" کی رہائش دونوں کے لیے سولہ روپیہ ماہوار کرایہ دیا جاتا تھا۔ اور کام کی حالت یہ تھی کہ ویسے تو ایڈیٹر "ریاست" کی تمام زندگی ہی دن رات میں سے چودہ چودہ، سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے گزر گئی۔ مگر اس زمانے میں یہ لگاتار اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا اور صرف چھ گھنٹے سوتا۔

رات ہو گئی۔ رات بھر کام جاری رہا۔ دن نکل آیا، غسل کیا اور پھر میز پر بیٹھ گیا اور پھر رات ہو گئی۔ یعنی چھتیس گھنٹے مسلسل کام کرتا رہا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار میں کامیابی ہوئی۔ دو تین ماہ کے اندر ہی اشتہارات کے آٹھ دس صفحے ہو گئے۔ اور لاہور، دہلی اور دوسرے مقامات کے اخبار نویس "ریاست" کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

مرحوم مہاراجہ نابھہ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں مگر آپ کی معزولی کا اصل باعث پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ آپ ابھی ولی عہد تھے۔ گورنمنٹ نے اپنی حمایت کے لیے آپ کو سینٹرل اسمبلی کا (جو اس وقت امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے نام سے تھی) ممبر نامزد کیا۔ مگر آپ اسمبلی میں گورنمنٹ کا ساتھ چھوڑ کر مرحوم مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالف بنچوں پر جا بیٹھے۔ چنانچہ آپ کے مصائب کی بسم اللہ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ آپ کی معزولی کی داستان بہت طویل ہے۔ مرحوم محمد علی نے کانگریس کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا کہ مہاراجہ کی معزولی کا سبب آپ کی صفات (یعنی حب الوطنی اور خودداری) تھیں، نہ کہ آپ کے نقائص، جن کو سامنے رکھ کر گورنمنٹ نے آپ کو معزول کیا۔ کیونکہ اگر ان نقائص کی بنا پر دوسرے والیانِ ریاست کو بھی سزا دی جاتی تو شاید ایک والیٔ ریاست بھی گدی پر حکمران نہ رہتا۔

مہاراجہ نابھہ نے اپنی معزولی کے بعد گورنمنٹ کے حکام سے تعاون کرنا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور آپ اس کوشش میں رہے کہ کانگریس اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے ذریعہ انصاف حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ کی دعوت پر سر تیج بہادر سپرو، مرحوم پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر رنگا آئر، مسٹر جناح، سردار سردول سنگھ کوشیر، ماسٹر تارا سنگھ، مولانا محمد علی، مسٹر سری نواس آئنگر، سر سی پی راما سوامی آئر وغیرہ درجنوں ہندوستانی لیڈر اور مسٹر اوڈنی جونس، مسٹر سکلتوالا وغیرہ ممبرانِ پارلیمنٹ مہاراجہ سے ملے اور ان

والوں میں سے ایک نے مختلف طریقوں سے مہاراجہ سے رقابت بھی حساب عمل کیا۔ چنانچہ بعض اصحاب نے تو ایک ایک دو دو لاکھ روپیہ گدی پر واپس بٹھانے کے نام پر وصول کیا۔ مہاراجہ کو مشورہ دیا گیا کہ اگر مہاتما گاندھی آپ کے مسئلے میں دلچسپی لیں تو آپ گدی پر واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ مہاتما گاندھی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کی مسوری میں دعوتیں ہوئیں۔ مرحوم مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی سے کہا۔ مختلف ممبران اسمبلی اور لیڈروں کے ذریعے اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی، سردار سر دول سنگھ کویشر اس سلسلے میں کئی بار گاندھی جی سے ملے اور مہاراجہ نے تمام اپنی شکایت کے متعلق نہ صرف تمام مطبوعہ لٹریچر بھیجا جو طلب کیا گیا تھا بلکہ ٹائپ کرا کر بہت طویل خطوط بھی گاندھی جی کو لکھے کہ آپ اس مسئلے پر ذاتی توجہ دیجئے اور دشمن سے مل کر گدی پر واپس بٹھوا دیجئے۔

تمام لٹریچر، اثرات اور خط و کتابت کے بعد مہاتما گاندھی کا ایک پوسٹ کارڈ مہاراجہ نابھہ کے نام مسوری پہنچا۔ جس پر صرف دو چار سطریں پنسل سے لکھی تھیں اور جن کا مطلب یہ تھا کہ تمام لٹریچر اور خطوط پڑھنے کے بعد مہاتما گاندھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مہاراجہ نابھہ کانگریس یا گاندھی جی کی امداد کے مستحق نہیں۔ مگر یہ پنسل کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ ہی مہاراجہ نابھہ کی مزید تباہی اور کوڈائی کنال میں نظربندی کا باعث ہوا اور وہیں نظربندی کی حالت میں وہ انتقال کر گئے۔

"ریاست بھاری ہو چکا تھا۔ میں مہاراجہ نابھہ کے پاس مسوری پہاڑی پر مقیم تھا۔ مہاراجہ اور مہارانی مجھے اپنی فیملی کے ایک ممبر کی طرح سمجھتے تھے۔ مہاراجہ کے ساتھ کئی برس سے میرے گہرے تعلقات تھے اور مہارانی بھی اپنے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھیں مجھے مسوری گئے ہوئے پندرہ بیس روز گزر چکے تھے۔ حافظ آباد سے میری والدہ کا خط ملا کہ شادی کی تمام تیاری مکمل ہو چکی ہے اور تاریخ مقرر کی جا رہی ہے۔ روپیہ کا انتظام مکمل کرو۔ میرے پاس روپیہ کہاں؟ تمام زندگی کبھی روپیہ جمع نہ ہو سکا۔ بلکہ میں ہمیشہ مقروض رہا۔ میں نے یہ خط مہارانی کو دکھایا تو مہارانی نے مہاراجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیوان سنگھ کی شادی کے لیے تاریخ مقرر ہو رہی ہے۔ اس کے پاس روپیہ موجود نہیں۔ مہاراجہ نے پوچھا۔ "کتنا روپیہ چاہیے؟" تو مہارانی نے کہا دو ہزار روپیہ کافی ہوگا۔

لنچ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں بیٹھے تھے کہ مہاراجہ نے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ جو لوگ پبلک خدمت کریں ان کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔ پھر مہاراجہ نے مزید کہا۔

"اگر میری شادی نہ ہوتی، میرے بیوی بچے نہ ہوتے تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ یہ بیوی بچے جن کے باعث میں نے گورنمنٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور نابھہ اور نابھہ کی گدی سے دستبردار ہو گیا۔ اگر بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کبھی دستبردار نہ ہوتا اور زندگی کے آخری لمحوں تک لڑتا رہتا۔" آخر کئی دن رات اس مسئلے پر بحث کرنے کے بعد جب میں نہ مانا تو مہاراجہ نے مجبور ہو کر چیک بک منگوائی چیک بک کھلتے ہی تو پھر فرمایا۔

"سردار دیوان سنگھ! تم نہیں مانتے، تمام زندگی پچھتاؤ گے۔ چونکہ تم نہیں مانتے اس لیے تم کو شادی کے لیے دو ہزار روپیہ دیتا ہوں۔ اگر نہیں کرو گے تو دو ہزار روپیہ اور دے دوں گا۔"

پچھلے تجربے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں بیوی بچے اور روپیہ ایک لعنت ہیں بیوی بچے اور روپیہ کے باعث انسان جرأت اور شجاعت سے محروم ہو کر خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اگر پبلک لائف اختیار کریں تو ان کے بیوی بچے نہ ہوں، اور وہ روپیہ سے محروم ہوں اور شادی صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو کلرک ٹائپ ہوں اور جن کا مقصد کھانا، پہننا اور بچے پیدا کرنا، بچوں کو کھلانا، ملازمت کرنا اور اگر ان کا افسر مسکرا دے تو خوش ہو جانا اور اگر افسر کی پیشانی پر شکن پڑ جائے تو رات کو نیند نہ آنا،

میں نواب بھوپال والے مقدمے کی پیشی پر جوشنگ

آباد گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو مجھے دفتر کے نوکروں نے بتایا کہ نواب صاحب رام پور کی حقیقی بہن شہزادی بیگم صاحبہ دہلی آئی ہیں اور وہ نئی دہلی پارک روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں اور اپنے حالات بتانا چاہتی ہیں اور کئی بار یاد فرما چکی ہیں۔

شام کو جب سیر کے لیے گیا تو پارک روڈ والی اس کوٹھی میں پہنچ گیا جس کا پتہ بتایا گیا تھا۔ وہاں کرنل محمد علی منتظر تھے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے، بیگم صاحبہ کے دونوں صاحبزادے (موجودہ نواب رام پور کے حقیقی بھانجے) بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد ساتھ والے کمرے سے بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور دروازے کی اوٹ میں پردے کے اندر بیٹھ گئیں اور باتیں شروع کیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ دہلی اس لیے آئی ہیں کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ والے آپ کے ساتھ انصاف کریں اور پبلک کو بتایا جائے کہ بھائی نے حقیقی بہن کے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ میں دو گھنٹے کے قریب بیگم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔

ادھر خواجہ حسن نظامی نے شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف اخبار "عادل" اور دوسرے اخبارات میں گندا پروپیگنڈا شروع کیا۔ میں کام سے فارغ ہونے کے بعد جب کار میں سیر کو جاتا تو مغرب کے بعد ہر روز بیگم صاحبہ کے ہاں ہر روز پہنچتا۔ بیگم صاحبہ بتاتیں کہ کون صاحب تشریف لائے تھے اور کیا کہتے تھے۔ میں مناسب رائے دے دیتا اور کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا۔

میں ایک روز شام کو شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک صاحب خواجہ حسن نظامی کے ہاں کلرک ہیں، وہ یہاں آئے تھے اور کہتے تھے کہ اگر روپیہ دو تو خواجہ حسن نظامی کے ہاں کے کچھ کاغذات دیے جا سکتے ہیں جو رام پور سے آئے ہیں۔ تیسرے روز یہ شخص کاغذات کا ایک چھوٹا سا بنڈل لے کر آیا تو اس سے کہا گیا کہ دو روز بعد جواب دیا جائے گا۔ میں اس روز جب بیگم صاحبہ کے ہاں گیا تو آپ نے بغیر اس بنڈل کو کھولے یہ کاغذات مجھے دیکھنے کے لیے دے دیے۔ میں کاغذات لے کر دفتر چلا آیا۔ وہاں اس بنڈل کو کھولا۔ کام کے جو کاغذات تھے ان میں چار پانچ بہت اہم تھے۔ ایک خط مسعود صاحب ریونیو منسٹر رام پور کا، ایک وہاں کے پبلسٹی آفیسر کا اور ایک کسی اور صاحب کا۔ ان خطوط میں لکھا گیا تھا کہ شہزادی بیگم کے خلاف اخبارات اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر اپنا اثر استعمال کرتے ہوئے خوب پروپیگنڈا کرو تاکہ یہ خاتون خوب رسوا اور ذلیل ہوں۔ ان خطوط کے علاوہ اخباری نقطۂ نگاہ سے چند مضامین کے مسودے بہت اہم تھے۔

شام کو بیگم صاحبہ کے پاس گیا۔ ان سے کہا کہ پانچ خطوط کام کے ہیں باقی تمام واپس کر دیجیے۔ ان خطوط کا معاوضہ ایک یا دو سو روپیہ دے دیا جائے۔ چنانچہ اگلے روز جب خط لانے والا آیا تو اس کو دو سو روپے دے دیے گئے۔

ان خطوں کے بلاک بنے، بلاکوں کا چربہ لیا گیا اور "ریاست" میں ان چربوں کے ساتھ لیڈر شائع ہوا تھا۔

حسن نظامی اپنے حواریوں کے ساتھ پولیس افسروں کے پاس پہنچے۔ راقم الحروف نے بھی ان کے کیمپ میں اپنا آدمی چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کیا کہ یہ سکیم ہے کہ چوری کا مقدمہ قائم ہوگا اور دفتر "ریاست" کی تلاشی ہوگی۔ میں نے اطلاع پاتے ہی فوراً تمام کاغذات اور بلاک ایک اٹیچی کیس میں بند کیے، تالا لگایا اور نئی دہلی میں ایک دوست کے پاس گیا۔ ان کے خسر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ میں نے اپنے دوست کو اٹیچی کیس دیا اور کہا کہ اس میں کچھ ضروری کاغذات ہیں ان کو اپنے ہاں احتیاط سے رکھو۔ اس نے کہا رکھ لیا جائے گا معمولی بات ہے۔ میں تو واپس آ گیا اور وہ کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی کانفیڈنشل الماری میں پہنچ گئے۔ جہاں سے دو ہفتہ بعد واپس منگائے گئے۔ اٹاچی کیس میں اس دوست کے پاس چھوڑ کر جب واپس آیا۔ اپنے کام میں مصروف تھا کہ پولیس کی جمعیت کے آٹھ دس آدمی ایک سب انسپکٹر اور متعدد دوسرے لوگ تلاشی کے لیے تشریف لائے۔ میں بالکل بے فکر اور لاپروا تھا۔ تلاشی ہوئی، مکان کا ایک ایک کونہ چھان مارا گیا لیکن
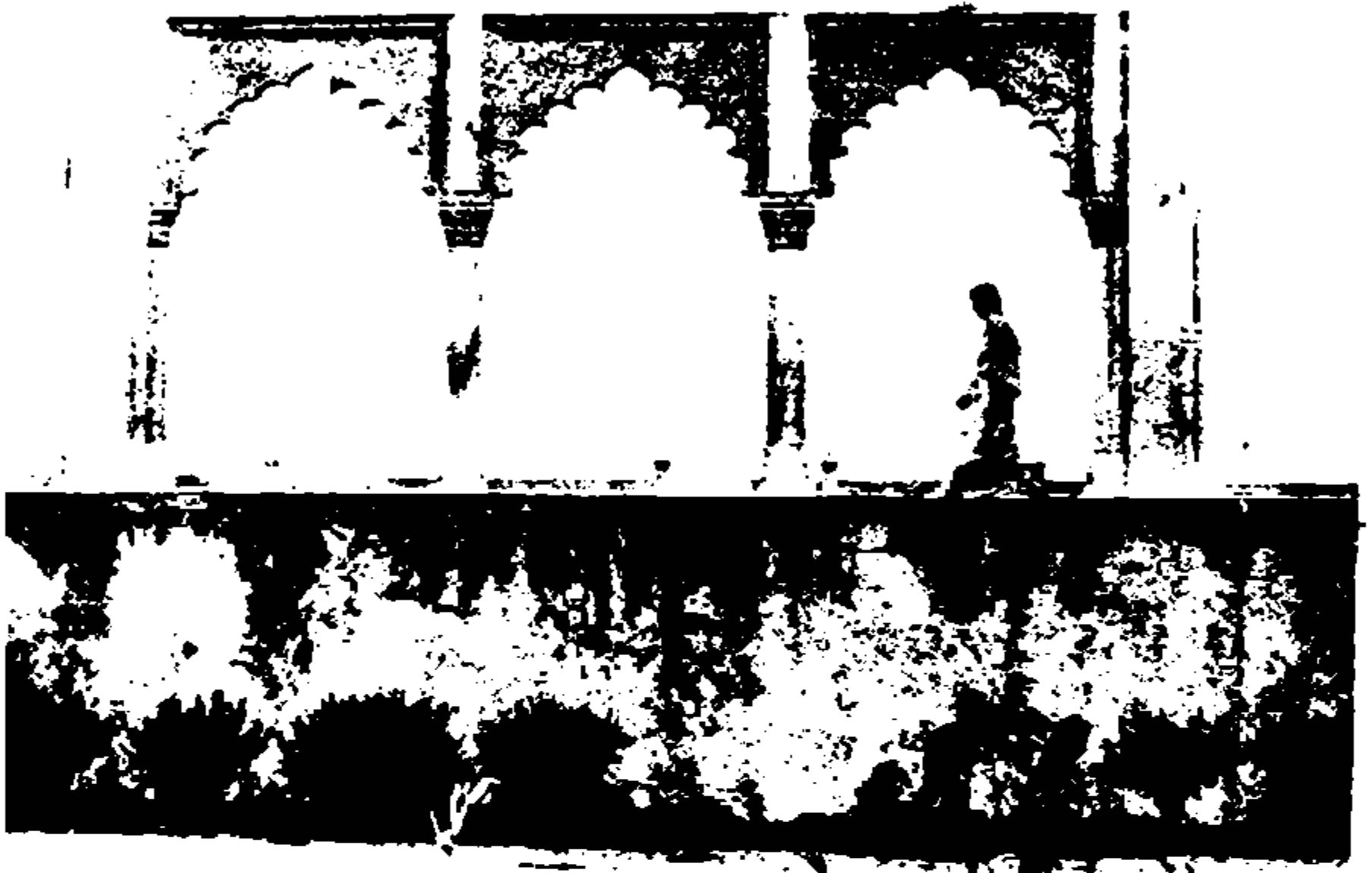
"چوری کا مال" ہی نہ پکڑا گیا۔ یہ خطوط اب بھی ایڈیٹر "ریاست" کے پاس موجود ہیں جن کی حیثیت اخلاق پارہ سے زیادہ نہیں۔

"ریاست" کو جاری ہوئے دو سال ہو چکے تھے میرے پاس نالاگڑھ سے بذریعہ رجسٹری ایک خط پہنچا جو بارہ سولہ صفحہ کا تھا۔ اس خط میں رانی نالاگڑھ (اہلیہ راجہ نالاگڑھ جو حال میں پٹیالہ یونین میں مدغم ہے) کی دلی مصائب کا ذکر تھا کہ وہ وہاں قیدی کی زندگی بسر کر رہی ہیں انتہائی تکلیف میں ہیں اور وہاں کا وزیر جو گورنمنٹ کا بھیجا ہوا ایک سرکاری افسر تھا نہ صرف رانی کو بہت تنگ کر رہے ہیں بلکہ پبلک بھی بہت پریشان ہے۔ اس خط میں اس وزیر پر بہت سخت اور سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ اس خط کے ملنے پر میں سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اگر ان الزامات کو شائع کرتا ہوں تو مقدمہ ہونے کا خوف، کیونکہ الزامات چاہے سچ ہوں ان کی سچائی کے متعلق ثبوت موجود نہیں تھے۔ صرف یہ خط الزامات کو عدالت میں ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چاہے کتنی بھی ذمہ دار شخصیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ میں چند روز سوچتا رہا۔

ان الزامات کے متعلق جب تسلی ہو گئی تو میں پاس ڈپٹی کمشنر جس کے ماتحت ریاست نالاگڑھ تھی کے دفتر میں گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اندر بلا لیا۔ میں نے اپنی جیب سے نالاگڑھ کے متعلق الزامات کی ٹائپ شدہ فہرست نکالی اور ڈپٹی کمشنر کو دے کر کہا کہ آپ مجھ پر یا دوسرے شخص پر اعتبار نہ کیجیے، کسی دوسرے صوبے یا اس صوبے سے کوئی افسر جو کبھی نالاگڑھ میں نہ جاتا ہو اور جو دیانت دار اور ہوشیار ہو نالاگڑھ بھیجیے اور معلوم کیجیے کہ یہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں یا نہیں۔ ڈپٹی

کمشنر نے الزامات کی تحقیقات کا وعدہ کیا اور میں واپس دہلی چلا آیا۔

اس ملاقات کے ایک ہفتہ کے اندر معلوم ہوا کہ یہ وزیر جو گورنمنٹ کی ملازمت میں تھا اور نالاگڑھ میں بطور لفٹیننٹ آفیسر تھا تنزل کر کے واپس برٹش علاقے میں بھیج دیا گیا اور نالاگڑھ کی پبلک اور راجہ کو اس سے چھٹکارا مل گیا۔

دہلی میں میرے ایک دوست محمد یوسف صاحب تھے جو خواجہ حسن نظامی اور ان کے دوستوں میں بھی عزیز سمجھے جاتے تھے۔ ان یوسف صاحب کو مالیرکوٹلہ کی ایک حسین طوائف شریفن سے عشق ہو گیا۔ اس شریفن کا تعلق نواب صاحب مالیرکوٹلہ سے تھا۔ یوسف صاحب بہت ہی خوبصورت ہیں۔ شریفن کو بھی یوسف صاحب سے بے حد محبت ہو گئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس محبت کے سلسلے میں شریفن نے ہی پہلے قدم اٹھایا۔ یوسف اور شریفن کا تعلق پہلے تو راز میں رہا۔ آپ نے چاہا کہ شریفن کا نکاح آپ کے ساتھ ہو جائے۔ شادی کے لیے آپ نے مشورہ کیا تو ایڈیٹر ریاست نے کہا کہ شریفن کے خاندان کے لوگوں کو سمجھا کر ان کو بھی شادی کے لیے آمادہ کر لیا جانا چاہیے۔ چنانچہ مشورے کے بعد ایڈیٹر ریاست نے شریفن کی والدہ کو (جو ریٹائرڈ طوائف تھیں) بلوا بھیجا۔ جب وہ آئیں تو میں نے محبت کے فلسفہ پر ایک طرح سے وعظ دینا شروع کیا کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت ہے۔ رسول اللہ بھی محبت کو پسند کرتے تھے، اور تمام نبیوں، اوتاروں اور گوروؤں نے محبت کے درجے بہت بلند قرار دیے تھے۔ محبت سے روح پاک ہوتی ہے۔ میں جب اپنی تمام نصیحتوں کا ذخیرہ ختم کر چکا تو شریفن کی والدہ نے پنجابی زبان میں (چونکہ وہ مالیرکوٹلہ کی تھیں) جواب دیا جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"سردار جی! آپ کس خیال میں پھر رہے ہو، ہمارے گھروں میں تو محبت کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ہماری جب بچیاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کے کانوں میں کہا جاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں جو دل چاہے کرنا مگر کسی سے محبت نہ کرنا جب یہ بڑی ہوتی ہیں تو ایک ہی سبق دیا جاتا ہے کہ محبت کرنے والے لوگ خودغرض اور بدمعاش ہوتے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ شریف لڑکیوں کو گھروں سے نکال کر لے جائیں اور برباد کر دیں۔"

شریفن کی والدہ کا جواب سن کر میں دنگ رہ گیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شریفن بالغ ہے وہ خود چاہتی ہے کہ اس کی شادی ہو، اس لیے اس کی ماں کی پروا نہ کرتے ہوئے نکاح کر لیا جائے۔

اس شادی کا علم سوائے قاضی صاحب، دولہا دلہن یا گواہوں اور براتیوں کے کسی دوسرے کو نہ تھا۔ اس وقت تک شریفن کی والدہ اپنی لڑکی کو مجبور کرنے پر صرف اس حد تک آمادہ تھیں کہ اس کا تعلق یوسف سے بھی رہے اور وہ پیشہ کے ذریعہ امراء سے بھی روپیہ پیدا کرتی رہے۔ مگر شادی کے بعد نئے جھگڑے شروع ہوئے۔ شریفن نے دوسرے لوگوں کے ہاں جانا اور ان سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی والدہ اور بھائی مجبور کرتے رہے مگر یہ نہیں مانی۔ آخر شریفن نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ چونکہ اس کا نکاح یوسف صاحب کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ تعلق نہیں رکھے گی۔ وہ اس کو حرام سمجھتی ہے اور اگر ان لوگوں نے تنگ کیا تو وہ گانا بھی چھوڑ دے گی، اور یوسف صاحب کے گھر جا کر پردے میں بیٹھ جائے گی۔

شریفن کے اس انکشاف پر اس کی ماں اور بھائی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کو اب پتہ چلا کہ ان کا گھر تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ یوسف صاحب کی اتنی کم آمدنی تھی کہ اخراجات پورے ہونے ناممکن ہیں۔ اور جب ان شکایتوں کا سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا تو یوسف صاحب اپنی بیوی کو لے کر اپنے گھر چلے گئے اور انہوں نے اپنی زوجہ کو پردے میں بٹھا دیا۔ شادی کے دو تین سال کے اندر اندر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں یوسف صاحب کی آمدنی محدود تھی۔ دو تین سال تو اچھے گزرے۔ بچے پیدا ہونے کے بعد شریفن کی محبت اپنے شوہر سے کم ہو کر بچوں میں منتقل ہو گئی۔ وہ پہلے تو ساتھ مرنے کا دم بھرتی تھیں۔ اب شکایت ہے کہ فلاں بچے کے لیے ریشمی

جامع مسجد دہلی کے سامنے منعقدہ اردو کانفرنس کے موقع پر یادگار تصویر

فراک نہیں ہے، اور فلاں بچوں کے لیے جوتے نہیں ٹوپی نہیں۔ ادھر شریفن کی ماں کو جب معلوم ہوا کہ شریفن مطمئن نہیں ہے تو اس نے اپنی بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے نتیجہ یہ ہوا کہ دن رات کے جھگڑے شروع ہو گئے اور بالآخر وہ پھر اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد یوسف صاحب نے واپس لانے کی بہت کوشش کی کہ وہ دوبارہ گھریلو زندگی بسر کرے لیکن شریفن اب اپنی ماں کے ہاتھوں میں تھی۔

یوسف صاحب سے اب باتوں باتوں میں شریفن کا ذکر کیا جائے تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں محبت کی جگہ انتقام اور انتقام کے بعد نفرت پیدا ہو چکی ہے اور وہ شریفن کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس داستان کے دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ رسی جل بھی جائے لیکن اس کا بل نہیں جاتا۔

اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کا میں ہمیشہ مداح رہا لیکن میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوئی اور مجھے میں تا عمر نہیں بھول سکوں گا۔ وہ فطرتاً ایک انتہا پسند انسان تھے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو اجمل خاں نے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو ٹھیک دس بجے تشریف لا رہے تھے۔ مولانا کی شرافت کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے میری وجہ سے اجمل خاں سے کہا کہ وہ پنڈت جی سے کہیں کہ وہ ایک گھنٹہ بعد آئیں۔ تھوڑی دیر بعد اجمل خاں نے واپس آ کر کہا کہ پنڈت جی سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے چونکہ وہ کوٹھی تین مورتی سے روانہ ہو چکے ہیں۔ بہرحال جب میں نے یہ کیفیت دیکھی کہ اب وہ یہاں آیا ہی چاہتے ہیں تو میں نے مولانا صاحب سے اجازت لی تو انہوں نے فرمایا کہ پھر کبھی ضرور ملنا بلکہ ملتے رہا کرو۔

میں اپنی ٹیکسی میں واپس دفتر آتے ہوئے سوچتا رہا کہ مولانا کا مرتبہ کس قدر اونچا اور ان کی پوزیشن کس قدر بلند ہے کہ وہ وزیراعظم سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی فرصت نہیں۔ ایک گھنٹہ بعد آئیے۔

ان کے انتقال کے بعد میں نے خود کو کس قدر مغموم محسوس پایا کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا ہندوستان کے ہر شخص کو مولانا جیسے محب الوطن، دیانت دار، بلند اخلاق، لائق اور بے ریا شخص کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ★

جس میں

شجاعت، سرفروشی، ایثار و قربانی، بلاکشی اور عدل و انصاف کی ایسی داستانیں پیش کی جارہی ہیں جن کی نظیر تاریخ انسانیت میں ناپید ہے

حضرت ابوبکرؓ کی رفاقت　حضرت عمرؓ کا عدل　حضرت عثمانؓ کی طہارت

حضرت علیؓ کا علم　حضرت خدیجہؓ کا خلوص　حضرت عائشہؓ کا ایثار

حضرت ابوعبیدہؓ کی شجاعت　امام حسینؓ کی صداقت

عمرؓ بن عبدالعزیز کا تقویٰ — آلِ یاسرؓ کی بلاکشی
اصحاب صفہؓ کی مسکینی — شہیدانِ رجیع کی شہادت
حضرت بلال حبشیؓ کی محبّت — اور
زید بن حارثہؓ ابوذر غفاریؓ عبداللہ بن مسعودؓ طلحہ بن عبیدؓ عمیر بن ابی وقاصؓ
عامر بن فہیرہؓ ضرار بن ازورؓ سلمان فارسیؓ کعب بن مالک انصاریؓ ابودجانہ انصاریؓ
حارث بن ہشامؓ کمیل بن زیادؒ خواجہ اویس قرنیؒ سعید بن جبیرؒ
خواجہ فریدالدین عطارؒ شمس تبریزؒ وغیرہ کے شوقِ جہاد، حق گوئی و

بے شمار نادر و نایاب اور روح پرور تصاویر

قیمت صرف آٹھ روپے

مارچ ۱۹۷۹ء کا یہ شمارہ فروری ۱۹۷۹ء کے پہلے ہفتہ میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر سے جلد از جلد مطلع کریں۔ پچھلے نمبروں کی طرح بعد میں آنے والے آرڈروں کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔

میں نے ابتدائے مشق سخن کے لئے دیوانِ غالب کو
پسند کیا تھا۔ دیوانِ غالب کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ پیمائی کرتا کلام
جب تہور الدولہ مدار الملک منشی مظفر علی خاں اسیر شاگرد مصحفی کو دکھاتا۔
اسیر مرحوم مجھ سے محبت بہت کرتے، مگر مرحوم کی خدمت سے میں
اکثر اس بے ثمر مژدہ واپس ہوتا کہ جناب اسیر بسا اوقات بجائے صحبت کر
بیت اشعار "لہ جیسے" کہہ کر سناتے۔ یہ امر خفت کا باعث ہوتا
یہاں تک کہ آخر میں اس خاص رنگ کا دیوان اور کلام تلف کر دینا پڑا۔
طبیعت صفائی کلام اور صحت کی طرف رجوع ہو گئی۔ سیتاپور و خیرآباد
کے مشاعروں میں حضرات سیتاپور بہ خصوصیت شریک ہوتے، سیتاپور
کے مشاعروں نے مجھ کو نمود کو اور ترقی دے دی تھی۔

رشید لکھنوی، وفا سیتاپوری، قلق کاکوروی، میر تجمل حسین
تجمل نیز دیگر مشاہیر کا کلام بزم سخن کی رونق تھا۔ ایک خاص مشاعرہ
کا انعقاد زمیندار سید محمد صادق صاحب مرحوم وکیل سیتاپوری کی کوٹھی پر
ہوا۔ اہتمام آپ کے خلف الرشید مولوی حاجی سید محمد اسمٰعیل کا تھا جن کے
جنونِ شاعری کو ترقی تھی۔ لکھنؤ کی مسلسل آمد و رفت کو اور سونے پر
سہاگہ کہئے

مجھے بھی شرکت کے لئے مجبور کیا گیا۔ ذیل کا شعر اس وقت
کی طرحی غزل کا ہے جس کو ابتدائے مشق سے تعلق ہے۔

شہیدِ ناز خواب مرگ سے گھبرا کے اٹھ بیٹھے
تری ٹھوکر بھی ان سے چل گئی فقرہ قیامت کا

اب میں نے اسیر مرحوم کے فرمانے سے اپنا کلام بغرض اصلاح
امیر مینائی کی خدمت میں رامپور بھیجنا شروع کیا تھا اور جب تک امیر مرحوم
حیات رہے کسی کو بغیر اصلاحی شعر نہ سنایا نہ شائع کیا۔

سیتاپور کے ایک مشاعرہ میں میر تجمل حسین صاحب تجمل مرحوم
کی غزل بہت شہرت پا چکی تھی، میرے پاس بھی ان کا یہ مشہور مصرعہ
بھیجا گیا۔

مجھ کو رہنے دیجئے نیکی بدی کے واسطے

میں نے بھی غزل کہی جس نے زیادہ شہرت حاصل کی بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو ناحق تم کسی کے واسطے

لوٹتے ہیں کاتبِ اعمال یوں آنکھوں کا لطف
حاصلِ عصیاں ہے گویا آپ ہی کے واسطے

دونوں عالم تنگ ہیں مجھ اور وسعت چاہئے
پاؤں پھیلانے کو میری بے کسی کے واسطے

لطف ہے جل جل کے رونوں سے رہی اک شمع خاص
کچھ بناوٹ بھی ہو تیری سادگی کے واسطے

پاسِ آداب بزرگی ہے یہ ابں وضع جنوں
جب ملے ناصح جھکے ہم بندگی کے واسطے

حشر میں لو کاتب اعمال کچھ تو ہو شریک
ساتھ رکھا تھا تمہیں نیکی بدی کے واسطے

جی نہ مانا حضرت ناصح کو آتے دیکھ کر
کچھ یونہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

سال بیٹے لے کے خم بھیری کو نکلے ہیں ریاض
میکدے کچھ وقف ہیں ان شاہ جی کے واسطے

اس کے بعد ہی امیر مینائی کی ایک مشہور غزل کا مصرعہ سیتاپور میں طرح دیا گیا۔ ع

"آرازنہ میں ستوں گجر کی"

مشاعرہ بہت ہی خاص اہتمام سے تھا جو دن کو شروع ہو کر نماز فجر کے وقت میری غزل پر ختم ہوا۔ میرے روبرو مولوی عبدالغنی صاحب وکیل سیتاپور شاگرد و خویش حکیم مومن خاں مرحوم دہلوی بیٹھے ہوئے تھے شرعی لباس لمبی داڑھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند نہایت خوبیوں کے بزرگ تھے۔ میں نے آپ کو متوجہ کر کے مقطع کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لطف آ گیا۔ ممکن ہے مولانا کو کچھ ناگوار بھی ہوا ہو۔

شرما دو ریاض مے کشی سے
لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

اسی طرح ایک مشاعرہ سیتاپور میں ذیل کا مقطع پڑھنے پر میں جس طرف سے گزرتا تھا لوگ تبسم کرتے تھے۔

پھرتا تھا اس گلی میں عجب وضع سے ریاض
اک پشتِ خار ہاتھ میں اور سر گھٹا ہوا

اس سلسلے میں ایک دوسرے مقطع کا بھی ذکر بے معنی نہ ہوگا جس سے مجھ کو خفیف ہونا پڑا۔ منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ نے شیخ چلی نام کا ایک ناول شائع کیا جس کے گرد پوش پر شیخ چلی کی تصویر نہایت مضحکہ خیز دی گئی تھی اور اس پر جلی قلم سے ذیل کا مقطع درج کیا گیا تھا۔ جو دیکھتا سمجھتا ریاض کی تصویر ہے

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاک ریاض
یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

اس زمانے کا ایک اور مقطع بھی میرے لئے بار بار پریشانی کا باعث ہوا۔ منشی رتن ناتھ سرشار آنجہانی نے فسانۂ آزاد میں میری یہ غزل شائع کی۔

دل کسی طرح چین پا جائے
غیر کی آئی مجھ کو آ جائے

جان لو کچھ گذر گئی اس پر
منہ چھپا کر کوئی ستا جائے

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام
نہ پئے اور جھومتا جائے

مقطع خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں مشہور ہے۔ جو زیادہ تر بدگمانی کا سبب ہوا۔

سرشار مجھ سے بے تکلف تھے۔ ہم مشرب بھی سمجھتے تھے ریاض الاخبار کے نامہ نگار بھی تھے۔ ایک روز آپ نے مجھ کو پیام دعوت دیا۔ سرشار نزدیک ہی کے قریب مقیم تھے۔ میں وہیں گیا۔ دوپہر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ آخر سرشار نے گاڑی منگائی اور مجھ کو لے کر میرے کمپنی کے ایک خاص کمرے میں داخل ہوئے۔ سرشار بار بار یہ مصرعہ پڑھتے تھے۔ ع

نہ پئے اور جھومتا جائے

بات کہتے میز پر وہ سامان آ گیا جو نظم میں جس کا خوگر تھا میرے ہوش شیشے کی پری بن کر اڑے، مگر سرشار کے خوش کرنے کو اس سے پیشتر کہ بوتل سے جام میں اور جام سے لب تک آتے۔ میری باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ دفعتاً میں سرشار سے دو منٹ کہہ کر اس طرح اٹھا گویا ابھی رفع ضرورت کے بعد واپس آتا ہوں مگر واپس آیا

ترکیب اور کہاں، بیس سال بعد دکن میں حضور مہاراجہ پیشکار بہادر کے کاشانے پر! یہاں میں سرشار کا مہمان تھا البتہ مہاراجہ پیشکار بہادر کی طرف سے میری خدمتِ مہمان داری انھیں کے سپرد تھی۔

دکن میں بھی اسی تخلص کی وجہ سے اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا۔

میں ایک شب جریدۂ روزگار" مدراس کے ایڈیٹر سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گیا۔ ۱۹۰۳ء والے دربار دہلی کے بچھڑے ہوئے دوست مدت کے بعد ملے۔

بہت سے احباب اور مشتاقینِ ریاض جمع ہو گئے جعفر صاحب بھی آئے اور دکن کے مشہور شاعر گرامی بھی، گرامی کے ہم ملک و ہم قوم میلانی شاعر با اصرار مجھ کو اپنی فرودگاہ پر لے گئے۔ دوچار ہم مشرب و ہم مذاق بھی شریکِ صحبت ہوئے۔ یہاں بھی تکلف کے ساتھ میز پر وہی مرے کبھی والا سامان آ گیا۔ میں نے بظاہر دستِ شوق بڑھایا پھر کچھ جھجکا رکا، استغفار کیا۔ خوف رکھتا ہے طبیعت مانی نہیں، جگر کے خراب ہونے سے ڈاکٹر نے ایک سال کے لئے قطعی ممانعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے استعمال سے ہلاکت واقع ہو گی۔ انکار سے رسائی کا یقین نہ ہوتا، اور یقین ہوتا تو۔

میرانی شاعر پر افشار راز سے بن جاتی ان کا تعلق مہاراجہ پیشکار بہادر سے تھا۔ "البشیر" اٹاوہ میں لمبے لمبے مضامین میری مے نوشی پر شائع ہو چکے ہیں۔ قیامِ گورکھپور میں پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں جا کر کوئی مے طہور سے دستکش رہے

توبہ کے پاس نہ رو کا لب کوثر مجھ کو
آج پینے کو طبیعت مری جاتی کیسی

دربارِ قیصری

جس زمانے میں "ریاض الاخبار" ہفتہ وار اور "گلدستۂ ریاض" ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ جس کے مطبع کا تاریخی نام "لمعۂ درخشاں" تھا۔ اعلیٰ حضور جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعے سے یاد فرمایا۔ میں اس وقت دربارِ قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کے لئے خدمت سے بیتاب تھا۔ اس سے پہلے دربارِ قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا۔ خیمے بکمال تزئین و شگفت نصب تھے۔ ہر ایڈیٹر کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا پر تکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں اعلیٰ پیمانے پر تاحدِ نظر ہر طرف تھیں۔ میں سید نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار دہلی گیا۔ کیمپ کے سوا مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فنِ مناظرہ کے دولت خانہ پر بھی مہمان بننا پڑا۔ شب گزاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے۔ بعد کو آ گئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیانِ ملک کے عالیشان پُر فضا فرودی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے، ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار بسے ہوئے بازار، ان کی وضع قطع ان کی آراستگی، یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ سیر گشت میں ظہیر و انور سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیر پور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس بنا پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروز لکھنؤ تھے سیٹھ سیتارام صاحب تعلقدار بسواں جن کے روابط مہاراجہ سے تھے، مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجہ بہ عزمِ واپسی سوار ہو چکے تھے سرسری شرفِ تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر متفکر آ رہے ہیں، کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی بجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی نفس کے ساتھ فنس پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ریذیڈنٹ کانگ کے ہمراہ خیمے میں آئے ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت واقعہ یہ پیش آ گیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا۔ شمس العلماء تشریف لائے، مہاراجہ نے براہِ تعظیم گوشۂ مسند پر جگہ دی، مزاج پرسی فرمائی، ساتھ ہی حکم دیا کہ ولی عہد کے اتالیق کو تکلیف دو، وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجہ نے انھیں بھی شمس العلماء کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلماء کی

نازک مزاجی سے شاہ سے پسند نہ کیا ہو۔ پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسئلے پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی، علماء کی یہ شان نہیں ہے۔ ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آ گیا۔ ان پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ مگر ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آ گئے۔ دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعے سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہِ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی، مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ میں رئیس رامپور کا ملازم ہوں۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گذرا۔ خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور رہے تھے۔ پرچہ گذرنے پر ولی عہد بہادر نے خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی۔ تار کا جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔

شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رامپور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کر لیں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رامپور چلے آئے اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔

ایک لطیفہ اوّل سر سالار جنگ بہادر نابالغ فرماں روائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی معیت میں رونق افروز اپنے شاہی کیمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو ایڈیٹر صاحب جریدۂ روزگار مدراس اور حیدرآبادی غفور صاحب سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علی خاں بہادر خیرآبادی خوشش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ممدوح ہمارے اور نظام احمد مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوائے ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ آٹھ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے بہ اصرار کہا گیا۔ مگر میں نے معذرت کی جب نظام احمد سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آئے، میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کا لیتا۔ اب میرے لئے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ سرخ سبز مختلف رنگ کی مدراسی شیرینی بھی تھی، قہر درویش برجان درویش دسترخوان ختم ہوا تو خوابگاہ کے اندر میز کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرینی کی طشتریوں کا۔ جب ہر طرف سے خراٹے بلند ہوئے، میں اٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچ کر ہاتھ بڑھایا۔ ڈلی کا محسوس ہوتا تھا کہ وہ منہ کے اندر پہنچ گئی میں چاہتا تھا زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رقیق شے ہوتی تو مئے تلخ کا دھوکہ ہوتا۔ یہ رنگین شیرینی کی ڈلی نہ تھی صابن کی بٹی تھی، میری مصیبت کا پورا لطف اٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لئے صابن کی ٹکیہ منہ میں رکھ کر کام و دہن کو ممنون کیجئے۔

رومال سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں رہ گئی جہاں سے اٹھائی گئی تھی، پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ رومال کی کارفرمائی منہ کے اندر بھی نہ رہی۔ ہم اس آسانی سے پلنگ تک پہنچ سکے جس طرح وہ چیز منہ تک پہنچی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا مگر اس کی لذت زبان پر۔ سب حضرات پہ بند ستم زدہ تھے۔ سنا زجرا دائی، ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ کے سامنے آ گئی۔ میں نے دو چار گھونٹ پیے اور بسکٹ اٹھا کر اتنے زیادہ پیالی میں ڈال لئے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی، دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں۔ نظام احمد مرحوم کو ہنسی آ گئی جو معنی خیز تھی استفسار پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا، واپسی کا بھی سہارا ٹوٹا، چائے میں تکلف رخصت ہو گیا اور بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہو گئے۔ میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا۔ کیا صابن کا واقعہ مذاقِ شعری رکھنے والے کے لئے اچھے شعر سے کم ہے۔

اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں اس کے لئے داستانِ خیال کی ضخامت درکار ہے۔ کمبخت کی یاد جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎

دربارِ قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں
دلی ہے اور ہم ہیں بتانِ فرنگ ہیں

★★

والد کی موت کے بعد میں نے فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے نہیں نہیں فلک یا زمانے کا کیا قصور، میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ جو کچھ بھی کیا میری قسمت نے کیا، سوائے میرے اپنے ہاتھ کے اور کسی کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا یعنی کوئی سرپرست نہ تھا مگر میں نے عزت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ہر گز کسی کے دروازے پر سائل بن کر نہ گیا، نہ میرے ہونٹ حرف مطلب سے آشنا ہوئے، نہ مجھے کسی چیز کی طمع پیدا ہوئی۔ کسی سے میں نے امداد طلب نہیں کی۔ نہ کسی نے مجھے امداد دی یعنی خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا اور مجھے میرے بھائی کا جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دستِ نگر نہ بنایا۔ میں رات دن درویش (والد) کا ماتم کرتا تھا اور تمام کام خدا کے آسرے پر چھوڑ دیے تھے۔ چھوٹے بھائی کو گھر بٹھا کر روزگار تلاش کرنے کے لیے سارے شہر میں گھومتا تھا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یعنی وطن میں کوئی صورت نکلی تو پردیس کا رخ کیا۔ راستے کی صعوبتیں اپنے اوپر گوارا کیں اور سفر کے شدائد جھیل کر شاہجہان آباد دہلی پہنچا۔ یہاں بھی بہت گھوما مگر کسی کو شفیق نہ پایا۔

خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامراء صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے میرے حال پر عنایت کی اور مجھے نواب کے سامنے لے گئے۔ نواب نے مجھے دیکھ کر پوچھا "یہ کس کا لڑکا ہے؟" خواجہ محمد باسط نے کہا: "میر محمد علی کا!" فرمانے لگے کہ "ان کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گزر چکے ہوں گے۔" پھر بہت افسوس ظاہر کرنے کے بعد کہنے لگے کہ "ان کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں، ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس لڑکے کو دیا جائے۔" میں نے التماس کیا کہ "اگر اتنی مہربانی کریں کہ مجھے دستخط فرما کر دیں تو متصدیوں کے چون وچرا کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔"

میں نے درخواست جیب سے نکالی، ناگہاں خواجہ مذکور کی زبان سے نکلا کہ "یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے!" یہ سن کر میں نے ٹھٹھا مارا، نواب نے میرے منہ کو دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا، میں نے عرض کیا کہ "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر یہ

زمانے کہ قلمدان بردار حاضر نہیں، تو ایک بات بھی کچھ بے محل نہ تھی، کہنا ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔ "قلمدان کا وقت نہیں" کہنا تو نئی ترکیب ہے۔ قلمدان کا وجود ایک لکڑی سے زیادہ نہیں وہ وقت بے وقت نہیں جانتا۔ جس شخص کو بھی حکم دیا جائے اٹھا لائے گا۔" نواب ہنسنے لگے اور بولے کہ معقول بات کہتا ہے۔ بہرحال میری بات کو رد نہ کیا، قلمدان منگوایا اور درخواست پر دستخط کر دیے۔ وہ بادشاہ کے دربار کا دن تھا، نواب تیار ہو کر چلنے لگے اور بڑی عنایت سے مجھے رخصت کیا۔

اس زمانے تک کہ نادرشاہ نے محمد شاہ پر چڑھائی کی اور نواب مذکور اس کے مقابلے میں مارے گئے، یہ روزینہ مجھے ملتا رہا اسی سے نان و نمک کھا کر گزارا کر رہا تھا۔

اس انقلاب (حملۂ نادری) کے بعد پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا۔ وہ لوگ جو درویش کی زندگی میں میری خاک پا بھی سرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، اب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔ مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچا، اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا احسان اٹھایا یعنی کچھ دن ان کے ساتھ رہا، اور شہر کے لوگوں سے چند کتابیں پڑھیں، جب اس قابل ہو گیا کہ کسی کا مخاطب صحیح بن سکوں تو بھائی کا خط ماموں کے نام پہنچا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیئے۔" وہ عزیز (آرزو) پکے دنیادار تھے اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا برا چاہنے لگے اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے، اور بچ بچ کر رہتا تو آوازیں کستے، ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے۔ میں کیا بیان کروں کہ ان سے کیسا سلوک دیکھا اور کس طرح کھول کر کیا رنج اٹھاتے، میں ہرچند صبر و ضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو مگر ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا، مگر دشمنی سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان کی ایذا دہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے، میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔ مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی، جس کوٹھری میں رہتا تھا۔ اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اس ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا۔ چاند نکلتا تو میرے لئے قیامت ہوتی تھی، اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دھلاتے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا، لیکن نہ اس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دور بھاگنے لگیں۔

فخرالدین خاں کی بیوی نے جو میرے والد کی مرید بھی تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں۔ میرے علاج میں بہت روپیہ خرچ کیا۔ ملاؤں سیانوں نے جھاڑ پھونک کی اور طبیبوں نے فصد کھولی بارے طبیبوں کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ جب خریف کا موسم آیا اور بہار رخصت ہوئی تو جنون خود بخود گھٹ گیا۔ جلد ہی پوری طرح صحتیاب ہو گیا اور "مکتوبات" پڑھنے شروع کر دیے۔

ایک دن بازار ایک کتاب کے کچھ اجزاء ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا کہ میر جعفر نامی ایک جوان ادھر سے گزرے، مجھے دیکھا تو میرے قریب آئے اور تھوڑی دیر توقف کر کے کہنے لگے: "اے عزیز، معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے کا تمہیں شوق ہے۔ میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں، لیکن کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آ جایا کروں گا۔ میں نے کہا: "آپ کی خدمت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اگر محض خدا واسطے آپ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہے۔" کہنے لگے: "اتنا منظور ہے کہ تھوڑا سا ناشتہ مل جائے اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔" میں نے کہا: "یہ مشکل خدائے کریم آسان کر دے گا، اگرچہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔" انھوں نے ان منتشر اوراق کو صفحوں کے مطابق کر کے مجھے دیا، اور چلے گئے۔ اس کے بعد اکثر انسان نما فرشتے سے ملاقات ہوتی۔ نہایت مہربانی سے پیش آتے، یعنی اپنا دماغ کھپا کر مجھے کچھ سکھاتے۔ میں بھی بقدر ان کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسر تھا ان کے لئے خرچ کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن عظیم آباد سے کوئی خط آیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد سعادت علی نام کے ایک سید سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے۔ اور اس وقت بہت رواج پا رہی تھی۔ میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کر لی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا۔ میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلیٰ کے کانوں تک پہنچ گئے۔

ایک دن ماموں نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کر دیا۔ میں بہت کڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اٹھ گیا۔ جب ان سے شفقت نہ دیکھی تو شام کو ان کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آ نکلا جو وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے یہاں میں نے پانی پیا۔ اس جگہ علیم اللہ نامی ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا: "تم میر تقی میر ہو نا؟" میں نے کہا "تم نے کیسے پہچانا؟" بولا: "تمہارا اسود اشیانہ تو مشہور ہے!" رعایت خاں نے جو علیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمہارے اشعار سُنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت ہی مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لئے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا۔ میں جا کر ملا۔ بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا۔ اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگدستی سے چھٹکارا مل گیا۔

ایک چاندنی رات میں خان کے سامنے ڈوم کا لڑکا چبوترے پر بیٹھا گا رہا تھا۔ خان نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا: "میر صاحب اسے اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجئے تو یہ اپنے ساز پر درست کر کے گائے گا۔" میں نے کہا: "یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" کہنے لگا: "میری خاطر سے!" چونکہ ملازمت کا پاس تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دئے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر دو تین دن کے بعد گھر بیٹھ رہا۔ اس نے ہر چند بُلایا، نہیں گیا اور اس کی نوکری چھوڑ دی۔ مگر اس شخص کی مروّت نے مجھے بے روزگار دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ میرے بھائی محمد رضی کو، میرے حقوق رفاقت کے پیش نظر، اپنے پاس سے گھوڑا عنایت کیا اور نوکر رکھ لیا۔ ایک مدت کے بعد جب میں جا کر ملا تو اس نے بہت معذرت خواہی کی۔ میں نے کہا: "خیر ——— گزشتہ را صلوٰۃ۔"

جب اسی طرح کچھ دن گزر گئے تو میں نے نواب بہادر کے ہاں ملازمت تلاش کی۔ اسد یار خاں نے جو اس کی فوج کا بخشی تھا، میرا احوال اسے سُنا کر، گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی۔ وہ (نواب بہادر) میرا لحاظ اور بہت امداد و اعانت کرتا تھا۔ خدا اسے جزائے خیر دے۔

جن دنوں محمد خاں بنگش کا لڑکا قائم خاں روہیلوں کی جنگ میں مارا گیا اور صفدر جنگ اس کے املاک کی ضبطی کے لئے روانہ ہوا۔ میں بھی ایک تقریب سے اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اس طرف کی سیر کرنے گیا۔ قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے بڑی بھاری جنگ ہوئی۔ وزیر کی فوج نے شکست کھائی اور اسحاق خاں بھی قتل ہوئے۔ میں اس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر شہر دہلی واپس آ گیا۔

(جب انتظام الدولہ وزیر ہوا) انہیں دنوں میں زمانے کی ناسازگاری سے تنگ آ کر میں نے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) کی ہمسائیگی ترک کر دی، یہ سوچ کر کہ وہ مجھے ہلکی نظر سے دیکھیں گے۔ اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں سکونت اختیار کی۔ (جو محمد شاہی عہد کے بڑے امیر تھے اور سلطنت کی دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ میں تھی نیز الٰہ آباد کی صوبہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔ تخلص ان کا انجام ہے اپنی خوش سلیقگی اور شیوا بیانی کے لئے ضرب المثل ہیں) ان کی حویلی میں منتقل ہو کر بڑی بھلی بسر کرتا رہا۔

اس زمانے میں جب صفدر جنگ نے وفات پائی اور صوبے (اودھ) کی ریاست اس کے بیٹے شجاع الدولہ کو ملی، میرے ماموں خاں آرزو لالچ کے مارے نکل پڑے، یعنی شجاع الدولہ کے لشکر میں اس توقع پر گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں۔ وہ حقوق سابق کا خیال کر کے کچھ مراعات دیں گے، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قسمت نے دھکا دیا تھا، وہیں مر گئے ان کی نعش وہاں سے لا کر انہیں کی حویلی میں سپرد خاک کر دی گئی۔

دو تین مہینے کے بعد راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت کے ساتھ رہتے تھے، مجھے گھر سے بلا کر لے گئے اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔

ایک دن میں نے راجہ جگل کشور کے سامنے روزگار کی شکایت کی۔ وہ عزیز شرم سے پیلا پڑ گیا۔ کہنے لگا: "میں خود مفلس ہوں کچھ بھی ہوتا تو ہرگز تامل نہ کرتا۔" ایک دن سوار ہو کر راجہ ناگر مل کے ہاں گیا اور میرا تعارف کرا کے بلوا بھیجا۔ میں گیا اور اس کے وسیلے سے ملاقات کی، بہت لطف و عنایت سے پیش آیا، کہنے لگا: "دعوت شیراز حاضر ہے یعنی تمہارا حصہ بھی تمہیں پہنچتا رہے گا۔" مجھے اطمینان ہو گیا تو اٹھ کر واپس آیا۔ دوسرے دن ملاقات میں جب شعر خوانی ہوئی تو

کہنے لگا: "میر کا ہر شعر موتیوں کی لڑی ہے۔" مجھے اس شخص کا اسلوب بہت پسند ہے۔ ایسے ہی کبھی کبھار جاتا رہا، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا چونکہ جا تو ڈیوڑھی تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد اس کے دروازے پر گیا، چوب داروں کا میر دہ جے سنگھ نامی میرے سامنے آیا اور کہنے لگا: "یہ دربار کا کونسا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اضطرار کا عالم ہے!" بولا: "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرتا۔ یہاں اپنی ریاست کے آگے تمہاری کیسے فکر ہے۔ صابر و شاکر رہنا چاہیئے، ہر کام کا ایک وقت ہے۔ یہاں تو تمہاری رسائی مشکل ہے البتہ ان کے بڑے لڑکے مل سکتے ہیں۔" میں نہایت شرمندہ ہوا اور واپس آ گیا۔

ایک دن اس دربان کے کہنے کے مطابق راجہ کے لڑکے سے ملنے گیا۔ دربان نے روک دیا۔ بولا: "اس وقت ان سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔" مجبوراً واپس آ گیا۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد گیا۔ دیکھا تو ڈیوڑھی پر دربان نہیں ہے۔ میں نے پوچھا: "دربان کہاں گیا؟" لوگوں نے کہا: "صبح اس کے سر میں ایسا شدید درد تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا" میں نے سوچا کہ تائید الٰہی شامل حال ہے۔ دیوان خانے میں داخل ہوا اور ملاقات کی، شعر خوانی کا بھی اتفاق ہوا۔ خواجہ غالب نے جو ایک باشعر آدمی ہے اور مجھ سے واقف تھا، میرا احوال مفصل سنایا اور کچھ مقرر کرا دیا جو میں ایک سال تک پاتا رہا۔ ایک رات راجہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میری ایک سال کی تنخواہ دے کر فرمایا: "اکثر مجھ سے ملتے رہا کیجیے۔" اس دن سے عشاء کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے ان کے پائیں باغ میں جاتا اور دو گھڑی رات گئے تک رہتا تھا۔ اس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔

ابدالیوں اور روہیلوں کے ہاتھوں دلی کی تباہی کے بعد میں راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں، چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ انہوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں بال بچوں کو لے کر پیادہ پا نکلا، کوئی منزل تو تھی نہیں۔ خدا پر بھروسہ کر کے راستہ طے کرنا شروع کیا۔ دن بھر بمشکل سے آٹھ نو کوس کی منزل ہو سکی۔ رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گزاری۔ اگلی صبح کو بیا جگل کشور کی بی بی ادھر سے گزریں، اور ہم مجبوروں کی دستگیری کی اپنے ساتھ برسانہ تک لے گئیں اور طرح طرح سے سلوک کر کے دل جوئی کی۔

ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو وہ کاماں گئیں جو برسانہ سے تین کوس پر راجا جے سنگھ (والیٔ جے پور) کی سرحد ہے۔ فقیر اپنے اہل و عیال کے ساتھ عشرۂ محرم میں وہیں (برسانہ) مقیم رہا اور عاشورہ سے اگلے دن (۱۱ محرم) وہاں سے نکل کر کمہیر پہنچا۔

کمہیر۔ یہاں صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ جو ان دنوں راجا کے ساتھ مقیم تھا۔ ایک شام کو آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور میری امداد و اعانت کی۔ میں اس کا احسان مند ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور کچھ دن سکھ چین سے بسر ہو گئے۔

میں ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا۔ جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں (جو فردوس آرام گاہ محمد شاہ کے عہد میں شش ہزاری امیر اور نہایت کریم النفس انسان تھا) کے لڑکے اعظم خاں سے ملا جائے تو شاید کچھ دن سکھ سے گزر جائیں۔ چنانچہ گیا اور سورج مل کے حویلی میں اس سے ملا جو دلی کے خانہ خرابوں کی نئی جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ اس عزیز نے، خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی۔ میں نے اپنا دکھڑا سنایا تو سننے والے بہت متاثر ہوئے۔ جب قہوہ اور حقہ لایا گیا تو یہ شعر میری زبان پر آیا ؎

امروز چو کارِ من و غربی بہم افتاد
باہم نگرستیم و گرستیم و نشستیم

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے اور دونوں آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکر مند ہے۔ میں نے کہا: "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" بولا: "کچھ نہیں۔" میں نے کہا: "کچھ تو ہے؟" کہنے لگا: "جب تم شہر دلی میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج عجب اتفاق ہے کہ کچھ کھانے کو بھی میسر نہیں جو تمہارے لئے ایک پیالہ شربت بنا سکوں۔" میں نے کہا: "میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں۔ وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا، یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے۔" یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور

بولی: "سعید الدین خاں خانساماں کی بہن نے آپ کو دعا بھی ہے کچھ حلوائے نزاکت اور شنبے کی شیرینی بھیجی ہے۔" خان نے خوان پوش اٹھایا اور اس کی نظر حلوے پر پڑی تو باغ باغ ہو گیا، کہنے لگا "یہ روسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے، ایک عمر سے فاقہ کشی پر مدار ہے۔ حلوے اور شیرینی کا تو ذکر ہی کیا، کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو، یہ سب تمہارا ہے۔ میرا حصہ مجھے دے کر باقی سب اپنے گھر بھیج دو۔" میں نے کہا: "یہ تو بہت ہے، میں اتنے سارے کا کیا کروں گا۔" کہنے لگا "تمہارے لڑکے میر فیض علی کے کام آئے گا۔" غرض کہ اس کھلے ناکس نے اصرار کر کے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ دو دن تک اسی مٹھائی پر گزر رہی۔ تیسرے دن راجا کے چھوٹے لڑکے بشن سنگھ نے مجھے بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو۔" میں نے کہا کہ کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں، بولا: "مطمئن رہو یہاں سب کچھ موجود ہے۔" خدا اسے خوش رکھے اس نے میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا۔

ابھی دوران مکھیر میں راجا ناگرمل دوبارہ تشریف لائے۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ التماس کیا: "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا، اب مجھے اجازت دیجئے کہ کہیں نکل جاؤں۔ کیونکہ ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔" راجا نے جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے کہا: "معلوم ہوتا ہے 'بیابان مرگ' ہونے کا ارادہ ہے۔ ہاں اگر میں چھوڑ دوں تو چلے جانا۔" اسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور میرا وظیفہ بدستور سابق دستخط کر کے عنایت کیا۔

(کچھ زمانے کے بعد دلی آیا) ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا، حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا۔ آبادی کا پتہ تھا عمارتوں کے آثار، نہ ان کے مکینوں کی خبر ——— گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ نہ خانقاہیں صوفیوں سے خالی، خرابات رندوں سے۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق و دق۔ نہ وہ بازار تھے جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، اب حسن کہاں جسے تلاش کروں۔ وہ یاران عاشق مزاج کدھر گئے۔ حسین جوان گزر گئے ——— ناگاہ اس محلے میں آ نکلا جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو روتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، ان کے حسن کی تعریفیں کرتا اور لمبی لمبی زلفوں والے معشوقوں کے ساتھ رہتا تھا، حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لئے بھی ان سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہو جاتا تھا۔ اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک رہوں شہر کا قصد نہ کروں گا۔

سفر آگرہ (اگلے سال) میں تیس سال کے بعد آگرہ گیا اور اپنے والد اور چچا کے مزارات کی زیارت کی۔ وہاں کے شاعروں نے مجھے اس فن کا امام سمجھ کر اکثر ملاقات کی۔ میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لئے جاتا تھا۔ میری سخن آفرینی کا شہرہ تو عالمگیر تھا۔ القصہ حسین، سیاہ پلکوں والے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا۔ لیکن کوئی ایسا مخاطب نہ پایا جس سے بات کر کے دلِ بے تاب کو تسلی ہو۔ شہر کو ایک وحشت ناک ویرانہ پایا۔ اور نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ چار مہینے وطن مالوف میں گزار کے رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔ سورج مل کے قلعوں میں واپس آ گیا۔

لکھنؤ کا سفر (نجف خاں کی بیماری کے زمانے میں) فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ بارے نواب آصف الدولہ بہادر کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ نے ان پہلے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں خان آرزو سے تھے، کہا: "اگر نواب صاحب از راہ عنایت زاد راہ کے لئے کچھ مرحمت فرما دیں تو میر ضرور آ جائے گا۔" حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انھوں نے سرکار سے زاد راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ "نواب والا جناب تمہیں طلب فرماتے ہیں، جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔" میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ فرخ آباد سے گزرا۔ مظفر جنگ نے جو وہاں کے رئیس تھے، ہر چند چاہا کہ میں کچھ دن ان کے ہاں ٹھہر جاؤں مگر میرا دل نہیں مانا۔ ایک دو دن بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پہ پہنچ
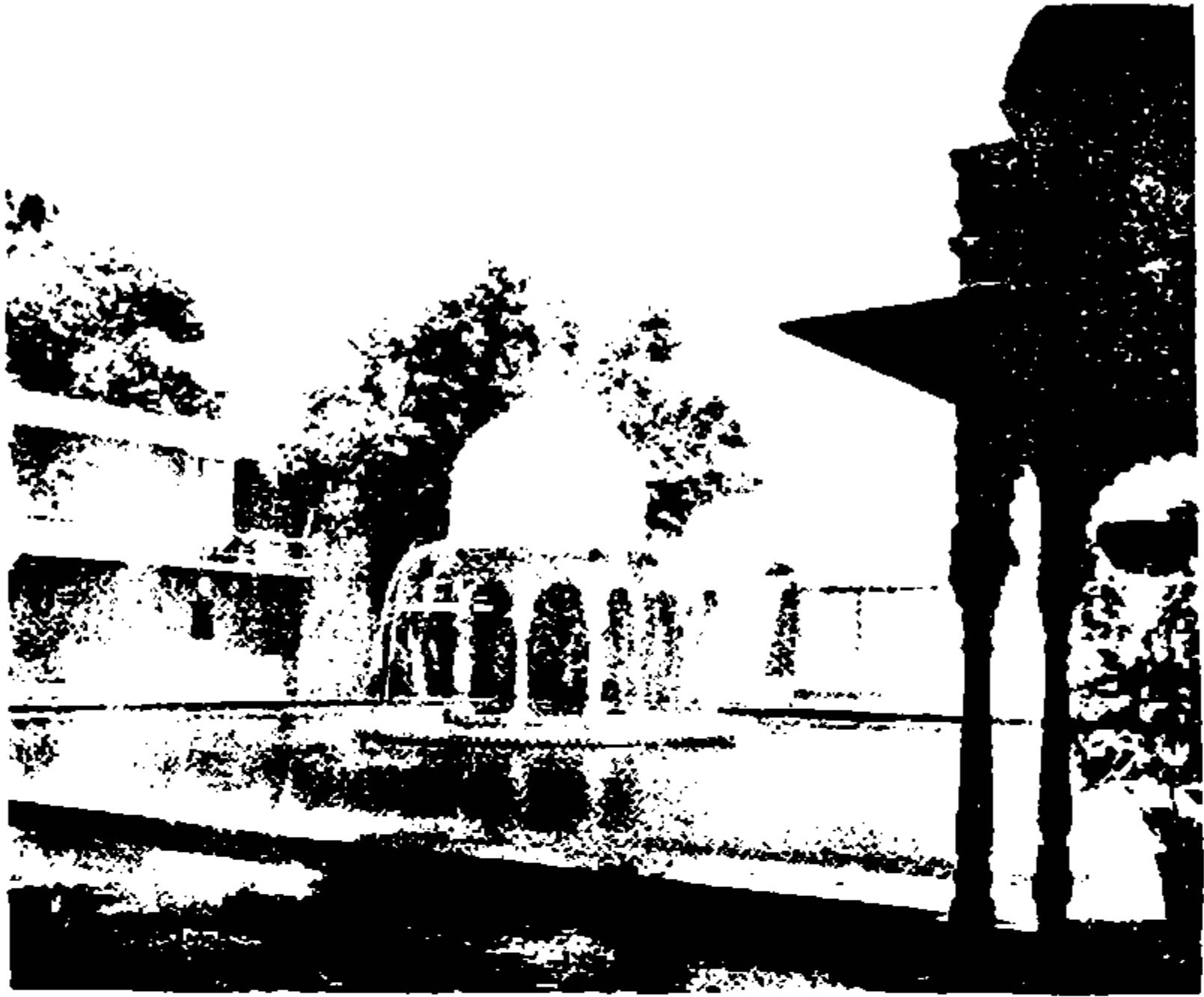
لیا۔ پہلے نواب سالار جنگ سے تعارف کرایا۔ انھوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لئے ضروری چیزیں بندگان عالی سے کہہ کر منگوادیں۔

چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغ لڑانے کے لئے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ حاضر خدمت ہوا۔ فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے "میر محمد تقی ہو؟" پھر بڑی عنایت سے بغلگیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے اور مجھے مخاطب کرکے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ۔ بادشاہوں کا کلام۔ کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔" فرمایا مہربانی سے مجھے بھی شعرخوانی کا موقع دیا۔ اس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے جب نواب صاحب اٹھ کر محل چلے گئے تو نواب سالار جنگ نے کہا: "میر صاحب آئے ہیں اور اب بندگان عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب رقعہ مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔" نواب صاحب نے فرمایا: "میں کچھ مقرر کرکے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔" دو تین دن بعد [illegible] تو میں حاضر ہوا اور عرض [illegible] سماعت فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کرلیا۔

خاتمہ

القصہ دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہوگئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے۔ کیسے باغ سے تھے ویران ہوگئے اور کیا محفلیں تھیں جو افسانہ ہوگئیں۔ کیسے کیسے پھول کملا گئے۔ کیسے کیسے رنگ گزر گئے۔ کیسی کیسی مجلسیں الٹ گئیں۔ کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے۔ عزیزوں نے کیا کیا خواریاں دیکھیں اور کیسے کیسے انسان جانوں کی بازی ہار گئے۔ ان عبرت بین نگاہوں نے کیا دیکھا اور ان سننے والے کانوں نے کیا کیا سن لیا۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہوگیا۔

•• (تلخیص نثار احمد فاروقی)

میں حیدرآباد میں خیریت آباد کے اس بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جو "شاہ منزل" اور "دلکشا" سے قریب ہے۔ جس کے سامنے ریل گاڑی دوڑتی ہے اور جہاں سے حسین ساگر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ میں سید مجتبیٰ علی بلگرامی کے ساتھ ادھر ادھر پھرا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کبھی نواب سعد جنگ مرحوم کے یہاں چلا جاتا تھا۔ کبھی ایجنسر کمپنی میں وقت ضائع کرتا تھا اور راتیں تو تھیٹر کے لئے بلاناغہ وقف تھیں۔ نو بجے شب کو سائیکل پر بیٹھتا اور ڈھائی تین بجے آکر پلنگ پر دراز ہو جاتا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب میں مدراس بھی گیا تھا جو تین سو تین صدی قبل ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراس کے مستقل رنگ کے انسانوں کو بھی دیکھا۔ جہاں بے شمار دیوتاؤں پر عقیدت رکھنے والے انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھا جہاں مردوں تک کو لمبے لمبے بالوں کا جوڑا باندھے ہوئے دیکھا رکشا پر سب سے پہلے یہیں سوار ہوا۔ گھوڑے گاڑیوں پر بھی راستے طے کئے۔ یہاں کی اسلامی معاشرت دیکھی۔ ناریل کا عرق پیا۔ جھینگوں کے سالن کھائے اور کھوپرے کی مٹھائیاں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کھائی گئیں اور تقریباً دس دن اس طرح کاٹ کر حیدرآباد واپس آیا۔

نواب سالار جنگ بہادر ثالث کی مدارالمہامی کے زمانہ میں سر سید علی امام سے ملنے شملہ گیا تھا۔ جب میں پہنچا ہوں تو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے تھے جن کا کتا ان کے آگے چلتا تھا اور جب کتا کمرے سے باہر نکلتا تھا تو معلوم ہو جاتا کہ ہارڈنگ برآمد ہو رہے تھے۔ شملہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا اور سر علی امام سے کئی مرتبہ ملا

نوابوں کے دربار

(ہوش بلگرامی)

یہ حیدر آباد میں سب سے پہلے صدر اعظم ہوئے تھے۔ مگر آصف جاہ سابع کی درباری سازشوں سے بیزار ہو گئے تھے۔ سر اکبر حیدری کی زمانہ سازیوں سے تنگ آ کر مستعفی ہو گئے تھے گو حضور نظام نے کوشش کی کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں مگر ان کے مضبوط کردار نے گوارا نہ کیا اور ریذیڈنٹ کو اطلاع دے کر چل دیئے۔

حیدر آباد میں دو تین سال اس طرح گزرے۔ آخر جو بندہ یا بندہ ایک رفیق زندگی مل گئی۔ ۱۹۱۶ء میں میں نے اپنی مصروفیت کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ذخیرہ نکالا جس کی سرپرستی نواب عماد الملک بلگرامی نے فرمائی اور مضامین بھی لکھ لکھ کر اس کا شمار معیاری پرچوں میں کرایا۔ سرامین جنگ نے بھی دو تین فلسفیانہ مضامین لکھے۔ ہندوستان کے بھی اہل قلم نے دلچسپی لی۔ حیدر آباد میں اس وقت صرف دو اخبار "مشیر دکن اور صحیفہ" نکلتے تھے۔ جن کی صحافتی دنیا میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ ادھر ادھر کی خبریں ان میں چھپ جاتی تھیں۔ کوئی اچھا اخبار کیسے نکل سکتا تھا جب کہ اکبر جنگ مرحوم کوتوال بیسے ناآشنائے صحافت تھے کہ مولانا ظفر علی خان کے بلند مرتبہ مضامین اور خبروں کو یہ کہہ کر کٹوا دیتے تھے کہ "حضور نظام کے برو برو (برابر) کوئی نہیں ہو سکتا"

علاوہ بریں اس زمانہ میں اخبار بینی کا عام ذوق بھی نہ تھا اور نہ علمی مضامین سے کسی کو دلچسپی تھی۔ ایسی حالت میں بھی ذخیرہ نکالتا رہا جس کی مقبولیت بڑھتی رہی اسی کی بدولت علامہ طباطبائی کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ حیدر کے مرشئے سنے ذہین کی فقیرانہ زندگی دیکھی۔ لسعد کی بھی شاعری سے کبھی کبھی لطف اٹھایا۔ ذخیرہ نے مہدی حسن افادی الاقتصادی سے تحریری شناسائی کرائی۔ اسی نے الہ آباد تک پہنچایا اور اکبر سے ملوایا اور قطعہ ذیل ان کی زبان سے فی البدیہہ سنوایا۔

> بڑھایا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
> لیے جاتی ہے پیری سوئے گور آہستہ آہستہ
> تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتیں نہیں مجھ کو
> سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ

مولانا سید سلیمان ندوی سے حیدر آباد میں ملا۔ وہ مجھے وہابی عربی شیعہ کہتے ہیں۔ ان کی سرسیدی ریش، ان کی خاموش مسکراہٹیں ان کا علم و فضل، ان کے ادبی لطیفے، ان کی علمی بذلہ سنجیاں ایسی نہیں ہیں جن کو بھلایا جا سکے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے بھی حیدر آباد ہی میں ملاقات ہوئی۔ بلگرامیوں سے ان کے تعلقات یورپ میں قائم ہو چکے تھے۔ حیدر آباد جب آئے تو میرے ساتھ کھانا کھایا، حکہ (حقہ) پیا اور میری بے تکلف باتوں نے ان کو کافی ہنسایا۔ مولانا ظفر علی خاں سے کئی ملاقاتیں حیدر آباد میں ہوئیں جب کبھی وہ تشریف لائے ان جویں سے مجھے محروم نہ رکھا۔ ان کے نظم و نثر کا رنگ سب سے اچھوتا ہے اور شعر تو ارتجالاً کہتے ہیں "طوفان محبت" کو سن کر آب دیدہ تک ہو گئے۔ نواب عماد الملک بلگرامی کی شفقتوں سے گراں بار ہوتا رہتا تھا۔ انہوں نے ذخیرہ کی وقتاً فوقتاً مالی امداد کی۔ میرے مضامین کی اصلاح فرمائی۔ میرا تخلص ہوش رکھا مجھ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کیا۔

اب میں حیدر آباد میں کالی قبر کے پاس ایک مکان میں رہنے لگا تھا جہاں ذخیرہ پریس بھی تھا اور ذخیرہ کا دفتر بھی نواب شوکت جنگ آتے جاتے تھے۔ نواب ابوالفتح خاں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ راجہ نارائن پرشاد (مہاراجہ کشن پرشاد کے بھانجے) دوستی کرتے تھے۔ حکیم مقصود علی خاں سے بھی ملنا جلنا تھا۔ سید علی اصغر بلگرامی سے میرے برادرانہ تعلقات تھے۔ جنہوں نے ذخیرہ کی قلمی امداد کی۔ ان کی فلسفۂ ازدواج پڑھئے، مآثر دکن دیکھئے۔ الناظر اور ذخیرہ میں علمی و ادبی مضامین کا مطالعہ کیجئے۔ اگر ان کا سفرنامہ عراق چھپ جاتا تو سیر و سیاحت کے لٹریچر میں قیمتی اضافہ ہوتا۔ اسی زمانے میں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی ایڈیٹر ادیب الہ آباد میرے مہمان ہوئے تھے۔ یاس عظیم آبادی (جواب یگانہ چنگیزی ہیں) سے سب سے پہلے یہیں ملاقات ہوئی تھی۔

نواب عماد الملک بلگرامی نے ذخیرہ کو حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش کیا جس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سالگرہ کی تقریب میں یاد فرمائی ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کی شاعری کا اس وقت شباب تھا۔ جلیل استاد السلطان تھے جن کی خضاب شدہ ڈاڑھی جن کے لکھنوی پیچ جن کی بانکپوری عادات

اور جن کی " امیری شاعری " نے ان کو " دربارِ عثمانی " کا ملک الشعرا بنا دیا تھا ذخیرہ میں بھی جلیل کا کلام چھپتا رہا ہے۔ جب استاد کا کلام ذخیرہ میں نظر سے گذرا تو شاگرد رشید نے بھی " کلام ملک " سے سرفراز فرمایا۔

دربارِ عثمانی میں باریابی حاسدین کی نظروں میں کھٹکی ذخیرہ کے سالگرہ نمبر میں ایک مضمون بھی ایسا شائع ہوا جو طبع شاہانہ پر " ان کے ان کے " کہنے سننے پر گراں گذرا۔ ذخیرہ پریس بند کر دیا گیا۔ ذخیرہ کی کاپیاں ضبط ہوئیں اور ہوش کو تین دن کی مہلت دی گئی کہ وہ حیدرآباد سے روانہ ہو جائے۔ ہوش نے تعمیل کی اور تیسرے دن بھوپال پہنچا۔

بھوپال میجر عبدالصمد خان نہ جواب حیدرآباد میں ہیں اور نواب صمدیار جنگ بہادر کے خطاب سے دہرے ہو رہے ہیں نے ہمایوں منزل میں ٹھہرایا۔ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو اطلاع ہوئی تو نیاز آئے۔ مانی ملے اور ان کے علاوہ دوسرے شعرا اور اہل قلم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو بھوپال تک محدود رہیں۔ ہاں مانی سے اس کے بعد حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی اور نیاز سے تو اب تک عزیزانہ تعلقات ہیں۔

سلطان جہاں بیگم صاحبہ پردہ نشین تھیں مگر ضرورتوں کی خاطر نقاب ڈال کر امیر حبیب اللہ خاں سے فارسی میں باتیں بھی کرتی تھیں۔ انگریزوں سے بھی ملکی و سیاسی مسائل میں گفتگو کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کے تین بیٹے تھے ولی عہد تو نواب نصر اللہ خاں تھے۔ یہ جب سیر و شکار سے فرصت پاتے تھے تو ماں کے پاس چلے جاتے تھے۔ جنرل عبید اللہ خاں کے مشاغل جب موقع دیتے تھے تو ماں کی دعائیں لینے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ہاں نواب حمید اللہ خاں ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور چیف سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب نواب نصر اللہ خاں اور جنرل عبید اللہ خاں دنیا سے رخصت ہو گئے تو بیگم صاحبہ نے یورپ کا سفر کیا اور نواب حمید اللہ خاں کو اپنا جانشین بنایا۔

ویسے تو میں بھوپال میں قاری علاء الدین کی بزرگی سے ملا۔ سید تقی بلگرامی کے یہاں قورمہ بھی کھایا۔ مانی کے ڈھلتے ہوئے شباب کی بے احتیاطیاں بھی دیکھیں۔ نیاز کو جوتے پہنے ہوئے نمازیں بھی پڑھتے دیکھا۔ مؤلف البرامکہ سعید انصاری سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ محمد امین زبیری کو تاریخ کی ورق گردانی کرتے دیکھا۔ مفتی انوار الحق کو سیرت رسول سناتے دیکھا اور نہ معلوم کس کس سے ملا۔

بھوپال سے آگرہ روانہ ہوا۔ یہی وہ اکبرآباد ہے جہاں نظیر کا سا درویش شاعر پیدا ہوا تھا جس نے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کی ایسی نظمیں کہی تھیں اور حقائق کے دریا میں ڈوب کر کہی تھیں جس نے اپنے شاعرانہ الہامات سے اپنے دیس والوں کو زندگی کے ایسے ایسے نکتے بتائے۔ حیات کے ایسے ایسے راز فاش کئے۔ نشیب و فراز کی ایسی ایسی راہیں دکھائیں جن کو علم کی دنیا اگر اب بھی نقش کا لحجر کرے تو پھر اس کی زندگی کا بیڑا پار ہے۔

وہ آگرہ جہاں میرے شناساؤں میں دلگیر کے لیے بھاری بھر کم شاعر گذرے ہیں۔ جنہوں نے نقاد نکالا تھا اور ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ اس کو جاری رکھا تھا۔ احباب کی ادبی شوخیوں نے ایک قمر زمانی پیدا کر دی تھی جن سے دلگیر سے فرضی خط و کتابت اکثر ہوتی تھی۔ یہ ابھی خوش قسمتی پر اکڑا چھلنے لگے تھے کہ نقاد کا دوسرا دور شروع نہیں ہوا بلکہ دلگیری بھی ڈھلتی جوانی میں شباب کی امنگیں پیدا ہو گئیں۔ قمر زمانی کے خطوط برابر نقاد میں شائع ہوتے تھے۔ دنیائے ادب دیکھا کرتی تھی آخر کار پردہ اٹھا تو نسوانیت کے بھیس میں نہ معلوم کون نکلا۔ یاروں نے جو ادبی مذاق کیا تھا اس کی عمر دراز نہ ہو سکی۔ دلگیر کے منصوبے میوہ کٹرہ میں اچھل کر رہ گئے اور ان کے وارفتہ ارادے بجھ گئے " اور یاران نجد " ان کے ادبی جنون سے لطف اٹھا کر خاموش ہو گئے۔

دلگیر کے میوہ کٹرہ میں دھوبیوں کی آبادی تھی جو دوسرے کپڑوں کے علاوہ ساریاں بھی دھوتے تھے۔ ساریاں دیکھ کر دلگیر کا تصور نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جاتا تھا اور جب کوئی بس نہ چلتا تھا تو از خود رفتگی پیدا کر کے چیخا کرتے تھے صوفیانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح ساری وادیوں تک اپنے والہانہ جذبات کو پہنچا کر " صدائے بازگشت " نہ معلوم کیا سنا کرتے تھے۔

نواب آف رامپور نواب کلب علی خان کی نایاب تصویر

دو تین ہینے آگرہ میں قیام کیا۔ دوستوں کی دلجوئیوں کے ساتھ "حسینی عرفت" نے بھی حیدرآباد کی یاد کو بہت کچھ بھلا دیا۔ آگرہ ہی کے قیام میں جے پور دیکھنے کا خیال پیدا ہوا مختصر سامان سے دو چار دن کے ارادے سے وہاں پہنچا سر فیاض علی خاں دار المہام نے جے پور ہوٹل میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے رکھا۔ اس وقت مہاراجہ مادھو سنگھ گدی نشین تھے۔ سر فیاض علی خاں بھیکم پور کے زمیندار بھی تھے۔ اور جے پور کے اس وقت وزیر اعظم تھے۔

یہاں عورتیں بہت لانبا گھونگھٹ نکالتی ہیں اور دو انگلیوں کی قینچی بنا کر اور گھونگھٹ کو نیوڑھا کر آیندہ روندہ کو درشن دیتی رہتی ہیں۔ منہ کو اس طرح چھپاتی ہیں مگر "کندلی پیٹ" کی نمائش سے بالکل نہیں شرماتیں جن کی خوبصورت ناف نافۂ ہرن کی طرح اتنی گہری ہوتی ہے کہ اگر اس میں ایک تولہ مشک سما سکتا ہے تو اس میں ایک چلو پانی نظربازوں کو ڈوبنے کا موقع دے سکتا ہے۔

سر فیاض علی خاں نے اپنی بزرگانہ شفقت سے دو ہفتے تک مہمان رکھا اور بہت مشکل سے واپسی کی اجازت دی تو میں جے پور سے رخصت ہوا اور آگرہ پہنچ گیا جہاں نواب عماد الملک بلگرامی کا گرامی نامہ ملا جس میں تحریر فرمایا تھا کہ مجھے فوراً رامپور چلا جانا چاہیئے۔ جس کی تعمیل میں آگرہ کے احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رام پور روانہ ہو گیا۔

رام پور

رام پور پہنچا، مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔ دو چار روز کے بعد ہز ہائینس نواب سید حامد علی خان

کی بارگاہ میں باریاب ہوا۔ میں نے اپنے دس سالہ قیام میں پورے چھ عدد وائسرائیوں کو آتے دیکھا۔ ڈیوک آف کناٹ کا بھی خیر مقدم دیکھا۔ والیان ملک میں پٹیالہ، گوالیار، بیکانیر اور اودے پور بھرت پور کے مہاراجوں کی بھی خاطر مدارت دیکھی۔ ان مہمانداریوں پر لاکھوں روپے صرف کر دیئے جاتے تھے۔ ایسی خوش سلیقگی سے انتظام کیا جاتا تھا کہ میں نے کسی دوسری ریاست میں نہیں دیکھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو رکابدار ملازم تھے۔ ہر رکابدار ایک ہی چیز پکاتا تھا جس میں وہ ایسا ماہر ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی سبک حرکت بجلی اور تیز آنچ کا اندازہ، سامان اور مسالوں کی مقداریں کھانوں کو فردوسی کھانے بنا دیتی تھی۔

ایک دن مہاراجہ بہادر کا حیدرآباد سے تار آیا کہ اجمیر میں آکر ملیئے۔ تو میں مسرت سے اچھل پڑا۔ حیدرآباد کی صحبتیں یاد آگئیں۔ ہز ہائینس کی خدمت میں جو اس وقت بمبئی میں تھے اجازت کے لئے تار دیا۔ دوسرے ہی دن جواب ملا کہ جاؤ اور مہاراجہ کو بمبئی سے لے آؤ۔ رام پور سے چل کر تیسرے دن اجمیر پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ ابھی اجمیر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ میں نے مہاراجہ کی خاطر دو ہفتے وہاں گذار دیے۔ اگر ادبی ذوق نہ ہوتا اور سید محمد حنیف صاحب کی بزرگانہ دعائیں نہ ہوتیں تو میں نہ مہاراجہ کا انتظار کر سکتا اور نہ اپنی مسافرت کے دن کاٹ سکتا آخر مہاراجہ یہاں آگئے اور ان کی معیت میں بمبئی روانہ ہوا

یہاں مسلمانوں میں خوجے ہیں، بوہرے ہیں اور آغاخانی ہیں اور سب تجارت پیشہ ہیں۔ جہاں کے بھولے بھالے انسان آغاخان کو روحانی پیشوا مانتے ہیں اور بغدادی صاحب کے "درازیٔ قد" سے بیعت کرتے ہیں اور ان کے تقدس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ یہ مقام ایسے مذہبی پیشواؤں کی چراگاہ ہے جن کی لبی عباؤں کو یہاں کے مسلمان غلاف کعبہ سے کم نہیں سمجھتے اور جن کی شراب کے گھونٹوں کو شربت جانتے ہیں

مہاراجہ بہادر اٹھارہ دن تک ہز ہائینس کے مہمان رہے امیروں کی خاطر مدارت تھی اور میزبان نواب حامد علی خاں ایسا مہمان نواز تھا۔ اٹھارہ دن میں نہ معلوم کیا صرف کر دیا مخصوص دعوتیں بھی ہوئیں۔ ارباب نشاط کے مجرے بھی ہوئے۔ روزانہ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ سنجیدہ مذاق بھی ہوتے تھے۔ تخفہ تحائف کے تبادلے بھی ہوئے۔ اور آخر اسٹیشن پر دونوں بغلگیر ہو کر روئے اور رخصت ہوئے۔ میں نے ستارہ تک مہاراجہ کو پہنچایا۔ اور پھر رام پور کا رخ کیا۔

واپس آیا تو اپنے دوست صفدر علی قدوائی کو مصائب میں مبتلا پایا۔ ان کے والد ابر قدوائی کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔

رام پور میں بھی وہ گھر تھا جہاں شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ شوق و ابر دونوں حقیقی بھائی تھے اور جب کوئی پھنس جاتا تھا تو دونوں شرط باندھ کر اپنا اپنا کلام سناتے تھے کہ سامعین کا مادۂ شعر فہمی مفقود ہو جاتا تھا۔ پناہ مانگتے تھے۔ جوتے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ تاجور کی دیوبندی مولویت اور میلارام وفا کی برہمنی پنجابیت داد دیتے دیتے تھک جاتی تھی۔ ایک ہی سانس میں یہ بھی بے اختیاری سے نکل رہا تھا کہ "منشی صاحب کا کیا کہنا" اور اسی لے میں یہ بھی کہ "ہوش صاحب جان بچاؤ"

نیاز

ویسے تو رام پور کے قیام کے دوران میں نیاز کئی مرتبہ آئے مگر اس وقت بھی آئے جب میں تحصیل ملک میں تحصیلدار تھا۔ نیاز دوستی کے اتنے پکے، وضعداری میں اتنے سچے اور نفسیات کے تولنے میں ماہر ہیں کہ کسی دوست کو ان کی کسی ادا سے کسی وقت بھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوگی۔ کیوں کر پہنچتی جبکہ وہ دوستی کے وسیع تر مفہوم سے آشنا اور اس نازک رشتہ کے ایسے نباض ہیں جس کی تڑپ مختلف الطبائع خاصیتوں سے پوری طرح باخبر رکھتی ہے اور جس کا ذوقی کے موڑ پر یہ لحاظ رکھتے ہیں۔

عبدالماجد

رام پور میں فلسفۂ جذبات و اجتماع کے عبدالماجد نہیں بلکہ مولانا عبدالماجد بھی میرے مہمان ہوئے تھے جس کو دنیا نے کسی وقت دہریہ بھی کہا اور ملحد بھی پکارا۔ مگر قدرت نے قلب ماہیت کر کے اس دہریہ اور ملحد کو خدا پرست بنا دیا۔ رسول کا پرستار بنا دیا یہ سنت کی پیروی ہے کہ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے حافظ کے شاعرانہ الہامات پر سر دھنتے ہیں۔ دل میں درد کی دنیا بسائے ہوئے ہیں اور خدا لگتی بات پر آنکھوں سے آنسوؤں کے

سیلاب بہاتے ہیں۔ جن کا فلسفیانہ طرز بیان صوفیانہ رنگ لی
تدریجاً گیا۔ جن کی ہر بات مضرانہ اور جن کی ہر ادا قلندرانہ ہونے
لگی۔ جن کی زبان چلتی ہے تو صرف قرآن و حدیث کے لئے جن کی
تحریریں اللہ سے رجوع کراتی ہیں۔ بھٹکے ہوؤں کو سیدھا راستہ
دکھاتی ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات سے دور رہنے والوں کو
للکارتی ہیں جو عصر حاضر کے مسلمانوں کی بے حیائی کے قصے
سناتی ہیں اور ہر ہفتہ سچی باتیں سنا کر بے حس دلوں میں
احساس پیدا کرتی ہیں

عبدالحق انجمن ترقی اردو کے مولوی عبدالحق بھی میرے
مہمان ہوئے تھے۔ وہ جس طرح اردو کی بقا
میں لگے رہتے ہیں اسی طرح وہ پیٹ کی بقا کو بھی سب کاموں
پر مقدم سمجھتے ہیں اس لئے وہ کھانے کے بہت شوقین ہیں
اوران کا عمل "زیستن برائے خوردن" پر ہے۔ پھلوں کو
وہ درخت سے توڑ کر نہیں کھاتے بلکہ اس کی شاخوں تک
یا تو اچک اچک کر پہنچتے ہیں یا سیڑھی لگا کر پھلوں تک اپنے
منہ کو پہنچاتے ہیں۔ رام پوری بیر چھلکے سمیت کھا جاتے ہیں
ان کو دنیا "مقدمہ باز" کے نام سے بھی یاد کرتی ہے
حیدرآباد میں خوب گذری۔ سر اکبر سے جو چاہا کرا لیا
نواب عماد الملک بلگرامی سے چک پر چک لکھواتے رہے
اردو کی ترقی کے لئے امراء کے خزانوں کو بھی ٹٹولتے رہتے
تھے اور سرمایہ داروں کی تھیلیوں کا اجارہ بھی انہیں بے
چین کرتا رہتا تھا۔ ملک غلام محمد سے چالیس ہزار سالانہ
انجمن کے لئے مقرر کرا لئے مگر سر مرزا اسمٰعیل کے وزارتی
عہد نے ایسے روڑے اٹکائے کہ لائق علی وزارت بھی اس
پر نظر ثانی نہ کر سکی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو دہلی میں جان لیوا ہنگامہ
ہوا تو انجمن کا دفتر بھی لٹا اس کے دو آدمی اردو پر بھینٹ
چڑھے۔ بابائے اردو بھی بے خانماں ہو کر کبھی بھوپال میں
تھوڑی کھائی۔ کبھی حیدرآباد میں تقی الاس کے یہاں مرغ
مسلم کھایا۔ وطن سے بے وطن ہوئے۔ اب کراچی میں اردو
کالج کھولا ہے۔ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اردو جلدی
پاکستان کی زبان بن جائے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

تاجور وغیرہ شمس العلماء تاجور نجیب آبادی اور پنڈت
میلا رام وفا ہفتوں میرے مہمان رہے جوش
ملیح آبادی سے سب سے پہلی ملاقات رام پور ہی میں ہوئی تھی
حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کا خاکہ
رام پور ہی میں سنایا تھا۔ میں نے ان کی شاعری سے زیادہ ان
کی موسیقی سے لطف اٹھایا۔

الور رام پور میں جب جی اچاٹ ہونے لگتا تھا تو کبھی دہلی
چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی گومتی کی ناز آفریں آب و ہوا میں
ایک آدھ ہفتہ گذار دیتا تھا۔ اب کی (۱۹۲۸ء) ارادہ ہوا کہ الور
کی سیر کر کے چتوڑ کے قلعہ کی اکبری معرکہ آرائی کا تصور کروں۔
دہلی پہنچ کر پروگرام میں صرف اتنی ترمیم کی کہ پہلے الور کو جڑی
سواری دیکھ لوں کیونکہ مہاراجہ سے رام پور میں تعارف ہو چکا
تھا۔ ان کی صحبتوں میں گھنٹوں بیٹھ چکا تھا۔ دہلی سے الور دوسرے
دن پہنچا۔ مہمان خانے میں ٹھہرا اور مہاراجہ سے تین مرتبہ ملا۔

اودے پور پہنچ گیا۔ محلات دیکھے۔ جھروکہ درشن دیکھا۔ بڑے بڑے موجوں پر موجیں مارتے ہوئے تالاب دیکھے۔ سادھوؤں کی موٹی تازی آبادی دیکھی۔ سؤروں کی بے خطر بھیڑ دیکھی۔ موروں کی دلکش صدائیں سنیں۔ ایک ہفتہ اودے پور میں قیام کرکے اور دو دن چتوڑ گڈھ کے قلعہ کو دیکھتا ہوا آخر رام پور روانہ ہوگیا۔

اودے پور سے جب رام پور واپس آیا تو بہت سے خطوط اور تار رکھے ہوئے تھے۔ پہلے تاروں کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے مجھ کو حیدرآباد آنے کی اجازت دیدی ہے۔ گو رام پور کے قیام سے خوش تھا اور اعلیٰ حضرت رام پور کے توجہات بے کراں سے مطمئن تھا مگر حیدرآباد میں اعزہ اور سسرالی عقربا کی وجہ سے جانے کو جی چاہا اس کے علاوہ اس وقت بیوی بھی وہیں تھیں رخصت کی درخواست کرتے ہوئے تکلف ہوتا تھا۔ آخر ایک ہفتہ توقف کرکے ہز ہائینس سے عرض کرنے پر مجبور ہوا۔ اجازت تو ملی مگر مشکل سے۔

حیدرآباد دس سال کے بعد

رام پور سے حیدرآباد روانہ ہوا اور چوتھے دن کاچی گوڑہ اسٹیشن پر جب پہنچا تو اعزہ و احباب کا ایک کافی مجمع پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ سب سے بغلگیر ہوتا ہوا یاقوت پورہ کے اس مکان میں پہنچا جہاں میری بیوی اپنے چچا کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔

دوسرے دن ایک دستار بنی بنائی بازار سے منگوائی نذر کے لئے چار میناری اشرفی خریدی اور ٹیکسی منگوا کر نجیب کنگ کوٹھی پہنچا۔ نذر پیش کی۔ ارشاد فرمایا رام پور جاکر اب کیا کروگے یہیں رہو۔ ہفتہ عشرہ کے بعد فرمان مبارک جاری فرمایا گیا۔ ہو تو مل بلگرامی کا تقرر چار سو روپے کی جگہ پر عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا جائے۔ نہ میں درس و تدریس کے فن کو جانتا تھا نہ طلبا کو افہام و تفہیم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ مہذب سرزنش سے ان کی شرارتوں کو کم کرسکتا تھا اس لئے خدمت سے خود کو معذور سمجھ کر معذرت کرنی پڑی آخر دو تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد انسپکٹری سیونگ بنک کو قبول کرنا پڑا۔ چھ ماہ کے بعد انسپکٹری سے ہٹمی پر ترقی ملی۔ اور اس کے چند ماہ بعد نواب احمد یار جنگ بہادر معتمد فوج نے اپنی مددگاری پر منتقل کرلیا۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے بیس سال میں معتمدی تعمیرات تک پہنچا اور سر مرزا اسمٰعیل کی صدارت سے مستعفی ہوجانے کی وجہ سے اتحاد المسلمین کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے اور یہاں کے سازشی ماحول سے تنگ آکر جنوری ۱۹۴۳ء سے وظیفہ لے لیا۔

ابتدائی زمانہ میں ایک عرصہ تک روزانہ بارگاہ خسروی میں حاضر ہوتا رہا۔ پھر جمعہ مقرر ہوا۔ تھوڑے عرصہ تک نہ روزانہ کی حاضری رہی نہ جمعہ کی آخر وہ زمانہ آگیا جب اعلیٰ حضرت نے یکایک یاد فرمایا اس وقت سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء تک (تقریباً، اسلانی، دگھنٹوں) حضوری میں حاضر رہتا تھا۔

مغلیہ بادشاہوں کے آداب کا لحاظ یہاں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ رکوعانہ تسلیمات کا طریقہ دستار سر پر اور بگلوس کمر پر جب تک نہ ہو غلامان زریں کمر شاہی محلات کے حدود میں داخل نہ ہوسکتے تھے۔ رام پور اور بھوپال میں بگلوس تو اسی قسم کا ہوتا تھا مگر سر پر شملہ (بہ مقدار علم) رہتا تھا۔ ہندو ریاستوں میں بھی اسی قسم کی پابندیاں تھیں۔ اودے پور کا عام درباری لباس ویسا ہی ہوتا تھا جیسا مہارانا زیب تن فرماتے تھے جے پور گوالیار اور الور وغیرہ میں بھی ایسی ہی پابندیاں دیکھی گئیں۔ جودھپوری درباری لباس سر مرزا کی تصویر میں دیکھا اور بڑودہ اور کشمیر کے لباس کا ان کے مہاراجگان کے لباس سے اندازہ کیا۔ چونکہ نظام دکن مغلیہ کے جانشین کہلاتے تھے اور آصف جاہ اول دربار مغلیہ کے تمام شاہانہ آداب سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اس کے عادی تھے اس لئے وہی آداب یہاں بھی رواج پا گئے۔ ہندو امراء ہوں یا مسلمان سب کی عجیب عجیب وضع کی خاندانی پگڑیاں سروں پر رکھی رہتی تھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ہمراہ میں نے پانچ سفر کئے۔ سب سے پہلے اورنگ آباد گیا۔ پھر گلبرگہ کا بہمنی دارالحکومت دیکھا۔ لارڈ ولنگڈن کے زمانہ میں دہلی کی سردیوں کا لطف اٹھایا۔ کرسمس کے زمانہ میں کلکتہ کی چہل پہل بھی دیکھ لی اور رائچور میں دو دن آندھی اور پانی میں ڈیروں کی زندگی کا بھی تجربہ ہوا۔

۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو خسرو دکن کی اسپیشل ٹرین صبح دہلی پہنچی۔ توپیں چلیں اور نظام پیلس میں دکن کا قافلہ فروکش ہوا۔ اہل دہلی نے قصر شاہی کی پر شوکت بلندیوں پر آصف جاہی پرچم لہراتے دیکھا۔ اس کے مرمریں فرش پر پھسلتے ہوؤں کو سنبھلتے دیکھا اس کے در و دیوار کے رنگ و حسن سے آنکھیں سینکیں بیش قیمت ساز و سامان کی فراوانی پر لوگوں کو حیران ہوتے دیکھا غرض کہ یہ دیکھا وہ دیکھا مگر اعلیٰ حضرت کو ایک برآمدہ ہی میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اعلیٰ حضرت جو ڈیڑھ کروڑ انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ اعلیٰ حضرت جن کے ملک کی آمدنی بارہ کروڑ ہے وہ اعلیٰ حضرت جن کا صرف خاص دو کروڑ کا ہے اور جو دولت کے لحاظ سے قارون ثانی مشہور ہیں۔ جو دولت اور حکومت کی ریل پیل میں پلے ہیں جو اسباب عیش و مسرت کے انبار میں

بڑھے ہیں۔ جن کے ملک میں ہزاروں جاگیردار ہیں جن میں چند ایسے امرا عظام بھی گذرے ہیں جو اگر سلطان میں ہوتے تو والی ملک کہلاتے۔ ہز ہائینس پکارے جاتے۔

ویسے تو امرائے عظام اور جاگیردار ہزاروں ہیں مگر سر وقار الامرا اور مہاراجہ سرکشن پرشاد ایسے بھی امیر گذرے ہیں جن کی فیاضیاں کبھی حاتم طائی سے شرمندہ نہ ہوتی تھیں دونوں ہر مذہب و ملت کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے مہاراجہ کی فیاضیاں تو میں نے دیکھی ہیں مگر سر وقار الامرا کی فیاضیاں معمر ہستیوں سے سنی ہیں۔

حضور نظام کے یہاں نہ مہاراجگان ہند کے ایسے ٹھاٹ باٹ ہیں نہ لباس میں کوئی امتیاز ہے نہ جواہرات کے زیور پہن کر پھر آکر تے ہیں۔ اوسط درجہ کا لباس ضرورت کے وقت پہن لیتے ہیں۔ سادگی حقیقی معنوں میں یقیناً قابل قدر ہوتی ہے مگر بعض لوگ اس کو سادگی سے نہیں تعبیر کرتے بلکہ اس کو خدا کی دی ہوئی نعمت کے استفادہ سے محرومی سمجھتے ہیں

دربار عثمانی

بیس سال تک جو بلا ناغہ "دربار عثمانی" میں حاضر رہا ہو اس نے وہاں دن کے اجالے اور رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ نہ دیکھا ہوگا۔ اس نے اعلیٰ حضرت کی خوش مزاجیاں بھی دیکھی ہوں گی اور برافروختگیاں بھی حکمرانی کے طمطراق بھی دیکھے ہوں گے اور انسانیت کی وہ ملوکی

نظام حیدرآباد عالم جوانی میں

جو عصر حاضر کی دنیا نے ملوکیت میں کہیں نظر نہیں آسکی۔ ان واقعات کو اگر پھیلایا جا سکتا تو اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت پڑ جاتی اور اس طرح گو چشم دید واقعات کی ایک معتبر تاریخ مرتب ہو جاتی مگر "مشاہدات" کے محدود صفحات اس کی تاب نہ لا سکتے تھے۔

اگر الطاف عثمانی پر نظر کرکے اور مشرقی روایات کے احترام میں حال کو حافظہ سے کچھ محو کر دیا جائے تو اس ماضی کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے جس کے نقوش تاریخی صداقت میں ابھرے ہوئے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے الطاف و کرم کا ہوش کو اعتراف ہے اس ابتدا تقرر خسرو دکن ہی کی زبان سے ہوا دیرینہ وفاداری کے صلہ میں "ہوش بلگرامی" سے ہوش یار جنگ ہوا۔ خون کی ندیاں بہانے والی بواسیر کا اپنی خاص توجہات سے علاج کرایا اور صحت سے ہم آغوش کر دیا میرے بچے کا نام سرفراز حسین خود بدولت نے رکھا اور پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی تحریری "بیٹا کہا" سے مفتخر فرمایا۔ سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رکھا۔ اسی قسم کی متعدد نوازشات کا میرے قلب پر اب تک اثر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی وہ اثرات تھے جس کی وجہ سے خاندان شاہی کی عمر طراز کرنے کے لئے اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دی۔ اتحادی پارٹی کے سیاسی طرز عمل کا میں چونکہ حامی نہ تھا اس لئے وہ دربار عثمانی میں میرے وجود سے گھبراتی تھی۔

میں آخر وقت تک ایڑی چوٹی کا پورا زور اس اندیشے لگاتا رہا کہ کہیں وزارت و قیادت کے غلط مشوروں سے اعلیٰ حضرت اور ملک کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے۔ مگر ہمارے درباروں میں کسی زمانہ میں بھی سچائی کی قدر نہیں کی گئی اور نہ صحیح مشوروں کو مانا گیا ◆ ■

تیسرا سال ہفتہ بھر پہلے ایک امریکی میڈیکل کمیشن نے ہمارا معائنہ کیا اور ہماری خوراک میں اضافے کی سفارش کی۔ یوں اب ہمیں بہتر کھانا مل رہا ہے۔ قوانین کی خلاف ورزی پر ایک بار پھر مجھے سزا دی گئی ہے۔ ایک ہفتے کے لئے کتابیں پڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔

کیلنڈر پر سال ختم ہونے میں چند دن باقی ہیں۔

تین ہفتوں سے میں نے کچھ نہیں لکھا، لیکن آج میری بیوی کے خط نے مجھے ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نے امریکی پبلشر الفرڈ اے نوف کی بیوی کا ایک خط بھیجا ہے۔ اس نے پیشکش کی ہے۔ اس کا خاوند میری یادداشتیں شائع کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

نئے سال کا تیسرا دن ہے۔ کچھ عرصے سے میرے ساتھی فنک کا محبوب موضوع تیسری رائخ میں کرپشن ہے۔ اس نے ۱۹۴۲ء کا ایک واقعہ سنایا: "گرمیوں کے موسم میں فوجی گاڑیوں میں اٹلی سے ہزاروں کی تعداد میں کپڑے جرمنی بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ ایک پرائس لسٹ بھی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جرمنی میں بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوتے ہیں۔ یہ کپڑے دراصل وہ تھے جو ہٹلر نے اپنے دوست ملک اٹلی کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن انہیں بارڈر پار کرتے ہی جرمنی واپس بھیج دیا گیا۔ اس سارے معاملے میں گورنگ کا ہاتھ تھا۔ اس نے بلیک مارکیٹنگ سے لاکھوں مارک کما لئے۔"

میں نے کر[illegible]ت کا وزیر ہونے کی حیثیت سے

۲۰ برس کی خفیہ ڈائری

ہٹلر کے قریبی ساتھی اور مقدمہ نورمبرگ کے سزا یافتہ نازی مجرم البرٹ کے قلم سے

تمہیں چاہیے تھا کہ اس واقعے کی اطلاع ہٹلر کو دیتے"۔

"کیا کہتے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "میں پہلے ہی معتوب افراد کی لسٹ میں تھا۔ ہیملر نے میرے بارے میں خاصا مواد اکٹھا کر رکھا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایک تقریر میں میں نے رواداری میں کہہ دیا تھا کہ مستقبل میں ہم بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کے خلاف اقدامات کریں گے۔ اس پر مرکز کے چند بڑے میرے خلاف ہو گئے۔ اب میں سوچتا ہوں، ہٹلر کی عقابی نظروں سے یہ دھندا پوشیدہ تو نہیں ہو گا۔ وہ یقیناً خود ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

جنوری کا آخری دن ہے اور سردی شباب پر۔ گذشتہ دنوں برسا مدہ رنگا ــــــ اور اب ہم اپنی کوٹھریوں میں رنگ کر رہے ہیں۔ ماضی میں چانسلری اور ہٹلر کے محل میں رنگوں کا انتخاب میری مرضی سے ہوتا رہا۔ لیکن ایک روز ہٹلر نے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں رنگوں کے فلسفے پہ بات کرتے ہوئے کہا کہ ان رنگوں کا انتخاب میں نے خود کیا ہے۔ میں حیران ہی تو رہ گیا۔

۱۴ فروری کا دن ہے۔ میری بیوی مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آسکتی کیونکہ مشرقی زون میں سفر کرنا ممکن نہیں۔ تاہم آج میں نے اپنے عم زادے سے ملاقات کی۔ میرے پیچھے ایک امریکی، ایک برطانوی، ایک فرانسیسی اور ایک روسی گارڈ موجود تھا۔ علاوہ ازیں کا ایک اور نمائندہ ہماری گفتگو کے نوٹس لے رہا تھا۔ ایک سارجنٹ ملاقاتی کے ساتھ کھڑا تھا اور ہم دونوں کے درمیان لوہے کی جالی کی دیوار تھی۔

آج ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء ہے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم روزانہ کی سیر کو نکلے، مگر ہمارا ایک ساتھی ہیس کوٹھری ہی میں مقید رہا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ گارڈ نے اسے حکم دیا: "فوراً سیر کے لئے جاؤ" جو بر آمدے میں انتظار کرتے اور آوازیں سنتے رہے: "نمبر سات، تمہیں سزا والی کوٹھری میں ڈال دیا جائے گا ورنہ سیر کے لئے چلو" ہیس بڑبڑاتے ہوئے اٹھا اور سزا والی کوٹھری میں چلا گیا جہاں صرف ایک میز اور کرسی پڑی ہے۔

مارچ کی تین تاریخ ہے۔ ہٹلر کی بے وفائیاں رہ رہ کر یاد آرہی ہیں۔ وہ محبت اور وفا سے نابلد تھا۔ وہ مسولینی کی دوستی میں گرمجوش تھا، لیکن جنگ کے آخری دنوں میں جب مسولینی کی نااہلی کی وجہ سے اٹلی جرمنی کا ساتھ نہ دے سکا، تو اس کے انداز میں سرد مہری آگئی۔ وہ دن مجھے اب بھی یاد ہے۔ جب اس دوستی کی بنیاد پڑی تھی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں مسولینی برلن آیا اور وہ کار پہ میفیلیڈ روانہ ہوئے جہاں انہوں نے لاکھوں کے مجمع سے خطاب کیا۔ مسولینی کے رخصت ہونے کے بعد ہٹلر نے کہا: "ڈیوک اس قدر متاثر ہو کر گیا ہے کہ اب ساری زندگی جرمنی سے وفادار رہے گا۔" گوئبلز نے فیوہرر اور مسولینی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا: "اٹلی میں ممکن ہے اس کی قدرومنزلت ہو کہ وہ رومن ہے۔ لیکن یہاں وہ عظیم جرمنوں کے مقابلے میں محض اطالوی ہے ــــــ مجھے تو وہ کسی مزاحیہ اوپیرا کا کوئی کردار لگتا ہے اس کے مقابلے میں ہمارا فیوہرر ــــــ"

ہٹلر اپنی تعریف اور برتری پر مسکرانے اور مسولینی کی نقلیں اتارنے لگا: "یوں ــــــ یہ دیکھو! اس طرح ہاتھ پشت پہ رکھ کر کھڑا ہوتا اور اس طرح بولتا تھا ــــــ اور یوں چلتا تھا۔"

ہم سب نیازمندی سے ان حرکتوں پر قہقہے لگاتے تھے۔ پھر ہٹلر یک دم سنجیدہ ہو گیا اور بولا: "تمہیں خبر ہے میں نے مسولینی کا دل کیسے جیتا ہے۔ میونخ کے دوران قیام میں نے اسے جدید آرکیٹیکچر پہ ایک لیکچر دیا اور وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اٹلی کی تمام تعمیرات بے معنی نظر آنے لگیں۔"

جون کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا ہے۔ بالآخر مشرقی زون میں سفر کرنا ممکن ہو گیا اور میری بیوی ملاقات کے لئے آئی تھی۔ منظر بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ شاید اس کے لئے مجھ سے بھی زیادہ۔ بارہ آنکھوں کی موجودگی میں ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہمارے الفاظ ڈرے سہمے اور مصنوعی سے تھے۔ وہ مجھے تین سال بعد ملی تھی۔

۲۰ جون کو ایک گارڈ نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا کہ مغربی علاقہ پہلے سے خود مختار ہو گیا ہے اور اس کا نام "فیڈرل ری پبلک" رکھا جائے گا۔ مشرقی حصہ ڈیموکریٹک ری پبلک کہلائے گا۔ تفصیلات خواہ کچھ بھی ہوں۔ حیران کن بات یہ ہے۔ ریخ کے ٹوٹنے کے چار ہی سال بعد جرمن عوام پر پھر سے جرمنوں

کی حکومت قائم کی جائے گی۔

یکم اگست کو دن بھر بارش ہوتی رہی۔ گرج چمک کے ساتھ۔

اس موسم میں ہیس نے ہٹلر کی سرد مہری کا ایک واقعہ سنایا: "۱۹۳۹ء کی بہار میں ایک روز ہٹلر کی محبوبہ ایوا براؤن میرے پاس آئی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے اپنی ذاتی باتیں کر لیا کرتی تھی ——— وہ بہت مضمحل تھی۔ اس نے بتایا کہ ہٹلر نے مجھے کسی اور مرد سے پیمانِ وفا باندھنے کا اختیار دے دیا اور سرد مہری اپنا لی ہے۔

چوتھا سال

اکتوبر ختم ہوا چاہتا ہے۔ اپنی صحت کو مزید تباہی سے بچانے کے لئے میں نے ورزش کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ دو سو میٹر کا فاصلہ ناپا ہے اور اس کے درمیان دوڑ لگاتا ہوں۔ ایسا کرنے میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

چند ہی روز بعد میرا ٹخنہ سوج گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بستر پہ آرام کا مشورہ دیا ہے اور ساتھ ہی ڈھیر ساری گولیاں!

آج ۱۴ فروری ہے۔ آٹھ ماہ بعد بیوی سے ایک اور ملاقات ہوئی۔ میں بہت خوش اور اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ خطوط کتنے ہی لکھے جائیں، ملاقات، ملاقات ہی ہے۔ اگلی ملاقات اگست تک ملتوی رکھوں گا جب ہم ان گھنٹے کے لیے مل سکیں گے یا پھر اکتوبر تک جب ہمیں ایک گھنٹے ملاقات کی اجازت ہوگی۔ نصف گھنٹہ بڑا ہی کم ہوتا ہے۔ پہلے پندرہ منٹ ایک دوسرے کے دیکھنے، حال احوال پوچھنے میں گزر جاتے ہیں اور آخری پندرہ منٹ خدا حافظ کہنے میں۔

اپریل کے وسط میں ایک امریکی ماہر نفسیات نے جیل کا دورہ کیا۔ ہیس نے ذہنی توازن کھو بیٹھنے کا تاثر دینا چاہا۔ نیورمبرگ میں بھی اس نے مقدمے کے دوران یہی انداز اپنایا تھا۔ ماہر نفسیات نے میرے ساتھ آدھ گھنٹہ گزارا۔ اس کی رپورٹ پڑھنے کے لائق ہوگی۔

جون آگیا۔ بہار رخصت ہو چکی۔ ۱۹۵۰ء کے ان ہفتوں میں پوری دنیا کا عظیم ترین دارالحکومت "جرمینیہ" مکمل ہوتا تھا جب ۱۹۳۸ء میں میں نے ہٹلر کو تکمیل کے لئے یہ تاریخ دی تو وہ بہت خوش ہوا تھا اور اس نے ہدایت کی تھی کہ ۱۹۵۰ء کا عالمی میلہ اس شہر کی خالی عمارتوں میں منعقد کیا جائے۔ ہم نے ابتدائی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ کئی جہاز راں کمپنیوں کو جہاز بنانے کے آرڈر دے گئے جو بیلنڈ سے نیویارک سے ٹرینالٹ لانے میں استعمال ہونے تھے۔ آج میں حیران ہوں کہ یہ سب دکھاوے کے لئے تھا، اگر نہیں تو جنگ کیوں شروع کی گئی؟ سب جانتے تھے جنگ اس مقصد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگی۔

جولائی کے ۲۱ دن بیت گئے۔ آج باغ میں فنک کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ موضوع وہی پرانا تھا۔ ہٹلر اور اس کے عظیم الشان منصوبے: "ہمیں احساس تھا کہ ہٹلر مشرقی علاقوں کے جو منصوبے بنا رہا ہے ان میں ہماری زندگیاں کھپ جائیں گی ان علاقوں میں جرمن شہروں سے ملتے جلتے شہر تعمیر کئے جاتے اور صنعتوں کا جال دور دور تک نظر آتا۔ ہٹلر اپنے وزیر مواصلات ڈورپ مُلر سے کہا کرتا تھا کہ وہ ریل کی ایسی پٹری بچھائے جس کی چوڑائی چار میٹر سے کم نہ ہو۔ اس طرح چھ میٹر چوڑی ٹرینیں چلائی جا سکتی تھیں تاکہ ایک کنبہ ریل گاڑی کے ایک اپارٹمنٹ میں آ جائے۔ ہٹلر بڑی بڑی مال گاڑیوں کے لئے علیحدہ ریلوے لائن بچھانا چاہتا تھا کہ جرمن نوآبادیاتی سلطنت کسی بحری بیڑے کی محتاج نہ ہو۔

کچھ عرصے سے یہ افواہ بھی سن رہے تھے کہ کوریا گڑبڑ ہے۔ ایک گارڈ اخبار لایا اور ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ لکھا تھا: "کھلی جنگ امریکی فوجی محاذ پر پہنچ گئے۔" آج سے روسی گارڈوں کے چہرے کرخت ہو گئے ہیں اور ان کے انداز میں سختی آ گئی ہے۔

آج اگست کی تیرہ تاریخ ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو لکھا ہے کہ اگر روسی مغربی جرمنی پر حملہ آور ہوں، تو خاندان کو لے کر امریکہ چلی جائے۔ کچھ عرصے پیشتر میں نے جیل کے امریکن ڈائریکٹر سے درخواست کی تھی کہ اگر روسی مغربی برلن پر قبضہ کرنے والے ہوں تو مجھے خودکشی کی اجازت دی جائے۔ ایسی ہی درخواست میں نے نیورمبرگ میں جج کے سامنے پیش کی تھی جب ہمیں روس بھیج دینے کی افواہ گردش میں تھی۔

آج ہوا کے دوش پر کہیں سے بچوں کے کھیلنے کی آوازیں آئیں۔ دل عجیب خوشی سے بھر گیا۔ کاش ہر روز ہوا اسی رفتار سے اسی رُخ چلتی رہے۔

پانچواں سال

جنوری ۱۹۵۱ء کا دوسرا ہفتہ گزر چلا۔ سوچ کی لہریں عہد رفتہ کے ساحل سے

گزار رہی ہیں۔

شاید! شاید ایسا ہی ہو! اگر نہیں تو میں بار بار ماضی میں کیوں دھنس جاتا ہوں؟ شاید ابھی تک اسی دور میں وابستہ ہوں۔

وہ اپریل ۱۹۴۵ء کا پہلا اتوار تھا۔ میں ہٹلر کے ساتھ اس کی ٹرین میں سفر کر رہا تھا ـــــ حفاظتی انتظامات کے اعتبار سے بے مثال ٹرین۔ ہٹلر کا ڈبہ درمیان میں تھا اور آگے پیچھے فوج کے منتخب فوجی دستے مشین گنوں اور طیارہ شکن توپوں سے لیس۔ ڈبے کے اندر ہلکی ہلکی نیلی روشنی بکھری ماحول کو افسانوی رنگ دے رہی تھی۔ کمانڈ کار میں بیرونی رابطے کے لئے وائرلیس سیٹ نصب تھے۔ اس کے علاوہ "ملٹری آپریشن روم" بھی تھا جس میں جنگ کی تازہ ترین صورت حال کا مکمل نقشہ آویزاں تھا۔ ہٹلر بار بار اپنے بچپن کے واقعات دہراتا اور بچوں کی طرح اچھل کود کرتا رہا۔ میں سوچتا ہوں، اس شخص کے کتنے چہرے تھے۔

موسم بہار کی ایک چمکیلی سہ پہر فنک نے ہٹلر کی شخصیت پر دلچسپ گفتگو کی۔ اس کی باتوں کا رخ ہٹلر کے ذاتی شعور کی طرف تھا۔ ۱۹۴۳ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے ہٹلر کو عجیب سوجھی۔ اس نے سٹیورڈ کینن برگ کا مذاق اڑانے کا منصوبہ بنایا۔ کینن برگ کو آرڈر ملے کہ وہ فوری طور پر ٹروپس کے ساتھ محاذ پر چلا جائے۔ یہ آرڈر ملتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ہم اس کی بدحواسیوں کا تماشا دیکھتے رہے۔ ہٹلر بھی کنکھیوں سے اس کی بے چینی دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ آخر کار کینن برگ نے اپنے حواس مجتمع کئے اور ہٹلر سے احکام منسوخ کرنے کی التجا کی۔ ہٹلر نے مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے کہا: "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ قوانین سب کے لئے یکساں ہیں۔" کینن برگ کا منہ لٹک گیا اور اس نے ایک بار پھر خوشامد کے لہجے میں کہا: "محاذ پر تو کوئی اور بھی جا سکتا ہے لیکن فیوہرر کو مجھ ایسا جانثار شاید ہی ملے۔" ہٹلر نے زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے احکام چاک کر دئے۔ ہم باتوں میں محو تھے کہ نیورا اندر آ گیا۔ اس نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے چلایا:

"ایک سربراہ مملکت کے مذاق ایسے ہوتے تھے! میرے سامنے ہٹلر نے ہمیشہ ایک مدبر کا چہرہ پیش کیا تھا۔ کاش! کوئی مجھے پہلے بتا دیتا!"

چھٹا سال تیرہ چھٹا سال بیت چلا۔ جمہوری رات بھی چھپی ہے۔ ایک رسالے میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا ہے۔ عنوان ہے "سپنڈو کی دیواروں کے پیچھے"۔ مصنف نے میرے بارے میں لکھا ہے: "سپیئر نے اپنے حواس مجتمع رکھے ہیں۔ اس کے سامنے ایک مشن ہے جس کی تفصیلات ہنوز نامعلوم ہیں۔ وہ حالات سے مسلسل برسرِ پیکار ہے۔ اس نے اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سخت ریاضت کی ہے اور باغ میں ٹہلتے ہوئے تازہ ہوا اور سورج کی شعاعوں سے پورا لطف اٹھاتا ہے۔"

امریکی گارڈ کا خیال ہے کہ سب سے خطرناک قیدی میں ہی ہوں۔ اور وہ اس پر خوش ہے کہ وہی "خطرناک قیدی" اس کی تحویل میں ہے۔

آج ۲۰ فروری ۱۹۵۱ء ہے۔

خبر ملی ہے کہ مغربی جرمنی کی افواج اتحادیوں کا ساتھ دیں گی۔ فنک اس خبر پر بہت خوش ہے۔ کہتا ہے: "دیکھا سات برس بعد فیوہرر کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔ اس نے کہا تھا کہ مغرب اور مشرق کا یہ اتحاد غیر حقیقی ہے اور جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔"

اور وہ دن آئے گا جب جرمن، امریکیوں اور انگریزوں کے شانہ بشانہ روسیوں سے لڑیں گے۔" میں یاد دلاتا ہوں کہ فیوہرر کی پیشگوئی مکمل طور پر پوری نہیں ہوئی، کیونکہ مشرقی جرمنی ابھی تک روسیوں کے ساتھ ہے۔

مارچ کا وسط ہے اور موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ آج کل سوچتا ہوں مجھے احساس جرم کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ آخر ہنڈنبرگ سائنس، اینڈ ہونٹ اور مسولینی جیسے بڑے بڑے مدبر بھی ہٹلر سے فریب کھا گئے تھے۔ حالانکہ وہ ایک اچھا سیاست داں تھا۔ نہ اچھا فوجی کمانڈر۔ البتہ انسانی نفسیات پر اس کی نظر گہری تھی۔ جنگی مسائل کو بھی نفسیات کی عینک سے دیکھتا تھا۔ اسی لئے اس نے شعلے اگلنے والی رائفلیں تیار کروائی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ دشمن کے لئے سب سے خوف ناک چیز لپکتے شعلے ہیں نہ کہ دھات کی گولیاں!!

اپریل کا آخری ہفتہ ہے۔ ان دنوں مجھ پر ایک اور موڈ طاری ہے۔ سوچتا رہتا ہوں کہ میں نے ہٹلر کی کبھی پرستش نہ کی تھی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب نومبر ۱۹۴۲ء میں میری گوئرنگ سے لڑائی ہوئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ بجٹ کی رقوم سے زیادہ اسلحہ تیار کیا جائے۔ میں نے کہا تھا کہ جرمن قوم کی خوشحالی متاثر ہوگی۔ گوئرنگ نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور آہستگی سے کہا "معاف کیجیے: میں یقیناً تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن ہم اگر احکامات پر اعتراض کرنے لگے تو یہ سلسلہ رکے گا نہیں بہتر ہے کہ تم بیمار بن جاؤ یا باہر چلے جاؤ۔ اسپین جانے کا بندوبست میں کئے دیتا ہوں:"

جولائی کی چودہ تاریخ ہے۔ مجھے زمانۂ جنگ کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب برلن پر سخت بمباری ہو رہی تھی۔ ہٹلر نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور برلن کی تباہ شدہ عمارتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بمباری ہمارے لئے بہت اچھی ہے۔ ہم برلن از سر نو تعمیر کریں گے۔ اس کے علاوہ انسانوں کے مرنے پر زیادہ غم نہیں کھانا چاہئے۔ تباہی جس قدر زیادہ ہوگی۔ عوام اسی قوت سے جنگ لڑیں گے قوم کو تاریخ کا ذرا بھی شعور نہیں۔ اسے مرنا ہی چاہئے۔ میں اس کی جہالت سے بہت تنگ آچکا ہوں۔ عوام آج میرا نعرہ لگاتے ہیں اور کل کسی اور کا جھنڈا لہرائیں گے۔"

نواں سال

یہ سال ہمارے لئے ایک نیا تجربہ لے کر آیا ہے۔ آج ۶ نومبر ہے اور ہفتہ کا دن ــــ گیارہ بجے کے قریب میں غسل خانے سے واپس آیا اور امریکی چیف گارڈ کو نیوراتھ کی کوٹھری میں جاتے دیکھا۔ اس نے نیوراتھ کو اسٹور روم تک آنے کا اشارہ کیا جو مسلسل علالت کی وجہ سے کمزور نظر آتا تھا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور آہستہ آہستہ امریکی چیف گارڈ کے پیچھے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کے بھاری دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی صدا آئی۔ ایک روسی گارڈ نے کہا: "وہ جا چکا ہے" اور یوں ہم میں سے ایک قیدی آزاد ہو گیا۔ ہاتھ ملائے گئے، نہ الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا۔

اگلے روز اخبارات میں نیوراتھ کے رہا ہونے کی خبر چھپی۔ چانسلر ایڈنائر نے اسے مبارک باد کا تار بھیجا تھا۔

کل ۳۰ مئی تھی۔ ہماری گرفتاری کی دس سالہ "برسی" پر بہت سے اخباری نمائندے باہر کھڑے ڈوئنٹز کی رہائی کا انتظار کرتے رہے۔ اسے دس برس قید ہوئی تھی۔ ہیس، جو ابھی تک عہد رفتہ کو آواز دیتا رہتا ہے۔ کہنے لگا: "صرف چند لوگ! کتنی بدنصیب قوم ہے! لاکھوں کیوں نہ آئے ڈوئنٹز کو خوش آمدید کہنے کے لئے:"

ستمبر کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا ہے۔ آج صبح میں ریڈر کے ساتھ میڈیکل ایڈ کے دفتر میں تھا۔ برطانوی ڈاکٹر نے معمول کے مطابق دوائیاں دیں۔ ریڈر مطالعے کے لئے لائبریری میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر نے اسے پھر بلا بھیجا: "تم سینے میں درد کی شکایت کر رہے تھے نا! آؤ میرے ساتھ طبی معائنے کے لئے:" وہ دونوں ہسپتال کی طرف چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی آہنی دروازہ کھلنے کا شور ہوا میں نے ایک پہرے دار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اس نے اشاروں ہی اشاروں میں کہا کہ وہ جا چکا ہے۔

بعد میں ایک اور پہرے دار نے بتایا کہ ریڈر نے جیل سے باہر نکلنے پر عجیب و غریب ردعمل ظاہر کیا وہ کہہ رہا تھا کہ

میں واپس جیل جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنی لائبریری کسی مناسب شخص کو سونپ آؤں۔ اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

دسواں سال

آج ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء ہے۔ میں نے ایک خط لکھا ہے جو خفیہ ذرائع سے باہر سمگل کیا جائے گا۔ اس میں اپنی رہائی کی خیالی تصویر کھینچی ہے۔ مجھے سات سو مارک دیے جائیں گے جن میں سے میں کپڑے اور فرینکفرٹ جانے کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدوں گا۔ میں نے گھر (ہائیڈل برگ) کا ٹیلی فون نمبر بھی منگوایا ہے۔

ستمبر کی تیس تاریخ، ڈوئنٹز کا قید کا آخری دن ہے۔ میں اکیلا اخروٹ کے درخت کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ میرے قریب آکر بڑی رازداری سے کہتا ہے: "مجھے تم سے ایک اہم بات پوچھنی ہے وہ یہ کہ ہٹلر نے آخری وقت میں جب مجھے اپنا جانشین مقرر کیا، تو میرا نام کس نے پیش کیا تھا؟"

"واقعہ یوں تھا" میں نے جواب دیا۔ "ہٹلر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ڈوئنٹز شمالی علاقوں میں بحیثیت سپہ سالار کی حیثیت سے کیسا کام کر رہا ہے۔ میں نے بتایا تھا کمال بڑی خوبی سے۔ چند گھنٹے بعد ہٹلر نے گوئرنگ کو اپنی جانشینی سے معزول کر دیا اور قرعہ فال تمہارے نام نکل آیا۔"

ڈوئنٹز نے قدرے برہمی سے کہا "میرے گیارہ سال صرف تمہاری وجہ سے ضائع ہوئے۔ بھلا میرا سیاست سے کیا تعلق تھا؟ تمہارے کہنے پر ہٹلر نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس ظالمانہ نتیجے کے بدلے میں تمہاری رہائی کے لئے باہر نکلتے ہی سر توڑ کوشش کروں گا۔"

پھر اس کی رہائی کا لمحہ آن پہنچا۔ سنا ہے اسے خوش آمدید کہنے کے لئے جیل کے دروازے پر ہزاروں افراد جمع تھے پھول کے ہار لئے ہوئے۔

گیارھواں سال

۹ مئی ۱۹۵۶ء ایک ہلکا سا مژدہ لایا ہے۔ جرمن وزیر خارجہ برینٹنگ کا خط سمگل ہو کر مجھ تک پہنچا ہے۔ اس نے لکھا ہے۔ جرمن حکومت میری اور فنک کی رہائی کے لئے کوشش کر رہی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔ کان میں بھنک پڑی ہے کہ ڈائریکٹروں کا خصوصی اجلاس ہو رہا ہے۔ ہمارے جذبات عود کر آئے ہیں۔

آج ہم علی الصبح سیر کو نکلے، فنک ہمارا ساتھ نہ دے سکا۔ شدید بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور وہاں اسے آزادی کی خوشخبری سنائی گئی۔ اس کی رہائی انتہائی رازداری اور خاموشی سے عمل میں آئی۔

بارھواں سال

کیلنڈر ۱۵ اکتوبر کی تاریخ بتا رہا ہے۔ آج کے اخبار میں شہ سرخی کے ساتھ خبر چھپی ہے کہ پہلے مصنوعی سیارے نے زمین کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے ہیں۔ یہ خبر پڑھتے ہی میں نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ بعض باتیں مجھ پر گہرا اثر کرتی ہیں۔ زندگی کے پہلے پچیس برسوں میں مجھے ٹیکنالوجی سے غیر معمولی لگاؤ رہا۔ عظیم جرمن سائنس دان فان براؤن نے مجھے چاند تک سفر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر مضطرب سا ہو گیا تھا اور آج وہی اضطراب لوٹ آیا ہے۔

اس بار کرسمس کا تحفہ سب سے منفرد ہے۔

ایک گارڈ نے خبر دی کہ ڈائریکٹروں کے پاس ہمارے بیرونی رابطے کا ثبوت موجود ہے اور ایک دستاویز پکڑی گئی ہے جس پر شیراخ کے دستخط ہیں۔ اسی روز وہ دستاویز شیراخ کو دکھائی گئی۔ اس نے کہا: "یہ دستخط میرے نہیں۔"

ستمبر ۱۹۵۸ء کی آخری تاریخ ہے۔ آج باغ میں بیج بو رہا تھا کہ تین آدمی میرے قریب سے گزرے۔ میں نے سیلوٹ کیا وہ رک گئے۔ آپس میں کچھ مشورہ کیا اور ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارتے ہوئے تعارف کروایا:

"ڈیوڈ بروس، امریکی سفیر ——— مسٹر سپیئر۔"

سفیر نے فوراً اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا۔ اس نے میرے دوست میکلوئے کا سلام پہنچایا۔ میں اس پیغام کا مفہوم سمجھ گیا۔

یہ ملاقات امریکی چیف گارڈ کی مہربانی سے ممکن ہوئی۔ چاروں ڈائریکٹر دفتر میں تھے۔ وہ سفیر کو سیدھا باغ میں لے آیا۔ ورنہ ڈائریکٹرز کی موجودگی میں ہاتھ ملایا جا سکتا تھا نہ اتنی باتیں ہوتیں۔

تیرھواں سال

دسمبر ۱۹۵۹ء ہے اور کرسمس کا دن۔ لگتا ہے میں خالی کاغذ سامنے رکھے صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ ایک بھی لفظ میری گرفت میں نہیں آ رہا۔

ایک بھی خیال اور ایک بھی جذبہ نہیں!!

میری بیٹی ہلڈ نے مجھے ایک اخبار بھیجا ہے جس میں یہ خبر بڑی نمایاں ہے کہ ہائیڈلبرگ میں اڑھائی ہزار افراد البرٹ سپیئر کی رہائی چاہتے ہیں جن میں پروفیسر، آرٹسٹ، فیکٹری ورکرز، کلرک اور طالب علم شامل ہیں۔ یہ اپیل چار بڑی طاقتوں کے سربراہوں سے کی گئی ہے۔

چودھواں سال

آج ۲۳ نومبر ہے۔ کچھ عرصے سے میں بیمار ہے۔ اس کا قد ۱۷۵ء۱ کلو ہے، مگر وزن کم ہوتے ہوتے صرف ۴۵ کلو رہ گیا ہے۔ پہرے داروں کا خیال ہے کہ بیمار ہونے کے لئے اس نے کپڑے دھونے کا صابن کھا لیا ہے۔

آج میں اس کی کوٹھڑی میں چپکے سے چلا گیا۔ بستر پر لیٹا تھا۔ جیسے ہی میں داخل ہوا وہ بچوں کی طرح بولنے لگا: "کل جب تم باغ میں تھے اور میرے ارد گرد کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنی عینک کے شیشے توڑے اور ایک تیز دھار ٹکڑے سے کلائی کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ تین گھنٹے تک کسی نے نوٹس نہ لیا۔ میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرا خیال تھا کہ مرنے کے لئے مجھے کافی وقت مل جائے گا۔ اور یوں میری مصیبت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ میں بہت خوش تھا اور کمزور بھی۔ لیکن ——— پھر کمبخت روسی آ گئے۔ میری کلائی پر ٹانکے لگا دئے گئے۔" اس نے اپنی کلائی مجھے دکھائی جس پر پٹی بندھی تھی۔

آج مارچ کی انیس تاریخ ہے۔ پچپن برس کا ہو گیا ہوں۔ کبھی فنک میری سالگرہ کا دن یاد رکھا کرتا تھا۔ اس دفعہ صرف پادری نے مجھے مبارک باد دی۔

کچھ دنوں سے میں ڈاکٹر ہنری پکر کی کتاب "ہٹلرز ٹیبل ٹاک" پڑھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر ہنری، بورمن کے نائبوں میں سے تھا۔ اس کتاب میں ہٹلر کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔ اس میں لکھا ہے ہٹلر کانفرنسوں کے دوران کچھ ہوتا تھا اور تنہائی میں کچھ اور! میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ شخص کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ پارٹی کے عہدے داروں کی موجودگی میں وہ اصل حالت میں سامنے آتا۔ اس کی باتوں میں کوئی تسلسل نہ ہوتا تھا اور وہ بار بار چند الفاظ دہرایا کرتا تھا "بنیادی"، "مکمل طور پر" اور "ناقابل تغیر" اس کے محبوب الفاظ تھے "کچل دینا"، "آہنی عزم" اور "شدید قوت" جیسے الفاظ اور "میں ذاتی طور پر اس کا خاتمہ کر دوں گا"، "میں خود اس کے سر میں گولی مار دوں گا" اور "میں اُسے فنس کر دوں گا" جیسے جملے اس کے پسندیدہ جملے تھے۔

پندرھواں سال

آج ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء ہے۔ "ڈائی ولیٹ" میں خبر شائع ہوئی ہے کہ ہٹلر کی ایک اور تصنیف ملی ہے جو عنقریب شائع کی جائے گی۔ ہیس تردید کرتا ہے کہ (MEIN KAMPH) کا کوئی دوسرا حصہ لکھا گیا تھا اور ہٹلر کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے لیکن مجھے یاد پڑتا ہے جب "برغوف" کی تعمیر کے سلسلے میں رقم کم پڑ گئی، تو ہٹلر نے اپنے پبلشر سے ایک کتابچے پر کئی ہزار مارک پیشگی لئے تھے۔ وہ کتابچہ ہٹلر کے لقول خارجہ پالیسی کی مصلحتوں کی وجہ سے اس وقت شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ ہیس کا خیال ہے وہ زیادہ سے زیادہ میمورنڈم قسم کی چیز ہو گی۔

کرسمس اس سال بھی "روکھا پھیکا" گزرا۔ ڈونٹز کی طرف سے بھی مبارک باد موصول نہیں ہوئی۔ رہا ہونے والوں میں سے اب صرف وہی زندہ ہے، کیونکہ فنک گزشتہ مئی میں اور روئیڈر چھ ہفتے پہلے فوت ہو گئے۔ نہ ہمیں بر وقت خبر ہوئی نہ دنیا نے کوئی نوٹس لیا۔

۲۴ جولائی ۱۹۶۱ء

میری پیاری بیٹی ہلڈ ان دنوں امریکہ میں ہے۔ اس کا منگیتر مجھے ملنے آیا ہے، مگر ڈائریکٹروں نے اُسے ہمارے خاندان کا جزو ماننے سے انکار کر دیا ہے، اس لئے میں اس سے ملاقات نہیں کر سکتا تاہم ان کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے انہیں خط لکھ سکوں گا۔

سولھواں سال

آج ۲۵ مارچ ہے۔ کچھ دن ہوئے میرا ایک دوست پہرے دار میرے لئے بھی ٹرانسسٹر لایا تھا۔ میں اوروں سے چھپ چھپا کر اسے سنتا ہوں۔ اس طرح باہر کی دنیا سے برسوں کا ٹوٹا رشتہ پھر سے جڑ گیا ہے خبریں، موسیقی، گیت، معلوماتی پروگرام! واہ! میں اپنی کھوئی ہوئی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔

سترھواں سال

نومبر آ گیا۔ سردیاں پھر شباب پر ہیں ہلڈ نے چانسلر ولی برانٹ سے ملاقات کی ہے۔ برانٹ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری رہائی کے سلسلے میں اقدامات کرے گا۔

اٹھارھواں سال

کیلنڈر پر نئے سال کا پہلا ہفتہ ہے اگر مجھے اپنی قید کے آخر تک بھی اسی جیل میں رہنا ہو، تو صرف نو سو ننانوے دن باقی ہیں۔ میں نے اس خوشی میں اپنی دعوت کی کہ ہزاروں دنوں کے چکر سے نکل آیا۔

۳۰ جنوری ماضی کی یادگار ہے۔ اکتیس سال پہلے آج کے دن ہٹلر نے اقتدار سنبھالا تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے گھر میں ریڈیو سے اس تاریخی پریڈ پر رواں تبصرہ سُنا تھا جو اسی روز شہر میں ہوئی تھی۔ تب سوچا بھی نہ تھا کہ میں بھی نئے عہد کے اہم لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

چند ہی ماہ بعد مجھے ہٹلر سے ملنے کا اتفاق ہوا اور پھر ساری زندگی ہی بدل گئی۔ اب حساب لگاتا ہوں کہ ہٹلر کی رفاقت سے کیا ملا؟ بس یہی کہ آدھی زندگی جیل میں کٹی اور جنگی قیدی کی حیثیت سے دنیا بھر میں رُسوا ہوا۔

اُنیسواں سال

آج ۲۸ اپریل ۱۹۶۵ء ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ بیس سال پہلے جا رہے ہیں۔ ہٹلر اپنی اور جرمنی کی تباہی کا ذمہ دار تھا ہی، لیکن اس کے ساتھی بھی اس سے کچھ کم نہ تھے۔ جنگ کے آخری دنوں تک وہ خیالی فوجوں کے ساتھ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے منصوبے دُہراتے رہے، رابرٹ لے کہتا: "ماؤ نیوہیرر، پارٹی کے تمام کارکن لڑتے مرنے پر آمادہ ہیں۔ اگر فوج ہتھیار بھی ڈال دے تو بھی وہ شیروں کی طرح لڑیں گے۔"

اسی طرح جنرل کمل اور ڈسار تھے جنہوں نے ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں چار انجنوں والا جیٹ ہوائی جہاز تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایسے بیسیوں جہازوں کو بڑے بڑے امریکی شہروں پر اس وقت تک بمباری کرنا تھی جب تک امریکہ گھٹنے نہ ٹیک دیتا۔ کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ہٹلر کے بنکر میں جا کر کہتا، ہم جنگ ہار چکے اور چار ہفتوں میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

بیسواں سال

دسمبر کا پہلا ہفتہ گزر گیا۔ میرے بچوں کی تعلیم کے لئے جو اکاؤنٹ کھولا گیا تھا اس میں چند ہزار مارک موجود ہیں۔ میرے دوستوں، بہی خواہوں اور پرستاروں نے اس عرصے میں کم و بیش ڈیڑھ لاکھ مارک جمع کرائے ہیں۔ میں نے اس اکاؤنٹ میں سے، اپنی بیوی کے لئے ایک گھڑی خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔

نئے سال کا پہلا دن ہے۔ آدھی رات کے وقت میں کوٹھڑی میں پڑے ہوئے سٹول پر کھڑا ہو گیا اور کوٹھڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ آسمان پر نئے سال کی آتشبازی رنگ بکھیر رہی تھی۔ ایسی کوئی رات اب جیل میں نہیں آئے گی۔

رہائی کا دن

آخر رہائی کا دن آن پہنچا۔ سہ پہر ہی سے ہیس اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ شیرخ اور میری رہائی کے بعد وہ اکیلا رہ جائے گا۔ آخری لمحے وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق ہوئی۔ میں نے رات کا کھانا کھایا، مگر ہیس نے کھانے سے انکار کر دیا۔

مجھے ساڑھے گیارہ بجے کے بعد بگ فور ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک پرانی جیکٹ، پتلون، ٹائی اور بنیان مجھے دی گئی جو میں نے انیس برس پیشتر سپینڈو جیل کے حکام کو دی تھی۔ ڈائرکٹروں نے دوستانہ جملے ادا کئے اور وہ مارک لوٹا دئے جو گرفتاری کے وقت مئی ۱۹۴۵ء میں میرے پاس تھے لیکن اب یہ کرنسی منسوخ ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کاغذ کا ایک پرزہ دیا گیا جس پر لکھا تھا،

"مسٹر البرٹ سپیئر ہوائی جہاز کے ذریعے برلن سے باہر جا سکتا ہے۔ یہ حکم ۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء تک کارآمد ہے۔ دستخط کمشنر پولیس ڈیپارٹمنٹ"

ہیس نے الوداعی ملاقات سے گریز کیا۔ بارہ بجنے میں ایک منٹ پر ڈائرکٹر مجھے جیل کے دروازے تک لائے ٹھیک بارہ بجے مجھے رہا کر دیا گیا۔ چند منٹ بعد شیرخ کی باری تھی۔ میں جیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی دروازے سے ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو اندر داخل ہوا تھا۔ باہر میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔

★★

الیغوز کے پہاڑی علاقہ میں شاید ہی کوئی ایسا بچہ، بوڑھا اور جوان ہوگا جس نے کرد شکاری ڈیوت کا نام نہ سنا ہو۔ وہ پرانے شاہ بلوط کی طرح مضبوط اور چیل کی طرح دوربین تھا اس کا سر اور سینہ کسی بوڑھے شیر کی طرح بڑا اور طاقتور تھا آج سے پچاس سال پہلے وہ ترکی سے بھاگ کر ارارت کے پہاڑی علاقہ میں آکر بس گیا۔

اب یہ اس علاقہ کی ایک روایت بن گئی تھی کہ جو شخص بھی اس علاقہ میں شکار کھیلنے کے لئے آمادہ سب سے پہلے ڈیوت کے ہاں حاضری دیتا۔ اس سے صلاح کرتا اور جب شکاری شکار سے واپس لوٹتے تو.... اس بوڑھے اور جہاں دیدہ.... شکاری سے گئے وقتوں کی کہانیاں سنتے۔ یہ کہانی بھی انہی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ جو زندگی کی ایک سچی داستان ہے جو زندگی کا ایک دھڑکتا ہوا زندہ ٹکڑا ہے

میں بھیڑوں کا گلہ لے کر صبح کے وقت پہاڑوں میں چل جاتا تھا اور سارا دن گلہ چراتا رہتا اور اپنی محبوبہ کی یاد میں آہیں بھرتا جسے ایک جاگیردار یوسف بیگ نے مجھ سے چھین کر اپنے بیٹے کو دے دیا تھا۔ میں اپنی یادوں میں کھویا رہتا۔ آنسو بہاتا۔ اور

زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ یہ بھیڑیں میرا سہارا تھیں۔ ایک سچا گڈریا مویشیوں اور جانوروں سے تہہ دل کے ساتھ پیار کرتا ہے حتیٰ کہ وہ کسی پیارے کتے، کسی بھیڑ، کسی بیل کی موت پر اتنا ہی غم محسوس کرتا ہے جتنا اپنے کسی عزیز کی موت پر۔ میں آج بھی اس زمانہ کی ساتھی اپنی لنگڑی ختنکا کی موت پر آنسو بہایا کرتا ہوں اور جو کہانی میں اس وقت سنانے لگا ہوں، یہ اسی ریچھنی ختنکا کی کہانی ہے۔

ایک دفعہ میں آرتوس کی پہاڑیوں میں شکار کھیل رہا تھا کہ وہاں میں نے کئی ریچھ مارے۔ ایک دو ریچھوں نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بس میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ گیا۔ ریچھوں کی بھی عجیب نفسیات ہے۔ ایک ریچھ شکاری سے ڈر جاتا ہے۔ مگر ریچھنی ۔ خدا کی پناہ ... اس میں ممتا کا جذبہ اتنا قوی ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے بچوں کو بچانے کے لئے برستی ہوئی گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو سکتی ہے۔

اس دفعہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں ایک ریچھ کا نشانہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک ریچھنی چٹانوں سے نمودار ہوئی۔ وہ خرخراتی ہوئی بڑے غضبناک انداز میں میری طرف لپکی۔ وہ کسی طرح مجھے مارنا چاہتی تھی۔ جب اس سے کچھ نہ بن پڑا تو اس نے اپنے ایک بچہ کو اٹھا کر میرے منہ پر دے مارا۔

میں ریچھنی کی اس غیر معمولی حرکت پر حیران ہو گیا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے گولی چلائی اور اپنے پیروں پر گرے ہوئے ریچھ کے بچے کو اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ریچھ کے اس بچے کو پالنا پوسنا مشکل تھا۔ نہ وہ ہم سے دودھ پیتا تھا نہ روٹی کھاتا تھا۔ میں نے اپنی ایک پالتو کتیا کو ریچھ کے اس بچے کی ماں بنا دیا۔ نتیجہ میری توقعات کے عین مطابق نکلا اور کتیا کے بچوں کے ساتھ یہ چھوٹی ریچھنی بھی پرورش پانے لگی گاؤں کے سب بچے اس ریچھنی کے ساتھ گھل مل گئے اور انہوں نے ہی اسے ختنکا کا نام دیا۔ اگست کے مہینے میں جب پھل پکنے لگے تو یہ ریچھنی سارا دن درختوں پر چڑھی رہتی اور پھل کھایا کرتی۔ ایک دن میں نے اسے درخت پر بیٹھے دیکھا تو اسے ڈرانے کے لئے درخت کو ہلانا شروع کر دیا ختنکا کسی نازک سی ٹہنی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور وہ زمین پر آن گری۔ اور یوں اس کی ایک ٹانگ میں خرابی واقع ہوئی اور وہ لنگڑی ہو گئی۔ اس کی یہ لنگڑاہٹ ساری عمر باقی رہی۔

اپنی غلطی کی وجہ سے میں ختنکا کا بہت خیال رکھنے لگا اور مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی۔ موسم خزاں تک ختنکا ایک بچھڑے جتنی بڑی ہو گئی۔ اور میں جب شکار پر جاتا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ختنکا اتنی سیانی تھی کہ وہ جلد ہی میری معاون بن گئی اور شکار میں میرے ساتھ یوں حصہ لیتی جیسے کوئی انسان ہو۔ وہ میرے بعض الفاظ کو بھی سمجھ گئی۔ جب میں اسے "بورخ" کہتا تو وہ سمجھ جاتی کہ میں اب گولی چلانے والا ہوں۔ اس لئے اسے مجھ سے دور ہو کر کھڑا ہونا چاہیئے۔ وہ میرے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ حیوانی جبلت نے بندوق سے ڈرنا سکھا دیا تھا۔ اس لئے وہ اس سے پرے رہا کرتی تھی۔

ایک سال میں ختنکا ایک جسیم اور قوی ریچھنی بن گئی۔ اس عجیب و غریب ریچھنی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کئی امراء اس کے گاہک بن گئے۔ کئی لوگوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ان کے پاس فروخت نہ کی تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے اور میری تمام کوششوں کے باوجود ایسا ہوا۔ یوسف بیگ کے کارندے ایک رات ختنکا کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ میں بے بس تھا۔ اتنے آدمیوں کا مقابلہ کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔

ختنکا کے جانے سے سارا گاؤں اداس ہو گیا۔

ایک رات اچانک میں نے اپنے چہرے پر کسی چیز کا گرم لمس محسوس کیا۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ ختنکا تھی۔ وہ زخمی تھی۔ میں نے فوراً اپنا ایک پرانا کرتہ جلا کر اس کی راکھ ختنکا کے زخموں پر باندھ دی۔ میں صبح ہوتے ہی ختنکا کو ساتھ لے کر پہاڑی علاقہ میں چلا گیا۔ میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ ختنکا کا زخمی ہونا بے معنی نہ تھا۔ اور واقعی چند دنوں کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ ختنکا نے یوسف بیگ کے آدمیوں کو زخمی کر دیا تھا اور انہی کی گولی سے وہ خود بھی زخمی ہوئی تھی۔

جب یوسف بیگ کا قبیلہ موسم بہار میں واپس اپنے

علاقہ میں چلا گیا تو میں ختنکا کو ساتھ لے کر گاؤں واپس آ گیا گاؤں والوں نے بڑی گرم جوشی سے ختنکا کا استقبال کیا۔

اس عرصے میں ختنکا بے چین رہنے لگی۔ وہ فطرت کی آواز سے مغلوب ہو رہی تھی۔ میں جان چکا تھا کہ ختنکا اب اپنے لوگوں میں واپس جانا چاہتی ہے۔ وہ ماں بننے کی خواہش مند تھی فطری تقاضے اتنے قوی ہوتے ہیں کہ ان سے مغلوب ہونا ہی پڑتا ہے۔ اور ایک دن ختنکا میرے سامنے ریچھوں میں چلی گئی میں نے اس کو جانے دیا۔ کیونکہ اس میں اس کی بھلائی تھی۔ میں بھلا اس کے فطری تقاضوں پر پابندیاں لگانے والا کون تھا

آہستہ آہستہ میں ختنکا کو بھول گیا۔ میں حسب معمول شکار پر جاتا۔ کبھی کبھی ختنکا کا خیال ذہن میں آتا تو۔ مسکرا اٹھتا۔ اس زمانہ میں میں ایک دن جنگل میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا تھک کر ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا۔ میری آنکھ لگ گئی اور جب میں جاگا تو میری بندوق غائب تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ اسی وقت سامنے سے ایک بڑا ریچھ آتے ہوئے دکھائی دیا۔ میں نے جان بچانے کے لئے درخت پر چڑھنا چاہا مگر ریچھ کو غور سے دیکھا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا یہ ننگڑی ختنکا تھی۔

میں بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ ختنکا مجھے ابھی تک نہ بھولی تھی۔ اس نے ہی بندوق کو غائب کیا تھا۔ تاکہ میں کہیں دھوکے میں اس کو نشانہ نہ بنا دوں۔ ختنکا بندوق اٹھا لائی اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگی۔ اس کی حرکتوں سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھے ایک غار کے اندر لے گئی۔ پھر غار کے ادھر اوندھی لیٹ کر نیچے دیکھنے لگی۔ میں نے نیچے دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ وہاں گائے جتنا بڑا چیتا لیٹا ہوا تھا۔ یہاں سے اس چیتے کا نشانہ بنانا آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ اس کا آدھا جسم میری نگاہوں کے سامنے تھا اور آدھا غار کے اندر تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے چیتے کے سر کا نشانہ بنایا۔ گولی عین نشانے پر لگی اور چیتا تڑپ کر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے اس وقت ختنکا کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی روشنی دیکھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس چیتے کو میرے ہاتھوں سے مروا کر خوش ہوئی تھی۔ آخر کیوں؟ شاید اس لئے کہ اس چیتے نے اس کے نر ریچھ کو مار دیا تھا یا ختنکا کے کسی بچے کو چٹ کر گیا تھا۔ کیا چیتا تھا وہ۔ پچھلے بیس سالوں میں اتنا بڑا چیتا کسی نے شکار نہیں کیا تھا۔ جب میں چیتے کی کھال اتار رہا تھا تو دل میں سوچ رہا تھا کہ میں کھال یوسف بیگ کو تحفہ میں بھیج کر ختنکا کی جان بخشی کرا لوں گا۔ اور ختنکا کو اپنے ساتھ پھر گاؤں میں لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں خوشی سے جھوم رہا تھا کہ میں نے اچانک اپنے پیچھے ختنکا کی خرخراہٹ سنی۔ میری ساری خوشی کافور ہو گئی میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ختنکا چیتے کے غار میں پڑی ہوئی تازہ ہڈیوں کو جمع کر رہی تھی۔ یہ ہڈیاں اور جسم کے بچے کھچے حصے ریچھ کے بچوں کے تھے۔ میں سارا ماجرا سمجھ گیا کہ بے چاری ختنکا کس بدنصیبی کا شکار ہوئی تھی۔ اس چیتے نے اس کے بچوں کو ہڑپ کر لیا تھا۔ ختنکا میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس چیتے سے انتقام لے سکتی۔ اس لئے اس نے میرے ہاتھوں چیتے کو ہلاک کرا کر انتقام لے لیا۔

ختنکا نے ایک ایک ہڈی ایک ایک ریزہ کو اکٹھا کیا۔ اور اسے آہستہ آہستہ اٹھا کر غار سے باہر لے گئی۔ اور اپنے بچوں کی ہڈیوں کو سوکھی گھاس سے ڈھانپ دیا۔

غروب آفتاب کے وقت جب میں اور ختنکا گاؤں کے قریب پہنچے تو ختنکا رک گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے گلے سے لگایا اور میرا دل ننگڑی ختنکا کے دکھ میں آنسو بہانے لگا۔ میں نے اپنے آنسو خشک کئے۔ ختنکا کو پھر گلے سے لگایا اور گاؤں کی طرف چل دیا۔

جب تک میں ختنکا کو نظر آتا رہا وہ مجھے اونچے ٹیلہ پر کھڑی ہوئی دیکھتی رہی اور واپس چلی گئی۔

اس کے بعد میری ختنکا سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اب تو یادیں بھی دھندلانے لگی ہیں۔ مگر دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں بھلایا ایک میری وہ محبوبہ جو مجھ سے بچھڑ گئی اور دوسری یہ ننگڑی ختنکا جس نے عجیب طریقہ سے اپنے بچوں کی موت کا انتقام لیا تھا۔

۱۹۶۷ء کے اوائل میں مصر پر افسردگی طاری تھی۔ ملک دیوالیہ ہو رہا تھا۔ ترقیاتی منصوبے کے لئے مالی وسائل ناپید تھے۔ مئی ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ناصر نے سپریم ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس بلایا جس میں عبدالحکیم عامر، زکریا محی الدین، حسین الشافعی، علی صبری، وزیر اعظم صدقی سلیمان اور میں نے شرکت کی۔ ناصر نے کہا، اب جب کہ ہم نے سینائی میں فوجیں مرتکز کر دی ہیں جنگ کے امکانات پچاس فیصد ہیں۔ لیکن اگر ہم آبنائے طیران کی ناکہ بندی کر دیں، تو جنگ سو فیصد یقینی ہو جائے گی۔"

ہم سب جانتے تھے کہ ہماری جنگی تیاریاں کافی بہتر تھیں۔ یہ اکتوبر ۷۳ء کی جنگ کے مقابلے میں کہیں بہتر تھیں۔ ناصر نے ہم سے رائے طلب کی۔ تو ہم نے متفقہ طور پر کہا کہ آبنائے طیران کی ناکہ بندی کر دینی چاہئے۔ اگرچہ ہمیں یہ

ہم اسرائیل سے لڑے

از

انور سادات

احساس تھا کہ ایسی صورت میں جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔

وزیر جنگ، روس سے واپس آگئے۔ وہ اسلحے کی فراہمی کا معاہدہ تو کر آئے۔ مگر روسیوں نے حسبِ عادت اسلحہ بھیجنے کے اوقات متعین نہ کئے۔ حسبِ معمول روسی لیڈر صورتِ حال کو پیچیدہ بنانا چاہتے تھے۔ ہمیں کس وقت پر اسلحہ ملنا چاہیے، اس کا فیصلہ انھوں نے اپنی مرضی پر موقوف رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ حالات کی نبض پر اُن کا ہاتھ رہے —— بعد میں میں نے روسی فوجی ماہرین کو مصر سے نکال باہر کرنے کا جو فیصلہ کیا اس کی تہہ میں لیت و لعل پر مبنی روسیوں کا یہی رویہ کار فرما تھا۔

۲ جون ۱۹۶۷ء کو اتوار کے دن ناصر نے صدر اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے دفاعی جنگی منصوبے کی توثیق کر دی۔ مجھے یاد ہے ناصر نے فضائیہ کے سربراہ صدقی محمود سے کہا کہ ایئر فورس کو پہلا وار سہنا پڑے گا۔ صدقی محمود پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اور پھر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے: "جناب، یہ بات ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہمیں اندازاً دس فیصد سے زیادہ نقصان اٹھانا نہیں پڑے گا۔"

منصوبے تبدیل ہو گئے

۵ جون تباہی اور بربادی کا پیغام لے کر آیا۔ اس دوران جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا، وہ جنگی منصوبہ جس کی ناصر نے توثیق کی تھی عبدالحکیم عامر کے ہاتھوں تبدیل ہو چکا تھا۔ پیر ۵ جون کی صبح عامر تمام کمانڈروں سمیت ایک طیارے میں سوار ہو کر سینائی کے فضائی معائنے پر نکلا —— فوجی ضابطہ تھا کہ جب کمانڈر انچیف محوِ پرواز ہو، تو سام میزائل اور طیارہ شکن توپیں خاموش رہیں۔ اس معائنے کے دوران اسرائیل نے ہمارے تمام ہوائی اڈوں پر حملہ کر دیا اور سارے طیارے زمین ہی پر تباہ کر دیے۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عامر کے فضائی معائنے کے دوران جنگ چھڑی بھی اور ختم بھی ہو گئی۔

مجھے تباہی کا علم کیسے ہوا؟

۵ جون ۶۷ء کی صبح ایک نشریے سے مجھے پتہ چلا کہ اسرائیل نے اچانک حملہ کر دیا ہے۔ میں نے دل میں سوچا، ٹھیک ہے، اسرائیلیوں کو ایسا سبق سکھایا جائے گا جسے وہ کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ مجھے اپنے ملک کی جنگی صلاحیت پر کامل اعتماد تھا۔ چنانچہ میں نے شیو بنائی، لباس بدلا اور پھر گاڑی نکال کر کمانڈ ہیڈ کوارٹر کا رُخ کیا۔

ہمارے پاس اسلحہ کافی سے زیادہ تھا اور جنگی منصوبہ شاندار، اس لیے فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ روسی سفیر کی کار میرے آگے جا رہی تھی۔ میں نے سوچا، وہ ہمیں مبارکباد دینے آیا ہے۔ میں تقریباً گیارہ بجے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ جاتے ہی پوچھا: "کیا خبر ہے؟" ایک افسر بول اٹھا: "ہم نے دشمن کے چالیس طیارے مار گرائے ہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا: "شاندار!"

میں عامر کے دفتر میں داخل ہوا، تو اُسے کمرے کے وسط میں خلا میں گھورتے ہوئے کھڑے پایا۔ میں نے "السلام علیکم" کہا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے فوری احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے دوسرے حضرات سے استفسار کیا، تو پتہ چلا کہ ہماری فضائیہ مکمل طور پر زمین ہی پر تباہ ہو گئی ہے۔

۵ جون کی شام میں نے عامر کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے خشک اور چڑچڑے لہجے میں بتایا کہ اسرائیلی العریش پر قابض ہو چکے ہیں۔ یہ خبر میرے لیے صدمے سے کم نہ تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں وقت اور فاصلے کے احساس سے عاری ہو کر اِدھر اُدھر بے مقصد ٹہلتا رہا۔

ناصر کی پریشانی

۸ جون کو ناصر نے مجھے بتایا کہ ہمارا چوتھا بکتر بند ڈویژن جو ہمارا بہترین ڈویژن تھا اور جسے عبدالحکیم عامر کے حکم پر نہر سویز کے مشرق میں بھیج دیا گیا تھا، پورے کا پورا تباہ ہو گیا ہے۔ اس سے ہماری مسلح افواج کی بدقسمتی پر مُہرِ تصدیق ثبت ہو گئی۔

۹ جون کو جنرل کمانڈ کی طرف سے جاری کردہ ایک نشریہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ نشریے میں خبر کی

گئی تھی کہ اسرائیلی نہر سویز کے مغربی کنارے پر آ پہنچے ہیں۔ جنرل کماندڑ نے دنیا سے اپیل کی تھی کہ وہ اس حرکت کا نوٹس لے۔

ان دنوں میں قومی اسمبلی کا اسپیکر تھا۔ میں نے اسمبلی کے سکریٹری جنرل کو ہدایت کی کہ وہ فوجی پس منظر رکھنے والے تمام ارکان سے کہیں کہ وہ ہر حلقے میں دو دو سو افراد جمع کریں..... اور انھیں ایسے مقامات پر اسرائیلیوں سے لڑنے کے لئے تیار کریں جن کا تعین میں کروں گا۔ اس کے بعد میں ناصر کے پاس گیا۔ وہ منشیۃ البکری والی رہائش گاہ میں اپنے دفتر میں ملا۔

میں نے کہا: "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ پریشان ہوں۔ آپ کس کے انتظار میں ہیں؟ جمال، ہمیں آپ کو بالائی مصر بھیجنا پڑے گا۔ وہی ایسا خطہ ہے جہاں سے ہم مزاحمت جاری رکھ سکتے ہیں۔"

ناصر میری طرف مسلسل دیکھتا رہا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ آخر اس نے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا: "تشریف رکھو، انوار! براہِ کرم تشریف رکھو۔"

اس نے کہا: "انوار، تمہاری حالت پر ترس آتا ہے تم بھی عوام الناس ہی سے ہو۔ کیا تم نے نشریے پر واقعی یقین کرلیا؟ دیکھو! میں جانتا ہوں کہ یہ نشریے کیسے جاری ہورہے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے یہودیوں نے نہر سویز ہرگز پار نہیں کی۔

تمہیں جنگ لڑنے کی ضرورت نہیں۔ جنگ تو ختم ہوچکی۔ امریکہ اور اسرائیل نے اپنے تیار کردہ ناٹک کو بڑی احتیاط سے عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہودی نہر سویز کے مشرقی کنارے پر تو آ پہنچے ہیں، مگر بوجوہ نہر کو عبور نہیں کریں گے ____ سب سے اہم سبب یہ ہے کہ وہ گنجان آباد علاقے میں اترنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیں گے۔ تاہم وہ جتنا ہمیں رسوا کر چکے ہیں اس سے زیادہ رسوا کرنے کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں؟ تمہیں میرے پاس ٹھہرو جب تک کہ وہ بیان مکمل نہ کرلوں۔ جو میں آج شام نشر کر رہا ہوں۔"

جس لمحے ناصر نے اپنا مختصر سا بیان ختم کیا، لوگ قاہرہ کی سڑکوں پر یوں نکل آئے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ وہ ناصر سے استعفا واپس لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا پہیہ واپس گھوم گیا تھا۔ اور ایک بڑی طاقت کی غلامی کا جوا گردن کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب برطانیہ کے بجائے امریکہ کی سامراجی طاقت کا سامنا تھا۔ ناصر کی تقریر سے جو الجھاؤ یا خلا پیدا ہوا اس نے عوام پر ایک گہرا اثر چھوڑا ان میں حبِ وطن کا جذبہ ابھرا۔ اور استرداد کی صلاحیت عود کر آئی ____ جو صدیوں سے اُن کا سب سے کارآمد ہتھیار ہے۔

۵ جون کے واقعات سے ناصر کے جسم و روح پر ایک مہلک ضرب لگی۔ اور وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ جو لوگ ناصر کو قریب سے جانتے تھے انھیں محسوس ہوا کہ وہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کو فوت نہیں ہوا۔ بلکہ ۵ جون ۱۹۶۷ء کو جنگ چھڑنے کے ایک ہی گھنٹہ بعد اس کی روح مرچکی تھی۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد بڑے عرصے تک ناصر ایک زندہ لاش دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر موت کی زردی نمایاں تھی۔ اگرچہ اب بھی وہ چلتا پھرتا، سنتا اور باتیں کرتا تھا۔

ناصر کا ورثہ

۱۹۶۷ء کی شکست سے لے کر اپنی رحلت تک ناصر کسی نہ کسی بیماری کی گرفت میں رہا۔ ۵ جون ہی کو اس کا ذیابیطس کا مرض شدت اختیار کر گیا۔ اور پھر نومبر ۶۷ء تک اس کا غلبہ رہا۔

یہ عرصہ اس کی صحت کے لئے بڑا مہلک ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد وہ موت تک کسی نہ کسی مرض کا شکار رہا۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں ناصر نے قاہرہ میں عرب سربراہی کانفرنس بلائی جس کا مقصد شاہ حسین کی فوجوں اور فلسطینی فوجوں کے باہمی خونریز تصادم کو رکوانا تھا۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی پیٹی میں ریوالور لگا کر اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ وہ مسلسل شاہ حسین پر حملے کرتے رہے۔ انھوں

نے اسے پاگل خانے بھجوانے کا مشورہ دیا۔ میں نے بمشکل ان کے جوش و غضب کو ٹھنڈا کیا۔

اس کانفرنس نے ناصر کے اعصابی نظام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ قذافی اور عرفات کے رویّے نے اسے انتہائی صدمہ پہنچایا۔ کانفرنس ختم ہو گئی اور ناصر عرب بادشاہوں اور سربراہوں کو الوداع کہتے ہوئے الجھ گیا۔

جب وہ شاہ فیصل کو الوداع کہہ چکا، تو تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اسے چلنا تک دشوار ہو رہا تھا۔ امیر کویت اپنے طیارے میں سوار ہوئے، ناصر بے حس و حرکت طیارے کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ اس نے وہیں گاڑی منگوائی اور گھر چلا گیا۔

میں سونے ہی کو تھا کہ صدر ناصر کے گھر سے بلاوا آیا جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ڈاکٹروں میں گھرا بستر پر دراز تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک گھنٹہ پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

بیچارے ناصر — وہ زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں کا تجربہ کیے بغیر ہی دنیا سے سدھار گئے

ان کی ساری زندگی نفرتوں اور کدورتوں میں ہی گذری۔ اور چونکہ وہ ہر آدمی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لیے ہر وقت انھیں تشویش اور پریشانی لاحق رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قریب ترین ساتھیوں اور پوری قوم کے لئے بھی ورثہ میں صرف نفرت اور عداوت ہی چھوڑ سکے۔

میں نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ناصر کی جگہ صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ اور چار مہینوں کے اندر ہی میں نے امن کے لیے اپنی پہلی مہم شروع کر دی تھی۔ اس مہم کا لب لباب یہ تھا کہ اسرائیل سینائی میں (جس پر اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا۔) دو دن تک اپنی فوجیں پیچھے ہٹالے تو میں نہر سویز کو کھول دوں گا۔ اور نہر کے مشرقی کنارے پر اپنی فوجیں لانے کے بعد نیک نیتی کے ساتھ التوائے جنگ کا اعلان کر دوں گا۔ میری عملی تجاویز کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ لیکن امریکہ نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اور یہ تجویز رکھی کہ اس کے وزیر خارجہ ولیم راجرز ہم سے ملنے آئیں۔

رچرڈسن کی پیشین گوئی

جب امریکی سفیر مسٹر ایلینٹ رچرڈسن ۱۹۷۰ کے اواخر میں واپس امریکہ گیا، تو اس نے حکومت کو رپورٹ پیش کی کہ سادات پانچ چھ ہفتے سے زیادہ برسرِ اقتدار نہیں رہ سکے گا۔ ادھر مصر میں سیاست میں گھسے ہوئے روسی ایجنٹ اقتدار کی جدّوجہد میں مصروف ہو گئے۔ جب میں نے نجی ملکیت پر سے پابندی ہٹائی تو یہ عناصر کھل کر سامنے آگئے۔

فروری ۱۹۷۱ء میں میں نے روس کا دورہ کیا۔ عہدۂ صدارت پر فائز ہونے کے بعد سے یہ میرا پہلا دورۂ روس تھا۔ اس کا مقصد ناصر سے کیے گئے معاہدے کے دوسرے حصّے پر عمل درآمد کرانا تھا جس میں دفاعی سام میزائلوں کی ترسیل اور جنگ کے نقصانات کی تلافی شامل تھی۔

مذاکرات کی میز پر میں نے روسی لیڈروں سے کہا "ہم نہیں چاہتے کہ روسی سپاہی ہمارے لئے جنگ لڑیں ہم روس اور امریکہ کو متصادم دیکھنا بھی نہیں چاہتے"۔ روسی وزیر اعظم کوسیجن اور وزیر دفاع مارشل آندرے گریچکو سے میری تند و ترش باتیں بھی ہوئیں۔ آخر بریژنیف نے مداخلت کی اور کہا کہ روس مصر کو کسی قسم کے ہتھیار فراہم کرے گا۔ یہ وہ ہتھیار نہ تھے جن کا ہم نے مطالبہ کیا تھا، مگر ہم انھیں بھی لینے کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ ہمیں اسلحے کی شدید ضرورت تھی۔

مذاکرات کے درمیان روسیوں نے ہمیں میزائلوں سے مسلح طیاروں اور ان کے لئے مصری عملے کو تربیت دینے کی پیشکش کی، مگر شرط یہ تھی کہ انھیں روس سے پیشگی اجازت لے کر استعمال کیا جا سکے گا۔ یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا: "مصری عوام یا صدر کے سوا کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کہ وہ مصری معاملات میں فیصلہ کن کردار ادا کرے۔ مجھے ایسے طیاروں کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اس پہ بریژنیف مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا:

چاروں مگ ۲۵ آپ کے پاس ہیں۔ آپ کا اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے کہا: "وہ بہترین ہیں۔" "میں آپ کو تیس مگ ۲۵ بمبار طیارے بھیج دوں گا۔" پوڈ گورنی نے کہا۔

میں نے کہا: "ایسی صورت میں میں اپنے تند و تلخ الفاظ واپس لیتا ہوں بشرطیکہ ان طیاروں کے پائلٹ مجھ سے احکام وصول کریں۔"

طیارے زمین پر کھڑے رہے

بریژنیف نے جن طیاروں کا وعدہ کیا تھا وہ ہمیں کبھی نہ بھیجے گئے۔ میں نے بھی حکم دے دیا کہ چاروں مگ ۲۵ جنھیں روسی پائلٹ اُڑاتے تھے، زمین پر کھڑے رہیں۔

میں نے تمام صورتِ حال سپریم ایگزیکٹیو کمیٹی کے سامنے پیش کی اور کہا: "میں نے ان طیاروں کو پرواز سے روک دیا ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ان کے استعمال سے پہلے روسی اجازت کی ذلّت آمیز شرط وابستہ ہے۔"

میرے سیاسی مخالفین نے کچھ بھی نہ کہا، مگر وہ غصّے سے کھولتے ہوئے اجلاس سے اٹھے۔ انھیں شدید صدمہ تھا کہ میں نے روسی شرائط مسترد کر دی ہیں۔

روس نے اپریل ۱۹۷۱ء میں سام میزائلوں کی بیٹریاں بھیج دیں۔ کچھ اور اسلحہ بھی بھیجا گیا۔ مگر باقی ماندہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ تک ہمیں موصول نہ ہوا۔ بریژنیف نے بمبار اور لڑاکا طیارے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوا۔

اس طریقے سے روسی زعما ہمارے ہاتھ باندھ دیتے تھے تاکہ ہم اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔ ۷ مارچ کو ایک عوامی اجتماع میں میں نے اعلان کر دیا کہ ہم جنگ بندی کی قیود کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور یہ کہ راجرز پلان ختم ہو گیا ہے۔

مئی ۱۹۷۱ء کے آخر میں پوڈ گورنی مصر کے دورے پر آیا۔ اس سے پہلے مصر میں سب سے بڑا روسی مُہرہ، بلکہ تمام روسی مہرے جیل بھیج دیے گئے تھے۔ پوڈ گورنی نے روس اور مصر کے مابین دوستی کے معاہدے کی فوری ضرورت پر زور دیا۔ مجھے اس پہ کوئی اعتراض تو نہ تھا۔ مگر میں نے ان سے کہا کہ معاہدے کے لیے یہ وقت غلط ہے۔ پوڈ گورنی صاحب کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب انھوں نے پولٹ بیورو کی خواہش کا ذکر کر کے فوری معاہدے پر اصرار کیا، تو میں بھی رضامند ہو گیا۔ تاکہ روسی لیڈروں کے خدشات کم ہو سکیں۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد پوڈ گورنی نے کہا: "مجھے چار دن کی مہلت دیجیے۔ جوابی ہتھیاروں سمیت وہ تمام اسلحہ جس کا آپ نے مطالبہ کیا ہے آپ کو مل جائے گا۔"

میں ستمبر تک پوڈ گورنی کے وعدے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ ستمبر کے آخر میں روسیوں نے پیغام بھیجا کہ ۱۱ اکتوبر کو ماسکو میں تمہارا استقبال کر کے ہمیں خوشی ہو گی۔ ماسکو پہنچا تو انھوں نے میزائلوں سے مسلح طیارے اور ماہرین بھیجنے کا وعدہ کیا تاکہ وہ مصریوں کو تربیت

دے سکیں۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے اس شرط کا اعادہ کیا کہ طیارے استعمال کرنے کے لئے ماسکو سے پیشگی اجازت لینا ہوگی۔ مذاکرات کے آخر میں میں نے کہا: "آج ۱۲ اکتوبر ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ہتھیار ہمیں حتی الامکان جلد بھیج دیے جائیں گے۔ اگر سال کے اختتام سے پہلے ہم موجودہ تعطل کو توڑ سکیں۔" یوں میں نے روسیوں پر واضح کر دیا کہ ۱۹۷۱ء فیصلے کا سال ہوگا۔ اور ہمیں پر امن حل یا جنگ ریکار میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور میں پر اعتماد ہو کر واپس آیا۔

۱۹۷۱ء گزر گیا۔ مگر روسی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

۱۹۷۲ء میں روس کے خلاف مصریوں کے جذبات انتہا کو پہنچ گئے۔ اپریل ۷۲ء کے آخر میں روسی سفیر نے ایک ہنگامی ملاقات میں اپنے حکمرانوں کی طرف سے ایک "اہم پیغام" دیا جس میں کہا گیا تھا:

"ہم (روسی لیڈر اور میں) نے ماسکو مذاکرات میں اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ وہ (روسی) صدر نکسن کے ۲۰ مئی کے مجوزہ دورے کے بعد ہمیں صورت حال کا ایک تفصیلی تجزیہ ارسال کریں گے۔ اور اس کے بعد پانچ ماہ کے عرصے میں (جون سے اکتوبر تک) سب ہتھیار بھیج دیے جائیں گے۔ اور ان میں پرانے معاہدوں کا اسلحہ بھی شامل ہوگا۔"

نکسن نے مئی ۱۹۷۲ء میں روس کا پہلا سرکاری دورہ کیا۔ ویتنام کے بارے میں ماسکو اور واشنگٹن کے جو پہلا مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا، اس میں مشرق وسطیٰ میں اسلحے کی دوڑ کم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ مجھے اس سے انتہائی صدمہ ہوا۔ کیونکہ ہم اسرائیل سے کم از کم بیس سیڑھیاں پیچھے تھے۔

نکسن کے دورے کے بعد کا روسی "تجزیہ" مجھے ۶ جولائی کو موصول ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ روسی امریکی مذاکرات کے دوران مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لطف یہ کہ اس میں ہتھیار بھیجنے میں تاخیر کا ذکر تک نہ تھا۔

میں نے روسی سفیر سے کہا: "بس اتنا ہی پیغام تھا؟"

"جی ہاں۔" اُس نے کہا۔

میں نے کہا: "میں روسی رہنماؤں کے اس پیغام کو اس کے الفاظ اور مفہوم سمیت مسترد کرتا ہوں جو انھوں نے ہمارے ساتھ روا رکھا ہے۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے ایک سرکاری پیغام کی حیثیت سے روسی لیڈروں تک پہنچا دیجئے۔

دوسری بات یہ کہ میں نے روسی فوجی ماہرین (تقریباً پندرہ ہزار) کی خدمات ختم کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ کہ انھیں آج سے ایک ہفتے کے اندر اندر واپس روس جانا ہوگا۔ میں وزیر جنگ کو اس حکم سے مطلع کر دوں گا۔

تیسرے یہ کہ مصر میں روسی ساز و سامان میں چار مگ ۲۵ طیارے اور ایک الیکٹرانی اسٹیشن ہے۔ یا تو یہ چیزیں ہمارے ہاتھ فروخت کر دی جائیں یا انھیں واپس روس لے جائیے۔

چوتھے یہ کہ روسیوں کا کوئی ساز و سامان مصر میں نہیں رہے گا۔ یا تو اسے ہمارے پاس فروخت کر دیجئے یا مقررہ تاریخ کے اندر اندر وہاں سے ہٹا لیجئے۔

۱۶ جولائی ۱۹۷۲ء تک میرے تمام فیصلوں پر عمل درآمد ہوگیا۔

کامیاب اسٹریٹیجی

میرے فیصلے کا ایک محرک روسیوں کا افسوسناک رویہ تھا لیکن اہم سبب یہ تھا کہ جب تک روسی ماہرین مصر میں برسر عمل تھے، کوئی جنگ نہیں لڑی جا سکتی تھی۔

روس، مغربی ممالک اور اسرائیل نے میرے فیصلے سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ اور اس سے میری اسٹریٹیجی کو تقویت پہنچی۔ وہ یہ سمجھے کہ میں نے جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں انھیں ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا دیکھنا چاہتا تھا۔

روسی ماہرین کے اخراج کا ایک اور اہم محرک یہ تھا کہ روسیوں کے سر میں یہ سودا سما گیا تھا کہ انھیں مصر میں خصوصی پوزیشن حاصل ہے۔ حتیٰ کہ روسی سفیر اپنے آپ کو مصر میں برطانوی دور کے انگریز ہائی کمشنر کا ہم پلہ سمجھنے لگ گیا تھا۔ میرے فیصلے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ میں روسیوں کو ان کے مقام پر رکھنا اور یہ بتانا چاہتا تھا کہ مصر میں صرف مصریوں ہی کی مرضی چلے گی۔ میں دنیا پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ ہم اپنے آقا خود ہیں نہ کہ کوئی اور۔

میں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی، اگرچہ جانتا تھا کہ پوری دنیا نے (اور ان میں مصر بھی شامل تھا) روسی فوجی ماہرین کے اخراج سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میں جنگ لڑنا نہیں چاہتا۔

بے مثال کارنامہ

میں نے وزیر جنگ محمد صادق کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اگلے روز مسلح افواج کی سپریم کونسل کا اجلاس بلائے اور انھیں باخبر کر دے کہ وہ ۱۵ر نومبر ۱۹۷۲ء سے جنگ لڑنے اور حملہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں۔ ۲۸ر اکتوبر کو میں نے سپریم کونسل کا ایک اور اجلاس بلایا اور ہر کمانڈر سے ان کی تیاریوں کی رپورٹ طلب کی۔ نوال (Nawal) نامی ایک میجر جنرل نے جو مسلح افواج میں انتظامی انچارج تھا، مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ اسے تو پہلے ایسا کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔

میں نے پوری کونسل کے سامنے صادق سے کہا: "اس کا کیا مطلب لیا جائے؟" وزیر جنگ نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "جناب میں نے ہر ایک کو آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے صرف فوجی کمانڈروں کو پیغام دیا تھا تاکہ راز افشا نہ ہو سکے۔"

وزیر جنگ کے بارے میں میں جن شبہات میں مبتلا تھا، اس سے ان کی تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ میں براہِ راست کمانڈروں سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ اس کا آغاز میں نے میجر جنرل عبدالمنعم واصل سے کیا۔ جو تیسری فوج کی کمان کر چکا تھا۔ میں نے اس سے فوج کی نقل و حرکت کے بارے میں پوچھا۔ اس کا جواب حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔ اس نے کہا: "جناب، ہم مکمل طور پر دشمن کی نظروں میں ہیں۔ اگر ہم نے نہر سویز کے اس طرف فوجوں کو مرتکز کرنے کی کوشش کی، تو اسرائیل کو پتہ چل جائے گا۔ حتیٰ کہ ہمارے نہر عبور کرنے سے پہلے ہی وہ ہم پر حملہ کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیلیوں نے نہر کے مشرقی کنارے پر قلعہ بندیوں کا ایک سلسلہ اور ۷۴ فٹ بلند مٹی کا حصار تعمیر کر لیا ہے ۔۔۔ اس کے مقابلے میں ہماری نگراں چوکیاں صرف دس فٹ کی بلندی پر ہیں۔"

میں نے مارشل احمد اسمٰعیل علی کو طلب کیا جو اس وقت میجر جنرل اور ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے۔ میں نے انھیں کمانڈر انچیف اور وزیر جنگ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کو کہا جب مارشل علی سرکاری طور پر کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہو چکے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ دفاعی منصوبے کو پھر سے اصل شکل میں لے آئیں۔ اگر اسرائیلیوں کی قلعہ بندیاں ۷۴ فٹ بلند ہیں، تو ہماری ۶۵ فٹ کی بلندی پر ہونی چاہئیں۔

ہم ۱۹۶۷ء کے سانحے کے اعادے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ مجھے فکر لاحق تھی کہ اس مرتبہ ہم ممکنہ اسرائیلی حملے کو کس طرح روکیں گے۔ مارشل علی سے ۳۰ر نومبر کو ایک ملاقات ہوئی تو میری تشویش جاتی رہی۔ اس نے بتایا کہ ہماری دفاعی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اور یہ کہ اب وہ جارحانہ حملے کا منصوبہ بنانے والا ہے۔ اس منصوبے کا بنیادی خاکہ جنوری ۱۹۷۳ء تک مکمل ہو چکا تھا۔

دراصل مارشل علی نے جو کچھ کر دکھایا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے نہر کے مغرب میں متعین ہر فوجی افسر سے کہا کہ وہ قلعہ بندیوں پر (جو اب ۶۵ فٹ بلند ہو چکی تھی) چڑھ کر سینائی کا جائزہ لے اور پھر اپنے لیے ایک ٹھیک ٹھیک عملی منصوبہ تیار کرے جس پر اسے

شہر پار کرنے کے بعد عمل کرنا ہوگا۔ اس طرح افسروں کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور عملی منصوبے میں شرکت کا موقع فراہم کیا گیا۔ میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے منصوبے کی تیاری میں ہماری پوری مسلح افواج نے حصہ لیا تھا۔

موشے دایان مات کھا گیا

مئی ۱۹۷۳ء میں میرا جنگ چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن انہی دنوں میں نے وسیع پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کر دیا اور شہری دفاع کی مشقیں شروع کرا دیں۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اس سے اسرائیلی اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ ناگزیر ہے۔ اسرائیل نے فوجی نقل و حرکت شروع کر دی لیکن ہم فوجی لحاظ سے بالکل پُرسکون اور خاموش رہے۔ اگست میں بھی میں نے ایسا ہی کیا اور اسرائیل کا ردِ عمل پھر وہی تھا۔

جنگِ اکتوبر کے بعد موشے دایان سے پوچھا گیا کہ اکتوبر میں اس نے فوج کو چوکس کیوں نہیں رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا: "سادات نے ہمیں دو مرتبہ چوکس رہنے پر مجبور کیا اور ہر بار ہمیں ایک کروڑ ڈالر کا زیر بار ہونا پڑا۔ تیسری دفعہ میں سمجھا کہ وہ سنجیدہ نہیں ہے۔ مگر وہ مجھے چکر دے گیا۔"

میں ۲۸ اور ۲۹ ستمبر کو شام کے صدر اسد سے ملا۔ اس ملاقات میں ہم نے فیصلہ کیا کہ جنگ ۶ اکتوبر کو چھیڑ دی جائے۔ ممکن ہے آپ کو یہ بات حیران کن معلوم ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ چھیڑنے کے بعد میں سکون کی نیند سویا۔ حالانکہ اس سے پہلے کتنی ہی راتیں بے چینی سے گزری تھیں۔

۶ اکتوبر ۷۳ء کو ہفتے کے دن مارشل علی مجھ سے ملے ڈیڑھ بجے سہ پہر کا عمل ہوگا۔ جب ہم دونوں ایک فوجی جیپ میں آپریشن روم پہنچے۔ ۲ بجے سہ پہر جنگ کا نقطۂ آغاز تھا جبکہ فضائیہ کو نہر سویز کو پار کرنا تھا۔ عین اس وقت مائیکروفون پر اطلاع ملی کہ ہمارے طیارے روانہ ہو چکے ہیں۔ حملے کے پہلے دور میں کل ۲۲۲ سپرسانک طیاروں نے حصہ لیا اور بیس منٹ میں اپنا مشن مکمل کر کے واپس آ گئے۔ صرف پانچ طیارے ضائع ہوئے۔ جنگ کے ان ابتدائی لمحات میں میرا سب سے چھوٹا بھائی ایئر پائلٹ عاطف مجھ سے بچھڑ گیا۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیارا تھا، کیونکہ اس کی پرورش میں نے کی تھی۔

فضائی حملہ طے شدہ منصوبے کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچا، ایک مکمل اور حیران کن کامیابی تھی۔ اسرائیل اور مشرق و مغرب کی تمام دُنیا ششدر رہ گئی۔ ہمیں خود بھی حیرت تھی کہ نوے فیصد نشانے صحیح بیٹھے۔ اس قابلِ تعریف فضائی حملے سے مصری فضائیہ نے وہ سب داغ دھو ڈالے جو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء کی شکستوں کی صورت میں اس کا مقدر بنے تھے۔ اس کے نتیجے میں ہماری مسلح افواج کی اس فتح کی راہ ہموار ہوئی جس سے ہمارے جوانوں، ہمارے عوام اور عرب قوم کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

بارلیولائن ریت کی دیوار ثابت ہوئی

ہمارے سپاہیوں کو اسرائیلیوں کا بنایا ہوا مٹی کا حصار عبور کرنا تھا جو بعض مقامات پر ۴۰ فٹ تک بلند تھا۔ وہ پرانے طریقوں کو کام میں لا کر اس حصار پر جا چڑھے جس سے دنیا حیرت میں ڈوب گئی۔ ایک سپاہی رسّے کی سیڑھی اٹھا کر اوپر جاتا اور چوٹی پر پہنچ کر اسے نیچے لٹکا دیتا۔ پھر دوسرے سپاہی اینٹی ٹینک میزائل اور درمیانی توپوں جیسے ہتھیار اٹھا کر اس سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھتے۔

جلد ہی ہمارے جوان ان مورچوں پر قابض ہو گئے جو اسرائیلیوں نے کھود رکھے تھے۔ سب سے پہلے ہمارے ساتویں بریگیڈ نے نہر پار کی۔ اور مصری جھنڈا مشرقی کنارے پر لہرانے لگا۔ وقفوں وقفوں سے اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ بارلیولائن کے مضبوط مقامات یکے بعد دیگرے ہمارے قبضے میں آتے جا رہے ہیں۔ اسرائیل چھ روزہ جنگ (۱۹۶۷ء) پر ناز کرتا چلا آ رہا تھا۔ اب ہم چھ گھنٹے کی جنگ پر ناز کر سکتے تھے۔

شروع شروع میں بیرونی دُنیا غلط فہمی کا شکار رہی۔ اکثر ممالک اسرائیلی نقطۂ نظر پر اعتبار کرتے تھے۔ اور

اس کے ذرائع اطلاعات اسرائیلی فوجی نشریے تھے جن کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ اسرائیل ہمیں مکمل طور پر کچل کر رکھ دے گا۔

پہلے تین دنوں میں اسرائیل کی ایک تہائی فضائیہ شامی اور مصری محاذوں پر تباہ ہو گئی۔ اور اسے اپنے بہترین تربیت یافتہ اور تجربہ کار ہوا بازوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اسرائیل کی برتری اور اس کی فضائیہ، بکتر بند ڈویژنوں اور سپاہیوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے افسانے غلط ثابت ہوئے۔ لڑائی کے چوتھے روز عالمی شہرت کا اسرائیلی جرنیل ابراہام منڈلر مصری محاذ پر مارا گیا۔ یہ دن ہمارے محاذ پر اسرائیلی فوجوں کی شکست اور تباہی کا دن تھا۔

ہمیں بچاؤ

پہلے تو کسنجر کو یقین تھا کہ مصری شکست سے دوچار ہوں گے۔ مگر جنگ کے چوتھے روز اس کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اُسے اصل صورتِ حال کا علم اس وقت ہوا جب اُسے جگا کر اسرائیل کی طرف سے یہ پیغام دیا گیا: "اسرائیل سخت مصیبت میں ہے، اسے بچاؤ۔" اس پیغام میں درخواست کی گئی تھی کہ مصری محاذ پر تباہ ہونے والے ٹینکوں کی جگہ چار سو ٹینک فوراً بھیج دیے جائیں۔ ادھر امریکی وزارتِ دفاع (پینٹاگون) نے بھی رپورٹ دی کہ مصری محاذ پر جنگ اسرائیل کے حق میں نہیں جا رہی۔

کسنجر نے یہ بھی ضرور سنا ہو گا کہ موشے دایان غیر ملکی نامہ نگاروں سے یہ کہتے ہوئے رو پڑا تھا کہ اسرائیل، مصریوں کو ایک انچ پیچھے دھکیلنے کی بھی توقع نہیں رکھتا اور یہ کہ تل ابیب کو جانے والی شاہراہ کھلی پڑی ہے۔

ہنری کسنجر نے مسز گولڈا میئر سے کہا: "آپ جنگ ہار چکے ہیں۔ آپ کو اس (شکست) کے لیے تیار رہنا چاہیے" پھر کسنجر ایسی کوششوں میں مصروف ہو گیا جن کا مقصد اسرائیل کو دم لینے کا موقع فراہم کرنا تھا کیونکہ مصری بدیہی طور پر فتح بہ فتح حاصل کرتے جا رہے تھے۔

کسنجر کی تگ و دو

کسنجر کو اسرائیل کی مصیبت کا علم ہوا تو وہ روس سے رابطہ قائم کر کے

جنگ بندی کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ پہلے تو وہ چھ اکتوبر کی حدود تک فوجوں کی واپسی پر اصرار کر رہا تھا کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اسرائیلی مصریوں کی ہڈیاں توڑ رہے ہیں مگر اب وہ موجودہ حدود پر جنگ بندی کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ ہم نے دونوں درخواستیں مسترد کر دیں۔

جس وقت میں آپریشن روم میں جنگ کی پیش رفت کی نگرانی کر رہا تھا، مجھ پر ایک سنگین صورتِ حال کا انکشاف ہوا امریکا اسرائیل کو بچانے کے لیے ہماری ہی سرزمین کو خفیہ پل کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ جدید ترین ہتھیاروں سے لدے ہوئے دیو قامت امریکی طیارے سینائی میں العریش کے ہوائی اڈے پر مسلسل اتر رہے تھے۔

ایک اور چیز بھی باعث تشویش تھی۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ ٹینکوں کی خونریز جنگ میں جس میں ابراہام منڈلر کی ٹینک فورس مکمل طور پر تباہ کر دی گئی ہرچند ہم درجنوں اسرائیلی ٹینک تباہ کر چکے تھے تو ان سے زیادہ ٹینک ان کی جگہ لینے کو آ موجود ہوتے۔ جنگ کے چوتھے روز اسرائیل نے جو التجا کی تھی اس کے جواب میں امریکا اسرائیل کو بچانے کے لیے جنگ میں کود پڑا تھا۔ میرے ذہن میں ان جنگی کا دستور کی یاد تازہ ہو گئی جن کا امریکا نے پہلے جرمن اور پھر جاپان

محاذوں پر مظاہرہ کیا تھا۔

جنگ امریکا لڑ رہا تھا

جنگ کے ابتدائی دور میں اسرائیلی فینٹم طیاروں نے مصری سام میزائلوں پر درجن بھر راکٹ فائر کیے۔ مگر وہ صرف ایک میزائل بیٹری کے ایریل ہی کو نشانہ بنا سکے اور اس کی ہم نے پندرہ منٹ میں مرمت کر لی۔ اس کے برعکس اب دو امریکی راکٹ دو مصری میزائل بیٹریوں پر آ کر لگے اور وہ دونوں مکمل طور پر بے کار ہو گئیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایک نئے امریکی راکٹ کی تباہ کاری ہے جو ٹی وی کیمرہ بم کہلاتا ہے۔ یہ بم امریکیوں کے لیے جاپان میں تیار کیا گیا تھا۔ لیکن یہ امریکا تجرباتی مرحلے میں تھا۔ اسرائیل کو بچانے کے لیے امریکا نے اسے مصر کے خلاف استعمال کر ڈالا۔

امریکا اسرائیل کو میورک (MAVERICK) بم جیسے زیر تجربہ ہتھیار اور دیگر اسلحہ فراہم کر کے جنگ میں عملی حصہ لے رہا تھا۔ مجھے اپنے ملک کی صلاحیتوں کا بخوبی علم تھا۔ میں امریکا کی پوری جنگی مشینری کے خلاف نہیں لڑ سکتا تھا۔

۱۹ اکتوبر کو ڈیڑھ بجے شب جب میں آپریشن روم سے نکلا تو میں نے اپنے جنگی شریک کار صدر حافظ الاسد کو ایک تار بھیج کر آگاہ کیا کہ میں نے جنگ بندی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جنگ بندی کا فیصلہ میں نے اسی رات کر لیا تھا۔ گزشتہ دس دنوں سے میں تنہا امریکیوں اور ان کے ایسے جدید ترین ہتھیاروں کے خلاف لڑ رہا تھا جن میں سے اکثر پہلے کہیں استعمال میں نہیں آئے تھے۔

مجھے یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ امریکی ٹی وی کیمرہ بموں کی مدد سے ہمارے فضائی دفاعی نظام کو مکمل طور پر تباہ کر دے گا اور اس طرح ۱۹۶۷ء کی مانند اسرائیل کو کھلی فضائیں مل جائیں گی۔

دنیا جو کچھ سمجھ رہی تھی، حقیقت اس سے کہیں مختلف تھی۔ سبھی خیال کر رہے تھے کہ روس نے ہماری پشت پناہی کی تھی اور ہماری مدد کے لیے اس نے فضائی پل قائم کر دیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں امریکا اور اسرائیل کا مقابلہ کر رہا تھا۔ جب کہ روس میری پشت میں چھرا گھونپنے کے لیے پیچھے تیار کھڑا تھا۔ اگر ۱۹۶۷ء کی طرح میں اپنا اسی فیصد اسلحہ کھو بیٹھتا تو روس ایسا کر گزرتا۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں کسنجر آیا اور فوجوں کی واپسی کے پہلے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ یوں امریکا نے ہمارے اور اسرائیل کے درمیان ثالث کا کردار انجام دیا۔

معاہدہ اسوان کے مذاکرات کے دوران ایک چیز میری نظروں میں تھی۔ میں اپنی زمینی فتوحات کو برقرار رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔ نہر کے مغربی کنارے پر اسرائیلیوں کی موجودگی کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہمارے قیدی ہیں اور ان کی وہاں موجودگی کا مطلب ان کی موت ہے۔ یا یوں ہم میں سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ تمام بڑی طاقتیں میری فتوحات پر پانی پھیر دینا چاہتی تھیں۔ ان میں امریکا پیش پیش تھا۔ روس بھی یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ روسی فوجی ماہرین کی موجودگی کے باوجود شام کی کارکردگی اچھی نہ رہی تھی اور میں نے روسی فوجی ماہرین کو نکال کر بھی فتح حاصل کی تھی۔

جہاں تک بڑی طاقتوں کا تعلق تھا مجھے کوئی پریشانی نہ تھی۔ تاہم میں اپنی فتوحات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ امن کے حصول کی خاطر ایسا کرنا ضروری تھا۔ وہ امن جس کے لیے میں نے دن رات کام کیا تھا۔

نہر سویز دوبارہ کھل گئی

جب کبھی میں نہر سویز پر واقع کسی شہر کا دورہ کرتا ہوتا ہوں میری آنکھوں کے سامنے ۵ جون ۱۹۷۵ء کے مناظر گھوم جاتے ہیں۔ یہی وہ دن تھا جب میں نے افتتاحی چبوترے پر کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ نہر سویز آٹھ سال بعد بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے کھول دی گئی ہے۔ پوری دنیا میری ہمنوا تھی۔ وہی دنیا جو چند ماہ پہلے تک نہر کو بیکار شے قرار دے رہی تھی۔ جب کہ اسرائیل بار بار دعویٰ کر رہا تھا کہ نہر کا کھلنا یا نہ کھلنا اس کی مرضی پر منحصر ہے۔

کسنجر کی امن کی مساعی ناکام ہو گئیں تو میں نے پارلیمنٹ کے سامنے تمام صورت حال رکھی۔ اسی اجلاس میں میں نے اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ ۵ جون کو نہر سویز دوبارہ بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے کھول دی جائے گی۔ اس اعلان کے مطابق

نہر سویز دوبارہ کھل گئی۔ مگر یہ مسلسل امریکا کی طرف سے، اسرائیل کو فراہم کردہ بڑی توپوں کی زد میں تھی۔ اس اقدام کا ایک اچھا فائدہ یہ ہوا کہ سات ہزار بے گھر بندر سعید، سویز اور اسمٰعیلیہ کے شہروں کو واپس جانے کے قابل ہو گئے۔

لاشوں کی قیمت؟ جنگ اکتوبر کے دو سال بعد نہر کے علاقے سے ۲۹ اسرائیلی سپاہیوں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ اسرائیل نے ان کی قیمت طے کرنے کے لیے بات چیت کی پیش کش کی۔ میں نے کہلا بھیجا: آپ کو کچھ ادا کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ تو ایک انسانی مسئلہ ہے۔ ہم ان کی کوئی قیمت نہیں لیں گے۔ کہیے اور اپنی لاشیں لے جائیے

میں نے ایسا کیوں کیا؟ محض امن کی خاطر۔ دنیا میں کوئی چیز امن سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔

اگست ۱۹۷۵ء میں کسنجر مشرق وسطیٰ پہنچا اور ایک دفعہ پھر مصر اور اسرائیل کے درمیان شٹل ڈپلومیسی شروع کر دی، لیکن اس کی تمام تر کوششیں بے سود رہیں۔ گذشتہ مارچ سے امریکی انتظامیہ کی پوزیشن خراب تر ہو رہی تھی۔ آئے دن نئے نئے اسکینڈل منظر عام پر آ رہے تھے اور اسرائیل ہر اس موقع پر امریکی مفادات پر ضرب لگا رہا تھا جب اس کے اپنے مفادات سے ٹکرا رہے تھے۔

میں نے کسنجر سے کہا: "میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اب کے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں نے نہر سویز کھول دی بے گھروں کو ان کے شہروں میں بسا دیا اور امن کی خاطر کئی اور اقدامات کیے ہیں اور اس دنیا کے سامنے اسرائیل کے اصل ارادوں کی قلعی کھول دی ہے۔ اب اگر اسرائیل امن کی موجودہ کوششوں کو سبوتاژ کرتا ہے تو حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ دنیا خود دیکھ لے گی کہ مذاکرات کی ناکامی کا ذمے دار صرف اور صرف اسرائیل ہے۔"

اب اسرائیل کے سامنے ہاں کہنے کے سوا کوئی راہ فرار نہ تھی، چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۷۵ء کو ہم نے فوجوں کی واپسی کے دوسرے سمجھوتے پر دستخط کر دیے۔ یوں امن کے سلسلے میں تیسرا مرحلہ مکمل ہو گیا۔

ستم ظریفی کی انتہا صدر کارٹر نے عہدۂ صدارت سنبھالا تو کچھ عرصے بعد میں ان سے ملنے گیا۔ میں نے ان کے سامنے امن مذاکرات کے تمام مراحل کا اعادہ کیا اور امن کا ایک قطعی منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے کا مرکز و محور مسئلہ فلسطین تھا۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ آج اس قسم کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں کہ فلسطینی، اسرائیل کا وجود تسلیم کریں۔ آپ بے گھر فلسطینیوں

سے ایسا مطالبہ کیونکر کر سکتے ہیں جن کی زمینیں، جن کا ملک اور جن کے انسانی حقوق تک چھن چکے ہیں۔

میں نے کارٹر کو جو منصوبۂ امن پیش کیا، اس میں کہا گیا تھا کہ میں اسرائیل کے حق تسلیم کا انکار نہیں کرتا، مگر اس کے لیے پوری صورت حال کا معمول پر آنا ضروری ہے۔ پہلے ایک معاہدۂ امن عمل میں آنا چاہیے جس کے تحت دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر فلسطینی ریاست قائم ہو اور اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر دے تاکہ ہم جینوا میں جا بیٹھیں، تو حالت جنگ ختم کرنے کا رسمی اعلان کیا جا سکے جو اسرائیل کے قیام سے لے کر تا حال چلی آ رہی ہے۔

میں نے صدر کارٹر سے کہا تھا: "اسرائیل جو بھی تحفظات مانگے اسے دیے جا سکتے ہیں اگر وہ یہ مطالبہ کرے کہ ہر مشکل شہری ایک ٹینک اور ایک طیارے سے مسلح ہو اور یہ چیز امریکا اسے فراہم کرے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن شرط یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کو وہ اپنے علاقے میں استعمال کرے، نہ کہ دوسروں کے علاقے میں۔"

میں اپنے اس موقف کو مبنی بر حق سمجھتا ہوں کہ جو تحفظات اسرائیل کو دیے جائیں وہی عربوں کو بھی ملنے چاہییں سوائے ایک کے۔ اگر اسرائیل امریکا کے ساتھ مشترکہ دفاع کا معاہدہ کرنا چاہیے تو میں ایسے معاہدے کا مطالبہ نہیں کروں گا۔

کارٹر کا ذاتی خط

میرے دورۂ یروشلم سے تقریباً دو ماہ پہلے کی بات ہے واشنگٹن کے مصری سفارت خانے کی وساطت سے صدر کارٹر کا ایک ذاتی خط موصول ہوا۔ وہ خصوصی طور پر سربند تھا۔ یہ خط ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ میں اس کی ذاتی نوعیت کی وجہ سے اس کے مندرجات کا افشا تو نہیں کر سکتا، تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اس خط میں صورت حال کا جو تازہ ترین تجزیہ کیا گیا تھا، اس نے پہلی مرتبہ مجھے وہ راہ عمل سجھائی جسے میں دو ماہ بعد اختیار کرنے والا تھا۔

صدر کارٹر ان نفسیاتی رکاوٹوں سے آگاہ تھے جو عربوں اور یہودیوں کے درمیان حائل تھیں۔ جب میں نے کارٹر کے خط کا جواب بھیج دیا تو صورت حال کا گہرا تجزیہ کرنے سے مجھے احساس ہوا کہ اس سنگین مسئلے کی تہہ میں واقعی نفسیاتی رکاوٹیں کارفرما ہیں۔ اس موقع پر میرے وجود میں داخلی قوت عود کر آئی جس کی افزائش قاہرہ کی مرکزی جیل کی کوٹھڑی نمبر ۵۴ میں ہوئی تھی۔ اسے آپ تبدیلی کی استعداد کہہ لیں یا فطری صلاحیت۔

جیل کی تنہائیوں میں زندگی اور انسانی فطرت کے بارے میں جہاں تک میں نے غور و خوض کیا تھا اس سے مجھ پر حقیقت آشکارا ہوئی کہ جو شخص اپنی فکر کے بنیادی تانے بانے کو تبدیل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ نہ تو کبھی حقیقت کا رُخ بدل سکتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی پیش رفت کر سکتا ہے۔

میں نے سوچا کیا مجھے تبدیلی کی ضرورت ہے؟ ہم اسرائیل کو اچھوت قرار دیتے چلے آ رہے تھے بلکہ ہماری پوری ایک نسل نے اسی نفرت کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا، اگر ہم جھگڑے کی تہہ میں جا کر پائیدار امن حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں باہمی بداعتمادی کی رسمی پابندیوں کو نظر انداز کر کے نئے سرے سے آگے بڑھنا ہو گا۔

امریکی کورا چیک

میں نے سوچا، تصفیے کی طرف پیش رفت میں امریکا کا کردار کیا ہو گا؟ اس ضمن میں امریکی تعاون کا تعین امریکا اور اسرائیل کے خصوصی تعلقات کی بنا پر ہی ہو سکتا تھا۔ میں صدر کارٹر سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ان خصوصی تعلقات کو ختم کر دیں یا اسرائیل کی مخالفت میں میرا ساتھ دیں۔ ان تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے ایک معروضی اور حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ میں صدر کارٹر سے اتنا ہی کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک ایسا موقف اپنائیں جو ایک تو امریکی مفادات کی ضمانت دیتا ہو اور دوسرے عالمی امن کی ذمہ داریوں کا امین ہو جو ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے امریکا پر عائد ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکا نے صدر جانسن کے دور سے اسرائیل کو جو کورا چیک دے رکھا تھا اسے واپس لے لیا جائے۔

جنگ اکتوبر سے جو نئے حقائق دنیا کے سامنے آئے وہ شاید ان سب باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ ان میں سے یہ حقیقت سرفہرست تھی کہ عرب عوام اب "بے جان لاشے" نہیں رہے تھے بلکہ وہ ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ اب وہ اسرائیل کو شکست دے سکتے تھے۔ مزید براں وہ پہلی مرتبہ موثر طور پر تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کے قابل ہوئے تھے۔

فضا میں فیصلہ ہو گیا: یہاں میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جس لمحے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ تیل کی بندش سے امریکی شہری متاثر ہونے لگے ہیں، ہم نے یہ پابندی اٹھا لی۔ ہمارا یہ مقصد نہ تھا کہ امریکی یا مغربی شہریوں کو سزا دی جائے بلکہ ہم تو محض انہیں یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ اسرائیل کی اندھا دھند حمایت کی بھی قیمت دینی پڑے گی۔

رومانیہ میں صدر نکولائی سیسکو سے میری طویل بات چیت ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اسرائیلی وزیراعظم بیگن سے ان کی اس سے بھی زیادہ طویل گفتگو ہوئی ہے۔ میں نے بیگن کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے تو انہوں نے کہا "بیگن واقعی کوئی تصفیہ چاہتا ہے۔" بیگن کی "خواہشِ امن" اور اس کی "مضبوط شخصیت" کے تذکرے سے میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ صورت حال میں تبدیلی اشد ضروری ہے۔ پھر جب میں ایران کی طرف محو پرواز تھا۔ تبدیلی کا محرک ایک ٹھوس شکل اختیار کر کے سامنے آ گیا۔

پانچ بڑوں کی ملاقات، مگر کہاں؟

طیارے کی تنہائی میں وزیر خارجہ میرے ساتھ تھا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے لیے تبدیلی کا محرک اتنا دلیرانہ اور تخیلی تھا کہ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا) میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "میں پانچ بڑی طاقتوں کے رہنماؤں یعنی کارٹر، بریژنیف، دیستان، کالیہان اور ہوا کو فنگ کو یروشلم میں ایک ملاقات کے لیے مدعو کرنا چاہتا ہوں۔"

قاہرہ واپس آ کر میں نے سوچا۔ نماز جمعہ کے بعد عید قرباں کی نماز زیادہ موزوں رہے گی اور عید کا تہوار مقبوضہ عرب علاقہ میں اپنے بھائیوں سے ملنے کا اچھا موقع فراہم کرے گا۔ مگر اس میں ایک مشکل تھی۔ عید چند دن بعد آنے والی تھی اور اتنے کم وقت میں یروشلم میں پانچ بڑوں کی ملاقات کا انتظام کرنا ممکن نہ تھا خواہ ان دنوں ان کی کوئی پیشگی مصروفیات بھی نہ ہوتیں۔

اب تبدیلی کے ابتدائی محرک نے ایک اور شکل اختیار کر لی: میں خود ہی کیوں نہ جاؤں اور مسجد اقصیٰ میں عید الاضحیٰ کی نماز ادا کروں؟ اس سے پہلے میں کہہ چکا تھا کہ امن کی تلاش میں، میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔ سوال یہ تھا کہ میں اسرائیل کو اس فہرست سے خارج کر دوں؟ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ براہ راست اسرائیلی عوام کے نمائندہ ادارے کینسٹ (اسرائیلی پارلیمنٹ) کے پاس جاؤں اور ان کے سامنے صورت حال کا مکمل آئینہ پیش کروں۔ میں گیند اسرائیل کی کورٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔

تبدیل شدہ تحریک جلد ہی پختہ ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ عوامی اسمبلی کے نئے اجلاس کی افتتاحی تقریر میں اپنے ارادے کا اعلان کروں گا۔

اجلاس میں حکومت کے وزرا بھی شامل تھے اور یاسر عرفات بھی۔ میرے اعلان کا فوری ردّعمل خاصا مضحکہ خیز تھا۔ بعض نے اسے زبان کی لغزش کہا اور بعض نے "یاوہ گوئی"۔

اسد کو اعتبار نہ آیا

عوامی اسمبلی کی تقریر کے فوراً بعد میں حافظ الاسد سے ملنے کے لیے شام گیا۔ انہیں میرے اعلان پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "کیا آپ حقیقتاً یروشلم جائیں گے؟ کیا آپ کا مطلب بھی وہی ہے جو آپ نے تقریر میں کہا تھا؟"

میں نے جواب دیا، "میں یقیناً وہاں جاؤں گا۔ میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو میرے ارادے میں نہ ہو۔"

ملاقات ختم ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کا موقف تبدیل کرنے میں ناکام رہے۔ میں سیدھا اسمٰعیلیہ پہنچا جہاں امریکی سفیر، وزیراعظم مینیم بیگن کی طرف سے ایک خط لیے میرا منتظر تھا۔

اس موقع پر میرے وزیر خارجہ نے اس اقدام کی مخالفت کی۔ میں نے اس سے کہا: "ٹھیک ہے میں کسی شخص کی مرضی کے خلاف اس سے کام نہیں لے سکتا چنانچہ میں نے اس کا استعفیٰ قبول کر لیا۔

دشمنوں کے روبرو

نہر سویز کے قریب ابو سویر کے ہوائی اڈے سے میرا طیارہ اڑا اور چالیس منٹ سے بھی کم وقت میں لُد کے ہوائی اڈے پر جا اترا۔ میں اسرائیل پہنچ چکا تھا۔ ماحول پر بے یقینی کی کیفیت طاری تھی اور عملاً ہر کوئی حیرت میں مبتلا تھا۔ جس لمحے میں نے طیارے سے باہر قدم رکھا مسز گولڈا میئر کو اپنے سامنے کھڑے پایا جس نے مجھ سے ملاقات کے لیے اپنا دورۂ امریکا مختصر کر دیا تھا۔ ہم نے باہم سلام و تہنیت کا تبادلہ کیا۔

اس کے بعد میں دایان سے ملا۔ اس شخص کو پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی جس کے خلاف میں نے ۱۹۷۳ء کی جنگ لڑی تھی۔ پھر ابا ایبان اور جنرل آریل شیرون سے ملاقات ہوئی۔ شیرون نے ۱۹۷۳ء میں جوابی حملے کی قیادت کی تھی۔ میں نے مزاحاً کہا: "اگر تم نے دوبارہ نہر سویز پار کرنے کی کوشش کی، تو میں تمہیں جیل بھیج دوں گا۔"

"اوہ، نہیں۔ میں تو اب وزیر ثقافت ہوں،" شیرون نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اب میری ملاقات اسرائیلی چیف آف اسٹاف مردخائی گور سے ہوئی، جس نے یہ کہہ کر میرے دورے کی مخالفت کی تھی کہ یہ کوئی فوری حملے کو اوجھل رکھنے کی ایک چال ہے۔ اُسے ملتے ہی میں نے کہا، "میں اخلاقی دھوکے پر یقین نہیں رکھتا۔ میں جنگی چال کا دھوکہ تو دے سکتا ہوں، مگر اخلاقی دھوکہ نہیں دے سکتا۔" اس کے بعد میں اور فرائم کاتزر کار میں بیٹھ کر کنگ ڈیوڈ ہوٹل چلے گئے جو یروشلم کے اسرائیلی حصے میں واقع ہے۔

بیت المقدس میں

میں اتوار کی صبح سویرے مسجد اقصیٰ گیا تاکہ نمازِ عید ادا کر سکوں۔ بائیس سال کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ مجھے عرب یروشلم (بیت المقدس) جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سہ پہر کو میں کینسٹ کے اجلاس میں شریک ہوا۔ پہلے میں نے تقریر کی اور اس کے بعد وزیراعظم بیگن اور حزب اختلاف کے رہنما پریز کی تقریریں ہوئیں۔ تھکاوٹ کے باوجود میں بعید خوشی محسوس کر رہا تھا۔

تھکاوٹ کام کی زیادتی کی وجہ سے نہ تھی نہ یروشلم میں گزرنے والے ہیجان خیز لمحات کا اثر تھا۔ بلکہ تھکاوٹ گہرے غور و فکر اور دماغ سوزی کا نتیجہ تھی۔ میرا دماغ غیر معمولی طور پر چوکس اور متوجہ تھا۔ صاف ظاہر ہے میں اسرائیل میں اپنے مشن کو انتہائی مقدس خیال کرتا تھا۔

جب میں واپس وطن پہنچا تو قاہرہ کے تقریباً پانچ لاکھ باشندے میرا استقبال کرنے کو نکل آئے۔ یہ تائید و حمایت کا ایک عدیم المثال مظاہرہ تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ کیا میرا منصوبہ برآیا۔

میرا خیال تھا کہ میرے دورۂ یروشلم سے نفرت کی وہ دیواریں گر جائیں گی جو برسوں سے ہمیں الگ تھلگ رکھے ہوئے تھیں۔ میرے اندازے بڑی حد تک درست ثابت ہوئے۔ جس طرح مصری عوام کا ردّ عمل بے مثال اور حیرت انگیز تھا اسی طرح اسرائیلی عوام نے بھی جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے شامل تھے ویسے ہی بے نظیر اور حیران کن ردّ عمل کا مظاہرہ کیا۔

یہ کیونکر ممکن ہوا؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑنے والے لوگوں کی عزت کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ ایسے شخص کی عزت کرتے ہیں جو فتح حاصل کرنے کے بعد کھڑا ہو کر یہ کہہ سکے،

"ٹھیک ہے، آئیں ہم اکتوبر کی جنگ کو آخری جنگ بنا دیں۔ آئیں ہم دوبارہ ہتھیار اٹھانے کی بجائے مہذب انسانوں کی طرح مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر سلامتی کے تقاضوں کو زیرِ بحث لائیں۔ وہ سلامتی جس کی آپ کو بھی ضرورت ہے۔

اکتوبر کی جنگ آخری جنگ ہے

میں دو بنیادی نکات پر اتفاق کر کے اسرائیل سے واپس آیا، پہلا یہ کہ اکتوبر کی جنگ ہماری آخری جنگ ہوگی۔ دوسرا یہ کہ مذاکرات کی میز پر ہمیں ایک دوسرے کی سلامتی کے سوال کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔

میں نے یہ نتائج اور ان کا تفصیلی پس منظر عوامی اسمبلی کے سامنے بحث کے لیے پیش کر دیے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اسمبلی نے متفقہ طور پر ان کی توثیق کر دی۔ ۳۶۰ ارکان میں سے صرف دو یا تین نے مخالفت کی۔

میں مستقبل میں بھی اپنے علاقے میں منصفانہ امن کے لیے کام کرتا رہوں گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسرائیل کو ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ عرب علاقے واپس کرنا ہوں گے اور فلسطینیوں کی قومی مملکت یا کارٹر کے الفاظ میں "قومی وطن" قائم کر کے مسئلۂ فلسطین کو حل کرنا ہوگا۔

آخر میں میں اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ مصری عوام بہت سی دوسری قوموں سے مختلف ہیں حتیٰ کہ عرب ممالک میں سے کسی ایک سے بھی مختلف۔ ہم نے اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد اپنا وقار اور خود اعتمادی بحال کر لی ہے۔ اب ہم کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہیں اور شکست اور شک اور نفرت کے احساسات سے نجات پا چکے ہیں۔ ■■

دھماکہ ایک ایسا سیاسی فکشن ہے جسے ناول نویس نے ۱۹۷۶ء میں تحریر کرتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں رونما ہونے والے خونریز، دہشت انگیز، افسوسناک واقعات و حادثات کی تصویر آرائی کی ہے۔

اس ناول کو ۱۹۷۶ء میں تحریر کیے جانے کے اعلان سے ناول نویس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس قانونی چارہ جوئی سے بچ جائے جو کئی ممالک اس کے خلاف کر سکتے ہیں۔ اس نے کئی بین الاقوامی سازشوں کا پردہ اس طرح چاک کیا ہے کہ اس ناول کے جگہ جگہ تجزیے ہو رہے ہیں۔ اس ناول کے مرکزی کردار شاہ خالد اور شہنشاہ ایران کے گرد برطانوی، اطالوی، فرانسیسی اور اسرائیلی سربراہ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی میں قذافی کی ان سازشوں کے خلاف سرگرمیوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

بل ہچکاک نام کے ایک عظیم ماہر اقتصادیات کے سعودی عرب میں تقرر سے یہ ناول شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اسے تقریباً پچاس لاکھ روپے سالانہ مشاہرہ پر چیف فائنانشیل ایڈوائزر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں کو احساس ہو چکا تھا کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے بینک سعودی عرب کے سرمایہ سے کروڑوں روپے نفع کما کر بھی اُسے بے وقوف بنا رہے تھے۔ بل ہچکاک نے ایسے تمام بینکوں کے کان پکڑنا شروع کر دیے۔ تقرری کے پہلے دن ہی اس نے نصف درجن ٹیلیفون کالوں کے ذریعہ اپنے آقاؤں کی آمدنی میں بارہ کروڑ روپے ماہانہ کا اضافہ کر دیا۔ پھر وہ اٹلی کے دارالحکومت، روم میں سرکاری ٹرپ پر آیا تھا، یہاں اس کی ملاقات ایک یہودی لڑکی ارسلا سے ہوئی جو فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے لیے تن من دھن سے کام کر رہی تھی۔ اس نے بل ہچکاک کی عربوں کی ملازمت کو قحبہ خانے کی کمائی کے مترادف قرار دیا۔ لیکن دو لاکھ روپے میں اسی رات اپنی عصمت کا سودا کر کے بل ہچکاک کے بستر عیش کی زیب و زینت بن گئی۔ بل ہچکاک اس سے ایران، سوئٹزرلینڈ، فرانس وغیرہ میں ایٹم بم سازی کے راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس نے فراہم کرنا شروع کر دیے۔ روم کے بعد بل ہچکاک سعودی عرب کے ولی عہد وغیرہ کے ساتھ شہنشاہ ایران سے ملنے تہران گیا۔ یہاں اس وفد نے شہنشاہ کو بتایا کہ سعودی عرب پیٹرول کی قیمت میں کمی کرنا چاہتا ہے لیکن شہنشاہ ایران نے اس تجویز کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ تہران سے بل ہچکاک پیٹرولیم کے وزیر شیخ ذکی احمد یمنی کے ساتھ لندن آیا جہاں دنیا کے چار بڑے پیٹرولیم کے سرمایہ داروں کے ساتھ مذاکرات و مشاورات کے بعد یہ طے کیا گیا کہ نیویارک اور واشنگٹن جا کر سرکاری اور غیر سرکاری با اثر لوگوں کو بتایا جائے کہ سعودی عرب امریکہ کو طویل مدت تک کم قیمت پر پیٹرول سپلائی کرے گا بشرطیکہ امریکہ سعودی عرب کے مطلوبہ دفاعی ہتھیاروں کو فوراً سپلائی کر دے۔ اسی دوران ارسلا کا باپ خرم شہر کی ایک بڑی لیبارٹری میں ایران کے لیے خفیہ طور پر ایٹم بم بنانے میں مصروف تھا۔ شہنشاہ نے اُسے حکم دیا تھا کہ ۲۸ مارچ ۱۹۷۹ء تک انہیں ایک درجن ایٹم بم تیار ملنے چاہئیں۔

۲۳ جنوری ۱۹۷۹ء کو یہ لوگ نیویارک کے لیے ایک اسپیشل ہوائی جہاز کے ذریعہ روانہ ہو گئے۔ جسے مرفی نام کے ایک

کھرب پتی نے جو اس وفد میں شامل تھا کہا تھا کہ اگر وہائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے سربراہ نے سعودی عرب کی اس پیش کش
اور سرگرمیوں سے امریکہ کے صدر کو سعودی عرب کی اس پیشکش اور اس سے منسلک مطالبہ کو منظور نہیں کیا تو اُسے اپنے
کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

نیویارک پہنچنے کے بعد بیڑو دیم بکینوں کے ان چار سربراہوں نے اپنی برق رفتار جدوجہد اور سرگرمیوں سے امریکہ کے صدر کو سعودی عرب کی پیش کش اور اس سے منسلک شرط کو قبول کر لینے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر اسی ہفتے امریکہ سے سعودی عرب کو ہتھیاروں کی سپلائی شروع ہو گئی۔ تیل کی کمی ہیں، اس کمی کے اعلان سے قذافی ناراض ہو گئے اور انہوں نے اوپیک کا فوری اجلاس طلب کر کے امریکہ اور سعودی عرب کو دھمکیاں ہی نہیں دیں بلکہ مخالفت کی مہم کا آغاز کرنے کے لیے وہ کی روز فرانس اور جرمنی کے دورے پر روانہ ہو گئے صدر قذافی کے اس اقدام سے امریکی اور برطانوی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔

ابھی سعودی عرب کے سربراہ بل ہچکاک جنرل فاک وغیرہ کے ساتھ امریکہ ہی میں تھے کہ یکم مارچ ۱۹۷۹ء کی شام کو بادشمن میں کسی عرب گوریلے نے سلطان عبدالعزیز، وزیر دفاع کی بلند و بالا عمارت کی دسویں منزل سے فائروں کی بوچھار کر دی۔ ان کے ساتھ بل ہچکاک اور جنرل فاک بھی تھے جو سلطان کی ڈھال بن گئے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ حملہ آور تو پولس کی گولیوں کا شکار ہو گیا لیکن یہ لوگ بچ گئے۔ سلطان عبدالعزیز کو امریکی حکومت نے فوراً ہی ایک اسپیشل ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا دیا اور بل ہچکاک تین دن قیام کرنے کے بعد اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے سوئٹزرلینڈ کی پہاڑی سیرگاہ سینٹ مارٹز چلا آیا یہاں آ کر ۳ مارچ کو اُرسلا ہرٹ مین نے اُسے بتایا کہ ایٹم بم بنانے میں مدد دینے کے لیے حل ابیب سے ایک پروفیسر بن لیوی جو عربوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کے ناپاک عزائم رکھتا ہے اس کے باپ سے جا ملا ہے اور وہ اپنے باپ سے یہ کہہ کر چلی آئی ہے کہ وہ دونوں ہی اسرائیل کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ اسرائیل کی سلامتی اسی میں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ جنگ و جدل سے محفوظ و مامون رہے لیکن طاقت کا توازن ایران و عرب میں اس طرح برقرار رہے کہ آپس میں فوجی مناقشات پیدا نہ ہو سکیں اُرسلا کے نزدیک اسرائیل کی سلامتی کے مسئلہ کا یہی تیسرا حل تھا۔

اُرسلا اور بل ہچکاک نے سینٹ مارٹز (سوئٹزرلینڈ) آنے کے بعد دیکھا کہ شہنشاہ ایران بھی وہاں حسب معمول مارچ کا مہینہ گزارنے کے لیے مع اپنی ملکہ کے آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ جنرل خاتمی اور جنرل فریدوں بھی تھے۔ شہنشاہ کی آمد کے اعزاز میں ایک شاندار عشائیہ میں اُرسلا اور بل ہچکاک بھی مدعو تھے اور اسی دعوت میں شہنشاہ نے اُرسلا کے رخساروں پر بوسے مرتسم کرتے ہوئے اُس سے جلد ہی تخلیہ میں گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بعد میں انہوں نے امریکی، روسی سفیروں، مغربی جرمنی کے چانسلر اور فرانس کے سربراہوں سے انتہائی رازمیں گفتگو کی۔ اسی دوران یہ خبر وحشت اثر پھیل گئی کہ سعودی عرب کی حکومت کا تختہ الٹ چکا ہے اور شیخ ذکی احمد یمنی ولی عہد فہد، سلطان عبدالعزیز وغیرہ قتل کیے جا چکے ہیں۔ فرانسیسی خبر رساں ایجنسی کی غیر مصدقہ اطلاعات کے بموجب شاہ خالد بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ بل ہچکاک کو امریکہ سے کئی فون موصول ہوئے جن کے ذریعے یہ اطلاع دی گئی کہ سعودی عرب کی حکومت نے امریکہ میں اپنے جمع شدہ سرمایہ کی میعادیں اضافہ کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اب یہ سرمایہ امریکہ سے ایک بار پھر یورپ کی جانب منتقل ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی دنیا میں کہرام برپا ہونے کا باعث بن گیا ہے۔

بل ہچکاک نے ان تمام خبروں کی تصدیق کے لیے ریاض سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ تمام مواصلاتی رشتے ٹیلی فون، ٹیلیکس، کیبل اور ریڈیو ٹیلی گراف کٹ چکے ہیں۔ حد یہ تھی کہ سعودی عرب جانے والی تمام ہوائی جہازوں کی پروازیں منسوخ کی جا چکی تھیں۔ بل ہچکاک سعودی عرب سے پتنگ کی طرح کٹ چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو مایوسی کے جنگلوں میں بھٹکتا ہوا محسوس کیا۔ وہ نہ تو سعودی عرب کی صورت حال معلوم کر سکتا تھا نہ وہاں بذات خود پہنچنے کے لیے کوئی ذریعہ اس کے پاس موجود تھا۔

شہنشاہِ ایران ۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو سوئٹزرلینڈ آئے۔ یہاں انہوں نے سوئٹزرلینڈ کے وزیرِ خارجہ کے پیش کردہ ایک ایسے اقرارنامے پر دستخط کیے جس کی رو سے ایران آنے والے دنوں میں سوئٹزرلینڈ کو بغیر کسی اضافے کے پیٹرول فراہم کرتا رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان فوجی نقشوں اور گوشواروں کو دیکھا جو ان کے دو جنرلوں خاتمی اور فریدون نے ایک کمرے کی دیواروں پر آویزاں کر دیے تھے۔ ان نقشوں میں مشرقِ وسطیٰ کی فوجی اہمیت کے شہروں اور ملکوں کو نمایاں کیا گیا تھا اور گوشواروں میں دی گئی ہتھیاروں کی تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایران ایک عظیم الشان فوجی طاقت بن چکا ہے اور اس کے پاس ایسے جدید ترین ہتھیار موجود ہیں جو کسی موسم اور کسی مقام پر قہرِ خداوندی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

محمد رضا شاہ پہلوی نے یہیں اس امریکی سفیر سے ملاقات کی جو سوئٹزرلینڈ میں مامور تھا۔ اس سفیر کو شہنشاہ نے بتایا کہ سعودی عرب کی حکومت کا تختہ امریکن دشمن شہزادہ عبداللہ نے الٹ دیا ہے اور اب وہ عراق کی حکومت کے تعاون سے ایران پر حملہ کرنے کی نیت سے دریائے شط العرب کے کنارے اپنی فوجیں اور ہتھیار جمع کر چکے ہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں پہلوی تاجدار نے امریکی سفیر کو چند تازہ ترین تصاویر دکھائیں۔ تھوڑی دیر بعد روسی سفیر کو انہوں نے شرفِ باریابی عطا کر کے کم و بیش وہی باتیں کیں جو امریکی سفیر سے کر چکے تھے۔ لیکن اس میں یہ اضافہ کر دیا تھا کہ شہزادہ عبداللہ نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے یمن کے ذریعے چینیوں کی مدد حاصل کر لی ہے اور اب ان کا یہ خیال ہے کہ قذافی، بومدین، عراق اور چین کی حکومتوں کے تعاون سے خلیج فارس پر قبضہ کر کے وہاں کے تیل کے ذخیروں کو اپنی ملکیت میں لے لیا جائے۔ روسی سفیر کے لیے چینیوں کا روس کے جنوب میں اس قدر نزدیک آجانا ایک ایسی وحشت انگیز خبر تھی جس کو سن کر وہ چونک اٹھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ شہنشاہ کی دی ہوئی اطلاعات سے قطعی مطمئن نہیں ہیں۔

روسی سفیر کے چلے جانے کے بعد شہنشاہ نے فرانس سے آئے ہوئے دو گروپوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی، ایک گروپ وہاں کی جہاز ساز کمپنی کے ارکان پر مشتمل تھا اور دوسرا سرکاری وفد جس میں وزیرِ اعظم اور وزیرِ اقتصادیات شریک تھے۔ شہنشاہ نے ان کے سامنے پیٹرول کی فراہمی کے سلسلے میں کچھ مراعات کی پیش کی اور جدید ترین بمباروں، میزائلوں اور دیگر مہلک اور قیامت خیز ہتھیاروں کو تین دن کے اندر اندر تہران ہوائی اڈے پر سپلائی کرنے کا آرڈر دیا۔ انہوں نے فرانس کے سرکاری وفد سے یہ بھی کہا کہ وہ ایران سے دوستی کی خاطر امریکہ کو اب کے یورپ کے دفاعی اڈوں کو استعمال کرنے کا موقع نہ دے اور اس ضمن میں وہ جرمنی، اٹلی اور دوسرے متعلقہ ممالک کے سربراہوں کا تعاون حاصل کرے۔

تھوڑی دیر تک تنہائی میں مشاورت کے بعد فرانس کے وزیرِ اعظم اور وزیرِ اقتصادیات نے طے کر لیا کہ ایران کو اس کے مطلوبہ ہتھیار جلد از جلد سپلائی کیے جائیں اور شہنشاہ سے ہتھیاروں کی سپلائی اور ان کی پیش کردہ تیل کی فراہمی میں مراعات کے معاہدے پر دستخط کر کے اگلے قدم اٹھائے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کاغذی خانہ پری کے فوراً بعد ہی فرانس کے دونوں گروپ اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر پیرس کی جانب روانہ ہو گئے۔

شہنشاہ نے مغربی جرمنی کے چانسلر کو بھی سینٹ مارٹز بلایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مغربی جرمنی بھی ایران کے موقف کا حامی بن جائے۔ اس چانسلر کی خاطر داری کے لیے فرانس کی جانب سے ایک حسین و جمیل دوشیزہ مقرر کی گئی تھی جس نے اپنے حسین و جمیل جسم کو اس کی آغوش میں ڈال کر اس کی ذہنی تھکاوٹ دور کر دی تھی اور ذہن پر کثافت کی تہہ کو اس طرح صفائی کے بعد وہ فرانس کی حمایت کرنے کے لیے فیصلہ کر چکا تھا۔ اور حمایت یہ تھی کہ اگر امریکی افواج یورپ کے اڈوں سے ایران کی جانب رخ کرنا چاہیں تو انہیں کوئی تعاون نہ دیا جائے۔

اسی رات ڈاکٹر بل بچکاک کو سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک کے سربراہ ہربرٹ نے بتایا کہ ان کی حکومت نے امریکہ جمع شدہ تمام سوئس سرمائے کو واپس نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بل بچکاک کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اس سلسلے کے حسن جہاں سوز اور ریکلم شیریں نے اسی جگہ پہنچا دیا جہاں حسن اور جمال کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا

ابھی وہ اَرسلا کی گھنیری زلفوں کے پیچ و خم کو سنوارنے میں مشغول تھا کہ خود شہنشاہ ایران نے اس سے فون پر رابطہ قائم کرنے کے بعد اسی وقت اُسے اپنی قیامگاہ سوریتا ہاؤس میں آنے اور شاہی شراب و کباب سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی۔ شہنشاہ نے کہا کہ انہیں کسی اہم معاملہ میں اُس کے مشورے کی فوری ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ اَرسلا کو اپنے ساتھ لانا ہرگز فراموش نہ کرے۔

جب بقیہ سینٹ مارٹز سویا ہوا تھا۔ یہ دونوں برف آلود زمین پر پیدل چلتے ہوئے شاہ کے پاس پہنچے جنہوں نے بہ نفس نفیس دونوں کا استقبال کرتے ہوئے اَرسلا کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حسن و جمال کا مہکتا ہوا شگفتہ و شاداب گلدستہ ہے۔

گفتگو کے دوران دیگر اقتصادی نکات پر بحث کرتے ہوئے شیکو نسرٹ شپ کی پُر اسرار اصطلاح کے مفہوم کو معلوم کر کے اپنی ذہنی الجھنوں کو دُور کر لیا۔ اسی بحث و مباحثے کے دوران جب اَرسلا نے اپنے باپ کی ایران میں ایٹم بم سازی کے لیے ملازمت کے سوال پر اپنے غم و غصّے کا اظہار کرتے ہوئے شہنشاہ کے سامنے گستاخانہ رویّے کا اظہار کیا تو ملکِ معظم نے دونوں کو اپنی رو بکاری سے باہر نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ تمام یہودی ایک ہی قماش کے ہوتے ہیں۔ سب کے سب من حیثیت العقوم جھگڑالو اور فسادی ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اَب جب کہ یہ بات صاف اور واضح ہو چکی ہے ان کی سازشوں کے خاتمے کا وقت آچکا ہے۔

اپنے گھر واپس لوٹتے ہی ڈاکٹر بل بچکاک نے امریکی بینکوں کے سربراہ اور سوئٹزرلینڈ میں قیام پذیر امریکی سفیر کو ٹیلیفون کے ذریعے متنبہ کیا کہ ایران آنے والے دنوں میں مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور ایٹم بم بنانے کے لیے اس نے ایک سوئس سائنس دان کی خدمات مستعار لے رکھی ہیں۔ لیکن دونوں نے ہی ڈاکٹر بل بچکاک کی اس خبر پر یقین نہیں کیا۔ اسی شب شہنشاہ اپنے ذہن سے اَرسلا کی گستاخ روی کی تلخی کو ایک سوئس حسینہ تر دوی شنیدر کے حسن و جمال سے کھیلنے میں معروف تھے اَرسلا اپنے باپ کو شہنشاہ سے ہوئی جھڑپ کی تفصیلات سے فون پر آگاہ کر رہی تھی۔ اور ڈاکٹر بل بچکاک اپنے بستر پر لیٹے ہوئے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

اَرسلا اور اس کے والد پروفیسر ہربرٹ ہین کے درمیان کافی دیر تک فون پر گفتگو جاری رہی۔ بات چیت ختم ہو جانے کے بعد اس نے ڈاکٹر بل بچکاک کو بتایا کہ اس کے باپ نے اسے مطلع کیا ہے کہ ایران میں ایٹمی ہتھیار بنانے کے سلسلے میں اس نے از خود ملازمت حاصل کرنے کی کوئی جد و جہد نہیں کی بلکہ اسے بلیک میل کر کے یہاں لایا گیا تھا شہنشاہِ ایران کی ذاتی خفیہ سروس "ساواک" کے چیف تبریزی نے اس سلسلے میں سوئٹزرلینڈ جا کر وہاں کی سب سے عظیم فرم بوش بونا کے چیرمین ڈاکٹر ہینس پیٹر کو ایک نایاب اور لاکھوں روپیوں کا قیمتی تحفہ اور ان کی کمپنی کو کروڑوں روپیوں کا ٹھیکہ دینے کا لالچ دینے کے بعد ایک ارب روپے کا چیک بطور پیشگی پیش کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ ایران کو معلوم ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی حکومت ایٹمی ہتھیار بنا چکی ہے۔ اگرچہ سوئیس حکومت ایسے ہتھیار نہ بنانے کا بین الاقوامی سطح پر بڑی ملکوں کی معیت میں اعلان کر چکی تھی۔ یہ انکشاف ڈاکٹر مسوٹر کے لیے نہایت ہیجان خیز تھا چونکہ وہ سوئیس دفاعی پلاننگ یونٹ میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی نگرانی سوئیس آرمی کے ایک کرنل کی حیثیت سے کر رہے تھے۔ جب اس انکشاف کے بعد تبریزی نے اپنے میزبان سے کہا کہ وہ ڈاکٹر ہربرٹ ہین کی خدمات اس ضمن میں مستعار لینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر مسوٹر کے ذہن میں اس مطالبے نے تین چار باتیں اجاگر کر دیں۔ اولاً یہ کہ مجوزہ ٹھیکے سے ان کے ملک کو بے پناہ اقتصادی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ بصورتِ دیگر تقریباً ایک درجن ممالک بشمول ہندوستان اس ٹھیکے سے معاشی

فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ دوئم یہ کہ ایران اس کی حکومت کو ہمیشہ کے لیے رعائتی نرخوں پر تیل فراہم کرنے کی ضمانت دے رہا تھا جو سوئٹزرلینڈ کی سماجی، سیاسی اور معاشی بقا کے لیے انتہائی اہم چیز تھی۔ تیسرے یہ کہ انکار کی صورت میں یہ راز کہ اس کی قوم کے سائنس دان خاموشی اور رازداری کے ساتھ ایٹم بم بنا کر مذکورہ معاہدے کی خلاف ورزی کر چکے تھے طشت از بام ہو کر سوئیس حکومت کے لیے بین الاقوامی سطح پر بڑی الجھنیں اور بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا جبکہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر مسوٹز نے تبریزی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی درخواست کو سوئیس حکومت کے سربراہوں کے سامنے فوراً ہی پیش کر کے اس تجویز کو منظور کرا لے گا۔ اور اس کے بعد ہی اس نے اپنی حسین و جمیل شباب کے نشے میں چور سیکرٹری کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ تبریزی نے جب اس حسن و شباب کے مجموعے کو دیکھا تو اس کی جنسی بھوک بیدار ہو چکی تھی اور سیکرٹری نے اس کے ارادوں کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیا

ڈاکٹر مسوٹز کی ہدایت کے مطابق اس کی چنچل اور شوخ سیکرٹری نے تبریزی کو دن میں شاپنگ کرائی اور شب اسی کے ساتھ بسر کی۔ شام کو جب یہ دونوں شاپنگ میں مصروف تھے سوئٹزرلینڈ کی حکومت کے سربراہ تبریزی کی پیش کردہ تجاویز پر غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں قبول کر لینے میں ملک و قوم کا فائدہ ہی فائدہ ہے اور کسی بھی صورت میں کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں۔ چنانچہ یہ بھی طے کر دیا گیا تھا کہ پروفیسر برٹ مین کو پہلی فرصت میں تہران روانہ کر دیا جائے۔ اور اس طرح بل ہچکاک کو اس بین الاقوامی سطح پر کی گئی بلیک میلنگ کا علم ہوا جو اسی رات جب شہنشاہ اور مس ارسلا ہرٹ مین کے درمیان چپ چاپ ہو گئی تھی۔

۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو شہنشاہ ایران مع اپنی ملکہ فرح دیبا اور دوسرے ساتھیوں کے ایران روانہ ہو گئے اور ان کے شاندار قافلے کو سینٹ فارٹز سے گزرتے ہوئے بل ہچکاک اور ارسلا دونوں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے دیکھا اور پھر تیسرے دن یعنی ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو شہنشاہ ایران نے اپنے معتبر نجومیوں کی بتائی ہوئی نیک ساعت پر صبح ۲ بج کر بیس منٹ پر مشرق وسطیٰ کی چہار روزہ لڑائی کا آغاز کر کے اپنی بے پناہ فوجی طاقت کو میدان جنگ میں دھکیل دیا۔

شہنشاہ ایران ۱۸ مارچ کی شام کو ہی اپنی کمانڈ پوسٹ پر آ چکے تھے جو ایک ایسے (بنکر) تہ خانے میں تھی جو کہ گہرائی خرم شہر کے نواح میں واقع ہوائی مستقر کی سطح سے بیس فٹ نیچے تک چلی گئی تھی۔ اس ہوائی اڈے سے سب سے پہلے فضائی حملوں کا آغاز ہوا۔ ایک سو فینٹم اور پچاس فرانسیسی ایف۔۱، بروز پیر بتاریخ ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء صبح چھ بجے خرم شہر سے اڑے اور عراق کی فوجی چھاؤنی پر حملے کی غرض سے چل دیے۔ ان فینٹم بمباروں میں فونیکس میزائل نصب تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے طلوع ہونے سے پیشتر عراق کے دوسو پچاسی (۲۸۵) لڑاکو ہوائی جہازوں میں سے تیس تباہ کر دیے گئے۔ عراق کے ان جہازوں پر سطح زمین سے فضاؤں میں چھوڑے جانے والے میزائل اپنے صحیح نشانے پر لگے۔ اور یہ ان ایرانی پائلٹوں کی کارگزاری تھی جنہوں نے امریکا میں تربیت حاصل کی تھی۔ تباہ ہونے والے جہازوں میں سعودی عرب کا کوئی ہوائی جہاز نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہاں درحقیقت سعودی عرب کا کوئی ہوائی جہاز موجود ہی نہیں تھا۔

اس کے بعد دوسرا ہوائی حملہ شہنشاہ کے حکم سے ام قصر پر ایک گھنٹہ بعد کیا گیا۔ ام قصر عراق اور کویت کی سرحد پر ایک بندرگاہی شہر تھا، اس بندرگاہ پر جو دریا شط العرب کے دہانے پر تھا عراقی حکومت نے روسی سائنس دانوں کی مدد سے ایک ایسا بحری جہازوں کا اڈہ بنا یا تھا جو اس اہم فوجی مرکز کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اس شہر پر حملے کے لیے ایک سو بیس ... ایف۔ ۵ لڑاکا ہوائی جہازوں کو استعمال کیا ... اور اسے برباد کر دینے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر تقریباً

ساڑھے آٹھ بجے صبح ایرانی فوجیں ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ اتاری ہوئی اس میں داخل ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چہل قدمی کی خاطر گئی ہوں۔ انہیں روکنے یا ان پر حملہ کرنے کے لیے کوئی عراقی فوج وہاں موجود نہ تھی۔ بنکر میں رضا شاہ پہلوی کے ساتھ جنرل خاتمی بھی موجود تھے۔ جب حملوں کی کامیابی اور ایرانی افواج کی فتح و نصرت کی خبریں فوجی ریڈیو سے شہنشاہ کو موصول ہوئیں تو انہوں نے خاتمی کو پرزور الفاظ میں مبارکباد پیش کی۔ یہ دونوں جس بنکر میں تھے۔ اُسے عصر جدید کی ٹیکنالوجی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اسے سان فرانسسکو کی عالمگیر شہرت رکھنے والی بیچل کارپوریشن نے تعمیر کیا تھا اور اس میں دیگر آلات حرب اور راڈر وغیرہ نصب کرنے میں دنیا کی مشہور و معروف کمپنیوں کا ہاتھ تھا۔ ان کمپنیوں میں ریتھان، ویسٹنگس ہاؤس، لٹن انڈسٹریز اور ٹیکساس انسٹرومینٹس شامل تھیں۔ جن کا فراہم کردہ مواصلاتی سسٹم اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس بنکر کو اتنا مضبوط، اتنا محفوظ اور اتنا جدید بنایا گیا تھا کہ خود ان دنوں اس کی نظیر پینٹاگان یا واشنگٹن میں واقع صدارتی محل وائٹ ہاؤس میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ یہ بنکر تمام تر جدید ترین آلات سے لیس عراق کی سرحد سے دس میل دور اور خلیج فارس سے پندرہ میل دور شمالی سمت میں واقع تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی جائے وقوع ایرانی کمانڈر ان چیف کے موجود ہونے کی صورت میں خطرۂ جان بھی بن سکتی تھی۔ لیکن شہنشاہ نے خود کو جنرل پیٹن کے روپ میں پیش کرنا، آئزن ہاور کے مقابلے میں زیادہ اچھا سمجھا تھا۔

آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر حملے کے سلسلے میں جو دوسرا حکم دیا گیا وہ کسی ایرانی فوجی جنرل کا نہیں بلکہ خود شہنشاہ کا تھا

"خاتمی میرا خیال ہے کہ ہم اپنی فوجوں کو دریائے شط العرب عبور کرنے کا حکم دے دیں۔"

"اس وقت" جنرل خاتمی نے اپنے آقا کی طرف تعجب خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں اسی وقت" جنرل خاتمی کو جواب ملا۔

تیسرا ہوائی حملہ جس میں فینٹم اور ایف۔۵ دونوں طرح کے بمبار ہوائی جہاز شامل تھے بے حد خطرناک ثابت ہوا۔ اس حملے کے ساتھ ساتھ خرم شہر اور آبادان کے فوجی اڈوں سے میزائل چھوڑے گئے تھے۔ ان کے علاوہ نیپام بموں نے بھی تباہی و بربادی کا طوفان برپا کر کے عراقی صفوں میں ہلچل مچا دی۔

بلاشبہ ایرانی فوجوں اور خصوصاً فضائی فوجیوں نے سارے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں سب سے زیادہ جرات بہادری اور وفاداری کا ثبوت پیش کیا۔ ۱۹۶۷ء میں جو حملہ اسرائیل نے عربوں پر کیا تھا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔

ہر ٹارگیٹ پر ایسے نپے تلے انداز میں بموں کی بارش کی گئی تھی جیسے ہوابازوں نے اس کی مشق ایک بار نہیں بلکہ درجنوں بار کی ہو۔ جہاں تک خرم شہر کے مذکورہ بنکر میں موصول ہونے والی ریڈیائی اطلاعات سے معلوم ہوا تھا ایک حملہ بھی رائیگاں نہیں گیا۔

۱۹ مارچ کی اس صبح کو گیارہ بجے جب تینوں حملے کامیابی کے ساتھ مکمل ہوگئے تو شہنشاہ نے اپنے مخصوص فوجی کھیل کا آغاز کرنے سے پہلے شاہدہ سے کہا:

"اب میں اپنا کھیل شروع کرتا ہوں۔"

اور اس کھیل کا خاتمہ تاریخ نگاروں کے الفاظ میں اس طرح ہوا کہ دریائے شط العرب کے مغربی علاقے قبرستان کی طرح ویران اور سنسان ہوگئے۔ ان پر بموں کی ایسی بارش ہوئی کہ وہ اس وقت تک اجاڑ اور بنجر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ دن کے گیارہ بجے ظہور پذیر ہوا تھا۔

دو گھنٹے بعد تقریباً ایک بجے برطانوی ساخت کے ہوورکرافٹوں نے جنہیں دزفول اور اہواز کے درمیانی علاقے میں رکھا گیا تھا۔ قطار در قطار پرواز کرنا شروع کی اور عراقی افواج پر ان کی پشت سے حملے کیے جن سے بے گنتی لوگ مارے گئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک قتل عام تھا جس سے متاثر ہو کر عراقی افواج کی اکثریت نے مر ...

پسپائی سے بچتے ہوئے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا۔
شام ہوتے ہی لڑائی میں سکون آیا اور خرم شہر کے بنکر میں موجود ایرانی جرنیلوں نے شہنشاہ کی معیت میں مشرقِ وسطیٰ کے اس بڑے نقشے پر نظریں دوڑانا شروع کر دیں جو بنکر کی مشرقی دیوار کو پوری طرح ڈھانپے ہوئے تھا۔ شہنشاہ کی انگلیاں اپنے جرنیلوں کو ٹارگیٹ کی نشاندہی کرتی ہوئی کویت، بحرین، قطار، ابوظہبی، دبئی اور سب کے بعد عمان پر پھسلتی ہوئی رک گئیں۔
رات کے آٹھ بجے تک دوسرے دن کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔
مشرقِ وسطیٰ میں یہ چار روزہ جنگ لڑی جا رہی تھی اس وقت سارے امریکا میں طرح طرح کی افواہیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ تمام غیر ملکی بینکوں اور حکومتوں نے امریکی بینکوں سے اپنا سرمایہ نکالنا شروع کر دیا۔ ہر بینک کے سامنے دو دو میل سے پانچ پانچ میل لمبی قطاروں میں کھڑے ہوئے لوگ اپنا اپنا سرمایہ نکالنے کے لیے بے چین تھے۔ بعض علاقوں میں سردی کی وجہ سے کہر پڑ رہا تھا لیکن بینکوں سے سرمایہ واپس لینے والوں پر اس کڑکتی ہوئی سردی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ یہ وبا اتنی بری طرح پھیلی کہ امریکا کے سب سے بڑی ساکھ رکھنے والے بینک "فرسٹ نیشنل" میں جمع شدہ رقم خلاص ہو گئی تو تار پر تار کھڑکنے لگے اور نیو یارک فیڈرل ریزرو بینک میں لگے ہوئے سینکڑوں ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں مستقل بجنے لگیں۔ دوسرے بینکوں سے اس تعداد میں روپیوں کی مانگ کی جا رہی تھی کہ یہ امریکا کا عظیم ترین بینک بھی امداد پہنچانے سے لاچار ہو گیا یہاں تک کہ معاملہ امریکا کے صدر کے نوٹس میں لایا گیا۔
۱۹ مارچ کی شام کو صدر کے وہائٹ ہاؤس کے سامنے سینکڑوں کاریں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہر محکمہ کا انچارج اور شہر کی دوسری عظیم ہستیاں ہی نہیں بلکہ سارے امریکا سے بینک کار اسپیشل ہوائی جہازوں کے ذریعے واشنگٹن پہنچ کر صدر سے ملاقات کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن صدر نے کل چار عمائدین سلطنت کو اپنے بیضوی دفتر میں طلب کیا۔ ان میں سیکرٹری آف اسٹیٹس، ڈیفنس سکرٹری، امریکی خزانے کے ناظمِ اعلیٰ اور فیڈرل ریزرو بینک آف امریکا کے چیئرمین کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔
اس دن پانچ بجے ان بڑوں کے اجلاس میں جو مذاکرات ہوئے وہ محض سرمائے سے متعلق تھے۔ فیڈرل ریزرو بینک کے چیئرمین نے سب سے پہلے صدر کو مفصّل طور پر اس روز کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ عنقریب امریکی بینکنگ سسٹم فیل ہونے والا ہے۔
"جنابِ عالی" وزارتِ مالیات کے سکرٹری نے کہا "اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، اس کی ذمہ داری خود ان بینکوں پر آتی ہے جنہوں نے اندھا دھند غیر ملکی سرمایہ اپنے یہاں جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے اس عمل سے افراطِ زر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ غیر ضروری تعداد میں کرنسی نوٹ چھاپنے پڑے،
"ٹھیرو ..... !"
صدر نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ "میں ان باتوں کو سننا نہیں چاہتا ہوں تاکہ بلین مارکیٹ بند ہو جائیں نہ میں یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ ایک بھی امریکی بینک خود کو دیوالیہ قرار دے۔ سمجھے؟"
"میں ..... " سیکرٹری امورِ مالیات نے جواب دینا چاہا تھا کہ صدر کی گرج دار آواز نے ان کے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا۔
"جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ ورنہ جس گدے پر تم سوار ہو اُسے تم سے چھین لیا جائے گا۔"
سکرٹری امورِ مالیات کو اب ہوش آ چکا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اس بحران کو روکنے کے لیے پچیس بلین ڈالر کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے فوجی ہوائی جہاز اتنی تعداد میں مل جائیں کہ تمام بڑے بڑے شہروں کے مرکزی بینکوں میں کل صبح ان کے کھلنے سے پیشتر رقوم روانہ کر دی جائیں تو عوام کی ... اعتماد پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)

Regd. No. D. (S)032

Registered with the Registrar of News Paper at R. N. No. 12786.61

Phone : 698864

MONTHLY
VOL. 14

'HUMA'

URDU DIGEST Delhi
No. 150

FEBRUARY 1979